

# دل دریا سمندروں ڈونگے

آسیہ مرزا

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

# دل دریا سمندروں ڈونگے

آسیہ مرزا

کتابی شکل: پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

پاکستانی پوائنٹ کوئی تجارتی ویب سائٹ نہیں ہے یہاں پر موجود تمام ناولز بالکل مفت ہیں۔ اس مشن کا مقصد صرف اردو ادب کی خدمت کرنا ہے تاکہ وہ لوگ جو وطن سے دور ہیں اور اردو کتب حاصل نہیں کر سکتے، وہ یہاں سے ڈاؤنلوڈ کر لیں۔ اگر آپ اردو لکھنا جانتے ہیں تو آپ بھی روز کا ایک صفحہ کمپوز کر کے اس مشن کا حصہ بن سکتے ہیں۔ مزید معلومات کے لئے، سپر موڈز: روشنی، بسم، حبیب یا مینجمنٹ و قار سے رابطہ کریں، شکریہ

# دل دریا سمندروں ڈونگے

گلناز کو لگ رہا تھا جیسے یہ سنسناتی گولیاں سیدھی اُس کے دل میں اتر رہی ہیں۔ کاش کوئی لہراتی، سنسناتی گولی اُس کے سینے میں بھی اتر جائے اور پھر ہمیشہ کے لئے وہ گہری خاموشی میں اتر جائے۔

نہ کوئی دکھ۔ نہ آرزوؤں کی ٹوٹی کرچیاں اُسے زخمی کریں گی۔ اس ظالم خود غرض دنیا سے وہ بہت دُور نکل جائے۔

اُس کی کوٹھی میں بھی زندگی تھرک رہی تھی۔ دُور دُور سے رشتہ دار شاہ بانو کی شادی میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے۔

وہ بہن کی خوشی میں شریک تھی۔ بظاہر اس کے لب مسکرا رہے تھے۔ اُس کا چہرہ مسرت سے دمک رہا تھا اور سب کی نگاہیں بھی اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔ مگر اُس کی روح بہت دُور تھی۔ وہاں تک کسی کی نگاہیں نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ ہاں، مگر شاہ بانو اُس کی آنکھوں میں نہیں، اُس کی رُوح میں جھانک رہی تھیں جہاں ایک عظیم طوفان برپا تھا۔

افیت ناک۔

کرب ناک۔

اور شدید جلتے ہوئے شعلوں کی آندھیاں محورِ قص تھیں۔

یہ چہرے پر سچی مصنوعی روشنیاں جو نظر آرہی تھیں مگر اندر تیرگی کے فانوس چمک رہے تھے۔

وہ آگاہ تھی اس سارے احساسات سے۔ مگر محض تماشائی تھی وہ بھی۔ مگر اس کے اندر آپنی کے انتقام لینے کے جذبے چل رہے تھے۔ وہ جتنی بار آپنی کی اُداسی اور ملول نگاہوں کو دیکھتی، فیروز خان سے نفرت اتنی ہی تیزی سے اندر اُٹھتی۔

وہ جب حویلی میں دُہن بن کر اُتری تو زرتاشہ جو دو دن پہلے ہی فیروز خان کی بیوی بن کر اور بی بی جان کی بہو بن کر آچکی تھی، آج اُس کا استقبال کرنے سب سے آگے آگے تھی۔

پُر نور چہرے پر بلا کی معصومیت لئے وہ پُر خلوص مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ اُس کے نرم نرم ہاتھوں کے لمس کی کرنیں شاہ بانو کے اندر مچے طوفان میں اضافہ کر رہی تھیں۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی اور اسی وقت وہ اس کا گلا دبا دے، زہر دے دے یا شوٹ کر دے۔

بہی تو ہے جس نے اس کی آپنی کی خوشیوں کو ڈس لیا ہے۔

اس کے خوابوں کے محل میں آگ لگادی تھی۔

آج گلناز آنسو بہا رہی ہے اور ادھر یہ کھنکھاتی مسکراہٹیں۔

”آداب شاہ بانو!“ زرتاشہ نے جھک کر سلام کیا۔

”ارے سلام تو چھوٹے کرتے ہیں بڑوں کو۔“ کسی نے پیچھے سے جھک کر شرارت آمیز لہجے میں کہا تو ساری لڑکیاں ہنس پڑیں۔

”چلیں سلام نہ سہی، جواب ہی مل جائے۔“ اُس کی نرم اور مترنم آواز پھر ابھری۔ وہ خاموشی سے سہج سہج کر ان کے ہمراہ چل رہی تھی۔ بے حد بھاری کا مدار پشواز کے بڑے سے دوپٹے میں وہ لپٹی ہوئی تھی۔ البتہ اس کا گھونگھٹ اس کی نند گل بی بی نے تھوڑا سا اونچا کر دیا تھا۔ اتنا کہ وہ سر ذرا سا اوپر کر کے اپنے سامنے والے چہرے کو دیکھ سکتی تھی۔

اس وقت تو اس کے اطراف کئی چہرے بکھرے ہوئے تھے جو سب کے سب اس کے لئے اجنبی تھے۔ جن کو اُس نے دیکھنے کی زحمت ہی نہ کی۔ ہاں، البتہ اس کی سماعت میں رنگ برنگے فقرے پڑ رہے تھے۔

”ارے بھابی \_\_\_ کم از کم جیٹھانی کو سلام کا جواب تو دے دیں۔“ گل بی بی شرارت سے ہنسی۔

”بہت شرما رہی ہے بھابی!“ کسی نے پیچھے سے کہا۔

پھر اچانک اُسے سچے سچائے کمرے میں بٹھادیا گیا اور وہ سب اُس کے اطراف بیٹھ گئیں۔ وہ ایک دوسرے پر ہنس رہی تھیں، چوٹ کر رہی تھیں۔ اُسے بھی چھیڑ رہی تھیں۔

”لو بھلا \_\_\_ ہم سے کیا شرمانا۔“ زرتاشہ نے مسکرا کر کہا۔

”آخاہ \_\_\_ دیکھو تو، کتنے آرام سے کہہ رہی ہیں جیسے آپ تو شرمائی ہی نہیں تھیں۔“ ایک لڑکی نے اُسے اچانک پکڑ

لیا۔ ”ابھی دو دن پہلے تو چہرہ اوپر نہیں اُٹھ رہا تھا۔ اور اب کتنا بول رہی ہیں۔“

”ارے نہیں \_\_\_ میرا مطلب ہے یہاں مہر وز خان تو نہیں ہیں۔“ وہ جھینپ گئی۔ پھر تو جیسے سب نے اُسے گھیر لیا۔

”توپر سوں آپ بھی تو مجھی سے شرما رہی تھیں۔ فیروز لالہ تو سامنے نہیں تھے۔“ گل بی بی بھی کسی سے پیچھے نہ رہی۔

”ہاں، ہاں \_\_\_ اب جواب دیں۔“ وہ سب کے زرخے میں پھنس کر بری طرح بوکھلا گئی تھی۔

”چلیں بھئی، میں ہاری۔“ وہ تنگ ہوتے دائرے سے گھبرا کر جلدی سے ہار مان بیٹھی۔

شاہ بانو نے ہلکا سا سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ وہ اُس کے بالکل سامنے ہی کرسی پر بیٹھی تھی۔ ہلکے پرہیل شلوار سوٹ اور بڑے سے بھاری دوپٹے میں اُس کا معصوم حُسن قیامت خیز لگ رہا تھا۔



گلابی گلابی چہرہ، ہلکے میک اپ میں کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ اطراف لٹکتے بڑے بڑے فانوس بھی اس کے سامنے ماند تھے۔ سرخ پتلے پتلے ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے جن میں شبنم سی نرمی تھی۔ بڑی بڑی سحر طراز آنکھیں جن میں کچھ حجاب بھی تھا اور کچھ شرارت بھی۔

اُس کے حُسن میں اتنی معصومیت تھی کہ ایک لمحہ وہ بھی اُسے دل میں سراہے بغیر نہ رہ سکی۔

شاید اسی حُسن، اسی معصومیت نے فیروز خان کو اسیر کر لیا تھا۔ اُس نے لب بھینچ کر چہرہ جھکا لیا۔

وہ گلناز سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ مگر بہر کیف وہ اسٹیٹس کے مقابلے میں اس سے کہیں زیادہ کم تر تھی۔ اُس نے تفاخر سے سوچا۔

’ایک امیر کبیر لڑکی کو ٹھکرا کر وہ رئیس زادہ یقیناً کہیں، کسی لمحے پچھتاوا محسوس کرے گا۔ اور اُسے پچھتناہی پڑے گا۔‘

’چلیں، اب ہم دیکھیں گے پہلے کون سی بہو ساس کی دلاری بنتی ہے۔‘ کسی نے پتے کی بات کہی تو ساری لڑکیاں اس موضوع پر آگئیں۔

’کیوں زرتاشہ بھابی! آپ کا کیا خیال ہے؟‘ اُس کی نند گل بی بی نے پوچھا۔

’محبت بھی نصیب کی بات ہے گل! جس کی جتنی قسمت میں ہوتی ہے اتنی ہی ملتی ہے اس کو۔‘ اُس نے پُر مزاح بات پر سنجیدگی سے جواب دیا۔ ’میری تو ساری محبت اس گھر اور اس گھر کے مکینوں کے لئے ہے۔‘

’لیکن فیروز لالہ کے لئے تو خصوصاً ہو گی نہ۔‘ پھر کسی نے شرارت آمیز جملہ پھینکا۔ وہ سرخ ہو گئی۔

شاہ بانو نے محسوس کیا اس مختصر عرصے میں اس نے گل سے خاصے اچھے تعلقات قائم کر لئے ہیں۔

’اور آپ کا کیا خیال ہے بھابی؟‘ گل بی بی اب شاہ بانو کی طرف جھک کر پوچھ رہی تھی۔ مگر وہ اپنی پوزیشن کا احساس

کرتے ہوئے خاموش رہی۔ وگرنہ اُس کے پاس بہت سے جواب تھے۔ ’اونہہ۔۔۔ زرتاشہ جیسی لڑکیاں ہر وقت نصیب پر قانع رہتی ہیں۔ ہر بات پر قسمت کو لاگھسیٹتی ہیں۔ مگر یہ بھی سچ ہے، کبھی کبھی خوش قسمتی ان جیسے نچلے طبقوں پر بھی مہربان ہو جاتی ہے جیسے تم پر ہو گئی زرتاشہ خان!‘ اُس کا ذہن مسلسل زرتاشہ کی نفرت میں سلگ رہا تھا۔

’مگر اب تم اپنے نصیب کی محبتیں ڈھونڈتی رہنا۔ اس حویلی میں آنا اب تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔‘ اُس نے تصور میں اُس کو مخاطب کیا اور پھر نگاہوں میں سارے جہاں کی نفرت، نخوت سمو کر نکلیوں سے اُسے دیکھا۔

’بی بی جان کے دل میں محبت پیدا کرنا تمہارے لئے اتنا آسان نہ ہو گا۔ کیونکہ تم صرف فیروز خان کی پسند ہو۔ کسی اونچے طبقے اور اچھے خاندان کی فرد نہیں ہو۔ بی بی جان محض ایک خوبصورت اور قیمتی شے کھو جانے کے ڈر سے تمہیں لائی ہیں یہاں۔ میرے سامنے تم ہر لحاظ سے بیچ ہو۔‘ وہ سوچتی رہی۔

’ارے لڑکیو! یہاں کیا ڈیرہ لگائے بیٹھی ہو۔ اب اٹھ بھی جاؤ۔‘ اچانک بی بی جان کی آواز پر سب کی باتوں اور قہقہوں کو بریک لگ گیا۔ وہ بھی یلکھت سوچوں کے بھنور سے باہر نکل آئی۔

’بے چارے فیروز لالہ انتظار کرتے کرتے سوکھ رہے ہوں گے۔‘ جاتے جاتے بھی شوخ فقرے اُچھل رہے تھے۔

خود اُس نے نئی زندگی میں قدم رکھا تھا۔ نئی جگہ، نئے لوگ، چاہنے والا خوبرو شوہر۔

محبت و لطافت کی افراط تھی مگر اس کے اندر جو چنگاری تھی، وہ اب بھی بھڑک رہی تھی۔ جو نفرت اور حقارت وہ زرتاشہ کے لئے اپنے ہمراہ لائی تھی اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔

فیروز خان کے مسرور چہرے کو دیکھ کر اس کے دل میں جو اب بھٹا اٹھتا۔ ہر لمحہ زرتاشہ کے گرد طواف کرتی نگاہیں۔

معنی خیز۔

تبسم آفریں۔

اور کچھ بہکی بہکی۔

زرتاشہ کا ان نگاہوں کی تپش سے سرخ ہوتا چہرہ۔

اور پھر فیروز خان کی شاداب اور پُرسوں مسکراہٹ۔

یہ سب کچھ اُس کا تن من جلائے دے رہا تھا۔ ایک جوالا مکھی پک رہا تھا اُس کے اندر۔

اُسے حیرت ہوتی، تاسف ہوتا کہ فیروز خان جیسا مکمل انسان ایک کم تر لڑکی کو بھلا اتنی شدتوں سے کیسے چاہ رہا ہے۔ محض صورت پر فریفتہ ہے یقیناً۔ وگرنہ تو یہ ذہنی ہم آہنگی، ذہنی رفاقت ایک متوسط طبقے کی لڑکی سے ناممکن سی بات ہے۔

انہی دنوں اُس کے سر پر بم پھٹا کہ گلناز شدید بیمار ہے۔

شاید اُس کی جامد خاموشی کے پیچھے یہی طوفان مچل رہا تھا۔ وہ بلک اُٹھی۔ اُس کی پیاری عزیزاں جاں اپنی فیروز خان کی بے مروتی کا نشانہ بن کر بستر سے جا لگی ہے۔

زرتاشہ کو بھی بہت دکھ ہوا۔ اس نے گلناز کو دیکھا تھا۔

”امی! اتنی اچھی لڑکی کو بھلا ایسی کیا بیماری لگ گئی؟“ اُسے شدید صدمہ ہوا۔ فیروز خان نے اُس سے یہ بات مخفی رکھی تھی کہ وہ پہلے گلناز سے منسوب تھا۔ کیونکہ وہ چند ملاقاتوں میں ہی زرتاشہ کے سارے مزاج کے موسموں سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اُس کے اس نرم اور مہربان دل کو پہچان گیا تھا۔ اگر اُسے ذرا بھی علم ہوتا کہ وہ بزرگوں کے درمیان کئے

گئے فیصلے کی ڈور کاٹ کر اُس کی طرف بڑھا ہے تو وہ یقیناً پیچھے ہٹ کر منہ موڑ لیتی اور اُسے جبراً ان راستوں پر بھیجتی جہاں اُس کی منزل نہیں تھی۔ اور زرتاشہ سے جدائی کا تصور بھی اُس کے لئے محال تھا۔ وہ تو اُس کی روح تھی۔ رُوح سے کٹ کر وہ کیسے جیتا۔

آج اُسے گلناز یاد آگئی۔ اُس کی بیماری کا سن کر احساسِ جرم نے اُسے گھیر لیا۔

کیا قصور تھا اُس کا؟

”کیوں سزا مل رہی تھی اُسے؟“

تو وہ ایک کمزور لمحے کی زد میں آکر سب کچھ بھول گیا۔ کسی ہستی کا استحصال ہوا ہے۔ تین ماہ محبت کی آبیاری کے لئے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

”اوہ خدایا!“ اُس کی پیشانی انفعال سے ڈوب گئی۔

وہ تو ایسا نہیں تھا۔ آج تک اُس کی ذات سے کسی کو ذرہ بھر بھی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ کسی کے ساتھ بھی ناانصافی نہیں کی تھی۔ اُس کی ذات تو ہمیشہ بے ضرر رہی ہوگی۔ مگر اب استحصال جیسا اتنا بڑا جرم اُس سے سرزد ہو گیا۔ اتنا عظیم گناہ۔

اُس نے سر کر سی کی پشت پر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

اپنی منزل پانے کی دُھن میں اُس کے قدموں تلے کتنی آرزوؤں کے پھول کچلے گئے۔ نادانستہ اُس نے کتنے خواب مسمار کر دیئے۔ کتنے لبوں سے مسکراہٹیں چھین لیں۔

اُسے یاد آیا، مہروز کی شادی کے دن اُس نے گلناز کو دیکھا تھا۔ مگر بے حد سرسری انداز میں۔

سُنا سُنا چہرہ۔

ڈھیروں زردیاں \_\_\_\_\_ جن کو میک اپ میں چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔

اُجاڑ، ویران آنکھیں۔

اُس وقت اُس نے دھیان ہی نہیں دیا تھا یا اُس کا ذہن ہی اُس کی اُداسی اور اُس کی ویرانی محسوس نہیں کر رہا تھا۔

مگر آج ان آنکھوں کی ویرانیاں یاد آ رہی تھیں تو اُس کے اندر کرب کی لہریں اُٹھیں۔

مگر سوائے ہمدردی کے اور کوئی احساس نہ جاگا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہیں؟“ وہ اس کے قریب آگئی۔ نرم نرم انگلیوں کے لمس نے اُسے چھوا تو اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

اُس کی زندگی اُس کے بے حد قریب کھڑی تھی۔

”نہیں \_\_\_\_\_ کچھ نہیں۔“ وہ ایک گہری سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔ ”تم گلناز کی طرف ہو آنا۔“ اُس نے کہا تو زرتاشہ

نے سر ہلا دیا۔

مگر پھر وہ نہ جاسکی۔ اچانک بی بی جان کی طبیعت بگڑ گئی۔ یونہی ایک رات سو کر اُٹھیں تو اُن کے سینے میں شدید درد

تھا۔ وہ سب پریشان ہو گئے۔ اُسی روز گل بی بی کے سسرال والے آئے تھے، اُس کی شادی کی تاریخ مانگنے۔ مگر فیروز

خان نے بی بی جان کے یوں اچانک بیمار ہو جانے پر تارتخ دینے سے انکار کر دیا۔ مگر بی بی جان راضی تھیں۔

”نہیں فیروز! گل کی شادی کردو، میری زندگی میں ہی۔ پتہ نہیں وقت کا۔ شاید میں بھی زندہ نہ رہ سکوں۔“

”بی بی جان!“ گل تڑپ کر اُن کے سینے سے لگ کر بلک اُٹھی۔

بی بی جان اصرار کرتی رہیں مگر ان میں سے کوئی بھی راضی نہیں تھا۔

”خوشیاں تو اپنے وقت پر اچھی لگتی ہیں بی بی جان! آپ ضرور صحت یاب ہو جائیں گی۔ اور خود اپنے ہاتھوں سے گل کو

رخصت کریں گی۔“ زرتاشہ اُن کے سر ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے رُندھی آواز میں بولی۔

مگر بی بی کی خوشیاں دیکھنے کی قدرت نے اُنہیں مہلت ہی نہ دی۔ اسی رات اُن کی رُوح اس دارِ فانی سے گزر کر آسمان کی

وسعتوں میں پرواز کر گئی۔

حویلی میں کہرام مچ گیا۔ بی بی جان کی اچانک موت پوری وادی کے لئے صدمہ تھا۔ فرشتہ صفت یہ عورت سب کے

دلوں پر حکمرانی کرتی تھیں۔ سب لوگ اس غم میں بلک اُٹھے۔

شاہ بانو اپنے میکے میں تھی۔ اُس کے لئے یہ خبر بہت بھاری تھی۔ بی بی جان اتنی جلدی اُنہیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ وہ تو

گلناز کی زندگی کے لئے دُعائیں مانگتی نہ تھک رہی تھیں۔ کسے خبر تھی ان کی

زندگی کے دن پورے ہو رہے ہیں \_\_\_\_\_ یہ خبر گلناز کے لئے بھی گہرا شاک ثابت ہوئی۔ وہ خود بستر پر تھی اور زود درنج

ہو گئی تھی۔ اُس کی حالت اور زیادہ بگڑ گئی۔

”شاہ! \_\_\_\_\_ بی بی جان کی بجائے میں چلی جاتی اس دنیا سے۔“ وہ کرب سے رو رہی تھی۔

”نہیں آپ! ایسا تو نہ کہو۔“ شاہ بانو تڑپ کر رہ گئی۔

...☆☆☆...

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بی بی جان کا غم تو بھرنے لگا مگر گلناز کے دل کے زخم جانے کیوں وقت بھی نہ بھر

سکا۔ اتنی مدتیں بھی اُس کے درد کا مداوانہ بن سکیں۔

”میں جب ان دونوں کو دیکھتی ہوں ناآپنی! تو میرے سارے زخم پھر سے تازہ ہو کر رہنے لگتے ہیں۔“ وہ گلناز کا ہاتھ تھامے اُس کی اُجاڑ آنکھوں پر نگاہیں مرکوز کئے کہہ رہی تھی۔ ”خدا کرے ان کی خوشیوں کو بھی آگ لگ جائے جس طرح انہوں نے آپ کو خاکستر کر دیا ہے۔“

”نہیں، نہیں شاہے! ایسے نہیں کہتے۔ اب وہ ایک بیٹے کا باپ ہے۔“ گلناز کے سوکھے لب کانپ گئے۔

”آپ اسے جی بھر کے بددُعائیں کیوں نہیں دیتیں آپنی! آپ تو مظلوم ہیں۔ ساری دُعائیں قبول ہوں گی۔“ شاہ بانو اُس کی خاموشی پر چڑ گئی۔ وہ بہت جذباتی تھی۔ بہت انتہا پسند۔ اُس کے اندر طاقت ور ہونے اور اثرورسوخ کی مالک ہونے کا بھی شدید احساس تھا۔

نفرت اور حقارت کے جذبے بھی انتہا پر تھے۔

زرتاشہ ایک بیٹے ذولین خان کی ماں بن گئی تھی جب کہ وہ خود ابھی اس رتبے سے محروم تھی۔

گلناز خوفزدہ تھی اُس کی فیروز خان اور زرتاشہ سے بڑھتی نفرت سے۔ وہ اپنی اس نفرت کے سیلاب کو کیسے روک دیتی جب کہ اُس کی پیاری آپنی اندر ہی اندر گھل رہی تھی چپکے چپکے بچھ رہی تھی۔

پھر ایک دن اچانک غروب ہو گئی!

وہ چیخ اُٹھی۔

”نہیں، نہیں۔“

اُس کی بہن، اُس کی آپنی اُس سے کیسے منہ موڑ گئی۔ اُس کی حالت دگرگوں ہو گئی۔

صرف ایک سال۔ اتنی قلیل مدت میں اُس کی ہنستی مسکراتی آپنی اس حال کو پہنچ گئی۔

ان کا بچپن ایک ساتھ کھلکھلاتے گزرا تھا۔

جوانی کا مہکتا دور ایک دوسرے کے ہمراہ گزرا تھا۔

”آہ فیروز خان! میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ کبھی نہیں۔“ وہ سرد یواروں پر مارتی بین کر رہی تھی۔ مہروز کو اُسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

”صبر کرو شاہے!“ وہ اُسے تھام رہا تھا مگر وہ مچل رہی تھی۔ یہ دُکھ اتنا ہلکا تو نہ تھا کہ وہ پی جاتی۔

ایسا دُکھ جس کا اب ازالہ بھی ناممکن تھا۔

”کون لائے گا میری آپنی کو اب۔“ بولو، ان کی زندگی کون مانگ لائے گا؟“ وہ مہروز خان کا بازو تھام کر جھنجھوڑ رہی تھی۔ چیخ رہی تھی۔

اُدھر فیروز خان کی گردن احساسِ جرم سے جھکتی چلی گئی۔

ہاں واقعی۔ اب ازالہ بھی ناممکن ہے۔ اور اُسے واپس لانا بھی۔

مگر واپس لا کر میں کون سا پھر اُس کی خوشیاں لوٹا سکوں گا۔ وہ زندہ تھی تب بھی کون سا اپنے حصے کی خوشیاں سمیٹ رہی تھی؟

’مجھے معاف کر دینا گلناز! میں تمہارا مجرم ہوں۔ خطا کار ہوں۔ تمہاری اتنی اذیت ناک موت کا میں ہی ذمہ دار ہوں۔ اس ناگہانی موت کا میں ہی سبب تھا۔‘

وہ شاہ بانو کی نفرت بھری نگاہوں کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کے دُکھ پر تسلی کے دو لفظ بھی نہیں تھے اُس کے



پاس۔

واقعی محبت بہت ادنیٰ درجے کی بھی ہو تو بہت ظالم ہوتی ہے۔ پھر گلناز کی محبت تو ایک دکھتی آگ تھی جو خود اُسے ہی جلا کر خاکستر کر گئی۔

اُس کی بڑی بڑی سبز آنکھوں میں کرب سمٹ آیا۔

اُس کا سارا جسم ٹوٹنے لگا۔۔۔ ایک بھاری بوجھ جیسے ذہن و دل پر آن گرا۔

ضمیر کی عدالت اُسے کھینچ رہی تھی اور وہ کتر ہا تھا۔

نہیں، نہیں۔ میں تو بے گناہ ہوں۔

میری اپنی تقصیر تو نہیں۔

بس اتنا ہی میں نے کیا نا کہ دل و ذہن کا فیصلہ قبول کیا تھا۔ میں جسم کا خالی مکان اُس کے سپرد کر کے اُسے ساری عمر فریب نہیں دینا چاہتا تھا۔ میرے ساتھ سفر کرتے ہوئے بھی اُسے کچھ نہ ملتا کہ دل میری دسترس سے بہت دُور تھا۔

میری رُوح کسی اور کی پجاری ہو گئی تھی۔

اور یہ سب کچھ میرے اختیار سے باہر تھا۔

میرا گناہ اتنا بڑا نہیں ہے۔

اُس نے اپنی وحشت کو کم کرنے کی سعی کی۔

”فیروز\_\_\_“ زرتاشہ کی گلاب گلاب انگلیاں اُس کے سنہری بالوں میں ٹک گئیں۔ وہ بھی رو رہی تھی۔ اُس کے گرم گرم آنسو اُس کے رخساروں پر پھیل رہے تھے۔ ”مجھے سب کچھ بتادو\_\_\_ کچھ مت چھپائو۔ تاکہ میں جان سکوں کہ تم\_\_\_ میرے حبیب! تم کتنے مجرم تھے۔ اور تھے بھی کہ نہیں۔“

”زرتاشہ \_\_\_“ اُس نے سر اٹھا کر متورم آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

”ہاں۔۔۔ کہہ دینے سے تمہارا دکھ بھی ہلکا ہو جائے گا۔ تمہارے اندر کا وہ خلفشار شاید کم ہو جائے۔“ وہ اُس کے بالوں سے ہاتھ نکال کر اُس کے سامنے بیٹھ گئی۔ ”میرے محبوب! میں جانتی ہوں تم مجھ سے کچھ نہیں چھپاؤ گے کہ آج تک تم نے میرے پندارِ محبت کا بھرم رکھا ہے۔“ اُس کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں التجا تھی۔

فیروز خان پگھل گیا۔ اُس نے وہ نازک مہربان ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لئے۔

”زرتاشے! تمہارا محبوب بہت گناہگار بھی ہے۔ مگر اعتراف سے گریزاں۔“ اُس کا مضبوط جسم لرز رہا تھا۔ ”کوئی ڈیڑھ سال پہلے بی بی جان نے گلناز سے میری بات طے کر دی تھی۔ تب میرے دل میں کوئی جذبہ نہیں اُبھرا تھا اس کے لئے۔ کوئی اُننگ ایسی نہیں تھی جو گلناز کے نام کی ہوتی۔ نہ میرا دل دھڑکا تھا نہ اُسے دیکھنے کی خواہش مچلی تھی۔ اس لئے کہ میرے لاشعور میں تو تم جگمگ رہی تھیں۔“

”فیر۔۔۔۔۔و۔۔۔۔۔ز۔۔۔۔۔“ زرتاشہ کے لب کپکپائے۔ اُس نے بے ساختہ سسکاری لے کر چہرہ اُس کے ہاتھوں پر جھکا دیا۔

”زر! \_\_\_ محبت کے حصول کا راستہ میرے لئے اتنا آسان ہو گیا تھا، منزل اتنی روشن تھی کہ میں نے اپنے اطراف دھیان ہی نہیں دیا۔“ فیروز خان نے پھر سب کچھ اُسے بتا دیا۔

ایک ایک لمحے کا حال۔



اپنے ایک ایک جذبے کا ذکر۔

”زر! میرے اندر طلب کی شمع اتنی روشن تھی کہ میں نے اس گوشے کی طرف دیکھا ہی نہیں جہاں اندھیرے سمٹ آئے تھے۔“

زرتاشہ اُس کے ہاتھوں پر جھکی روتی رہی۔

”آہ! اتنی محبت، اتنی چاہت کرتے ہو فیروز خان! تم مجھ سے کتنی خوش نصیب ہوں میں۔ مگر کتنی بد نصیب کہ میرا وجود کسی کے لئے شدید اذیت کا باعث بنا۔ کسی کی اندوہناک موت کا سبب۔“ اُس کی آنکھیں تو اتر سے بہنے لگیں۔

”زرتاشہ! تمہارا محبوب، تمہارا رفیق مجرم ہے نا؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”نہیں فیروز خان! مجرم تو میں ہوں۔ گناہ گار تو میں ہوں۔ میں گلناز کے خوابوں کی قاتل ہوں۔ اُس کی آرزوؤں کو ریزہ ریزہ کرنے والی۔ وہ محل جو ابھی پورا تعمیر بھی نہیں ہوا، اُسے گرانے والی میں ہی تھی۔ کاش کاش میں تمہارے درمیان نہ آتی۔ یہ وجود تمہیں ملنے سے پہلے کسی گہری کھائی میں جا گرتا۔ مجھے اب اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی ہے فیروز!“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”نہیں زر! شاید ہم سب ہی مجرم ہیں۔“ یاسب ہی بے قصور۔ یہ سارا تقدیر کا کھیل ہے۔ اور ہم تو سب بساط کے مہرے ہیں۔ جنہیں متحرک کرنے والی قدرت ہے۔ بس کسی روباوٹ کی طرح ہیں ہم۔“ اُس نے دھیرے سے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اُس کی متاعِ حیات اُس کا جرم اپنے سر لے رہی تھی۔ بھلا وہ کیسے برداشت کر لیتا۔

”بس ایک ملال رہ جاتا ہے نا کہ یہ متحرک مہرے ہم کیوں تھے؟“ اُس کی آنکھوں سے اب بھی اشک گر کر

رخساروں کو جلا رہے تھے۔

”مجھے معاف کر دینا زر! تم سے میں نے یہ سب کچھ چھپایا۔ تمہیں پانے کے لئے خود غرض بن گیا تھا۔“ اُس کے لہجے میں ایک عجیب سی کسک تھی۔ ایک گہری ندامت۔ ”محبت میں تو تھوڑی خود غرضی جائز ہے نا؟“

زرتاشہ اپنے محبوب، اپنے حبیب کو بھیگی بھیگی پلکوں سے تک رہی تھی۔ وہ اُس سے اتنی بے پناہ محبت کرتا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس چاہت پر نہال ہو جاتی۔ اس ادراک پر سرشار ہو جاتی۔ مگر اس وقت اُس کا دل ندامت سے چور تھا۔ گلناز کے غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ گلناز کی موت کا سبب اُسے بے چین کئے دے رہا تھا۔

گلناز کی موت سے سب کا دل شاہ بانو کے لئے نرم اور گداز ہو گیا تھا۔ مہروز خان کی عنایتوں اور محبتوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ زرتاشہ بھی اس سے قریب ہونے کی سعی کرتی۔ اس کی دل جوئی کرنا چاہتی تو وہ بپھراٹھتی۔ اسے اب کسی کی محبتوں اور عنایتوں کی ضرورت نہیں رہی تھی اور پھر زرتاشہ سے فیروز خان کی نفرت وقت کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اس نفرت کے تند و تیز سیلاب کو روکنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

زرتاشہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں سے شرارے نکلتے جو زرتاشہ کو اندر ہی اندر ہولائے ڈالتے۔ وہ گھبرا کر خود ہی پیچھے ہٹ جاتی۔ اس کی نرم گود میں ذولین کو ہمکنار دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ بھڑکتی۔ ویسی ہی ہیروں کی طرح سبز دمکتی آنکھیں جن سے اسے نفرت تھی، بے تحاشہ سرخ ہونٹ، سنہری بال، وہ مکمل فیروز خان کی تصویر تھا اور پھر حسد کا وہ جذبہ بھی اس کے اندر موجزن تھا، وہ خود بھی اس نعمت سے محروم تھی۔

وہ اپنی اس بے زاری اور انتہا پسندی میں اتنی بڑھ گئی کہ آہستہ آہستہ سب سے کٹتی چلی گئی۔ پہلے گل بی بی سے ہی ڈھنگ سے بات کر لیتی تھی، مسکرا لیتی تھی، مگر پھر رفتہ رفتہ گل بی بی سے بھی متنفر ہونے لگی۔ اسے سب اپنی آپنی کی دشمن محسوس ہونے لگیں۔ وہ اکثر سوچتی کہ اگر گل چاہتی تو اپنے بھائی کو اس گھناؤنے اقدام سے روک سکتی تھی، وہ گلناز سے اپنی محبت کا کبھی پرچار کرتی تھی تو پھر وہ کیوں خاموش تماشائی بنی رہی۔

آل، سب خود غرض ہیں۔

اپنے اپنے مفاد کے خول میں سمٹے ہوئے۔

انہی دنوں گل بی بی کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔ اب صرف ایک ماہ وہ اس حویلی کی مہمان تھی، اس کی جدائی کا سوچ کر ہی زرتاشہ دکھی ہو جاتی۔ وہ شاہ بانو کے رویے سے سہم گئی تھی۔ اس حویلی میں فیروز خان کے بعد گل کا ہی وجود اسے غنیمت لگتا تھا، اس کے چلے جانے کے بعد وہ بالکل تنہا ہو جائے گی۔

شاہ بانو کی شرارے بھری اور نفرت انگیز نگاہوں سے اپنے دم نکلتا ہوا محسوس ہوتا۔ اپنی کم مائیگی کا احساس اسے شاہ بانو کے رویے سے شدید ہو جاتا تھا۔ اثرورسوخ اور ڈھیروں جائیداد کی مالک شاہ بانو، فیروز خان سے بھی زیادہ دولت مند تھیں۔

احمد یار نے ورثہ تقسیم کر دیا تھا۔ وہی تو بچے تھے ان کے سینکڑوں ایکڑ پر پھیلی سرسبز و شاداب زمینیں، زیور کی صورت میں، کیش میں اتنا کچھ وہ جہیز میں لے آئی تھیں جبکہ زرتاشہ سوائے معمولی جہیز کے کچھ ساتھ نہ لائی تھی۔ یہ تو حویلی کے لوگوں کی اور فیروز کی بے پایاں محبت تھی جس نے اسے اعتماد بخش دیا تھا اور اب ذولین کی صورت میں یہ نعمت پا کر وہ مسرور تھی۔

”گل! تو پھر یہاں آتی تو رہے گی ناں، اپنے ذولین سے ملنے؟“ وہ اپنے اندر کا دکھ چھپا کر اسے کہتی تو گل بے تحاشہ سرخ ہوتے ہوئے ہنس پڑتی۔

”ابھی کون سا جارہی ہوں بھابھی۔“

”پھر بھی جانا تو ہے نا تجھے۔“

پھر ایک دن گل، سب کو روتا، مسکراتا چھوڑ کر اپنے گھر چلی گئی۔ وہ گھر جو اس کا اصل گھر تھا، جہاں وہ نئے ساتھی کے ساتھ نئی زندگی کی ابتدا کر رہی تھی۔

آہ۔ یہ لڑکیوں کی جدائی کا دکھ بھی کتنا جان لیوا ہوتا ہے۔ اتنی عمر ہنستی مسکراتی جس آنگن کو مہکائے رکھتی ہیں، پھر اچانک ہی اسے چھوڑ کر دوسرے آنگن میں چلی جاتی ہیں۔ اپنے پیچھے ماں، باپ، بہن، بھائی، سب پیاروں کو روتا چھوڑ کے۔

یہ لڑکیاں بوجھ ہوتی ہیں مگر ایسا بوجھ جو آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون بھی ہوتا ہے۔ جس کے جانے سے دل ملول ہوتا ہے آنسو بھی بہتے ہیں۔

زرتاشہ بہت ادا اس ہو رہی تھی۔

”میں بھی تو یونہی ابھی کو ادا اس کر کے یہاں چلی آئی تھی۔ وہ بھی رو رہی تھیں مگر ان آنسوؤں میں خوشی بھی تھی اور طمانیت بھی، کتنا عجیب ہوتا ہے یہ قدرت کا نظام بھی۔“

زندگی کے ماہ و سال گزرے تو رفتہ رفتہ شاہ بانو، شاہ خانم بن کر حویلی کی حاکم بننے لگیں۔ ان کے اندر اتنی طاقت تھی، اتنا اثرورسوخ تھا کہ کسی نے بھی انہیں آگے بڑھنے سے نہیں روکا۔ مہروز خان ویسے بھی نرم اور کم گو تھا۔ اسے کسی کے بھی کسی طرح کے بھی فیصلے سے انحراف نہیں ہوتا تھا۔ بی بی جان کی ہر بات پر اس نے سر تسلیم خم کیا تھا اور پھر گلناز کی موت نے اسے اور بھی نرم کر دیا تھا اور اس نرم دلی کا شاہ بانو خاصا فائدہ اٹھا رہی تھی۔ وہ اپنے بنائے گئے سخت اصول حویلی کے مکینوں پر مسلط کر دینا چاہتی تھی اور ایسے میں زرتاشہ پس منظر میں جاتی چلی گئی۔

وہ اپنی ذات تک محدود ہو کر رہ گئی۔ بس فیروز خان جب تک ہوتا اسے لگتا اس حویلی میں وہ آسانی اور سکون کے ساتھ سانس لے سکتی ہے مگر جیسے ہی تنہا ہوتی اس کا دم گٹھنے لگتا۔

پھر ایک دن فیروز خان کو شہر جانا پڑ رہا تھا۔ فروٹ کی سپلائی کے کام میں کچھ گڑبڑ ہو رہی تھی۔

”میں بھی جائوں گی آپ کے ہمراہ شہر۔“ زرتاشہ رات کو اس کے قریب بیٹھ کر رودی۔

”ارے، مگر تم کیسے جاؤ گی۔“ اس کو یوں بچوں کی طرح روتے دیکھ کر فیروز خان بے ساختہ مسکراہٹ کو نہ روک سکا۔

”کیوں۔ میں کیوں نہیں جاسکتی؟ نہ جانے کتنے دن رہنا پڑے آپ کو اور میں تنہا نہیں رہ سکتی۔ یہ تنہائی مجھے مار ڈالے گی۔“

”ہوں، اتنا چاہتی ہو مجھے، میرے بغیر ایک ہفتہ بھی نہیں رہ سکو گی۔“ اس نے اپنی بڑی بڑی کانچ آنکھیں اس کے بھگے بھگے چہرے پر ڈالیں تو وہ سرخ پڑ گئی۔

”ہاں!“ اس نے شرمیلیں پلکیں جھکا کر سر ہلادیا۔ اب وہ اسے کیا بتاتی کہ اس کے جانے کے بعد یہ دن وہ کیسے گزارے گی۔ ان اونچی اونچی دیواروں کے سناٹے اسے مار ڈالیں گے۔ وہ کسی ذی روح سے بات کرنے تک کو ترس جائے گی۔

شاہ بانو کی نفرت۔

اس کی سرد مہری، اس کے اندر چلتے خون کو منجمد کر دیتی ہے۔

فیروز خان خلاف عادت اسے اپنے ساتھ لے جانے پر راضی ہو گیا تھا۔

”تم میری محبت کا بہت فائدہ اٹھاتی ہو زرتاشہ۔“ وہ اس کے گلزار چہرے پر پیار بھری نگاہ ڈال کر شرارت آمیز لہجے میں بولا تو وہ ہنس دی۔

”کبھی ناجائز فائدہ تو نہیں اٹھایا ناں۔“ اس نے بھی برجستہ کہا۔

وہ بہت خوش تھی فیروز خان کی اس رضامندی پر۔ اس حویلی کی اونچی اونچی بلند و بالا عمارت سے باہر نکل جائے گی۔ ایک ہفتے کے لئے ہی سہی۔ اس کے اندر طمانیت سی سرایت کر گئی۔

”ذولین کو یہیں چھوڑ جایئے گا بھابھی۔ یہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔ اسے لے جانا مناسب نہیں ہے۔“ مہروز خان نے اسے ذولین کو ساتھ لے جانے سے روک دیا۔

”آج کل ویسے بھی برساتوں کا موسم ہے شہر میں بھی۔ آپ لوگ پریشان ہوں گے اس کی وجہ سے۔“

”ٹھیک ہے۔“ زرتاشہ نے سر ہلادیا۔ وہ بھلا دیور کی بات کیسے ٹال دیتی اور وہ بھی اتنے خلوص اور محبت سے کہہ رہا تھا۔

شاہ بانو نے نخوت سے چہرے کا رخ موڑ لیا۔ انہیں مہروز خان کی ذولین سے بڑھتی چاہت ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ وہ کب چاہیں گی کہ اس کے دشمن کی اولاد اس کے شوہر کے دل میں گھر کر لے۔

زرتاشہ اور فیروز خان ایک سالہ ذولین کو حویلی چھوڑ کر چلے گئے۔ حویلی کی ڈھیروں ملازمائیں تھیں جو ہمہ وقت ذولین کا خیال رکھتی تھیں مگر مہروز خان خود بھی اپنا فارغ وقت اس کی نذر کر دیتا تھا۔ وہ زمینوں سے آکر سیدھا ذولین کو اٹھاتا، اس کے گلابی گلابی رخساروں پر ڈھیروں بوسے دیتا۔

”دیکھو تو شاہے، کتنا پیارا ہے بالکل پھولوں کی طرح۔“ وہ اسے اٹھا کر اس کے قریب لے آتا۔ ”ہمارے آنگن میں



ایسا پھول کب اترے گا شاہے۔“ وہ محبت اور شرارت سے پوچھتا تو وہ سرخ پڑ جاتی، مگر اندر کہیں دراڑ سی پڑ جاتی۔

چھن چھن۔

بہت کچھ اندر ٹوٹا چلا جاتا۔

”خیر... جب خدا کو منظور ہوگا۔“ وہ پھر اسے منموم دیکھ کر جلدی سے کہہ ڈالتا اور بیڈ پر لیٹ کر ذولین کو اپنے سینے پر بٹھا کر اس سے خوب کھیلتا۔

اچانک موسم بدلا اور پوری وادی اور اطراف کے علاقوں میں برف باری شروع ہو گئی۔ ننھے منے سفید گالے، مکان، درخت، سڑکیں، تاروں کے کھمبے سب سفید ہوتے گئے۔ اتنی شدید بے موسم کی اس برف باری نے مہروز خان کو پریشان کر دیا۔ فیروز خان اور زرتاشہ کے آنے کا وقت تھا مگر سارے راستے تیزی سے ہلاک ہو رہے تھے۔

”یہ بہت برا ہوا۔“ وہ اضطراب سے ہاتھ مسلتے ہوئے درتچے سے پار گرتی برف کو دیکھنے لگا۔

”آپ اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟ \_\_\_ یہ تو اب اپنی مدت پوری کر کے رہے گی۔“ شاہ بانو کو اس کا پریشان ہونا ناگوار گزرا۔

”وہ لوگ دودن شہر میں زیادہ رہ لیں گے تو کیا حرج ہے۔“

”ہوں... ہاں یہ تو ٹھیک ہے مگر، خیر۔“ انہوں نے ایک گہری سانس لے کر درپچہ پر دبیز پردہ ڈال دیا۔

دودن مسلسل برف گرتی رہی۔ پھر کہیں جا کر رکی تو مہروز خان نے سکون کا سانس لیا۔ وادی میں بھی زندگی بیدار ہونے لگی۔ ہر شے متحرک ہونے لگی۔ لوگ موٹے موٹے کپڑوں میں خود کو لپیٹے پھر سے کام میں لگ گئے۔ چہل پہل ہونے لگی، مگر راستے ابھی خطرناک تھے۔ اس نے فیروز خان کو پیغام دے دیا تھا کہ وہ ابھی وادی کا رخ نہ کرے

تو اچھا ہے۔ ابھی راستوں کی پہچان مشکل ہے اور پھر جیب میں آنا اور بھی خطرناک ہے۔

فیروز خان نے مہروز کے اس پیغام کو زیادہ سنجیدگی سے نہ لیا اور دودن بعد واپسی کا پروگرام مرتب کر لیا۔ زرتاشہ نے اسے روکا بھی۔

”ابھی دودن اور انتظار کر لیتے ہیں۔ مہروز بھائی نے منع بھی کیا ہے اور پھر سچ پوچھے تو میرا دل بھی ڈرتا ہے۔“

”ارے کچھ نہیں ہوتا جانِ فیروز۔۔۔۔۔!“ وہ بہت مطمئن تھا۔ ”میرے ساتھ بھی ڈر لگتا ہے؟“

”مجھے اپنی زندگی سے زیادہ تمہاری زندگی عزیز ہے فیروز خان۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بے حد سچائی کے ساتھ بولی تو فیروز خان مسکرا دیا۔ اس نے زرتاشہ کے وسوسوں کو دور دھکیل دیا اور دودن رہ کر وادی کا رخ کیا۔

ادھر مہروز خان کو پتہ چلا کہ وہ لوگ شہر سے نکل گئے ہیں تو وہ متفکر ہو گیا۔

”پاگل ہو گئے ہیں فیروز لالہ تو نہ اپنا خیال ہے اور نہ بھابھی کا۔ اگر دو تین دن مزید رک جاتے تو کیا حرج تھا؟“ وہ سخت پراگندہ ہو گیا۔

”دعا کرنا شاہے، اب خیریت سے آجائیں۔“

”آپ تسلی رکھیں، خدا بڑا نگہبان ہے۔“ شاہ بانو نے اسے تسلی دی۔

مگر وہ سب کچھ ہو گیا جس کا تصور بھی ان سب کے لئے محال تھا۔ وادی کی حدود میں داخل ہوتے ہی ان کی جیب اچانک بے قابو ہو کر پر تیج پہاڑیوں سے پھسلتی ہوئی کھائی میں جا گری۔ برف سے لدی اس کھائی نے دونوں کو ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنا نوالہ بنا لیا۔

جب یہ اندوہناک خبر حویلی میں پہنچی تو مہروز خان گنگ رہ گیا۔ اس کے حواس منجمد ہو گئے۔



اتنی خوفناک۔

اتنی جان لیوا خبر سننے کا اس کا دل کب متحمل تھا۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ بھر بھری مٹی کی طرح بیٹھتا چلا گیا۔ اس کا اونچا لمبا مضبوط وجود پورا کانپ اٹھا۔

”نہیں نہیں، کہہ دو کہ یہ خبر غلط ہے نصیب خان، کہہ دو۔“ وہ چیخ اٹھا۔ ”یہ کسی نے جان لیوا مذاق کیا ہے میرے ساتھ۔“ وہ بکھر کر رہ گیا۔

حویلی کے در و دیوار ہل کر رہ گئے۔ پوری وادی کو اس خبر نے سو گوار کر دیا۔

یہ کیسا ستم ٹوٹا ہے اس حویلی پر۔

دو جوان موتیں ایک ساتھ۔

بچہ بچہ اس غم میں رواٹھا تھا۔

ہر آنکھ اشکبار تھی۔

مہروز خان تو اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اس کے دل کی دیواروں سے لہور سننے لگا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا دم غم کے اس بوجھ سے پھٹ جائے گا۔

ذولین خان کی صورت میں اس ننھے پھول کو وہ دونوں اس کے دامن میں ڈال کر ہمیشہ کے لئے اسے دکھوں سے ہمکنار کر کے چلے گئے تھے۔

شاہ بانو اپنی جگہ ایستادہ پتھر کے بت کی طرح نصب رہی۔ وہ خالی ذہن دیوار کو گھورتی رہی۔

کیا گلناز کی موت پر اس نے ان دونوں کے اجرٹنے کی جو بد دعائیں دی تھیں وہ اتنی جلدی اور یوں قبول ہو گئیں۔ کیا

انہیں قبول ہو جانا چاہئے تھا۔ یا ان کی زندگی کے دن ہی پورے ہو گئے تھے۔

وہ پوری آنکھیں پھاڑے، بے حس و حرکت در پیچے کے پار کی دیوار دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔

جب کچھ ہوش میں آئی تب بھی آنکھوں سے ایک آنسو نہ ٹپکا۔

آنکھوں کے سوتے خشک ہو گئے تھے یاد دل کے ساحل پر کوئی ایسا جذبہ ہی نہ رہا تھا۔

اسے خود پر حیرت ہونے لگی کہ کیا یہ نفرت اتنی بڑھ چکی ہے کہ دل اتنا سخت اور بے حس ہو گیا ہے۔ جذبے اتنے سرد جیسے ڈھیر ساری برف تلے برسوں دبے رہے ہوں۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولنا چاہا کہ وہ کیوں روئی نہیں۔ اس خبر نے اسے کیوں غمزہ نہیں کیا۔

”ہاں میں کیوں روؤں۔ میرے پاس اب کوئی قطرہ نہیں رہا۔ وہ سارے آنسو میں نے گلناز کی موت پر لٹا دیئے ہیں۔ بس وہی ایک غم تھا جو مجھے ملا تھا۔ اس کے بعد سارے دکھ، سارے حادثات بے معنی اور بے وقعت ہو کر رہ گئے تھے۔“

اس نے بہت سفاکی سے سوچا اور آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے ان تمام منظروں سے ان تمام آوازوں سے بچنے کی سعی کی جو حویلی میں گونج رہی تھیں۔

دن ذرا آگے سر کے تو مہروز خان کو ذولین کا خیال آیا۔ اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔

”شاہ ہے! اب ہم دونوں کو مل کر اس کی حفاظت کرنی ہے۔ یہ امانت ہے میرے پاس۔“ وہ ذولین کو سینے سے بھینچے بھاری آواز میں بولا تو شاہ بانو نے سر اٹھا کر دیکھا وہ دکتے سبز ہیرے عجیب سی خامشی لئے اسے دیکھ رہے تھے، مگر اس کے اندر کوئی ایسا نرم جذبہ نہ ابھرا جس کا مہروز خان خواہش مند تھا۔ اس نے چہرے کا رخ موڑ لیا۔

”تم مر کر بھی میرے سامنے ہی ہو فیروز خان۔“ اس نے نفرت سے سوچا۔

اس دن شہر یاد آیا۔ اداس اور ملول بہن اور بہنوئی کی اندوہناک موت نے اسے اور ابٹی کو اجاڑ دیا تھا۔ ابٹی تو بستر سے جا لگی تھیں۔ جوان بیٹی کی موت نے انہیں گہرا صدمہ دیا تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ زرتاشہ یوں انہیں داغ مفارقت دے جائے گی۔

ابھی تو اس نے کھل کر مسکرا کر ہنسنا سیکھا تھا۔

ابھی تو اس کے بکھر جانے کے دن نہیں تھے۔

وہ صدمے سے نڈھال تھیں۔

شہر یاد خود بے حد پریشان تھا۔ وہ ذولین کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنا مدعا مہروز خان کے سامنے رکھا تو مہروز خان کی پیشانی پر ناگواری کے بل پڑ گئے۔

”تم کیا یہ سمجھتے ہو شہر یاد کہ میں فیروز لالہ کے بعد اسے باپ کا پیار نہیں دے سکوں گا یہ میرے لئے بوجھ ہے۔“

”نہیں، نہیں مہروز خان۔ باخدا یہ مطلب نہیں تھا میرا۔ وہ تو میں ابٹی کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔ وہ بہت یاد کرتی ہیں اسے۔“ اس نے جلدی سے اس کی غلط فہمی دور کی۔ فیروز خان اور زرتاشہ کی موت نے انہیں بالکل توڑ پھوڑ دیا ہے۔

”میں جانتا ہوں ایک ماں کے لئے یہ کتنا بڑا صدمہ ہو گا مگر تم یہ بھی جانتے ہو کہ فیروز لالہ میرا بھائی تھا اور زرتاشہ میری بھابھی۔ یہ دونوں ہستیاں حویلی کی طرح میرے دل کو بھی اجاڑ کر چلی گئی ہیں۔ اب ذولین ہی ہے ان کی نشانی اور میرا خون۔ میں معذرت خواہ ہوں شہر یاد۔“ اس کا لہجہ اداس تھا اور شہر یاد مایوس اٹھ گیا۔

”میں کویت جا رہا ہوں۔ میری جاب وہاں ہو گئی ہے مستقل۔ ابٹی کو بھی لے جا رہا ہوں۔“ اس نے کچھ سوچ کر مہروز خان کو اطلاع دی۔

”ابٹی یہاں رہیں گی تو پریشان رہیں گی۔“

”ہاں، دکھ کم کرنے کی سعی بہر حال کرنی پڑتی ہے۔ اب یہ دکھ یادیں بن کر دل پر کسی داغ کی طرح نقش رہیں گی۔“ مہروز خان کی بڑی بڑی سنہری آنکھیں نم ہو گئیں۔ ”تم کویت سے جب واپس آؤ تو حویلی میں ضرور آنا۔ اس حویلی کے دروازے تم پر اور ابٹی کے لئے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ ذولین بھی تمہارا منتظر رہے گا۔“ اس نے جاتے وقت گرم جوشی سے اس سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا۔ پھر ذولین کو اس کی گود میں دیتے ہوئے بولا۔

”تم اس کے ماموں ہو۔ تمہارا اور اس کا رشتہ تابدا قائم رہے گا۔“

شہر یاد نے ذولین کو خوب بھیج بھیج کر پیار کیا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر ڈھیروں بوسے دیئے پھر اسے واپس مہروز خان کی گود میں ڈال کر چلا گیا۔

مہروز خان کی ساری محبتیں صرف اور صرف ذولین کے لئے وقف ہو کر رہ گئی تھیں، مگر پھر ایک دن اس کی محبتوں کا شریک ’اشمل خان‘ کی صورت میں آگیا۔

بڑی بڑی بھوری آنکھوں والا، بالکل شاہ بانو کی صورت تھا۔

اتنے عرصے بعد حویلی میں خوشی کی کرن چمکی تھی۔ سب کے لب سچی بے لوث مسکراہٹ سے سج گئے۔

شاہ بانو کے پیر تو زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ وہ خود کو ہوائوں میں اڑاتا ہوا محسوس کر رہی تھیں جیسے کہکشاں اس کے پیروں کی دھول ہو۔

اشمل کے آجانے پر مہر وز خان کی محبت ذولین کے لئے اپنی جگہ قائم تھی۔ جو شاہ بانو کو ناگوار گزرتی تھی۔ وہ اس محبت کا رخ صرف اور صرف اشمل خان کی طرف موڑ دینا چاہتی تھی۔ اشمل کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں جتنی چاہت، جتنی چمک اٹتی، ذولین کو دیکھ کر اس کے اندر اتنا ہی زہر بھر جاتا۔

یہی جذبہ۔

ایسے ہی سرد گرم احساسات لئے اپنی ڈگر پر چل رہے تھے۔

ذولین کو وادی کے سکول میں داخل کر دیا گیا۔ وہ اب اتنا سمجھ دار ہو گیا تھا کہ نرم اور گرم میں تمیز کر سکتا تھا۔ لبوں سے نکلتے ہر لفظ کو سمجھ سکتا تھا۔ محسوس کر سکتا تھا۔ وہ فطرتاً سنجیدہ، خاموش طبع اور بے حد ذہین تھا۔ وہ صورت کے ساتھ ساتھ ہر انداز بھی فیروز خان سے چرالا یا تھا۔ سرخ سرخ لبوں کو بھینچے وہ شاہ بانو کو بس دیکھتا، اس کی آنکھوں سے نکلتی وہ ساری ناخوشگوار شعاعوں کی تپش محسوس کرتا تھا مگر اس نفرت کی وجہ جاننے سے قاصر تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ وہ اس تپش کی شدت محسوس کرنے لگا۔

کئی موسم آئے اور گزر گئے۔

لمحے بوند بوند وقت کے پیالے میں گرتے رہے۔

ایسے میں اشتار اپید اہوئی تو زندگی میں دوبارہ ہلچل مچ گئی۔ مہر وز خان تو بہت مسرور ہوا۔ اسے سیٹیاں بہت اچھی لگتی تھیں اور وہ بالکل مہر وز خان کی صورت تھی۔ ویسی ہی چمکتی شربتی آنکھیں جن میں سارے جہاں کی نرمیاں تھیں۔

”اتنا خوبصورت اتنا بڑا تحفہ تم نے مجھے دیا ہے شاہے۔“ وہ اسے اٹھائے بے تحاشہ چوم رہا تھا۔

اس نے حویلی میں بڑی سی دعوت دے ڈالی۔ شہر سے فیصل ماموں بھی آگئے۔ انہیں یہ سنہری گڑیا اتنی اچھی لگی کہ

شاہ بانو سے بولے۔

”شاہے، اسے تو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا اپنی بیٹی بنا کر۔“

”ہاں شاہ بانو! اسے تم مجھے دے دو۔“ ممانی بھی ماموں کی تائید میں بولیں تو شاہ بانو ہنس پڑیں۔

”ارے فیصل! شاہے نے مجھے اتنے عرصے بعد ایک پیارا سا تحفہ دیا ہے، وہ بھی تمہیں دے دوں۔“ مہر وز خان جلدی سے بولے تو شاہ بانو نے انہیں گھور کر دیکھا۔

”کیوں جی، اشمل خان کو بھول گئے آپ۔“

”آں، ہاں نہیں۔ اصل تحفہ تو اشتار ہے۔ بیٹا تو میں نے پہلے ہی پالیا تھا ذولین کی صورت میں۔ اب تو ایک ننھی منی بیٹی کی ضرورت تھی۔“ مہر وز خان اشتار کو گود میں لئے اپنی ہی دُھن میں بولے اور ادھر شاہ بانو کا چہرہ رنگ بدل کر رہ گیا۔

مہر وز خان کے منہ سے ذولین کا نام سن کر ان کا وجود انگاروں پر لوٹ گیا۔ مگر وہ چپ رہیں۔ اتنے سارے لوگوں میں کہتی بھی کیا۔

ذولین خان نے شعور کی زندگی میں قدم رکھا تو اس کو ماضی کی مدفون باتوں کا ادراک ہوا۔ شاہ بانو کا نفرت انگیز لہجہ اسے ہر لمحہ اپنی ہتک کا احساس دلاتا۔ وہ مہر وز خان کی وجہ سے چپ بھی تھا تو ان کے اندر پکتا لاوا ذولین سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔

اس نے شہر کے کالج میں ایڈمیشن لے لیا اور وہیں ہاسٹل میں سیٹ ہو گیا۔ مہر وز خان بے حد خفا ہوئے۔ ان کا خیال تھا روز صبح جیپ اسے شہر چھوڑ آئے گی اور واپس بھی لے آئے گی۔ ہاسٹل میں خوار ہونے کی کیا ضرورت ہے اتنی چھوٹی

عمر میں۔ مگر وہ نہ مانا۔ نہ اس نے کوئی شکوہ کیا۔

وہ جانتا تھا ہاسٹل کی ویران زندگی اس کے لئے کسی کشش کا باعث نہ ہوگی، بلکہ خاصی دقت طلب ہوگی، مگر یہ سوچ کر وہ مطمئن تھا کہ وہاں ایسی نگاہیں نہ ہوں گی جس میں اس کے لئے بیزاری چھلکتی ہوگی۔ یہ تو مہروز خان اور اشمل کا دم غنیمت تھا جو اس نے اتنے برس گزار دیئے۔ اب اسے وحشت ہوتی تھی۔

”انتقام اور نفرت کا یہ انداز بہت غلط اپنایا ہے آپ نے چچی خانم۔“ وہ سلگتے ذہن سے سوچتا۔

وہ جب چھٹیوں پر حویلی آیا تو سوائے شاہ خانم کے سب ہی خوش ہوتے۔ اشمل تو اس دن سکول کی چھٹی کر لیتا۔

”ذولین! ہاسٹل کی زندگی کیسی ہے؟ میں بھی اب عنقریب آنے والا ہوں۔“ وہ ہنس کر کہتا اور ڈھیروں سوالات کی بوچھاڑ کر دیتا۔

”اچھی ہے۔“ وہ مختصر آگاہ کر ٹال جاتا۔ اس حویلی سے بہت اچھی ہے وہ سوچتا، مگر کچھ نہیں کہتا۔ اسے چچا خان کی عزت بھی عزیز تھی اور ان کی محبت بھی۔

میٹرک کر کے اشمل بھی ضد کر کے ہاسٹل میں رہائش پذیر ہو گیا۔ اسے روز روز اتنا لمبا سفر کر کے آنا جانا پسند نہیں تھا۔

”اس طرح یکسوئی سے پڑھائی نہیں ہو پائے گی بابا خان۔“ وہ سنجیدگی سے کہتا۔ اسے اپنی پڑھائی ذہنی سکون کے ساتھ از حد عزیز تھی۔

ذولین نے ایگری کلچر یونیورسٹی جوائن کر لی تھی جبکہ اشمل کا ارادہ ایم بی اے کرنے کا تھا۔

ذولین خان نے چھٹیوں پر آنا چھوڑ دیا تھا۔ کیا فائدہ ایسے گھٹے ماحول میں چھٹیاں گزارنے کا جہاں صرف چچی خانم کے

کڑے اصول چلتے تھے، جو رفتہ رفتہ پوری حویلی پر قابض ہو چکی تھیں اور چچا خان پس منظر میں چلے گئے تھے۔ سب کچھ اس کی نظر کے سامنے ہو رہا تھا۔ اس کے جامد لب اور خاموش نگاہیں دیکھ بھی رہی تھیں اور محسوس بھی کر رہی تھیں۔ اس نے چچا خان کی خفگی بھی خاموش سے سہ لی۔ مگر چھٹیوں پر آنا مکمل چھوڑ دیا۔ کبھی اگر دل کرتا تو ایک آدھ دن ملنے آ جاتا۔

انہی گزرتے دنوں میں اس پر ایک عجیب سا انکشاف ہوا کہ وہ شربی معصوم آنکھیں ہمہ وقت اس کی منتظر رہتی ہیں۔ نوخیز شرمیلی مسکراہٹ۔

متلاشی آنکھیں۔

اسے دیکھ کر خود بخود ہونٹ کے گلاب کھل اٹھتے۔

”نہیں نہیں، اشتار۔ تم ابھی بہت چھوٹی ہو۔“ اسے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ بڑی سی چادر میں لپیٹی وہ اپنے سر و قد اور حسین چہرے کے ساتھ اس کے دل میں اترنا چاہ رہی تھی۔ اس انکشاف نے اسے گھبرا دیا۔

وہ جب جاتا تو اس کی آنکھوں کی والہانہ چمک، لبوں پر شگفتہ مسکراہٹ اسے متحیر کر جاتی۔

شاہ خانم سے ڈری سہمی وہ یہاں وہاں ہو جاتی مگر جیسے ہی شاہ خانم کی نگاہیں کہیں اور ہوتیں وہ چپکے چپکے اسے ٹکا کرتی وہ کم فہم یا اتنا سادہ لوح نہیں تھا کہ جذبات کے رنگ نہ پہچان سکے۔ وہ محبت کی اس روشنی سے آشنا تھا جس میں دل کے ہفت رنگ جذبے یکجا ہو جاتے ہیں مگر وہ جان کر نگاہیں چرا لیتا۔

قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے خود کو دیکھا۔ دراز قد، خوب رو، اس نے اپنی مکمل مردانہ وجاہت کو سرسری دیکھا پھر تخیل میں دود مکتی آنکھوں کو لاتے ہوئے سوچا۔



”تم نے بہت غلط شخص کو چن لیا ہے اشتار امہروز، جس کا دل پتھرا گیا ہے۔“ اس نے اپنے پتھر یلے چہرے کو دیکھا اور عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

”تمہارا یہ نازک سراپا کسی پتھر سے ٹکرانے کے لئے نہیں بنا۔ تمہاری معصوم نوخیز منگوں کو سوائے دکھ کے کچھ نہیں ملے گا۔“

جس دن وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے حویلی آیا، اس نے اسی روز انیکسی میں منتقل ہو جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو شامل خان پھٹ پڑا۔

”کیوں؟ آخر تم ایسے تنہائی پسند اور قنوطی کیوں بن رہے ہو؟ آخر یہاں کیا مصیبت ہے تمہارے لئے۔“ اس کا یہ اقدام اسے سخت ناگوار بلکہ دکھی کر گیا۔ البتہ بابا خان چپ تھے۔ وہ شاہ خانم کے رویے سے واقف تھے۔ اس کے اندر موجزن نفرت کے اس بہر بیکراں سے بھی بہ خوبی آگاہ تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ وہ اس نفرت کو ختم نہیں کر سکیں گے اور نہ ذولین کی غیرت کو مجروح دیکھ سکتے تھے۔ انہیں فیروز خان کی یہ نشانی بے حد عزیز تھی۔ اس کی عزت، اس کی انا بھی انہیں اتنی ہی عزیز تھی۔

”ٹھیک ہے بیٹا۔ جیسے تم چاہو۔“ انہوں نے رضامندی دے دی۔

اسی رات اشتار اچھوٹ پھوٹ کر روئی۔ اس کا دل کرچی کرچی ہو گیا۔

”کیا ہم لوگ اتنے برے ہیں ذولین خان کہ آپ ہماری صورت دیکھنے کو بھی تیار نہیں۔“ اس دن وہ انیکسی میں صفائی کروانے کے بہانے آگئی تھی۔ بے حد رندھے لہجے میں بولی تو وہ چونکا۔

وہ پہلی بار اس سے براہ راست مخاطب تھی۔

بھگی بھگی آنکھوں میں گہرا شکوہ ہلکورے کھارہا تھا۔ دھیمے دھیرے لہجے میں درد سمیٹے، اس نے پہلی بار اسے اتنے غور سے دیکھا۔

گہرے گلابی رخساروں کے اوپر دو آنکھیں ایسے نظر آئیں جیسے دو ستارے ہلکی ہلکی پھوار سے بھگ گئے ہوں اور ایسے میں ان کی جھلملاہٹ گہری ہو گئی تھی۔ وہ آج اسے قدرے مختلف لگ رہی تھی۔ وہ ان پر دو پر فسوں نمناک آنکھوں کے سامنے کتنے ہی ثانیے مسحور کھڑا رہا۔

”شاہ خانم کے ناروا رویے کا یہ رد عمل ہے یا یہ بھی آپ کی کوئی ضد کا حصہ ہے۔“ وہ بول رہی تھی اور وہ ششدر ہوئے جارہا تھا۔ وہ بھلا اسے اتنا کیسے جان چکی ہے کہ وہ ضدی ہے، خود سر ہے اور شاہ خانم کے رویے سے آشنا ہو گئی ہے۔

”تم جو بھی سمجھ لو۔“ اس نے اچانک سارے جہان کی بیگانگی چہرے پر سجا ڈالی اور پلٹ کر بیڈ روم میں چلا گیا۔ وہ چند لمحے کھڑی رہی پھر باہر نکل گئی۔

یہ پہلا پتھر تھا جو اس کی طرف سے اسے لگا تھا۔ وہ تو اس منزل کی طرف لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی جہاں محبتوں اور عنایتوں کی خواہش جاگ اٹھتی ہے۔

ایسی عنایت۔

ایسی محبت جو صرف اور صرف اس کے لئے ہو۔

جس میں بے گانگی کا شائبہ بھی نہ ہو۔

اور بے اعتنائی کی آنچ بھی نہ ہو۔

جہاں ہاتھ پھیلا کر انسان ڈھیر ساری محبت تھام کر صرف اپنے دامن سمیٹ لینے کا شائق ہو۔ مگر اسے تو پہلے قدم پر ہی ٹھوکر لگی۔

دل کے اندر دھواں سا بھر گیا۔

مگر نجانے کیوں ایک میٹھی میٹھی سی کسک تھی جواب بھی سارے وجود کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔

اس شخص کی بے اعتنائی۔

آنکھوں کے سبزے میں سچی بے گانگی۔

اس کے قدموں کو پیچھے ہٹانے کی بجائے بہت تیزی سے آگے لے آئی۔

دل کے چراغ کی لومدھم ہونے کی بجائے اور بھی تیز ہو گئی۔

شاہ خانم نے اسے انیکسی سے باہر نکلتے دیکھا تو ان کا چہرہ تن گیا۔ انہوں نے اسی وقت اپنے کمرے میں بلا کر یہ حکم صادر کر دیا۔

”آج کے بعد تم کبھی انیکسی کا رخ نہیں کرو گی۔ اس نے جب اپنے راستے الگ کر لئے ہیں تو ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے ان راستوں کی سمت جانے کی، سمجھ گئی تم۔“ انہوں نے بے حد شاطرانہ انداز میں سارا بار ذولین خان پر ہی ڈال دیا۔ وہ بھونچکا سی رہ گئی۔

آپ کے غلط رویوں اور نفرت آگیاں نگاہوں نے اسے اس اقدام پر مجبور کیا تھا۔ وہ اندر ہی اندر پگھل گئی۔ ”یہ تو خونی رشتے ہیں شاہ خانم۔ انہیں کیسے کاٹ دیا جاسکتا ہے۔ جسم کا کیا ہے یہ تو

روح اور خون کا سنگم ہے۔ اس نے صرف سوچنے پر اکتفا کیا اور سر ہلا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

ذولین خان نے اپنے باپ کی زمینی سنبھال لی تھیں۔ وہ بابا خان کی بھی بہت مدد کرتا تھا۔ اس نے اسی فیلڈ میں تعلیم حاصل کی تھی جس کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہ رہا تھا۔

...☆☆☆...

”ٹھائیں۔ ٹھائیں۔“ گولیوں کی تیز آواز پر شاہ خانم کی بند آنکھیں کھل گئیں۔ نہ جانے وہ کتنی دیر روتی رہی تھیں۔

”یہ کیسی آوازیں ہیں خیراں؟“ انہوں نے پیچھے کھڑی خیراں کی موجودگی محسوس کرتے ہوئے اس کی سمت دیکھے بغیر پوچھا اور کھڑکی کے باہر دیکھا۔

اب منظر بدل چکا تھا۔ پورچ خالی تھا اور بارش کی بوچھاڑ تیز بوندوں میں بدل گئی تھی۔ ہر طرف دھند چھائی ہوئی تھی۔

”پتہ نہیں جی۔ میں معلوم کرتی ہوں۔“ اس کی زبان ہمیشہ لکنت کھا جاتی۔

”یہ آوازیں اتنی خوفناک نہیں لگ رہیں۔ فائر صرف پہاڑوں پر ہی کئے گئے ہیں۔“ انہوں نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں تم جانو معلوم کرو۔“ وہ کرسی سے کھڑی ہو گئیں۔ خیراں کے باہر نکلتے ہی وہ پلٹیں اور چادر کے کنارے سے چہرہ صاف کیا۔ درتچے کے پٹ بند کر دیئے اور ہاتھ بڑھا کر کمرے کی ساری روشنیاں گل کر دیں۔ اس بڑھتے ہوئے اندھیرے سے انہیں وحشت ہو رہی تھی۔

خیراں تھوڑی دیر بعد اندر آگئی اور بادب ایک طرف کھڑی ہو کر دھیرے سے بولی۔

”زرسانگہ کی شادی طے ہو گئی ہے ناں، اس ہفتے کے آخری دن میں۔ اس کے یہاں لوگ ہوائی فائر کر رہے ہیں۔“

”آں اچھا اچھا۔“ شاہ خانم نے ایسے سر ہلادیا جیسے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔

”زر سانگے کے سارے رشتہ دار آگئے ہیں۔ پر لے گاؤں میں اس کے ننھیال رہتے ہیں ناں۔“ زریل جانے کہاں سے ساری معلومات اکٹھی کر لائی تھی۔ اب اشتاد کے لمبے بالوں کو دھیرے دھیرے سلجھاتی اسے بتا رہی تھی۔

”بہت خوش ہیں سارے لوگ۔ اس کے ننھیال میں یہ پہلی شادی ہے ناں۔“

”اور تماش۔ اس کا کیا ہوگا؟“

”وہی جو زر سانگہ کا ہوگا بلکہ ہو رہا ہے۔“ زریل اس کے سارے بالوں کو ہاتھ میں لپیٹ کر آئینے میں اس کے عکس کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا مطلب۔“ اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے لمبی لمبی پلکیں جھپکیں۔

”تم بھی بہت بھولی ہو خان زادی۔ بھلا یہ بھی نہ سمجھنے والی بات ہے۔“

”بتاؤ نازریل۔“ وہ اصرار کرنے لگی۔

”زر سانگہ کی شادی ہو جائے گی۔ ظاہر ہے دونوں دکھی ہیں۔ مگر وقت بڑا مرہم ہے۔ دکھوں کو کم کر دے گا۔ ایک دن تماش بھی کسی اچھی لڑکی سے بیاہ کر لے گا۔“ زریل اتنے اطمینان سے بتانے لگی جیسے وہ واقعی ان دونوں کے مستقبل سے آگاہ ہو۔

اشتاد اشد ر رہ گئی۔

”کیا یہ سب اتنا آسان ہے؟ نہیں زیہ، یہ کہنا آسان ہے۔“ اس نے زریل کی بات کی نفی کر دی۔ اس کی آنکھوں میں ایک انجانا کرب سمٹ آیا۔ وہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ زریل نے اس کے بالوں پر اپنے ہاتھوں کی گرفت چھوڑ دی تو سارے طلائی بال پک کر کمر اور شانوں پر بکھر گئے۔

”کیوں اشتاد بی بی۔ تو پھر کیا ہوگا؟“ زریل نے اچھنبے سے پوچھا۔

”تم کہتی ہو وقت ہر زخم کا مرہم ہے۔ ہاں سچ کہتی ہو۔ مگر زیہ زخم تو بھر جاتے ہیں پر داغ تو رہ جاتے ہیں ناں، اور یہ داغ ساری زندگی کے لئے کسک بن جاتے ہیں۔“ اس نے درتپے سے باہر جھانکا۔ گہری دھند چھائی ہوئی تھی۔ سیاہ بادلوں کے ٹکڑے اپنا سارا پانی زمین پر نچھاور کر رہے تھے۔

”دیکھو بادل بھی رو رہے ہیں زر سانگے کے لئے۔ جانتی ہو آج زر سانگہ بھی اسی طرح ٹوٹ کر رو رہی ہوگی۔“

”ہاں، نجانے ان بادلوں کو کیسے خبر ہو جاتی ہے کہ آج کسی کے نین برس رہے ہیں۔ خود بھی شریک ہو جاتے ہیں۔“ زریل بھی ادا اس ہو گئی۔ اس کی دوست زری اتنے بڑے دکھ سے گزر رہی ہے، اکیلی تنہا۔ اپنے بھی تو دشمن بن گئے ہیں۔

”یاد ہے زریل! تو زری کو کوستانے کے لئے اکثر کہتی تھی کہ تماش سے اچھا نواب داد ہے، وہ تجھے زیادہ خوش رکھے گا، مگر نہیں۔ میں کہتی ہوں تماش اچھا ہے پر خلوص۔“

”ہاں کہتی تو تھی۔“ زریل ذرا اثر مندہ سی ہو گئی۔ ”میں بھی یہی سمجھتی تھی کہ وہ محض کاہل اور کام چور ہے اور زر سانگہ سے دل لگی کر رہا ہے۔ اپنے لمحوں کو رنگین بنا رہا ہے۔ مگر نہیں زریل۔ دیکھو اس نے صرف زری کی خاطر خود کو یکسر بدل ڈالا۔ برسوں کی پختہ عادتیں چھوڑ دیں۔ زمینوں کا کام سنبھال لیا۔ اپنی زندگی کو سنوار لیا اور زری کو پانے کے لئے رات دن ایک کر ڈالا۔ مگر اسے کیا ملا۔ کچھ بھی تو نہیں۔“ اس کی آنکھیں زر سانگہ کے غم میں ڈوب گئیں۔

”ہاں مقبول شاہ نے اس کے ماضی کو کسی صورت معاف نہیں کیا۔ خود ہی اپنی بیٹی کی خوشیوں کا دشمن بن گیا۔“ زریل کو اشتاد کا ایک ایک لفظ سچ لگ رہا تھا۔ بالکل حقیقت۔

”تم جانو گی نہیں اشتارابی بی، زرسا نگہ کے پاس؟“

”میں۔“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر مضطربانہ انداز میں چلتی ہوئی اس کے قریب آگئی۔ ”نہ جانے شاہ خانم اجازت بھی دیں گی یا نہیں۔“

”دور وز بعد اس کا نکاح ہو جائے گا۔ پھر دور وز رک کر رخصتی ہو گی۔ تماش کے ماں باپ دوسرے گاؤں میں رہتے ہیں ناں، رخصتی رک کر ہو گی۔ تم بات تو کر لینا شاہ خانم سے۔ شاید وہ اجازت دے دیں۔“ زیبیل اس کی ٹوٹی ہمتیں جوڑ کر بولی۔

”ہوں۔“ اس نے کچھ سوچ کر سر ہلادیا۔

بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ دھندلی کھٹ چھٹ گئی تھی۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ ہر چیز دھل کر نکھر آئی تھی۔ بڑے بڑے ناریل اور صنوبر کے درخت کھلکھلاتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ لمبی لمبی کیاریوں میں سب سے پھولوں کا رنگ نکھر آیا تھا۔ شفاف دیواریں آئینوں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ بارش کے بعد ہر شے کے کے نقوش نمایاں اور دلکش ہو گئے تھے۔

اس نے سارا منظر بہت سپاٹ اور سرسری نگاہوں سے دیکھا۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا، کوئی اور موسم ہوتا اس کے دل کا تو وہ اس پھیلے حسن کی ساری طراوت اپنے اندر اتار لیتی۔ دیوانہ وار یہاں وہاں نرم گھاس پر بھاگتی۔ رنگ برنگے پھولوں کو چومتی یا پھر تالاب کے کنارے بیٹھ کر آسمان پر ٹٹماتے ستاروں کو تکتی رہتی۔ ہمیشہ کی طرح رفتہ رفتہ اس کی روشنی تیز ہو جاتی۔ پھر دفعتاً کہیں سے سنہری چاند اٹھتا کسی ٹہنی کے پیچھے سے۔ پتوں کے پیچھے چھن چھن کر اندھیرا بڑھ جاتا۔ پھر گہری تاریکی۔ ہر شے مہیب نظر آنے لگتی اور اس اندھیرے میں چیئر کے نوکیلے پتوں کی سرسراہٹ، معطر پھولوں کی خوشبو اور دھیمی دھیمی چاندنی کے علاوہ سب کچھ خاموش ہو جاتا۔ پھر کوئی اچانک پوری حویلی کو

مصنوعی روشنیوں سے نہلا دیتا۔ زیبیل اس کے قریب کھڑی ہوتی۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھتی تو وہ چونک اٹھتی۔ اسے یہ لمحے انتہائی پر فسون لگتے تھے۔

آں۔ مگر آج اس کے دل کے افق پر صرف زرسا نگہ کا دکھ پھیلا ہوا تھا۔ کسی گہری تاریکی کی طرح اس کے تخیل میں اس کی سیاہ بھنور اسی آنکھیں کبھی ہنس رہی تھیں کبھی رو رہی تھیں تو کبھی فریاد کناں تھیں۔

اس نے جب محبت کے فرحت آگیاں سفر پر قدم رکھا ہو گا تو سوچا بھی نہیں ہو گا کہ یہ سفر اتنا پُر پیچ، اتنا پُر خار ہو گا۔ اتنا ڈھیر سارا دکھ اس کے ہمراہ سمٹ آئے گا۔ منزل کی بجائے گہری تھکان اس کا استقبال کرے گی۔

نارسانی کا دکھ نہ جانے کیسے زرسا نگہ جھیل رہی ہو گی۔

اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس کے ذہن کی ساری سوئیاں بس زرسا نگہ پر ہی اٹک کر رہ گئی تھیں۔

دوسرے دن وہ شاہ خانم سے زرسا نگہ کے گھر جانے کی اجازت طلب کرنے آگئی۔ شاہ خانم نے اسے گھور کر دیکھا۔ ”تم زرسا نگہ کے گھر جانو گی؟“ انہیں اچھنباسا ہوا۔

”اس کی شش شادی ہونے والی ہے ناں۔“ اس نے ہمت کر کے دھیرے سے بات آگے بڑھائی۔

”ہوش میں تو ہو۔ تم یعنی شاہ خانم کی بیٹی اب ایک چھوٹے سے گھر کی معمولی سی لڑکی کی شادی کا بے تکا ہنگامہ دیکھنے جاؤ گی۔“ ان کا لہجہ برہم بھی تھا اور استہزاء بھی۔

اشتار اکا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اپنی دوست اپنی رفیق کی اس تذلیل پر اس کے اندر احتجاج کی سرد لہر اٹھی اور اندر ہی کہیں گم ہو گئی۔

اس نے لب دانتوں میں دبائے۔



”جانے دو شاہے۔“ بابا خان جو کنارے کی بڑی سی کرسی پر براجمان تھے، پہلی بار بولے۔ انہیں اشتراکِ معصوم اور بے بس چہرہ بولنے پر مجبور کر گیا۔

”مگر آپ جانتے ہیں، یہ کون لڑکی ہے۔“ شاہ خانم کے لہجے میں حقارت سمٹ آئی۔

”ہاں، اس کے بچپن کی سہیلی ہے، ایک ساتھ کھیلی ہیں دونوں۔“ بابا خان نے یہ کہہ کر گویا جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وہ بھڑک اٹھیں۔

”اونہہ، وہ کوئی اشتراک کے بچپن کی سہیلی نہیں ہے اور اشتراک تم نے۔“ پھر بل کھا کر اشتراک کو قہر برساتی نگاہوں سے دیکھا۔ ”ہمیشہ ایسے بے حیثیت اور کم ظرف لوگوں سے دوستیاں باندھیں ہیں تم نے۔ بے وقوف، گدھی لڑکی۔ کب عقل آئے گی تمہیں۔ نہ تمہیں اسٹیٹس کی پرواہ ہے نہ حیثیت اور اپنی وقعت کی۔ کیا دلچسپی ہے ایسے لوگوں سے تمہیں؟“

وہ، وہ بہت اچھی ہے شاہ خانم۔“ اس نے اپنی آنکھوں کا پانی اندر ہی اتار لیا۔ اس کی سماعت پر آگ بھرے تیر برس رہے تھے۔ زرسا نگہ کی اس بے وقعتی پر اس کا دل کٹ سا گیا۔

”اونہہ، اچھی۔“ انہوں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

”جانے دو شاہے اسے، جلدی آجائے گی۔“ بابا خان کرسی سے کھڑے ہو گئے۔ اشتراک نے سر اٹھا کر بابا خان کو دیکھا۔ شاہ خانم کی باتوں پر ان کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی مگر بے حد سپاٹ چہرہ لئے وہ اس کے حمایتی تھے۔

”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ شاہ خانم جھنجلا گئیں۔

”تم جاؤ اشتراک، مگر جلدی آنا۔ محمد سلام تمہیں چھوڑ آئے گا اور اسی کے ساتھ واپس آجائے۔“ بابا خان کی بات سن کر وہ

تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ یہ دیکھے بغیر کہ شاہ خانم کے کیا تاثرات تھے۔ وہ جانتی تھی اب بابا خان انہیں سنبھال لیں گے۔ وہ مزید ایک لمحہ بھی ٹھہر جاتی تو یقیناً شاہ خانم کا حکم ہی اسے سننا اور ماننا پڑتا۔

وہ جلدی اپنے کمرے میں گئی۔ اپنی گرم شال اوڑھ کر کاسنی ریشمی پردوں سے سبکی پجیر و میں آ بیٹھی۔

محمد سلام کو زرسا نگہ کے گھر کا پتہ اس نے سمجھا دیا تھا۔ پجیر و دھیرے دھیرے ڈھلوانی راستوں سے گزرنے لگی، مگر اچانک محمد سلام نے روک دی۔

”کیا ہوا محمد سلام؟“ اس نے حیرت سے استفسار کیا۔ وہ بالکل پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ محمد سلام کی سیٹ سے اس کا خاصا فاصلہ تھا۔

”پٹرول تو ختم نہیں ہو گیا۔“

”نہیں جی۔ یہ ذولین خان ہیں جی۔“ وہ کھڑکی سے سر باہر نکال کر بولا تو وہ چونکی۔

”ذولین خان۔“ اس نے کھڑکی کا پردہ سر کا کر باہر جھانکا۔ مشکلی گھوڑے پر بیٹھا پستی رنگ کے شلوار سوٹ اور سیاہ جیکٹ میں ملبوس خاصا ہشاش بشاش لگ رہا تھا۔ سبز آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح ایک عجیب سا طلسم تھا۔ ایسا طلسم جس نے اسے جکڑ رکھا تھا۔ یہی آنکھیں تو تھیں جس نے اس کے اندر ہیجان خیز احساسات جگا دیئے تھے۔

آج بھی اس کے دل کی بستی میں ہلچل مچ گئی۔

”کہاں جا رہے ہو محمد سلام؟“ وہ سڑک کے دوسری طرف ڈھلوانی راستے پر گھوڑا روکے کھڑا تھا۔

”جی۔ وہ اشتراک بی بی کو چھوڑنے جا رہا ہوں، کوئی کام ہے کیا؟“ اس نے دروازہ کھول کر نیچے اترنا چاہا تو ذولین خان نے جلدی سے روک دیا۔

”نہیں نہیں۔ تم جاؤ۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے بے اختیار نگاہیں اس کھلے شیشے پر ڈالیں۔ اندر سے سیاہ چادر کے ہالے میں دو جگمگاتی آنکھیں صاف نظر آرہی تھیں۔

سبز سبز نگینوں سے نگاہیں ٹکرائیں تو اس نے جلدی سے رخ پھیر لیا۔ وہ اس سے خفا تھی جس کا برملا اظہار کر دینا چاہتی تھی۔ اپنی ہتک اسے ابھی تک یاد تھی۔

”چلو محمد سلام۔۔۔۔!“ وہ تحکم بھرے لہجے میں بولی تو محمد سلام نے جھٹ سے پجیر واسٹارٹ کر دی۔

ذولین خان نے اس کی آواز سنی جس میں گہری چھجن اور خفگی سمٹی ہوئی تھی۔

پجیر ودھیرے دھیرے سڑک پر پھسلتی آگے بڑھنے لگی تو وہ بھی گھوڑے کی را اس کھینچ کر دوسری طرف اتر گیا۔

”میں تم سے اپنی ڈھیروں ہتک کا بدلہ نہیں لے سکتی ذولین خان۔ یہ تو بس ایک ہلکا سا احتجاج تھا۔“ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا مگر اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ نہ جانے گھوڑا لئے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ چھوٹی لمبی اونچی نیچی پہاڑیاں سنسان اور ویران تھیں۔

پجیر وزر سانگہ کے گھر کے قریب آکر رکی تو وہ اتر آئی۔ پھر محمد سلام کی طرف آتے ہوئی بولی۔

”تم اب جاؤ، مجھے ایک گھنٹے بعد لے جانا۔“

”نہیں بی بی جی، شاہ خانم نے حکم دیا ہے کہ پورے آدھے گھنٹے بعد ہی آپ کو لے جاؤں۔“

”ٹھیک ہے تو آدھے گھنٹے بعد آ جانا۔“ اسے غصہ آگیا۔ شاہ خانم کے اتنے کڑے پہرے سے اسے وحشت ہونے لگی۔

”مگر، جی۔“

”اگر مگر کچھ نہیں۔“ وہ چیخ اٹھی۔

”جج۔۔۔۔۔ جی بہتر۔۔۔۔۔“ محمد سلام گھبرا گیا اور پجیر واسٹارٹ کر کے تیزی سے آگے بڑھالے گیا۔

وہ چند ثانیے تنے تنے چہرے کے ساتھ کھڑی رہی۔ وہ زر سانگہ سے مل کر گل بی بی کے پاس جانا چاہتی تھی۔ آج اسے موقع مل گیا تھا ورنہ تو شاہ خانم اس کے ایک ایک قدم کا حساب رکھتی تھیں اور وہ اس طرح اجازت لے کر بلند و بانگ اعلان کر کے گل بی بی کے گھر نہیں جاسکتی تھی۔ گھر تو کجا وہ ان کے سامنے گل بی بی کا تذکرہ کرنے سے بھی گریز کرتی تھی، مبادا وہ برہم ہو کر اسی پر نہ برس پڑیں۔

زر سانگہ کا چھوٹا سا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ بچے، عورتیں، لڑکیاں ادھر ادھر آ جا رہی تھیں۔ وہ سب اس کے لئے قطعی اجنبی تھیں اور خود وہ سب کے لئے نا آشنا تھی۔

”ارے تم خان زادی، یہاں اس غریب خانے میں۔“ نور جان اسے اپنے چھوٹے سے کچے کچے صحن میں دیکھ کر ششدر رہ گئی۔

”کیوں، میں یہاں نہیں آسکتی؟“ وہ ہولے سے مسکرائی۔

”نہ بی بی، کیوں نہیں آسکتی، یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے، آؤ آؤ اندر آؤ۔“ نور جان کا چہرہ چمک اٹھا۔

حویلی کی خان زادی کو یہاں دیکھ کر وہ مسرت سے کھلی جا رہی تھی۔ مہمان عورتیں اسے اجنبی اجنبی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں، کچھ حیرت کا تاثر لئے، کچھ بے مقصد مسکراتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے۔

”زر سانگہ کہاں ہے نور جان!“ اس نے رک کر پوچھا، وہ جلد از جلد زر سانگہ سے ملنا چاہتی تھی۔

”ہاں ہاں زر سانگے وہاں کنارے کے حجرے میں بیٹھی ہے ٹھہر و۔“ نور جان نے پلٹ کر سامنے دیوار کے ساتھ بیٹھی دوپٹے پر گھنگرو لگاتی لڑکی کو پکارا۔

”بخت آرا، ذرا اسے زرسا نگہ تک پہنچاؤ اور ہاں دروازہ ٹھیک سے بند کر دینا پرانی نظر نہ پڑ جائے۔“ وہ پلٹ کر اشارہ کو دیکھ کر بولی اور بلا مقصد مسکرا دی۔

وہ بخت آرا کے سنگ اس کنارے والے حجرے تک آگئی۔ باریک لکڑی کا دروازہ بند تھا۔

”تم لوگوں نے اسے اکیلا چھوڑ رکھا ہے۔“ دروازہ کھولتے ہوئے اس نے بخت آرا کو دیکھا۔

”جج جی۔“ وہ گھبرا گئی۔ ”ہم تو اس کے پاس ہی بیٹھتے ہیں پر وہ منع کرتی ہے۔ کہتی ہے میں اکیلی بیٹھنا چاہتی ہوں۔ ویسے دل آ میری بڑی بہن اس کے پاس بیٹھتی ہے۔“

”اچھا اچھا اب تم جائو“ اشارہ نے اسے بھگادیا اور خود دروازہ کھول کر اندر آئی تو اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔

کنارے پر بچھی بے رنگ دری پر وہ اجڑا جاڑویران سی بیٹھی تھی۔ بڑی سی پیلی چادر میں بھی اس کا چہرہ پھیکا پھیکا لگ رہا تھا۔ ان چمکتی آنکھوں میں ڈھیروں کرب سمٹا ہوا تھا۔ وہ بے مقصد دری پر انگلیاں پھیر رہی تھی۔ آہٹ پر سر اٹھا کر دیکھا تو آنکھیں لمحہ بھر کو چمک اٹھیں جیسے ویران مزار پر دیئے جل اٹھے ہوں۔

”اشارے! تو تم۔۔۔۔۔“ وہ بے تابانہ اٹھ کر اس کی طرف لپکی۔ اشارہ نے بھی آگے بڑھ کر اسے بانہوں میں سمیٹ لیا۔

”اشارہ! کہاں چلی گئی تھی۔ میرے پاس اب آئی ہو جب سب کچھ لٹ گیا۔“ وہ نہ جانے کب کا سیلاب روکے بیٹھی تھی۔ یکلخت سارے بند ٹوٹ گئے۔

”زری!۔۔۔۔۔ زری، میری جان! تو جانتی تو ہے، میں بھی اونچی اونچی دیواروں میں قید ہوں۔“ اس نے زرسا نگہ کے سارے آنسو اپنی چادر میں چن لئے۔ ”کیا حالت بنا رکھی ہے تو نے، کیوں ایسا روک جی کو لگا بیٹھی ہے۔“ وہ اس

کے علیل چہرے کو دیکھ کر اضمحلال سے بولی اور اسے تھامے دری پر بیٹھ گئی۔

”یہ ظلم ہے اور اس سے بڑا ظلم تم خود پر کر رہی ہو زرسا نگہ۔ جب احتجاج کی طاقت نہیں تھی، اپنا حق مانگنے کی جسارت نہیں رکھتی تھی تو پھر کیوں اپنا آپ محبت کے نام پر لٹا بیٹھی۔“ وہ ہلک اٹھی۔ اپنی پیاری عزیزاں جاں دوست کو دکھوں کے اس طوفان میں پامال ہوتا دیکھ کر اس کے دل کی دیواروں سے خون رسنے لگا۔

”تم یہ مجھ سے کہہ رہی ہو، یہ جانتے ہوئے بھی کہ محبت شعوری عمل نہیں ہے۔ بخدا اگر یہ دل میرے اختیار میں ہوتا تو میں کبھی کی اسے بھول جاتی۔“

”اب بھی بھول سکتی ہو، ہاں زری۔ تیرے حق میں اسے بھول جانا ہی بہتر ہے۔ کھرچ ڈال دل سے وہ سارے منظر جیسے تو نے کوئی خواب دیکھا تھا۔“ اشارہ اس کے دونوں ہاتھ تھام کر بولی تو اس کے لبوں پر زخمی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”تجھ سے کوئی کہے کہ تو ذولین خان کو بھول جا۔ اس کے خیالوں سے فراموش ہو جائو۔“ زرسا نگہ نے کہا تو اس کی پلکیں لزر گئیں۔ پہلو میں دل بے قرار ہو کر پھڑ پھڑانے لگا۔ اس نے لب دانتوں میں دبا کر بے بس نگاہوں سے زرسا نگہ کو دیکھا۔ یہ ظالم لڑکی ہمیشہ ایسے ہی تیر پیوست کر جاتی ہے۔

”نہیں اشارے، بھول جانے کا دوسرا نام واپس پلٹ جانا ہوتا ہے اور میں اپنی ساری کشتیاں جلا کر آگے بڑھی تھی۔ میں نے کوئی روئی کے ٹکڑے بکھیر کر نہیں رکھے تھے واپسی کے سارے راستے کھو چکی ہوں میں۔“

”مگر زرسا نگہ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی چارہ بھی نہیں تو نہیں ہے۔“ وہ الجھ گئی یہ سوچ سوچ کر اس کا دماغ پاگل ہو رہا تھا کہ اب زرسا نگہ اس نئی زندگی کی ابتدا کیسے کرے گی جبکہ تماش خان کی محبت اس کے ہمراہ ہوگی۔

”میں تماش خان کو نہیں بھول سکتی۔ مر کے بھی نہیں۔ اس کی محبت میرے خون میں گردش کر رہی ہے۔ بھلا میں خون کے ایک ایک قطرے سے اسے کیسے صاف کروں۔ وہ میری روح ہے اور روح کے بغیر زندہ کیسے رہا جاتا ہے۔“



وہ سرگھٹنوں میں رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”میں بھی کتنی پاگل تھی اشتارے پت جھڑ میں بہاروں کے خواب دیکھتی رہی۔ چاند ستاروں کو پکڑنے کی خواہش کر بیٹھی۔ میں نہیں جانتی تھی منظریوں اچانک بدل جائے گا۔ زندگی اپنی تمام تر بد صورتی اور ہولناکی کے ساتھ میرے سامنے یوں تن کر کھڑی ہو جائے گی۔ میں بھی بے کل، بے نواپتوں کی طرح بکھر جاؤں گی۔“

”ہاں میں تمہارا درد محسوس کر سکتی ہوں۔ مگر میں خوفزدہ ہوں۔ اگر۔۔۔۔۔ اگر کہیں نواب داد کو ان سب باتوں کا علم ہو گیا۔۔۔۔۔ اگر اسے شک ہو گیا تو۔۔۔۔۔“ اشتار نے بہت دنوں سے دل میں چلتے خدشے کو زبان دی تو زرسا نگہ نے چونک کر سراٹھایا۔ اس کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں خوف سمٹ آیا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔

”نہیں، نہیں۔۔۔۔۔ اسے کیسے شک ہو سکتا ہے اور اگر یہ ہوا تو بھی نہیں، یہ نہیں ہونا چاہئے۔“ اس کا حلق خشک ہونے لگا۔

نواب داد کا تاناہوا چہرہ، سرخ سرخ کھڑی ناک، تخیل میں لہرانے لگی۔

اس پہلو پر تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اپنی آنکھوں میں چلتے تماش کے نام کے جذبے کو چھپانے کی کوشش ہی اب تک نہیں کی تھی۔

”وہ کیسے مزاج کا آدمی ہے، تماش کی طرح نرم مزاج یا؟“

”نہیں، وہ بہت سخت اور ظالم شخص ہے۔“ زرسا نگہ نے لرزتی آواز میں اس کی بات کاٹ دی۔ ”اسے خبر نہیں ہونی چاہئے۔ وہ بہت سفاک ہے بالکل میرے داجی جیسا۔“ اس نے اپنے ٹھنڈے تن ہاتھ اشتار کے ہاتھ میں دے دیے۔

اس کا سارا وجود کانپنے لگا۔ بڑی سیاہ آنکھوں میں وحشت سی اتر آئی تھی۔

”نہیں زری۔ بھلا اسے کیسے خبر ہوگی؟“ اشتار نے اس کے سر دبے جان ہاتھوں پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی۔

”تم اپنے آپ کو حالات کے بہتر دھارے پر کھلا چھوڑ دینے کی بجائے اپنے آپ کو سنبھالو۔ کوئی مرد بھی وسیع القلب نہیں ہوتا۔ ظرف کے معاملے میں سارے مرد صفر ہوتے ہیں۔ چاہے وہ باپ ہو، بھائی ہو یا شوہر۔ میں جانتی ہوں تم بہت بہادر ہو، یقیناً اپنے آپ کو سنبھال لوگی۔ آنے والی زندگی کا حوصلے اور سمجھداری کے ساتھ سامنا کروگی، کروگی ناں؟“ وہ اسے تسلی دینے لگی۔ اس کی کمر میں بازو جمائل کر کے اس کے بکھرے وجود کو سمیٹنے کی کوشش کرنے لگی۔

”زیل کہہ رہی تھی زری سے کہنا کہ صرف میری خاطر تھوڑا مسکرا لینا۔ وہ کہہ رہی تھی زری مسکراتی ہوئی بہت اچھی لگتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے گلاب کے شگوفے کھل اٹھے ہوں۔ ہر طرف مدھر پائل بج رہے ہوں۔“ وہ جبراً مسکرا کر اس کی تشفی کرنا چاہ رہی تھی۔ زرسا نگہ روتے روتے مسکرا دی۔

”زیل سے کہنا وہ میرے پاس ضرور آئے۔“

”کہہ دوں گی، اچھا اب میں چلوں گی۔“

”اتنی جلدی؟“ وہ ادا اس ہونے لگی۔

”کیا کروں، بڑی مشکل سے آئی ہوں، اتنے دنوں سے گل بی بی کی طرف بھی نہیں گئی۔“

”شاہ خانم سے ڈرتی ہو تم بہت۔“ زرسا نگہ بھی اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی، اس کی پلکیں جھک گئیں۔



”ہاں۔“ اس نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔ ”تم تو جانتی ہو زری! گل بی بی کے نام پر ہی شاہ خانم برہم ہو جاتی ہیں۔

تمہارے گھر کا بہانہ کر کے آئی ہوں، تو ان سے بھی مل آتی ہوں۔“

”اکیلی کیسے جاؤ گی وہاں تک۔ ٹھہرو میں بخت آرا کو تمہارے ساتھ بھیج دیتی ہوں، وہ تمہیں...“

”نہیں نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے جلدی سے انکار کر دیا۔ ”بس تھوڑا راستہ ہی تو ہے، واپس یہیں

آؤں گی۔ محمد سلام گاڑی لے کر آجائے گا۔ اچھا خدا حافظ۔“

زر سانگہ ایک بار پھر اس کے گلے لگ گئی۔ خود بخود ہی گرم گرم آنسو دونوں کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔

”میری باتیں ضرور مان لینا زری۔ یہ تیرے حق میں بہتر ہے۔“ اشارہ الگ ہوتے ہوئے بولی تو اس نے سر ہلادیا۔

زر سانگہ کے کمرے سے وہ باہر آگئی۔ چھوٹی سی راہداری میں خاموشی تھی۔ سب عورتیں نور جان بی بی کے چھوٹے سے کمرے میں جمع خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ وہ نور جان کو رک کر کمرے کی کھڑکی سے ہی خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئی۔

اس کی نگاہیں زر سانگہ کے کمرے کے باہر دوسری طرف رکھی چھوٹی سی لکڑی کی الماری کے پاس کھڑے نواب داد پر نہ پڑ سکی تھیں جو کب سے کھڑا ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ وہ اپنے کسی کام کے سلسلے میں داہی سے ملنے آیا تھا۔ مگر اس کے قدم تماش کے نام پر رک گئے تھے اور اس کی سماعت نے جو کچھ سنا اس کے دل کے لئے بہت اذیت ناک تھا۔

زر سانگہ کی سسکیاں۔

تماش کی چاہت میں اس کی ڈوبی آواز۔

اس کی روح میں جیسے کند چھری پھیر دی ہو زر سانگہ نے۔

اس کا وجود کانپنے لگا۔ سرخ ہونٹ دانتوں میں دبائے سے اور بھی سرخ انگارہ ہو گئے۔ پیشانی پر شکنوں کا جال سا بن گیا۔ اس کی منگ جواب صرف ایک دن بعد اس کی منکوحہ ہو رہی تھی، تماش خان کی محبت میں پور پور ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں خون اگلنے لگیں۔

وہ داہی کو ڈھونڈنے کی بجائے سب سے نظر بچاتا واپس باہر نکل گیا۔

...☆☆☆...

”امی، امی۔ کیا یہ فیصلہ، یہ خیال آپ ترک نہیں کر سکتیں۔“ ماہ گل کی آواز میں رونے کا تاثر پیدا ہو گیا تھا۔ اسے گہرا

صدمہ ہوا تھا، یہ اس کی ماں کیا کرنے لگی تھی؟

پھر یہ کسے امتحانات میں گھسیٹنے کا عزم کر چکی ہیں۔

”نہیں بدل سکتی میں۔ اس لئے کہ یہ فیصلہ صرف میرا ہی نہیں تمہارے ابو اور شاہ خانم کا بھی ہے جو غلط قطعی نہیں ہے۔“ امی یہ کہہ کر کرسی سے اٹھنے لگیں تو ماہ گل نے جلدی سے انہیں بازو سے تھام کر دوبارہ بٹھادیا اور خود ان کے سامنے دو زانو بیٹھ گئی۔

”مجھے دیکھئے امی۔ آپ سب کے مشترکہ فیصلے کی بھینٹ چڑھ گئی ہوں میں۔ یہ وٹے سٹے کی شادیاں بربادی ہے سراسر۔ اگر ان میں سے کوئی فریق بھی دل سے راضی نہ ہوایا اپنے شریک سفر سے ذہنی ہم آہنگی نہ ہوئی تو، تو اس کی سزا سب کو ملتی ہے۔ جس طرح مجھے مل رہی ہے۔ آپ جانتی بھی ہیں کہ زمان بھائی اور شاد داہا بھی کی ازدواجی زندگی کی ناکامی کا دکھ میں بھی سہہ رہی ہوں۔“

”مگر یہاں یہ معاملہ نہیں ہے ماہی!“ امی اس کے رونے پر نرم پڑ گئیں۔ اشارہ بہت معصوم اور پیاری بچی ہے اور اشمیل بھی سلجھا ہوا پڑھا لکھا لڑکا ہے۔“

”امی، مجھے اشمیل اور سحر گل کے رشتے سے انکار نہیں ہے۔ مگر، مگر امی اشارہ اور فروان، بہت بے جوڑ ہو گا یہ رشتہ۔ صرف جسمانی ساخت سے کچھ نہیں ہوتا۔ فروان ذہنی طور پر بہت پست ہے اور پھر وہ اشارہ اسے ایک سال چھوٹا بھی ہے۔“ وہ جھنجلا گئی۔

کیوں نہیں سمجھ رہی تھی اس کی ماں۔ جان بوجھ کر آنکھ بند کرنے سے یہ صاف نظر آنے والے مسئلے ختم نہیں ہو جاتے۔

”لیکن شاہ خانم کو کوئی تردد نہیں ہے۔“ امی نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ماہ گل تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔

”بات پھوپھی جان کی نہیں، اشارہ کی ہے۔ وہ پھوپھی جان کے کسی فیصلے پر انکار کرنے کی جسارت نہیں رکھتی۔ میری طرح سولی پر خاموشی سے چڑھ جائے گی اور قطرہ قطرہ پگھل کر ختم ہو جائے گی۔ خدا کے لئے امی، یہ سراسر ظلم ہو گا۔“ وہ ہاتھ چھوڑ کر ملتتی ہو گئی۔ اس کی نظروں میں سحر گل اور اشارہ کے معصوم چہرے گھومنے لگے۔

کچھ بھی ہو گا گھائے میں یہ لڑکیاں ہی رہیں گی۔

یہ معصوم معصوم چہرے۔

خاموش بے زبان سیٹیاں۔

کیسی ماں ہے یہ ایک بیٹی کی عبرت سے سبق نہیں لیتی۔ دوسری کو بھی سوئے مقتل کھینچے لئے جا رہی ہے۔

اس نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے امی کی طرف دیکھا تو وہ رخ پھیر کر کھڑی ہو گئیں۔ اور اس کی تمام تر تاویلیوں کو اس

کے سارے آنسوؤں کو پس پشت ڈال کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔

”اوہ خدایا۔“ اس نے کانپتے لب دانتوں میں مضبوطی سے جکڑ کر دیوار سے ٹیک لگائی۔ ”امی اور ابو نے میرے دکھ پر شاید آنکھیں بند کر لی ہیں یا میرے دکھ کو، میری بے سکونی کو محسوس ہی نہیں کر سکے ہیں اب تک۔“

پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا تو مسعود شاہ بھی تھا۔

انٹلکچوئل تو زمان بھائی بھی تھے۔

مگر کہاں گئی ان کی وہ تعلیم؟

کہاں کھو گئی وہ تربیت؟

اونہہ اس مقام پر آکر سارے مردوں کی ذہنیت ایک ہی ہو جاتی ہے چاہے وہ ان پڑھ ہو یا تعلیم یافتہ۔ معصوم تو شاردہ بھا بھی ہیں۔ مگر پھر بھی زمان بھائی ان سے نباہ نہیں کر سکتے۔ محض کم تعلیم ان کے دکھوں کا سبب بن گئی۔ مگر مجھ میں کیا کمی تھی۔ پڑھی لکھی سلجھی ہوئی۔ میرے نصیب میں ان دکھوں کا سبب کیا ہے۔

یہی ناکہ مسعود شاہ بہن کے دکھ پر آنکھیں بند کر کے نہیں بیٹھ سکتا۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تو اپنی مردانگی کی ضربیں مجھے لگاتا ہے۔ شاید اسی طرح بہن کے دکھ میں کمی آجائے۔ آہ کاش۔ اس طرح کمی ہی آجاتی۔ میری اذیت بھا بھی کی خوشی بن جاتی۔ مگر افسوس ہم دونوں ہی خالی ہاتھ ہیں۔

خوشیوں اور مسرتوں کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہیں تو ہتھیلیوں پر صعوبتوں کے رنگ چمٹ جاتے ہیں۔

اب قصور وار کون ہے۔

میں؟

شارد ابھابھی

مسعود شاہ یا زمان بھائی۔

اگر اس میں سے قصور وار کوئی بھی نہیں تو پھر؟

یہ والدین کے کئے گئے فیصلے ہی غلط تھے۔ وہی قصور وار ہیں، ہاں۔

”آپی، آپی۔“ فروان اسے پکارے جا رہا تھا۔ اس کی بند آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کی ذات کا سارا کرب آنسو کی صورت بہہ رہا تھا۔

”آپی، کیا ہو گیا ہے؟“ فروان اس کے دونوں شانے تھام کر جھنجھوڑنے لگا۔

اس نے آہستگی سے آنکھیں کھولیں۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں سوائے آنسوؤں کی دبیز چادر کے کچھ بھی نہ تھا۔ فروان پریشان ہو گیا۔

”میرا دل چاہتا ہے آپی میں مسعود بھائی سے خود بات کروں۔ آخر آپ کا کیا قصور ہے جو سزا سہ رہی ہیں۔“ فروان کا دل کٹ گیا۔ اس نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کے نازک شانے پر رکھ دیا۔

”اگر تم کہو آپی تو میں آج ہی۔“

”نہیں، نہیں فروان۔“ اس نے جلدی سے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ ”یہ رشتے بہت نازک ہوتے ہیں ذرا سی ٹھیس پر چکنا چور ہو سکتے ہیں۔“

”او نہہ، کون سا اس رشتے کا پاس کر رہے ہیں مسعود بھائی۔“ وہ جل اٹھا۔

”نہیں فروان، میں تو بس ایسے ہی رو رہی تھی۔“ اس نے فروان کو مشتعل دیکھ کر بات ٹالنی چاہی پھر کچھ سوچ کر

بولی۔

”پتہ ہے امی کیا چاہتی ہیں؟“

”کیا؟“ فروان نے پوری آنکھیں کھول کر ماہ گل کی طرف دیکھا جیسے وہ کوئی بہت ہی پراسرار بات کہنے کو تھیں۔

”اشمل بھائی اور سحر گل کا آپس میں رشتہ ہو جائے اور۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ فروان نے اس کا جملہ کاٹ کر مسرت کا اظہار کیا۔ ”ہاں اور، اور کیا؟“

”اور۔“ ماہ گل نے کرب سے لب دانتوں میں جکڑ لئے۔ ”تنت، تمہارا اور اشتار کا رشتہ۔“ اس نے جملہ پورا نہ کیا اور ہمدردی سے فروان کی سمت دیکھا، مگر اس کی آنکھوں میں تخیر سمٹ آیا۔

فروان کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ لب بے حد خوبصورت انداز میں مسکرانے لگے۔ وہ اچانک ہی جذبات کی یورش سے ہنس پڑا۔

”آ۔۔۔۔۔ آپ سچ کہہ رہی ہیں آپی؟“ اس کی آواز لڑکھڑائی۔

”اوہ گاڈ! اتنی بڑی خبر آپ نے مجھے یوں کھڑے کھڑے سنائی، بغیر مٹھائی کے۔ کیا میرے جذبوں کا اتنی جلدی انعام مل گیا۔“ وہ مارے خوشی کے ناچ اٹھا۔

”زندگی یوں بھی مہربان ہو جاتی ہے آپی۔“ وہ تیزی سے پلٹا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

ماہ گل پھٹی پھٹی آنکھوں میں تخیر آمیز بے یقینی سمیٹے اسے بھاگتا دیکھتی رہی۔ اس کا دماغ مائوف ہونے لگا۔

”اوہ، میرے خدا۔ تو کیا فروان، فروان بھی۔“ اسے لگا جیسے وہ ابھی چکرا کر فرش پر آگرے گی۔

اشترا، زرسا نگہ کے گھر سے نکل کر جلدی جلدی چلنے لگی۔ راستے ناہموار تھے۔ اسے چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ دوسری طرف گزرتی شفاف سڑک پر چلنے سے گریز کر رہی تھی۔ اس نے چادر کا نقاب منہ پر لگا لیا۔ مبادا کوئی دیکھ نہ لے۔ زبیل کی غیر موجودگی میں وہ پہلی بار تنہا نکلی تھی۔ وہ چھپ کر گل بی بی کے گھر جتنی بار بھی گئی تھی زبیل اس کے ہمراہ تھی۔

مگر آج نہ جانے کیوں اسے زبیل کو ساتھ لینے کا خیال ہی نہ آیا اور اب اسے اپنی اس حماقت کا شدید افسوس ہونے لگا۔ اس نے ایک طرف رک کر دائیں بائیں دونوں طرف نگاہیں دوڑائیں اور راستے کا تعین کرنے لگی۔ برسات کی وجہ سے ابھی تک اطراف میں چھوٹے چھوٹے نالے پانی سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ کچھ سوچ کر بائیں طرف مڑ گئی اور تیزی سے چلنے لگی۔ مگر خاصی دور نکل جانے کے بعد اس کا دل زور سے دھڑکا۔ اس کی چھٹی حس نے خبردار کر دیا کہ وہ غلط راستے پر آ نکلی ہے۔

”اوہ خدایا۔“ وہ بوکھلا کر رہ گئی۔ اس نے دور دور تک نگاہیں ڈالیں۔ ویران اور سنسان سڑک پر جو کسی ذی روح کے استعمال میں نہ تھی، سڑک کے اطراف ٹوٹی پھوٹی چھوٹی چھوٹی کھائیاں تھیں۔

وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر پٹی مگر اس کے قدم جیسے فرش نے جکڑ لئے ہوں۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں دہشت پھیلنے لگی اور حلق میں جیسے کانٹے سے چھبنے لگے۔

پھر اچانک میکا کی انداز میں اس کے پیر حرکت میں آ گئے۔

ہیبت ناک موت کا خوف، اس کے خون کو بجائے جمانے کے مشتعل کر گیا۔

اسے بہر کیف اپنا دفاع کرنا ہی تھا۔

اس نے بغیر اطراف کے دیکھے آگے دوڑ لگا دی۔

ناہموار راستے۔

چھوٹی چھوٹی کھائیاں۔

پانی سے بھرے اونچے اونچے گڑھے۔ اسے کچھ بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ اندھا دھند بھاگنے لگی، پھر اچانک اس کے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکل گئی جو پوری فضا میں پھیل گئی۔

شاہ خانم کا وجود تھرا اٹھا۔ اُن کی آنکھوں میں غصے کے ہمراہ اضطراب سمٹ آیا۔

”کہاں چلی گئی ہے اشترا؟“ تم سب لوگ منہ دیکھتے رہ گئے۔ میری بیٹی کو اگر کچھ بھی آنچ آئی تو میں پوری وادی کو تباہ و برباد کر دوں گی۔“ ان کی پاٹ دار آواز حویلی کے در و دیوار کو لرزائے دے رہی تھی۔

محمد سلام تھر تھر کانپ رہا تھا جیسے یہ سارا قصور اسی کا ہو اور ابھی شاہ خانم اسے موت کی سزا کا حکم سنادیں گی۔

”محمد سلام! تم نے نور جان سے پوچھا نہیں کہ وہ نکل کر کس طرف گئی تھی؟“ انہوں نے کوئی چوتھی بار یہی سوال پوچھا۔

”جج جی۔“ پوچھا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ خان زادی کوئی آدھا گھنٹہ پہلے ان کے گھر سے نکل چکی تھیں اور جی میں تو گل بی بی کے گھر بھی معلوم کر آیا تھا۔“ اس نے چوتھی بار وہی جواب دیا اور پھر سمٹ کر کھڑا ہو گیا۔



زیبل الگ دیوار میں سمٹی، لرز رہی تھی اور لمحہ لمحہ گن رہی تھی کہ ابھی \_\_\_\_\_ بس ابھی شاہ خانم کا عتاب اس پر نازل ہوا ہی چاہتا تھا۔

اشارہ کے یوں اچانک غائب ہو جانے پر ساری حویلی میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ عزت خان بھاگا بھاگا زمینوں کی طرف گیا تاکہ بابا خان کو اشارہ کے یوں اچانک غائب ہو جانے کی اطلاع کرے۔ پسینے میں شرابور ہاتھ پتا کانپتا وہ زمینوں تک آیا تو بابا خان وہاں موجود نہیں تھے \_\_\_\_\_ وہ ذولین کی طرف بھاگا۔

”کیا بات ہے عزت خان؟“ ذولین نے سامنے پڑا جسٹر بند کرتے ہوئے خان کو گھبرایا ہوا اپنی طرف آتے دیکھ کر پوچھا۔

عزت خان اس کے سامنے رک کر اپنی بے ترتیب سانسیں درست کرنے لگا۔

”اب بول بھی دے عزت!“ قابل نواز جو ذولین کے پاس ہی کھڑا تھا، عزت خان کو خاموش دیکھ کر بولا۔

”وہ جی \_\_\_\_\_ اشنا \_\_\_\_\_ تارا بی بی \_\_\_\_\_“ وہ گھبراہٹ میں ہکلا کر بولا۔

”کیا ہوا اشارہ کو؟“ ذولین خان چونک اٹھا۔

”وہ جی \_\_\_\_\_ پتہ نہیں، خان زادی غائب ہو گئی ہیں کہیں۔“

”کیا! \_\_\_\_\_ غائب ہو گئی ہے؟“ ذولین خان اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ اسے لگا جیسے عزت خان نے ڈھیروں پتھر

اس کے سر پر لڑھکا دیئے ہوں۔

”وہ اپنی سہیلی زرسا نگہ کے گھر گئی تھیں۔ محمد سلام گاڑی میں چھوڑ آیا تھا۔ مگر جب لینے گیا تو بی بی وہاں سے نکل چکی تھیں۔ مگر پھر جانے کہاں غائب ہو گئیں۔ محمد سلام نے توہر راستے میں پڑنے والی سڑک دیکھ ڈالی۔ گل بی بی کے گھر

بھی پتہ کر آیا مگر \_\_\_\_\_ مگر وہاں بھی نہیں ہیں۔“ اس نے ایک ہی سانس میں ساری تفصیل بتا ڈالی۔

”اب کیا ہو گا جی؟“ قابل نواز بھی گھبرا گیا۔ اس نے ذولین خان کی طرف مضطرب نگاہوں سے دیکھا۔

اس خبر پر ذولین کا دماغ چند سیکنڈ کے لئے چکرا کر رہ گیا تھا۔ ڈھیر سارے پریشان کن خیالات ذہن میں در آئے تھے۔

”وہ کہاں جاسکتی ہے \_\_\_\_\_ مجھ سے خفا تھی، شاہ خانم سے خوفزدہ بھی تھی۔ مگر نہیں، وہ ایسی کوئی حرکت نہیں کر سکتی۔ اور اگر یہ اس کی کسی شعوری حرکت کا فعل نہیں ہے تو پھر \_\_\_\_\_ کون لے جاسکتا ہے اُسے؟“ ذہن سخت منتشر ہو گیا۔

مضبوط دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔

”قابل نواز \_\_\_\_\_“ اس نے زور سے پکارا۔

”جی \_\_\_\_\_ جی خان!“ قابل نواز جلدی سے بولا۔

”تم یہ رجسٹر سنبھالو، میں دیکھتا ہوں جا کر۔“ اس نے رجسٹر قابل نواز کو دے دیا اور اپنی جیکٹ کی جیب سے چابی

نکالتا ہوا تیزی سے جیب کی طرف دوڑا۔

ہر گزرتے لمحے میں اس کے ذہن میں مختلف خیالات آرہے تھے۔

ہیبت ناک \_\_\_\_\_

پریشان کن \_\_\_\_\_

روح کو لرزادینے والے \_\_\_\_\_

اس کی کشادہ پیشانی پر اضطراب کے کئی بل پڑ گئے تھے۔

اس طرح کہاں جاسکتی ہے اشتار؟ \_\_\_\_\_ یہ سوال اس کے لئے الجھن کا باعث تھا۔ اس نے جیپ فل اسپڈ پر چھوڑ رکھی تھی۔

اُونچے نیچے ناہموار راستوں پر جیپ جھٹکے کھاتی، اُچھلتی، تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ زرسا نگہ کے گھر کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے جیپ روک دی۔ اب اُسے سوچنا تھا کہ اشتار کس راستے سے جاسکتی ہے؟

گل بی بی کے گھر محمد سلام پتہ کر آیا تھا، اس کا مطلب تھا کہ گل بی بی کے گھر آنے والے عام راستوں پر محمد سلام نے نگاہ ڈالی ہوگی۔

اس کے دائیں بائیں دوسڑکیں تھیں، بائیں جانب نگاہ ڈالتے ہوئے اس کا ذہن ٹھٹکا۔ اگر اشتار کا یہ شعوری عمل ہے تو یقیناً یہ راستہ ہو سکتا ہے۔

’خودکشی‘

’نہیں‘ اس کا مضبوط سینے میں مقید دل یوں دھڑکا جیسے ابھی ساری پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اس کا ذہن یہ بات ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ اشتار اس طرح کی کوئی حرکت کر سکتی ہے۔ وہ بظاہر دُور تھا مگر اسے سب سے زیادہ جانتا تھا۔

بہر کیف، اسے اب اشتار کو ڈھونڈنا تھا۔ اس نے نگاہیں اطراف میں ڈالتے ہوئے بائیں سڑک پر جیپ موڑ دی۔

مگر ٹوٹے پھوٹے راستوں کی وجہ سے اس نے جیپ کنارے پر ہی روک دینا مناسب سمجھا اور خود نیچے اُتر آیا۔

اچانک اس کی نگاہ سڑک کے کنارے چھوٹی کم گہری کھائی میں جا پڑی جس میں اُگی خود رو جھاڑیوں میں سیاہ کپڑا

پھڑپھڑا رہا تھا۔ وہ تیزی سے اس جانب لپکا اور دوسرے ہی لمحے اس کی سبز آنکھوں کی ساری توانائیاں جاگ اُٹھیں۔ کھائی میں وہ بے ہوش پڑی تھی۔ اس کا نقاب چہرے سے اُتر چکا تھا اور چادر جھاڑیوں میں پھنس کر کہیں کہیں سے پھٹ گئی تھی۔

”اشتار! \_\_\_\_\_“

اس نے قریب آکر بہت نرمی سے اُسے پکارا مگر وہاں گہرا سکوت تھا۔ گلابی چہرے پر سیاہ پلکیں جامد تھیں۔ سفید ہاتھ سینے پر تھا جبکہ دوسرا ہاتھ زمین پر اُگی چھوٹی چھوٹی خاردار جھاڑیوں کے اوپر گرا ہوا تھا جہاں سے سرخ خون کی باریک لکیر نکل کر جم گئی تھی۔

وہ پہلی بار اس کے اتنے قریب آیا تھا۔ اس کا کھلا، شفاف چہرہ نگاہوں سے اتنا قریب تھا کہ خود بخود اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ اتنی قربت پر اس کے دل میں عجیب قسم کی لہریں سی اٹھنے لگیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اپنے دل کی ساری حالت پوشیدہ رکھ کر اس حُسنِ ضو فگن سے رُخ موڑ کر چلا جاتا۔ مگر اس وقت وہ اس حالت میں قطعی نہیں تھی۔ وہ بے یار و مددگار، بے ہوش ایک کھائی میں پڑی تھی۔

اس نے آہستگی سے اس کی پیشانی کو چھوا۔

”اشتار!“ وہ قدرے اس کی طرف جھکا۔ پھر اچانک اس کے لمس کی کرنیں اُسے بیدار کرنے لگیں۔ ساکن پلکیں تھر تھرائیں، گلاب گلاب لب وا ہوئے۔

”آہ“ ایک ہلکی سی سسکاری اس کے لبوں سے آزاد ہوئی۔

”اشتار! آنکھیں کھولو۔“ دھیمے، گمبھیر لہجے کی یہ سرگوشی اشتار کی سماعت سے ٹکرائی تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور چند لمحے اپنے سامنے بیٹھے ذولین خان کو خالی خالی نگاہوں سے تکتے لگی۔

گزرے لمحے یلکھت اس کی آنکھوں کے سامنے لہرانے لگے۔ سیاہ بڑے بڑے خونخوار کتے نہ جانے کہاں سے نکل کر اس کے پیچھے لپکے تھے۔ اتنی ہیبت ناک آواز کے ساتھ اسے دیکھ کر بھونکے تھے کہ وہ اپنے بچاؤ کے لئے بھاگ کھڑی ہوئی تھی اور پھر اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی تھی۔

ایک تو اتر سے سارا منظر نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔

یلکھت اسے اپنی حالت کا خیال آیا تو بوکھلا اٹھی۔ جھاڑیوں میں پھنسی چادر کھینچ کر جسم میں ڈالی اور اٹھ کر پیچھے کھسک کر بیٹھ گئی۔

”مم۔۔۔۔۔ میں ڈر گئی تھی کتوں سے۔“ اُس نے پلکیں جھکادیں۔ وہ بغور اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آواز پر وہ اپنی محویت سے بیدار ہوا۔

”آں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ شکر ہے کہ تم ٹھیک ہو۔“ وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ”تمہیں اس طرح تنہا کہیں بھی نہیں جانا چاہئے۔ شاید گل بی بی کی طرف جا رہی تھیں۔“ اس نے صحیح اندازہ لگایا۔

”ہاں۔“ وہ مختصر آہولی اور اٹھنے کی سعی کرنے لگی۔ مگر درد میں ڈوبا جسم ساتھ نہ دے سکا اور ایک کراہ نکل گئی۔ وہ لڑکھرائی تو ذولین نے جلدی سے تھام لیا۔ تکلیف کی شدت سے اس کی ستارہ آنکھوں میں پانی جمع ہو گیا۔

اس کی آنکھوں کی جھلملاہٹ سے وہ اس کی تکلیف کو محسوس کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے چہرے کی کرخنگی میں نرمی پیدا ہو گئی تھی۔

”ہمت کرو۔۔۔۔۔ میری جیب قریب ہی کھڑی ہے۔ دیکھو، موسم بھی اپنا رخ بدل رہا ہے۔“ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ مٹیالے مٹیالے بادل نہ جانے کہاں کہاں سے آکے جمع ہو رہے تھے۔

”کیا واقعی موسم اپنا رخ بدل رہا ہے؟“ اُس کے لہجے کی نرمی پر وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ لمحہ بھر کے لئے اپنا سارا درد بھلا بیٹھی۔ وہ اس کے اتنے قریب کھڑا، اس کے لئے

پریشان تھا۔ اس کے وجود کو سہارا دیتے ہوئے، سارے جہاں کی حلاوت سموئے۔ کیا یہ خواب نہیں تھا؟

”محمد سلام نے تمہیں ہر جگہ ڈھونڈا۔ شاید ان راستوں پر نہیں آیا۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

”تو کیا تم پریشان ہو کر مجھے ڈھونڈنے نکل آئے؟ آہ۔۔۔۔۔“ اُس کے اندر ایک سرشاری سی اُترنے لگی۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ کبھی تو اس بے درد کی زندگی میں کوئی لمحہ اس کا اپنا ہو۔

پھول سا نرم مل لمحہ، آج اس کو مل گیا تھا تو وہ کیسے کھودیتی۔

’اے مغرور آنکھوں والے! آج یہ کرم کیوں؟‘ اُس نے اپنی ابریشمی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ سرمئی کُرتے، شلوار میں وہ اس کے سامنے تھا۔ ہمیشہ کی طرح جاذبِ نظر۔ اُس کے دل کا سکون غارت کر رہا تھا۔ آج ان آنکھوں میں فکر مندی تھی، پریشانی تھی۔

”اشترا۔۔۔۔۔ اشترا! کیا پاگل ہو گئی ہو؟“ وہ اُسے خواب کی سی کیفیت میں دیکھ کر جھنجھلا اٹھا۔ ”چلو آؤ۔۔۔۔۔“ اُس نے اس کے نرم بازو پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔

”ٹپ۔۔۔۔۔ ٹپ۔۔۔۔۔ ٹپ۔۔۔۔۔“

آسمان سے بوندیں تو اتر سے گرنے لگیں۔ پھر اچانک یہی بوندیں تیز ہو گئیں۔ وہ اس کے بازو کا سہارا لئے دھیرے دھیرے چلنے لگی۔

اچانک ذولین خان کی نگاہ اس کی سفید مرمیں کلائی پر پڑی جہاں سے خون دوبارہ بہنے لگا تھا۔ اس نے جیب کے پاس

اُسے روک کر اس کی کلائی تھام لی۔

”بہت زیادہ خون بہہ رہا ہے۔“

”ہاں، شاید کوئی نوک دار پتھر لگ گیا تھا۔“ اس نے آہستگی سے سر ہلا دیا۔

ذولین خان نے جیکٹ کی جیب سے اپنا رومال نکالا اور اس کی کلائی تھام کر زخم پر مضبوطی سے باندھنے لگا۔ اشتار اچند ثانیہ حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ یہ یکایک زندگی کا رخ کیسے بدل گیا؟ کیا اس کی بیزار طبیعت میں پیار پیدا ہو گیا تھا یا محض ہمدردی تھی؟

وہ آنکھیں پوری کھولے اس ستم گر کو دیکھنے لگی جو آج اُسے حیرتوں کے سمندر میں لمحہ لمحہ دھکیل رہا تھا۔

کاش کاش یہ لمحے امر ہو جائیں۔ یہ وقت کبھی نہ ختم ہو۔ وقت کی نبضیں تھم جائیں۔

اس کے دل میں یہ خواہش مچل کر رہ گئی۔

ذولین خان نے رومال باندھ کر نگاہیں اوپر اٹھائیں تو وہ سحر انگیز ستارہ صفت نگاہیں اسی کی جانب محو تھیں۔

یکایک اس کے مضبوط سینے میں مقید دل میں شعلہ سا لپکا۔

وہ کچھ کہتی آنکھیں

ایسی سا گر سا گر آنکھیں

اتنا جاذب نظر چہرہ۔

معاً اس نے لب بھینچ کر نگاہیں پھیر لیں۔

ایک کرب سمٹ آیا اس کے دل کی سر زمین پر۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا، یہ شکر فی لب، یہ گلاب، گل تر سے بھی خوش رنگ عارض، یہ طلائی رنگ گیسو، یہ شفیق رنگ چہرہ اس کا نہیں بن سکتا۔

وہ انجام سے باخبر تھا اور خوفزدہ بھی کہ یہ خوش رنگ گھٹائیں کہیں دُور برس جائیں گی اور وہ یو نہی تشنہ لب رہ جائے گا۔

نہیں۔۔۔ وہ تشنگی کے عذاب سے دوچار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنے دل کے اندر چلتے شعلوں کو ہوا دینے کی بجائے ان پر بے حسی کی برف جمادینا چاہتا تھا۔

ہر جذبہ، ہر احساس، ہر خیال منجمد کر دینا چاہتا تھا۔

”ذولین خان! کیا یہ صرف ”ہمدردی“ ہے۔۔۔؟“ اشتار کے لبوں پر بے اختیار یہ سوال مچل اٹھا۔

ذولین خان نے جیب کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ چکی تھی اور امید افزا نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

یہ معصوم معصوم چہرہ ذولین کے دل کو گھائل کر دینے کو کافی تھا۔

”تم خان چچا کی امانت ہو اور میں خان چچا سے وابستہ ہر شے کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔“

وہ ساری نرمیاں، لہجے کی ساری حلاوت یکسر غائب ہو گئی تھی۔

وہ چٹان صفت لہجہ جو اشتار خان کے دل کی نرم نرم دیواروں کو لہو کر گیا۔ وہ سنائے میں رہ گئی۔ کیا یہ محض خواب تھا؟ اس کی آنکھوں میں سچی کا جل کی لکیر بے اختیار بھگیکتی چلی گئی اور آنکھیں یکسر سمندر بن گئیں۔

محبت بالآخر دکھ ہی دیتی ہے۔ وصل ہو یا ہجر، یہ کانٹوں سے پُر راستہ ہے جو قدموں کو فگار کر دیتا ہے۔



اس نے چہرے کا رخ موڑ لیا۔ لمحوں میں جڑ پکڑتی اُمیدیں پھر سے سوکھنے لگی تھیں۔ دل ٹوٹتے ہی جسم کی ساری تکلیف جاگ اٹھی۔ ننھی ننھی خوشگوار بوندیں اسے آگ میں لپٹی گولیاں محسوس ہونے لگیں۔

”ذولین خان! کیا واقعی آپ جیسے نظر آتے ہیں اندر سے بھی ویسے ہی ہیں؟“ اُس نے بکھرتے لہجے میں پوچھا تو وہ چونکا۔

اس کا دل اندر ہی اندر پگھلنے لگا۔

”نہیں اشتار امہروز! میرے دل پر بے اعتنائی اور نفرت کی محض راکھ جمی ہوئی ہے۔ کبھی کبھی یہ اڑنے لگتی ہے تو اندر سے بہت نرم، بہت شیتل نظر آتا ہے۔“

”ہاں شاید۔۔۔“ اس نے بہت کھردرے اور کرخت لہجے میں جواب دیا اور جیپ کی رفتار بڑھا دی۔

وہ جلد از جلد حویلی پہنچ جانا چاہتا تھا۔

وہ اس کے قریب بیٹھی اس کے دل کی دنیا کو زیر و زبر کر رہی تھی۔ عجیب سے شوریدہ سر جذبے دل کے ساحل پر سر پٹن ہے تھے۔ وہ ٹوٹنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ہارنے سے خوفزدہ تھا۔

اس کے وجود سے اٹھتی مہکی مہکی خوشبو اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ اس کے قرب کی آنچ اس کی ہستی پر طلسم طاری کر رہی تھی۔

”نہیں ذولین خان! تم انتقام لے رہے ہو۔۔۔ اپنی محرومیوں کا بدلہ لے رہے ہو۔ ایک شخص کی نفرت کا انتقام تم اس کی پوری صنف سے لے رہے ہو۔ یہ مردانگی نہیں ہے ذولین خان!“ وہ اچانک پھٹ پڑی۔ اس کا دل غموں کے بوجھ سے ٹوٹنے لگا تھا۔

وہ متحیر رہ گیا۔ خود بخود اس کا پیر بریک پر پڑا اور جیپ اچھل کر رک گئی۔

”تم بظاہر چٹان نظر آنے والے، دراصل بزدل ہو، کم ہمت ہو۔ تم اپنے اندر کی جمع شدہ آگ کو ٹھنڈا نہیں کر سکتے تو مجھ پر برساتے رہتے ہو۔۔۔ شاید اس طرح میرا بیٹا شاہ خانم کو بکھیر کر رکھ دے۔۔۔ میری لمحہ لمحہ موت شاید ان کا سکون غارت کر دے۔ ہے نا یہی بات؟ بولو، جواب دو۔“ وہ دیوانی ہو گئی۔ وہ اس کا بازو تھام کر جھنجھوڑنے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں کا سمندر بہنے لگا۔

”اشٹارا!“ وہ چیخ اٹھا۔۔۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنے قوی ہاتھ میں جکڑ لئے۔

”چھوڑ دو مجھے۔۔۔ چھوڑ دو۔“ وہ اس سے بھی زور سے چیخی۔ ”تم ایسے مرد ہو جو محض ہر لمحہ، ہر وقت اپنی انسانیت کی تسکین کا سامان ڈھونڈتے پھرتے ہو۔ تم نے یہ کھر درالبادہ صرف اور صرف میرے لئے پہن رکھا ہے۔ محرومیوں، اپنے ساتھ کی گئی زیادتیوں کا بدلہ شامل خان سے یا بابا خان سے کیوں نہیں لیتے؟ تم نے ایک عورت کے ہاتھوں دُکھ سہے ہیں۔۔۔ تم بزدل ہو، محض اپنی۔۔۔۔۔۔“ وہ جنونی آواز میں چلا رہی تھی مگر اس کے بقیہ لفظ حلق ہی میں رہ گئے۔

”چٹاخ“ کی آواز کے ساتھ ہی اس کے نرم رخساروں پر سرخ نشان ابھر آیا تھا۔ ذولین کے تھپڑ نے اُسے گنگ کر دیا تھا۔

بڑی بڑی آنکھوں کی پتلیاں ساکن ہو گئیں۔ انگارہ ہوتے رخسار پر ہاتھ رکھ کر اس نے ذولین خان کو ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

”میں اپنی ذاتیات میں کسی کو مداخلت کا حق نہیں دے سکتا۔ میری زندگی میری ذاتی ہے۔ چاہے میں کسی طرح بھی بسر کروں۔“ اس نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا اور جیپ اسٹارٹ کر دی۔

”مگر میں کیا کروں کہ میرے حصے کی ساری روشنیاں تمہاری ہتھیلی میں اُتری ہیں۔ چاہو تو تم مٹھی کھول کر میرا دل منور کر دو۔ چاہو تو ظلمتوں میں دھکیل دو۔“

وہ سوچنے لگی اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس کی سسکیاں ذولین خان کے دل کی دیواروں سے ٹکرا کر اس کے لئے اذیت کا باعث بن رہی تھیں۔ مگر وہ چپ رہا۔ خود اس کے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ اس کا ذہن سخت منتشر ہو گیا تھا۔ وہ اس کی تسلی بخشی کرنے کو قطعی آمادہ نہ تھا۔

اس کی روح بے قرار تھی۔ اس کے دل میں عجیب جذبے مچل مچل اٹھتے تھے مگر ذہن ان جذبوں کی پذیرائی کے لئے تیار نہ تھا۔ دل و دماغ کے چکر میں گرفتار آدمی دو طرفہ ہوا کے درمیان نرم و نازک شاخ کی مانند ہوتا ہے جو کسی وقت بھی بادِ مخالف کے تیز جھونکوں سے ٹوٹ سکتی ہے۔ اور وہ کسی قیمت پر بھی ٹوٹنے کو تیار نہ تھا۔

اس نے جیب حویلی کی طرف جانے والی سیدھی سڑک پر ڈال کر ایک نظر اس کے آزدہ جمال پر ڈالی۔

”تم محبت کو کیا سمجھتی ہو؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ مگر وہ چپ رہی۔ احساسِ تذلیل سے اس کا رواں رواں سلگ رہا تھا۔ وہ اس سفاک انسان کی طرف اب دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

”یقیناً کوئی خوشنما پھول یاد مکتارنگ \_\_\_\_\_ جسے ہاتھ بڑھا کر مٹھی میں جکڑ لو گی۔ ہے نا؟ اگر یہی سوچ رہی ہو تو یہ سراسر بے وقوفی ہے۔ ہم جہاں کھڑے ہیں وہاں محبت وقت کے اس منہ زور وسیع سمندر میں ڈولتی پرانی ناؤ کی طرح ہے۔“

”نہیں ذولین خان! یہ سب خود کو بہلانا ہے۔ جو محبت کے لمس سے آشنا نہیں ہوتے نا، وہ اسے اتنی ہی خوفناک شے سمجھتے ہیں۔“ اس نے کرب سے سوچا مگر کہا کچھ نہیں۔

جیب حویلی کے بڑے سے پورچ میں رکی تو وہ چہرہ چادر سے رگڑ کر اس کی سمت دیکھے بغیر اترنے لگی۔

”اشٹارا!“ ذولین نے اُسے پکارا تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ”اب آئندہ اس طرح تنہا چھپ کر کہیں مت جانا۔ ضروری نہیں ہر بار تم حادثاتی موت کو شکست دے سکو۔“ اس کا لہجہ ناصحانہ تھا۔ اشٹارا نے لب بھینچ لئے۔

”کاش میں اس وقت موت کو شکست نہ دے سکی ہوتی۔ لمحہ لمحہ ہزیمت کے احساس کا شکار ہونے سے تو یہی بہتر ہوتا۔“ اس نے گلوگیر لہجے میں کہا اور نیچے اتر آئی۔

آزدہ چہرہ۔

بھگی بھگی پلکیں۔

اور لہجے کا اتنا بکھراؤ۔

ذولین خان کی پسلیوں میں دبا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

اس نے کلائی سے رومال کھینچ دیا۔ رومال کی سخت رگڑ سے خون دوبارہ بہنے لگا۔

”یہ کیا کر رہی ہو اشٹارا؟“ وہ جیب سے اتر آیا۔ اس کی آنکھوں میں خفگی سمٹ آئی۔

”میں ہمدردی سے نفرت کرتی ہوں۔“ اس نے اس کی برہمی کا قطعی نوٹس نہ لیا۔

ادھر عزت خان اشٹارا کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ پھر اچانک دوسری طرف پریشان کھڑے شاہ خانم اور بابا خان کی طرف دوڑا۔ مگر بابا خان اور شاہ خانم اسے دیکھ چکے تھے۔ وہ پورچ کی طرف بڑھے۔

”اشٹارا بیٹی!“ بابا خان کے بے قرار وجود میں جیسے ٹھنڈک سی اتر گئی۔

”بب \_\_\_\_\_ بابا خان!“ وہ بابا خان کو دیکھ کر دیوانہ وار ان کی طرف لپکی اور ان کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

زیبل اور خیزراں بھی اس طرف دوڑی آئی تھیں۔

”ایک گڑھے میں پھسل کر گر گئی تھی۔“ ذولین خان سب کو مختصر آبتار ہاتھ۔ ”پہاڑی کتے ان کے پیچھے بھاگے تھے۔“

”خدا کا شکر بچ گئی۔ زیادہ چوٹیں تو نہیں اٹھیں بیٹا؟“ بابا خان نے اس کے بالوں پر پیار بھرا بوسہ دے کر پوچھا۔  
’بہت چوٹیں آئی ہیں بابا خان! آپ تو کیا کوئی بھی اس کا مداوا نہیں کر سکے گا۔‘ وہ دل ہی دل میں کہہ کر رہ گئی۔  
”نہیں، بس بے ہوش ہو گئی تھی۔“ اس نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

شاہ خانم بھی قریب آگئی تھیں۔ انہوں نے ایک نظر ذولین خان پر ڈالی اور لب بھینچ لئے۔ ان کے اندر بسی نفرت کے انگارے پھر سے جلنے لگے۔ وہ ذولین کے ہمراہ آئی تھی۔ اتنا سفر بھی اسی کے ہمراہ طے کیا۔ انہیں بھلا کیسے گوارا ہوتا \_\_\_\_\_ وہ ویسے بھی اشارہ کا جھکاؤ ذولین کی طرف وقت کے ساتھ بڑھتا دیکھ کر پریشان ہو کر رہ گئی تھیں۔

”آؤ \_\_\_\_\_ اندر آجاؤ۔“ انہوں نے اشارہ کو سنبھالا۔ زیبل نے بھی دوڑ کر اشارہ کو تھام لیا۔

”آؤ ذولین! تم بھی اندر آؤ۔“ بابا خان نے اسے جانا دیکھا تو پکارے۔

”نہیں خان چچا! میں اب ذرا زمینوں کی طرف جاؤں گا۔ ویسے بھی خاصا وقت برباد ہو گیا ہے۔“

اس نے دانستہ یہ جملہ شاہ خانم کو جتانے کے لئے کہا اور بڑے بڑے ڈگ بھرتا جیپ کی طرف آگیا۔

...☆☆☆...

”اچھا تو جناب! آپ کو اپنی دھرتی کی یاد آگئی اچانک، یا کسی الہر دوشیزہ کی یادیں دل میں گھنگر و بجا رہی ہیں؟“

”اؤں، ہوں \_\_\_\_\_ احسن! کبھی تو سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ کر میرے پاس آیا کرو۔“ وہ اپنا سیاہ چمڑے کا بیگ بھر رہا تھا، پلٹ کر اس کی طرف تنبیہی نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولا۔

”کیوں \_\_\_\_\_ تم ایک سنجیدہ سب کے لئے کافی نہیں ہو، میں بلاوجہ لوگوں کی ویران زندگی کو مزید ویران کر دوں۔“ وہ ترکی بہ ترکی بولا۔

”سنو، تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ وہ گھوم کر بیڈ پر بالکل اس کے سامنے دراز ہو گیا۔

”تم نے کوئی سوال ہی کب پوچھا ہے \_\_\_\_\_ صرف بکو اس کی ہے۔“ اس نے بیگ کی زپ بند کر کے بیگ اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”پوچھ تو رہا ہوں \_\_\_\_\_ اپنی دادی یاد آ رہی ہے یا کوئی ٹیاری؟“

”بہت عرصہ ہو گیا ہے حویلی گئے ہوئے۔ سوچا ایک ہفتہ یہاں پڑے رہنے سے بہتر ہے وہاں گزار آؤں۔ بابا خان اور شاہ خانم بھی بہت کہتے ہیں۔“ اس نے احسن کے بے تکی سوال کا انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا تو احسن نے سر ہلا دیا۔

”ٹھیک ہے، ہمیں اُداس کر کے جا رہے ہو۔“

”تو تم بھی چلو نامیری وادی میں۔“ اس نے الماری کھول کر اپنا سیاہ کرتہ شلوار نکالتے ہوئے احسن کو دعوت دی۔

”ہاں یاد \_\_\_\_\_ ضرور آتا۔ مگر تین دن بعد میری فیانیسی کی سالگرہ ہے۔“

”خوب \_\_\_\_\_ اتنے جھگڑے کے بعد بھی تم اس کی سالگرہ میں شرکت کرو گے۔“ اشمل خان استہزائیہ ہنسا۔

”تم ایک محبت بھرا دل نہیں رکھتے اس لئے ہنس رہے ہو یاد! دل اپنی دسترس میں ہوتا تو اس کی صورت بھی نہ



دیکھتا۔ ویسے جانا بھی ضروری ہے۔ اگر نہیں گیا تو اس ”دردِ سر“ کو ایک اور بہانہ مل جائے گا شکوہ کرنے کا۔“ اس نے ہمیشہ کی طرح اپنی منگیتز کو دردِ سر کے خطاب سے نوازتے ہوئے کہا۔

”اچھا سنو!“ وہ بیڈ سے اتر آیا۔ ”وہاں سے جلدی واپس آجانا۔ یہ نہیں کہ وہیں چپک کر رہ جاؤ۔“

”ارے نہیں، وہاں زیادہ دن کیسے رہ سکتا ہوں۔۔۔۔۔ یہاں الیکشن سر پر ہیں۔ اچھا ہاں، سنو۔ جو نہی یونیورسٹی کے حالات معمول پر آتے دکھائی دیں، تم مجھے فوراً اطلاع کر دینا۔ اور ہاں، اپنی گاڑی کی چابی یہیں چھوڑ کر جاؤ۔“

”کیوں؟“ احسن نے بغور اسے دیکھا۔ ”تمہاری گاڑی کو کیا ہوا؟“

”وہ ورکشاپ میں پڑی ہے۔ شاید کل صبح تک مل جائے۔ اور مجھے اس وقت شاپنگ کرنی ہے۔“

”تو کیا میں بس میں لکھتا ہوا جاؤں گا؟“ وہ آنکھیں نکال کر بولا۔

”اوفوہ بھئی، میں تمہیں تمہارے گھر ڈراپ کر دوں گا۔ بلکہ اگر تم چاہو تو میں تمہیں تمہاری فیانیسی کے گھر بھی ڈال آؤں گا۔“ وہ پہلی بار پُر مزاح انداز میں کہتا ہوا با تھر روم میں جا گھسا اور احسن بند دروازے کو گھورتا رہ گیا۔ پھر ایک میگزین اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد اشمیل باتھ روم سے نمودار ہوا۔

”ویسے ریحان پر اچہ نے یہ ہنگامہ کر کے اپنے ہی حق میں برا کیا ہے۔ دیکھو نا، اب سراج کیانی کو سب نے فائرنگ کرتے دیکھا ہے۔“ اس نے تولیہ کرسی کی پشت پر پھیلا کر گزرے ہوئے واقعے پر تبصرہ کیا۔

”ہوں۔۔۔۔۔ مگر ہمارے جلسے کا بیڑہ غرق تو ہو گیا۔“ احسن میگزین پچھ کر کھڑا ہو گیا۔

”ہو سکتا ہے اس میں بھی کوئی جال ہو۔ شرپسند اسٹوڈنٹس تو ویسے بھی اس کی ہی طرف داری کر رہے ہیں۔ ویسے

ہشتمینہ ابرار نے اس کی تنظیم میں آکر ہمارا بیڑہ غرق ہی کیا ہے۔“

احسن کی بات پر اشمل خان کی نگاہوں میں بے ساختہ ہشتمینہ ابراہیم کا سرخ سرخ چہرہ اور غصے میں بھری آنکھیں اہرا گئیں۔ اس کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”تم ایک لڑکی سے ڈر گئے۔۔۔ جبکہ میرے خیال میں وہ ہمارے لئے قطعی بے ضرر ہے۔“ اس نے بالوں پر برش پھیرتے ہوئے کہا۔

”واہ \_\_\_\_\_ خوب \_\_\_\_\_ ہشمنہ ابرار اور بے ضرر۔ بڑی جلدی ترقی کر رہے ہو۔“ احسن نے معنی خیز تبسم سے اشمیل کو گھورا۔ مگر اشمیل قطعاً نہ سمجھ سکا۔ قدِ آدمِ آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے پلٹ کر احسن کو دیکھا۔

”کس قسم کی ترقی؟“

[illegible]

”تمہاری تان ہمیشہ اسی طرح کی باتوں پر ٹوٹتی ہے۔“ اشمیل کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

احسن نے جو نتیجہ نکالا تھا اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اُسے احسن کی عقل پر ماتم کرنے کو دل چاہا۔

”کبھی تو انسانیت کے لہادے میں رہ کر گفتگو کر لیا کرو۔“ اس نے آئینہ کی طرف دیکھا اور برش بالوں میں پھیر کر ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھ دیا اور میز پر پڑی چابی اٹھالی جو کہ احسن کی گاڑی کی تھی۔

”تو میں کیا حیوانیت کے لبادے میں آتا ہوں تمہارے پاس؟“ احسن نے منہ بنایا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”ویسے یاد! تم واقعی اس لطیف احساس سے خالی ہو جسے محبت کہتے ہیں۔“

”میرے خیال میں تمہارے اندر یہ احساسات کچھ زیادہ ہی مقدار میں جمع ہو گئے ہیں۔ بہر کیف، میرے لئے یہ



موضوع نہایت فضول سا ہے۔ سو میں تو چلا۔“ وہ اپنا پرس اٹھا کر دروازے سے باہر نکل گیا۔

”موضوع فضول ہوگا۔ مگر میں تو فضول نہیں ہوں جو مجھے اس طرح بے آسرا چھوڑے جا رہے ہو۔“ احسن جلدی سے اس کے پیچھے لپکا۔

”تو پھر نہایت شرافت سے میرے ساتھ چلو۔“ اس نے پلٹ کر احسن کی جانب دیکھا جو جلی کٹی نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ اس کے اس انداز پر اشمل خان کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

احسن کو اس کے گھر پر ڈراپ کر کے وہ خود مارکیٹ چلا آیا۔ وہ وادی جانے سے پہلے سب کے لئے کچھ تحائف لے کر جانا چاہتا تھا۔ پورے تین ماہ کے بعد وہ حویلی جا رہا تھا۔ اس کا دل اندر سے بے حد سرشاری محسوس کر رہا تھا۔

”شاہ خانم، بابا خان، اشارا\_\_\_\_ فرد آفر دآسب کے چہرے اس کی نگاہوں تلے آکر مسکرائے جا رہے تھے۔

ذولین خان\_\_\_\_ اس کا دوست\_\_\_\_ اس کا عمرا\_\_\_\_ اس کا بچپن کا ساتھی۔ اس کے عنابی لب بے اختیار ذولین خان کی محبت میں مسکرا اٹھے۔

”کتنا مشکل شخص ہے ذولین\_\_\_\_ مگر نہ جانے کیوں شاہ خانم اس سے کبیدہ خاطر رہتی ہیں۔“

وہ گاڑی کو شاپنگ سنٹر کے سامنے پارک کر کے نیچے اتر آیا اور پُر رونق سڑک کے کنارے بنی روش پر دھیرے دھیرے چلنے لگا۔ اس کے دائیں طرف بہت سی دکانیں تھیں جو طرح طرح کی چیزوں سے سجی ہوئی تھیں۔ روئیں دار کوٹ، بالوں والے ملائم جوتے، خوش نما قالین، لیڈیز بوتیک\_\_\_\_ وہ ہر دکان پر گہری نظر ڈال کر سوچنے لگا۔ اُسے بہت سی چیزیں خریدنی تھیں۔ سب سے پہلے اسے کیا لینا چاہئے۔ شاہ خانم کے لئے خوبصورت شالیں، بابا خان کے لئے عمدہ سوٹ کا تحفہ اور اشارا کے لئے ڈھیروں چیزیں\_\_\_\_ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اشارا اُسے بے حد عزیز تھی۔

وہ ابھی خریداری سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ معاً ایک بڑی سی دکان کے پاس ایک مانوس چہرہ نظر آیا۔ اسے پہچاننے میں قطعی دشواری نہ ہوئی۔ وہ اشناس تھا۔ اشناس نے بھی اُسے دیکھ لیا تھا۔ تیزی سے اس کی طرف لپکا اور دوسرے ہی لمحے دونوں بغل گیر ہو گئے۔

”واہ یار! ابھی اسی شہر میں ہو اور مجھے بتایا نہیں۔“ اس نے شکوہ کیا تو اشمل خان مسکرایا۔

”بس اب آخری سال ہے\_\_\_\_ ویسے کل وادی جا رہا ہوں ایک ہفتے کے لئے۔ تم سناؤ، سب ٹھیک ٹھاک ہیں؟“

”جی\_\_\_\_ سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔ چلو میرے ساتھ گھر۔ وہاں خوب باتیں ہوں گی۔“ اشناس نے اسے سوچنے کی مہلت نہ دی اور اسے تھامے کارپارکنگ سائیڈ پر لے آیا۔

”ارے نہیں اشناس! پھر کبھی سہی۔“

”کیوں\_\_\_\_ آج کیوں نہیں؟\_\_\_\_ میں جانتا ہوں تمہاری یہ پھر کبھی آئے گی ہی نہیں۔“ اشناس نے اس کا جملہ کاٹ دیا۔

”بھی اس دن خفا ہوئے تھے مجھ پر کہ تمہیں جب اشمل ملا تھا تو اُسے گھر کیوں نہیں لائے؟ آج ان کی ناراضگی ختم کر دوں گا۔“ اُس کا لہجہ حتمی تھا۔

اشمل خان نے زیادہ تامل نہ کیا۔ ویسے بھی اشناس سے اس کی خاصی فرینڈ شپ تھی۔ وہ اس کی گل بی بی کی نند کا بیٹا تھا۔ اس مضبوط رشتے داری نے اُسے زیادہ سوچ بچار کرنے پر مجبور نہ کیا۔

بہت عرصے بعد وہ ابرار احمد کے خوبصورت بنگلے میں آیا تھا وہ بہت خوش ہوئے تھے اور ڈھیر سارے لوازمات امی نے ان کے سامنے میز پر سجادیئے تو وہ شرمندہ سا ہو گیا۔

”ان سارے تگلات کی کیا ضرورت تھی آنٹی؟“ اس نے امی کے شفیق چہرے کی طرف دیکھ کر شکایتی لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دیں۔

”اشناس کی بیوی کو بہت شوق ہے مہمانوں کو اپنے ہاتھ کی بنی چیزیں کھلانے کا۔ خوش ہوتی ہے وہ۔“ انہوں نے کہا تو اشناس بے ساختہ ہنس پڑا۔

”کم کم کھانا \_\_\_\_\_ بعد میں کچھ ہو جائے تو اس کے ہم ذمے دار نہیں ہوں گے۔“ اس نے اشمیل کو دیکھ کر کہا۔

”اچھا، تو وہ اپنے تجربات مہمانوں پر آزماتی ہیں۔“ اشمیل نے بھی پُر مزاح انداز میں کہا۔

”اور سناؤ، وادی میں سب خیر خیریت ہے؟ پچھلے ماہ بڑی زوروں کی برف باری ہوئی تھی۔“ اشناس نے سنجیدہ گفتگو کا آغاز کیا۔

”مجھ سے زیادہ تو وہاں کی تمہیں خبر رہتی ہوگی \_\_\_\_\_ پھوپھا جان آتے رہتے ہیں نا یہاں۔“

”ہاں، ہاں \_\_\_\_\_“ ابرار احمد نے سر ہلایا۔ وہ بتا رہے تھے، شاندا نہ کی منگنی کر دی ہے۔“

”اچھا \_\_\_\_\_“ اشمیل خان کے لئے یہ نئی خبر تھی۔ تو آخر پھوپھا جان راضی ہو گئے۔ کسی ایک رشتے پر اسے واقعی دلی مسرت ہوئی۔ اُسے تو شاندا نہ اور حور مینا کو دیکھے بھی ایک سال ہو گیا تھا۔ شاہ خانم جانے کیوں ان رشتوں کی جڑوں کو مضبوط کرنے کی بجائے انہیں اکھاڑ دینے کے درپے تھیں۔ پرانی رنجشوں کو وہ وقت کے ساتھ ساتھ اور بھی مضبوط کر رہی تھیں۔ نفرت، حسد اور ناچاقی جیسے جذبات کو دل میں جگہ نہیں دینی چاہئے۔ انہیں تو کسی پانی کے بلبلے کی طرح ہونا چاہئے۔ بنا اور بکھر گیا۔ یا جیسے گہرے بادل گرے، برسے اور پھر مطلع صاف۔

مگر یہ اس کی سوچ تھی۔ اور وہ اپنی سوچ، اپنے خیالات شاہ خانم پر حاوی نہیں کر سکتا تھا۔

”تمہیں نہیں خبر اس کی؟“ امی نے اسے اس خبر پر حیران اور خوش ہوتا دیکھ کر پوچھا۔

”نہیں \_\_\_\_\_ میں تین ماہ سے وادی گیا ہی نہیں۔ اور پھر فون پر بھی کوئی ایسی بات نہیں بتائی ہے شاہ خانم نے۔ خیر اب جانوں گا تو گل بی بی سے خود ملوں گا۔“

”آپ اپنی گاڑی کی چابی تو دیں پلیز۔“ اس کھنکھاتی مانوس آواز پر وہ بری طرح چونکا۔ اس کی مضبوط ہتھیلی میں جمی چائے کی پیالی میں ہلکا سا ارتعاش ہوا۔

”بالکل نہیں، اسے چابی مت دیجئے گا۔ یہ آپ کی گاڑی کا بھی حشر نشر کر آئے گی۔“ اشناس اس کی حیرانگی سے بے خبر کہہ رہا تھا۔ مگر ہشمنہ نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی تھی۔ اچانک اس کی نظر اشمیل خان پر پڑی۔ اس کے قدم اپنی جگہ ایسے جم گئے تھے جیسے اب کبھی بھی ہل نہیں پائیں گے۔ مخالف پارٹی کالیڈر ”اشمل خان خل زئی“ اس کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔

دونوں عالمِ تحریر میں گھر کر رہ گئے۔ اس چہار دیواری میں ایک دوسرے کی موجودگی دونوں کے لئے استعجاب کا باعث تھی \_\_\_\_\_ اشمیل خان نے پہلی بار اسے گہرے کامنی سرسراتے ریشمی لباس اور بکھری ہوئی ابریشمی زلفوں اور بے تحاشا جگمگانی آنکھوں میں سچی کا جل کی لکیر کو دیکھا تھا۔ وہ عام دنوں سے زیادہ حسین اور منفرد لگ رہی تھی اور وہ کسی حسین تراشیدہ محسمے کی طرح ایک جگہ نصب تھی۔

”تمہاری گاڑی کو کیا ہوا ہے؟“ ابی اس سے پوچھ رہے تھے۔ وہ یوں چونکی جیسے اس بیوی کو سوسال نیند لینے کے بعد اچانک ایک شہزادے نے جگادیا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے سارے حواس مجتمع کئے۔

”وہ \_\_\_\_\_ مہم \_\_\_\_\_ میری گاڑی پول سے ٹکرائی۔“ اس نے نگاہیں کی طرف اٹھا کر صاف گوئی سے کہہ دیا۔ ”اس کا بریک خراب ہو گیا تھا ابی!“ اس نے یہ کہتے ہوئے ایک باردزدیدہ نگاہوں سے اشمیل خان کی طرف

دیکھا۔ مگر اب وہاں ایک گہری بے نیازی سمٹ آئی تھی۔

وہ سبیلی، بھوری آنکھیں کسی جھیل کی مانند پُرسکون ہو گئی تھیں۔ اس کے وجہ چہرے پر چند لمحے پہلے در آنے والا تحیر کا شائبہ تک نہ تھا۔

بہت کمال حاصل تھا اسے اپنے تمام تر جذبات پر۔ مگر اس کے ذہن کی سُئی بری طرح اٹک گئی تھی کہ اشمیل خان کی اس کے ڈرائنگ روم تک رسائی کس سلسلے یا کس رشتے کی کڑی ہے۔

”اوہ سوری \_\_\_\_\_ ابی اچانک چونکے۔“ اشمیل! یہ ہشمنہ ہے، میری بیٹی۔ اس نے بھی یونیورسٹی جوائن کی ہے۔“ انہیں اشمیل کی موجودگی کا احساس ہوا تو تعارف کرنا مناسب سمجھا۔

”جی \_\_\_\_\_“ اشمیل خان نے رسمی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر ایک انجان نگاہ اس پر ڈالی۔

”اور ہشمنہ بیٹی! یہ اشمیل ہے، تمہاری ممانی کا بھتیجا یعنی شاہ خانم کا بیٹا۔“

”دھڑ۔۔۔۔۔۔ دھڑ۔۔۔۔۔۔ دھڑ۔۔۔۔۔۔“

ہشمنہ کے حواس پر ایک بار پھر بجلی سی لپک گئی۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر ایک بار پھر اشمیل خان کو یوں دیکھنے لگی جیسے وہ کوئی عجوبہ رہا ہو۔ اس نے گل بی بی کے پاس شاہ خانم کی تصویر دیکھی تھی۔

ایسی ہی شفاف آنکھیں تھیں۔

ایسی ہی مغرور کھڑی ناک۔

”اچھا \_\_\_\_\_ یہ لو چابی۔ اور دیکھو بیٹا! دھیان سے چلانا۔“ ابی نے جیب سے چابی نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے تاکید کی۔

اس نے جلدی سے چابی اچک لی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”ہاں \_\_\_\_\_ سیاست میں وہی لوگ کامیاب ہو سکتے ہیں جو اچھی سیاست کرنا جانتے ہیں۔ محض لفاظی یا منفی سوچ اپنا کر کامیابی حاصل نہیں کی جاسکتی۔“ اشمیل خان کے لفظ اس کی سماعت سے ٹکرائے۔ وہ شناس کے کسی سوال کے جواب میں کہہ رہا تھا۔ اب ان کے درمیان موضوع سیاست تھا۔

”اب تو لڑکیاں بھی محض تفریحاً سیاست میں داخل ہو رہی ہیں۔“ اُس کے جملے در پردہ اس کو سننے کے لئے تھے۔

ایک دکھتا انگارہ اُسے جیسے چھو گیا۔ وہ تڑپ اٹھی۔ اس کا دل چاہا وہ پلٹ کر کوئی سخت بات اُسے سنائے۔ مگر اپنی پوزیشن کا خیال کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔

ہمیشہ کی طرح اشمیل خان نے یہاں بھی ایک بے ساختہ طنز کیا تھا۔ اس کی ذات پر وہ سلگتی باہر آئی تو بھابی کچن کے دروازے کے پاس کھڑی تھیں۔ اسے دیکھا تو جلدی سے بولیں۔

”اے، جانتی ہو کون آیا ہے؟ \_\_\_\_\_ شاہ خانم کا بیٹا، اشمیل خان۔“

”جانتی ہوں \_\_\_\_\_“ اس نے کندھے اچکائے اور فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر گلاس میں انڈیلنے لگی۔ اس لمحے اس کے کھولتے ذہن کے لئے ٹھنڈے پانی کی اشد ضرورت تھی۔

”تم جانتی ہو؟“ بھابی متعجب ہو گئیں۔

”یہ وہی اشمیل خان ہے جو مخالف پارٹی کا لیڈر ہے۔“ غماغٹ گلاس خالی کر کے اس نے بھابی کی سماعت پر نئے انکشاف کا دھماکا کیا۔

”اِس \_\_\_\_\_“ بھابی اپنی جگہ سے اچھلیں اور اس تک پہنچیں۔ ”کک \_\_\_\_\_ کیا وہی اشمیل \_\_\_\_\_ اوہ گاڈ!“



”بہت کرتی تھیں نا اُس کی حمایت آپ۔“ اس نے بھویں اچکا کر بھابی کو دیکھا۔ ”وہی ہے شاہ خانم کالا ڈلا سپوت۔“

”نہیں۔۔۔ یہ بہت مختلف ہے شاہ خانم سے۔ ممانی جان اس کی بہت تعریفیں کرتی تھیں۔“ بھابی نے جلدی سے اس کے خیال کی نفی کی۔ ”ویسے تم کیا پہلے ہی سے جانتی تھیں کہ یہ شاہ خانم کا بیٹا شامل خان ہی ہے؟“ بھابی ابھی تک حیران تھیں۔ ان کی حیران آنکھیں ہشمنہ کے چہرے پر ٹکی تھیں۔

”نہیں۔۔۔ یہ دونوں انکشافات مجھے خود آج ہی ہوئے۔“ بہر کیف اس نے اپنے اوپر سے حیرانگی کے تمام در بند رکھے۔ اطمینان سے شانے اچکائے اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

”اس شخص نے ہر بار مجھ پر بے جا طنز کیا ہے۔۔۔ ہماری تنظیم پر کیچڑ اُچھالا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ یہ الیکشن میں بری طرح شکست کھائے تاکہ ساری اکڑ دھری کی دھری رہ جائے۔“ اس کا غصہ ہنوز قائم تھا اور لہجہ خاصا تیز اور درشتی لئے ہوئے تھا۔

”بھابی ہمیشہ کی طرح اس کی جھنجلاہٹ پر ہنس پڑیں۔

”ویسے تمہارے ریحان پر اچہ سے تو اچھا ہی ہے۔“

”صورتا گہرہ رہی ہیں نا آپ؟“ اس کی نگاہیں شکایتاً بھابی کی سمت اٹھیں۔

”ہر لحاظ سے۔“ بھابی کو اسے چھیڑنے میں لطف آ رہا تھا۔ ”دیکھو نا، شریف لڑکا ہے۔ پھر پہاڑی نوجوان جس کے عزائم بھی پہاڑ جیسے ہیں۔ اس کا کردار توصاف و شفاف ہی رہا ہے۔۔۔ پھر ریحان پر اچہ تو لوگوں کی نگاہوں میں کئی عرصے تک مشکوک رہا ہے۔“

بھابی کی اس بات پر اُسے دن ہوٹل والا منظر یاد آ گیا۔ ریحان پر اچہ کا وہ مذاق۔ مگر اس نے جلدی سے سر جھٹک

دیا۔۔۔ وہ بھابی کی کسی بات پر قائل ہونا نہیں چاہتی تھی۔

”ہو سکتا ہے ریحان پر اچہ کی وہ حرکت محض مذاق ہی ہو۔۔۔ اس نے مجھ سے معذرت کر لی تھی۔ ہمیشہ نے خود ہی تاویل پیش کی۔

”آپ کو بھلا شامل خان کے کردار کی پارسائی سے کیسے آگاہی حاصل ہو گئی؟ دُور کے ڈھول سہانے ہی لگتے ہیں۔“ وہ نا خوشگوار لہجے میں بولی۔ بھابی ہمیشہ اس کا غصہ بڑھا دیا کرتی تھیں۔ اس کا سرخ ہوتا چہرہ اور گہری گہری سیاہ آنکھوں میں ہلکورے لیتی جھنجلاہٹ انہیں لطف اندوز کرتی تھی۔ وہ پھر خوب ہنستی تھیں۔

آج بھی وہ اس کے غصے کو ہوا دے رہی تھیں۔

وہ گلاس رکھ کر پلیٹی تو ٹھٹک گئی۔ شامل خان اپنے شاندار سراپا کے ساتھ بالکل سامنے ہی کھڑا تھا۔ ڈرائنگ روم میں فون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔ جب کہ شناس، شامل خان کو ”ایک منٹ“ کا کہہ کر اپنے کمرے کی طرف گیا تھا اور وہ نہ جانے کب سے یہاں آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ بھابی تو جھٹ سے کچن میں ہی گھس گئی تھیں۔

”بہت خوبصورت خیالات ہیں میرے بارے میں آپ کے۔“ اس کا لہجہ بڑا چبھتا ہوا تھا۔ ”ایک مخالف پارٹی کی سیکرٹری کو ایسے ہی خیالات رکھنے چاہئیں۔ یہی تو سیاست کا پہلا اصول ہے۔“ وہ استہزائیہ ہنسلا۔

وہ شاید اس بے ساختہ جملے کے لئے قطعاً تیار نہ تھی، بوکھلا کر رہ گئی۔

وہ بھوری بھوری آنکھیں اندر باہر کے اُجالوں سے سرشار اُسی پر مرکوز تھیں۔

”میں قدر کرتا ہوں آپ کے ان تمام جذبوں کی۔“ وہ بدستور طنز کے تیر چلا رہا تھا۔

”مسٹر شامل خان! آپ یہاں ہمارے مہمان بن کر آئے ہیں۔ ورنہ آپ کے ہر سوال کا میرے پاس بہت سخت جواب



”ہے۔“

”اوہ \_\_\_\_\_ مگر میں نے تو قطعاً کوئی سوال نہیں کیا آپ سے۔“ اس نے بے حد شائستہ لب و لہجے کے ساتھ اس کی سماعت پر تیر پیوست کر دیا۔ ”بہر کیف \_\_\_\_\_“ اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ میرے پھوپھا جان کی لاڈلی بھانجی ہیں۔ کچھ تعلق تو ہے اس وادی سے آپ کا۔“

وہ مبہم مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو اس کا دل جل کر خاکستر ہو گیا۔ اس کا دل چاہا کہ طنز کے تیر برساتے انسان کا خوبصورت چہرہ بگاڑ کر رکھ دے۔ ہر بار وہ اس کے سامنے اسی انداز میں آکر اس کے وجود میں انگارے بھر دیتا تھا۔ اس شخص کو اپنی بے تحاشا جاہت پر گھمنڈ تھا۔

یاڈھیر ساری ذہانت پر۔

یا پھر یہ انداز اس کے مزاج کا خاصہ تھا۔

آج تک اس کے جملوں پر کوئی سخت جوابی حملہ نہیں کر سکی تھی۔ شاید اس لئے کہ اس کے تمام پہلو ہمیشہ کمزور رہے تھے۔

اور آج بھی وہ اس پر ڈھیر سارے نشتر برسایا اور وہ جارحانہ رویہ اختیار نہ کر سکی تھی کہ وہ اس کے گھر میں مہمان بن کر آیا تھا اور اس کی کوئی بھی جذباتی حرکت شناس بھائی یا بی کی نگاہوں میں آکر خود اس کے لئے خفگی کا باعث بنتی۔

سو وہ لب بھیج کر رہ گئی۔ غصے کے بڑے بڑے گھونٹ حلق سے اتار گئی۔

”ہشتمینہ ابراہیم! میری شکست کے لئے دعائیں کرنے سے بہتر ہے اپنی فح کی دعائیں مانگیں۔ اچھا اوکے \_\_\_\_\_ میرے خیال سے اگلے مہینے یونیورسٹی میں ضرور ملاقات ہوگی۔“ اس کا لہجہ بے حد سادہ تھا۔ ”خدا حافظ!“

ہشتمینہ نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا مگر پھر جلدی سے پلکوں کی دراز باڑھ جھکالی۔ نہ جانے کیوں وہ اس شفاف چہرے پر چمکتی آنکھوں سے نگاہیں نہ ملا سکی۔

وہ سامنے بڑے دروازے سے باہر نکل گیا۔ مگر ایک عجیب سی سبج سبج روشنیاں اس کے چاروں طرف چھوڑ گیا۔ زردی مائل سیاہ آنکھوں کے نامانوس سے دھندلے پھلتے گئے تو ہشتمینہ نے سر جھٹک دیا۔

”ہوں \_\_\_\_\_ بد تمیز انسان۔“ اس نے منہ پھیر کر کچن کی طرف دیکھا۔ بھابی اپنی بے تحاشا مسکراہٹ روکے ہوئے تھیں۔ اس سے نگاہیں ملیں تو کھل کھلا کے ہنس پڑیں۔

”بات مت کیجئے گا آپ بھی مجھ سے۔“ وہ ایک جلتی نگاہ بھابی پر ڈال کر دھم دھم کرتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆☆...

کہ تو آج اپنے سائے تک سے لرزاں ہے

سیہ نفرت کی زنجیر گراں پہنے

زمانے بھر سے نالاں ہے

کبھی نیلے سمندر سے نہنگ اُٹھے

کبھی اودی گھٹائوں سے لہو برسا

یہ عالم ہے کہ آئینوں سے خوف آیا

اندھیرا سا اندھیرا ہے

اگر تو میری طرف دیکھے

مجھے پلکیں اٹھانے دے

تو شاید میری آنکھوں میں

وہ کرنیں تجھ کو مل جائیں

بھری دنیا میں تو جن کو گنوا بیٹھا

میرے ہاتھوں میں ہیں اور اقم گم گشتہ تمنا کے

تو یہ صبح فردا کے

کہ میں انسان کی پہلی وفا

پہلی محبت کی نشانی ہوں

وہ تالاب میں لگے فوارے سے نکتے مچلتے پانی پر نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔ کبھی کبھی جھک کر تالاب کے ٹھنڈے پانی میں ہاتھ ڈال کر تھوڑا سا پانی بھر کر اپنی سفید مرمیں کلائی پر سبز خم پر لگاتی۔ وہ زخم اب مند مل ہو گیا تھا مگر دل میں لگا وہ زخم اب بھی تازہ تھا۔

وہ نشتر جو ذولین خان نے لگایا تھا اس کی چبھن اب بھی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر نجانے کیوں، حزن اور نئے انوکھے دکھ کے ساتھ کبھی پچھتاوا اس کے دکھ کے ہمراہ نہیں آیا تھا۔

کرب اس کے اندر سمٹ آتا تھا مگر قدم پیچھے ہٹا لینے کا اس نے تصور ہی نہیں کیا۔ یا اپنے اتنے آگے بڑھ آنے پر کوئی ملال یا پچھتاوے نے اس کا پیچھا نہیں کیا تھا۔ شاید اس لئے کہ اس کا دل اس ظالم انسان کے لئے اب بھی اسی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اب بھی اس کے خوابوں اور اس کے تصورات پر اسی کا قبضہ تھا۔ لیکن وہ شخص پہلو تہی کر رہا تھا۔ وہ اسے پیچھے دھکیل رہا تھا اور وہ اسی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔

”اشٹارابی بی! اشٹارابی بی!“ نور اس کے پاس کھڑی اُسے پکار رہی تھی۔ اُس کے یوں سامنے آجانے پر اُس کے خیالات کا تسلسل چھنا کے سے ٹوٹ گیا۔ وہ عالم مدہوشی سے عالم ہوش میں واپس آگئی۔ اُسے یہ مداخلت ناگوار گزری۔

”کیا بات ہے نور اس؟ کیوں بے وقت پریشان کرتی ہو؟“ اس نے خفگی سے نور اس کو دیکھا۔

”جج۔۔۔۔۔۔ جی وہ آپ کا فون۔“ نور اس گھبرا گئی۔

”میرا فون؟“ وہ متعجب ہوئی۔ ”کس کا؟“ وہ تالاب کے کنارے کھڑی ہو گئی۔ ”چلو دیکھتی ہوں۔“ وہ خود سے ہی سوال کرتی، جواب دیتی آگے بڑھ گئی۔

”معاف کر دیں خان زادی! آپ کا فون نہ آتا تو میں آپ کو پریشان نہ کرتی۔“ نور اس کے پیچھے چلتے ہوئے بے چارگی سے بولی تو اشٹاراک گئی اور پلٹ کر نور اس کو دیکھتے ہوئے ہولے سے مسکرائی۔

”ارے نہیں نور اس! بس مجھے ایسے ہی ذرا غصہ آگیا۔ بھلا تمہارا اس میں کیا قصور؟“ اس نے نور اس کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھ دیا۔

وہ اندر آئی اور ریسیور اٹھا کر بولی۔

”ہیلو!“

”آخا، کیسی ہوتا رہا؟“ دوسری طرف فروان کی شگفتہ آواز آئی تو وہ لمحہ بھر کے لئے حیران رہ گئی۔

”اوہ \_\_\_\_\_ تم ہو۔“ اس نے ایک گہری سانس باہر نکالتے ہوئے کہا۔ اس کا خیال تھا شاید ماہم آپ نے اُسے پکارا ہو گا۔

”کیوں، یہ بندہ بشر آپ کو یاد نہیں کر سکتا؟“

”کیوں نہیں \_\_\_\_\_ مگر اس بے وقت یاد کرنے کا مقصد؟“ وہ سائیڈ پر رکھی سیٹ پر بیٹھ گئی اور اپنے اوپر چھائی بے کلی کو جھٹکتے ہوئے ہولے سے مسکرائی۔

”ارے ہم تو ہمہ وقت آپ کی یادوں میں ڈوبے رہتے ہیں۔“ اس نے خوابیدہ لہجے میں کہا تو اشتار اچونک سی گئی۔ یہ اندازِ سخن ہمیشہ صرف اسی کے لئے ہوتا تھا۔ یہ خیال اُسے کبھی آکر پریشان ضرور کرتا تھا۔

”ممائی جان، ماموں اور سب کیسے ہیں؟“ اس نے آہستگی سے پوچھا۔

”جناب! پورا اہل خانہ ٹھیک ٹھاک، بخیریت ہے \_\_\_\_\_ اب الگ الگ سب کی خیریت پوچھنے مت میٹھ جانا۔ تم اپنا حال سنائو۔“ وہ بے حد خود اعتمادی اور بذلہ سنجی سے بول رہا تھا۔

ریسیور تھا مے اشتار اکا ہاتھ نم ہو گیا۔ فروان سے ملے، اُسے دیکھے ایک سال کا عرصہ بیت گیا تھا۔ نہ جانے کیسا اور کتنا بڑا ہو گیا ہو گا۔ اتنا پُر اعتماد اور ایسا تیز و طرار۔

”فروان! تم مجھ سے ایک سال چھوٹے ہو، آپ کیوں نہیں کہتے مجھے؟“ اس نے کچھ سوچ کر کہا تو فروان کی بے ساختہ ہنسی ایئر پیس سے اُبھری۔

”کیوں \_\_\_\_\_ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔“

”واہ \_\_\_\_\_ کیا ٹھیک کہہ رہی ہو؟ صرف ایک سال بلکہ دس ماہ کے فرق پر میں تمہیں آپ جناب کہوں۔ پتہ ہے تارا! یہ آپ واپ فاصلوں کو بڑھاتے ہیں۔“

”جو عمر کا فاصلہ ہے وہ تو بہر حال رہے گا ہی \_\_\_\_\_“ اُس نے سہولت سے اُسے قائل کرنا چاہا۔

”خیر، میرے نزدیک یہ کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ تم نے مجھے دیکھا ہے، اب میں تم سے قد میں کتنا بڑا ہوں۔ جناب! پورے چھ فٹ کا۔ اور تم میرے سامنے بالکل چوہیا لگتی ہو۔“ وہ نہایت غیر سنجیدہ تھا اس موضوع پر۔

”اچھا کم از کم تارا ہی کہنا چھوڑ دو \_\_\_\_\_ مجھے سب اشتار کہتے ہیں، سو تم بھی۔“ وہ نہ جانے کیوں شعوری طور پر فروان کو یہ جتنا دینا چاہتی تھی کہ وہ بہر حال اس سے ایک سال بڑی ہے۔

”سب کہتے ہیں نا۔ اس لئے میں نہیں کہتا۔ میں منفرد اور الگ حیثیت چاہتا ہوں اپنی۔“

”فروان!“ اشتار اکا سارا وجود لرزا۔ اُس کا لہجہ یک بیک سنجیدہ ہو گیا۔ فروان کا اندازِ بیان اسے لمحہ لمحہ استعجاب میں دھکیل رہا تھا۔ ”تم میرے کزن ہو، میرے بھائی۔ بس یہی تمہاری حیثیت ہے۔ یہی تمہارا مقام ہے میرے لئے۔“

”ارے تم تو خفا ہو گئیں \_\_\_\_\_ میں تو مذاق کر رہا ہوں تارا!“ وہ زور سے ہنسا اور اس ہنسی میں اس نے ساری خفگی ختم کرنے کی سعی کی۔ ”یہ بتاؤ تم شہر کیوں نہیں آئی تھیں؟ ممی بیسا سب تمہیں یاد کرتے ہیں بہت۔“ اس نے یکسر موضوع بدل دیا۔

”فروان! تم بہت شریر ہو۔“ اس کا دل جو بیٹھا جا رہا تھا، اب ذرا معمول پر آ گیا۔

”ارے، ابھی کہاں ہم نے کوئی شرارت کی ہے۔ اچھا سنو، جھٹ پٹ پروگرام بناؤ شہر آنے کا۔“

”قطعی نہیں۔۔۔ اب تم لوگ آؤ۔ میں مہمان نوازی کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ بولی۔

”ارے میرا تودل چاہتا ہے ابھی اڑ کر اس حسین وادی کی حسین دوشیزہ کے پاس پہنچ جاؤں۔ مگر ہائے یہ امتحانات کی مصیبت۔“ وہ پھر پٹری سے اترنے لگا۔ مگر اشارانے کوئی مداخلت نہ کی۔ محض یہ انداز اس کی مزاح کی شرارت کا خاصہ سمجھ کر نظر انداز کر گئی۔

”کب ہو رہے ہیں تمہارے ایگزام۔۔۔ بی۔ کام پارٹ ون کا ایگزام دے رہے ہونا؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”ہاں، بالکل۔۔۔ اس کا مطلب ہے تم میرے بارے میں اتنی بے خبر نہیں ہو۔ تھینک یو۔“

”بکومت۔۔۔ چند دن پہلے سحر نے فون کیا تھا۔ وہی بتا رہی تھی۔ اس کے بھی تو ایگزام ہو رہے ہیں نا۔“ اس نے اس کی خوش فہمی بھک سے اڑادی۔

”تارا! میں نے تم سے بہت اہم باتیں کرنے کے لئے فون کیا تھا۔ مگر خیر۔۔۔“ وہ یک بیک سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ اس کی آواز میں عجیب سی کیفیت تھی۔

”ہوں۔۔۔ تو پھر کہو نا۔“ وہ متحسّس ہوئی۔

”مگر نہیں۔۔۔ آج نہیں۔“

”ایں۔۔۔ کیوں؟“ جب فون اسی لئے کیا ہے تو پھر آج کیوں نہیں؟ کیا بہت زیادہ اہم بات ہے؟“

”بہت زیادہ۔۔۔ دنیا کی ساری باتوں سے زیادہ اہم۔“

”اچھا۔۔۔“ وہ متعجب ہوئی۔ ”ایسی کیا بات ہے؟ کہو نا، میں ہمہ تن گوش ہوں۔“ اس نے اصرار کیا۔

”کہوں گا۔۔۔ مگر آج نہیں۔ پھر کسی ایسے ہی دن کی خوبصورت ساعت میں۔ ہو سکتا ہے مجھے کچھ کہنے کی

ضرورت ہی پیش نہ آئے۔“ وہ عجیب الجھے الجھے لہجے میں بات کر رہا تھا۔

اشارا کی سمجھ سے بالاتر تھا اس کا یہ انداز۔

”اچھا، اس وقت تو خدا حافظ۔۔۔ دعا کرنا میں کامیاب ہو جاؤں۔“

”کس میں؟“ اشارا نے ہنس کر ازراہ مذاق پوچھا۔

”ہر امتحان میں۔“ وہ بھی شگفتہ انداز میں ہنس پڑا اور وہ بھی ہنس پڑی۔ پھر اس کے فون رکھنے کے ساتھ ہی خود بھی ریسپور کریڈل پر ڈال دیا۔

وہ اس ساری گفتگو کے دوران فروان کو قطعی نہ سمجھ سکی۔ یہ ایک سال پہلے والا فروان تو قطعی نہیں لگتا تھا۔ عجیب اُلجھی اُلجھی اور معنی خیز گفتگو تھی اس کی۔۔۔ پل میں سنجیدگی، پل میں شرارت۔

وہ کتنا بدل گیا تھا۔۔۔ اس کے ہر انداز میں نیاپن محسوس ہو رہا تھا۔ آج وہ اس کے اس نئے انداز پر کچھ دیر سوچ میں غرق رہی اور پھر گہری سانس لے کر لائونج سے باہر آگئی۔

اچانک حویلی کے گہرے سناٹے میں زبیل کی سسکیوں بھری چیخیں اُبھریں اور وہ دہل کر رہ گئی۔

”ستم ہو گیا۔۔۔ ستم ہو گیا خان زادی! ستم ہو گیا۔۔۔ خدایا! ایسا تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ یہ کیا ظلم ہو گیا۔“

وہ بڑے گیٹ سے اندر آئی۔ پھر روش پر اسی طرح شور مچاتی ہوئی رہائشی حصے کی طرف آگئی۔

”بکھرے بال، متوحش چہرہ اور روتی پیٹتی، اس لہجے میں شاہ خانم کے آرام میں خلل پڑنے کی بھی پرواہ نہ تھی۔ وہ اشارا کی طرف دوڑتی ہوئی آئی اور پھر اس کے قدموں میں بیٹھ کر بھل بھل رونے لگی۔

”سب کچھ اُجڑ گیا خان زادی! سب کچھ ختم ہو گیا۔“ وہ اپنا سر پیٹنے لگی۔



اشتار ادم بخود کھڑی تھی۔ ایک انجانے خدشہ سے لرزی۔

”زے۔۔۔۔۔بل۔۔۔۔۔کک۔۔۔۔۔کیا اُڑ گیا۔“ اس کی آواز لرزنے لگی تھی۔

”سب کچھ خان زادی! سب کچھ۔“ وہ بدستور روتے ہوئے بولی۔

زئیل کی سسکیوں کے شور سے پوری حویلی گونج رہی تھی۔ شاہ خانم، خیزراں، نوراًں سب لائونج سے باہر راہداری میں جمع ہو گئیں۔

”زئیل!“ شاہ خانم دھاڑیں۔ ”یہ کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے؟“

مگر زئیل بدستور روتی رہی۔ اپنے آپ کو پیٹتی رہی۔ اُسے آج شاہ خانم کے غصہ کی پرواہ نہ تھی۔ اس کا سارا وجود دکھ سے چور چور ہو رہا تھا۔

”زئیل! خدا کے لئے بتاؤ، کیا بات ہو گئی ہے؟“ اشتار اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کے شانے جھنجھوڑنے لگی۔

”وہ۔۔۔۔۔وہ زرسا نگہ۔“ زئیل کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔ وہ مستقل رو رہی تھی۔ سارا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔

”کیا۔۔۔۔۔کیا ہوا زرسا نگہ کو؟“ آج تو اس کا نکاح ہونا تھا۔ اشتار اکا دل پہلو میں بری طرح دھڑکا۔ زئیل کے شانے پر دھرے ہاتھ لرز کر رہ گئے۔

”نواب داد نے۔۔۔۔۔زرسا نگہ کو۔۔۔۔۔گگ۔۔۔۔۔گولی ماری ہے۔“ اس نے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے یہ اندوہناک خبر سنائی۔

اشتار ایوں پیچھے ہٹی جیسے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔

”وہ مر گئی ہے خان زادی۔۔۔۔۔مر گئی ہے۔۔۔۔۔“ زئیل یہ کہہ کر فرش پر سرٹکا کر تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔

یہ خبر سن کر شاہ خانم بھی چند ثانیے کے لئے سناٹے کا شکار ہو گئیں۔ خیزراں اور نوراًں کے چہرے بھی خوف سے زرد پڑ گئے۔

”یہ جھوٹ ہے زئیل! کہہ دے یہ جھوٹ ہے، یہ جھوٹ ہے۔“ اشتار اچانک ہذیبانی انداز میں چلائی اور زئیل کا بازو جھنجھوڑنے لگی۔

”نہیں۔۔۔۔۔یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔زرسا نگہ کیسے مر سکتی ہے؟“ غم کے اس بوجھ سے اشتار اکا دل پھٹنے لگا۔ ”میری زری نہیں مر سکتی۔۔۔۔۔یہ جھوٹ ہے۔“ وہ پاگلوں کی طرح چلائے لگی!

”نہیں، نہیں۔۔۔۔۔میری زری نہیں مر سکتی۔۔۔۔۔وہ زندہ ہے۔۔۔۔۔وہ نہیں مر سکتی۔“

شاہ خانم نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا اور جھنجھوڑنے لگیں۔

”اشتار! پاگل مت بنو۔۔۔۔۔ہوش میں آؤ۔“

”شش۔۔۔۔۔شاہ۔۔۔۔۔خانم! زرسا نگہ مر گئی۔۔۔۔۔اُسے نواب داد نے گولی ماری۔“ وہ جھلملاتی آنکھوں سے شاہ خانم کو دیکھنے لگی۔

”ہاں، مجھے پتہ ہے۔۔۔۔۔اس کی موت یونہی لکھی تھی۔ اب تم یا ہم کچھ کر تو نہیں سکتے۔“ ان کا لہجہ ترش ہو گیا تھا۔ وہ شاک جو انہیں کچھ دیر پہلے لگا تھا اب زائل ہو چکا تھا۔



”تم اسے صرف ایک بوجھ سمجھتے تھے نا؟ \_\_\_ اس کی کسی خواہش کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے زبردستی پھینک دینے پر مصر تھے۔ دیکھو \_\_\_ دیکھو، اب یہ بوجھ خود تمہارے کندھوں سے اتر گیا۔“

”خان۔۔۔۔۔ زادی۔۔۔۔۔“ مقبول شاہ تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا سرد چہرہ لال ہو گیا۔ اس کے نتھنے پھٹ پھٹانے لگے۔ لب کانپنے لگے۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو تم خان زادی۔۔۔؟“ اس کی بھاری آواز لڑکھٹا گئی۔ لمبا چوڑا مقبول شاہ سوکھے پتے کی طرح کانپنے لگا۔

دوسرے ہی لمحے زر سانگہ پر جھک گیا اور اس کی پیشانی پر اپنے جلتے ہوئے ہونٹ رکھ دیئے۔

”اس پاگل لڑکی کے نصیب میں ایسی ہی موت تھی۔“ نواب داد بھی اپنی جگہ درست ہے۔ کوئی مرد یہ نہیں چاہے گا کہ اس کی منکوحہ کے دل میں کسی اور مرد کا بسیرا ہو۔“

اس نے اپنی نم نم، سرخ آنکھیں اوپر اٹھا کر اشارہ کو دیکھا۔ اس کا بوڑھا جھریوں زدہ چہرہ آہستہ آہستہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔

”نواب داد نے مجھے رقعہ بھی بھیجا تھا۔ اس میں سب کچھ لکھ دیا تھا۔ مجھے تو دکھ اسی بات کا ہے کہ میں اس بیٹی کا باپ ہوں جس نے اس عمر میں میرے کندھے جھکا دیئے۔ مر کے بھی رسوائی میرے کندھوں پر ڈال دی ہے۔ مجھے اگر پہلے خبر ہوتی تو میں خود اسے گولی مار دیتا۔“

مقبول شاہ کی آواز شدتِ ضبط سے لرز رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے زر سانگہ کے چہرے پر چادر ڈال دی اور لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

زیبل اشتراکوز بردستی حویلی لے کر آئی تھی۔ اس کی حالت بے حد خراب تھی۔

”اتنا نرم دل رکھتی ہو اشترا!\_\_\_ ہر ایک کے غموں پر اپنا دل زخمی کر ڈالتی ہو۔“ شاہ خانم نے لب بھینچ لئے۔ وہ کرسی پر بیٹھی تھی اور اس کے سامنے جہازی سائز پلنگ پر اشترا غفلت کی حالت میں پڑی تھی۔ انہوں نے بابا خان کے کہنے پر اسے خواب آور گولیاں پانی میں گھول کر پلا دی تھیں تاکہ طویل نیند اس کے اعصابی تناؤ کو ختم کر دے۔

”کیوں رکھتی ہو اتنا گداز دل کہ ہر لمحہ دکھ تمہارے وجود کو روندتے رہیں۔ بے وقوف لڑکی! ان بے توقیر لوگوں کے معمولی معمولی دکھوں پر خود کو منڈھال کر ڈالتی ہو۔“

اشٹار کی اس حالت پر انہیں بے حد رنج ہو رہا تھا۔ وہ اشٹار کو اس روپ میں دیکھنے کی قطعی خواہاں نہیں تھیں۔ اُسے تو وہ مکمل طور پر اپنے جیسا دیکھنا چاہتی تھیں۔ اپنی تکمیل کے اس رنگ کو وہ ”شعلہ وقت“ دیکھنا چاہتی تھیں۔ یہ نرم، لچک دار شاخ کی مانند کیونکر بن گئی کہ ہر بے حقیقت جھوٹکا اسے اپنی مرضی سے جھکا کر گزر جاتا ہے۔

”تم نے مجھے مایوس کر دیا اشترا!“ انہوں نے ایک گہری اور طویل سانس سینے سے خارج کی اور کرسی سے کھڑی ہو گئیں اور بے آواز قدموں سے چلتی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

ساری رات اشارا تقریباً نیم غنودگی میں رہی۔ دوسری صبح اس کا وجود نڈھال ہو رہا تھا۔ بڑی بڑی سنہری آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے۔ گلاب رخسار ماند ہو گئے تھے۔

”کیسی طبیعت ہے؟“ شاہ خانم اس کے اوپر جھکیں اس سے پوچھ رہی تھیں۔ اس نے اپنی بو جھل پلکیں اوپر اٹھا کر بس ایک نظر شاہ خانم کو دیکھا پھر پلکیں جھکا دیں۔

”میں چاہتی ہوں تم کچھ دن کے لئے شہر اپنے ماموں کے گھر چلی جاؤ۔ تمہارا دل بھی بہل جائے گا۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”ماموں کے گھر ہی کیوں؟“ اس نے آہستگی سے پوچھا۔ ”اگر آپ کا خیال ہے کہ اس حویلی سے باہر نکل کر میرا دل بہل جائے گا تو پھر گل بی بی بھی تو ہیں۔“ وہ جانے کیوں کہہ گئی۔

شاہ خانم کے چہرے پر تناؤ سا گیا۔

”اشٹارا!“ انہوں نے تنبیہی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”کیوں دانستہ ایسی باتیں کر کے میرے غصے کو ہوا دیتی ہو؟ یہ جانتے ہوئے ہوئے بھی کہہ لیں۔“ انہوں نے اپنے سرخ لب بھینچ لئے۔

”یہی تو جاننے سے قاصر ہوں کہ گل بی بی سے اتنی شدید نفرت کیوں ہے آپ کو۔“ کیا بگاڑا ہے انہوں نے آپ کا؟“ احتجاج کی کئی سرد لہریں اس کے اندر سے اٹھیں مگر لبوں پر آنے سے پہلے ہی دم توڑ گئیں۔ وہ ہمیشہ کی طرح کچھ نہ بول پائی۔ بس اتنا کہہ سکی۔

”نہیں، میں ماموں کے گھر ابھی نہیں جانا چاہتی۔“

”ٹھیک ہے۔“ جیسی تمہاری مرضی۔“ اس کا یہ جواب شاہ خانم کو ناراض کر گیا۔ اسی لمحے خیزراں اندر آئی۔

”شاہ خانم جی۔“ وہ اشمل خان آئے ہیں۔“

”کیا۔“ اشمل آیا ہے؟“ شاہ خانم پہلے حیران ہوئیں پھر خوشی سے کرسی سے کھڑی ہو گئیں اور تیزی سے دروازے کی طرف لپکیں۔ اشٹارا کا حیران چہرہ بھی اس خبر پر چمک اٹھا تھا۔ اشمل کے لئے وہ کتنا تڑپتی تھی۔ ایسے اُداس لمحوں میں یہ ہمدرد بھائی کس قدر یاد آتا تھا۔

وہ بیڈ سے اتر کر خود بھی دروازے کی طرف بھاگی۔ وہ بابا خان کے ساتھ اندر آ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح تروتازہ اور ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔

”کیسی ہیں آپ شاہ خانم؟“

”ٹھیک ہوں۔“ تم کیسے ہو؟ بہت انتظار کروایا اس بار تم نے۔“ شاہ خانم نے محبت سے اس کے شانوں پر ہاتھ پھیرا۔ ”ہر دن تمہیں یاد کرتے ہوئے گزرتا ہے۔ کب ختم ہوگی تمہاری یہ پڑھائی؟“ ہمیشہ کی طرح ان کے لبوں پر شکوہ مچل گیا۔ ان کی آنکھیں ترستی رہی تھیں اشمل کے انتظار میں۔ ان کا دل بیٹے کی محبت سے لبریز تھا۔ آج اشمل کو دیکھ کر ان کے اندر ڈھیروں ٹھنڈک سرایت کر گئی۔

”ارے، اشٹارا! تم کیسی ہو؟“ اشمل دروازے میں استادہ اشٹارا کو دیکھ کر جلدی سے مسکرا کر اس کی طرف بڑھا اور وہ بے اختیار سی ہو کر اشمل خان کے شانے سے لگ کر بے ساختہ بلک اٹھی۔ اپنے ماں جانے کو دیکھ کر ڈھیر سارے غم اس کی آنکھوں کے سامنے آنسوؤں میں ڈھل گئے تھے۔

”ارے۔۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔۔ اشٹارے۔۔۔۔۔ پاگل ہو گئی ہو کیا؟“ بھی اس میں رونے کی کیا بات ہے؟“ اس نے اپنے مضبوط بازوؤں میں اسے کسی نازک آگینے کی طرح سمیٹ لیا اور پھر اسے اپنے ساتھ لئے بڑے کمرے میں آ گیا۔ وہ اب بھی دھیرے دھیرے رو رہی تھی۔ اچانک وارد ہونے والے آنسوؤں کی یورش نے اس کی قوت گویائی سلب کر لی تھی۔

”اس کی سہیلی زرسا نگہ کا کل انتقال ہو گیا ہے۔ اس وجہ سے۔“ بابا خان نے دھیرے سے بتایا تو اشمل خان چونکے۔ ”زرسا نگہ۔“ کیا وہی زرسا نگہ جو اس کے ساتھ بچپن میں کھیلا کرتی تھی؟“ اُسے ماضی کی وہ دوڑتی بھاگتی بچی یاد آ گئی۔

”ہاں، وہی لالہ! وہ مر نہیں گئی، اُسے مار دیا گیا ہے۔“ وہ روتی ہوئی بولی۔

”مار دیا گیا ہے؟“ اشمل خان کی آنکھیں حیرانی سے پھیلیں۔



”اس کے منگیترا نواب دادنے اُسے گولی ماری۔“

”اوہ، گاڈ\_\_\_\_\_“ وہ تاسف سے بولا۔ ”بہت ظلم ہے یہ تو۔“

”ارے، یہ کہاں کی باتوں میں لگ گئے تم\_\_\_\_\_ بیٹھو آرام سے۔ تھک گئے ہو گے تم۔“ شاہ خانم اُسے پریشان ہوتا دیکھ کر جلدی سے بولیں۔ انہیں یہ موضوع بے حد گراں گزر رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ تھکے ہارے اشمل خان کو وادی کے گھروں کی دلدوز داستانیں سنائی جائیں۔

”پاگل ہو گئی ہو اشترا تم تو\_\_\_\_\_ کیوں رکھتی ہو ایسا چڑیا جیسا دل۔“ انہوں نے اشترا کو ڈانٹا جو ابھی تک آنسو بہا رہی تھی۔

”غم تو ہو گا نا اسے\_\_\_\_\_ آخر اس کی بچپن کی سہیلی تھی۔ خیر خدا اُسے جنت الفردوس میں جگہ دے۔ شاید اس کے نصیب میں یہی لکھا تھا۔ بس کرو اشترا بیٹی!“ بابا خان اپنی جگہ سے اٹھ کر اشترا کے پاس آگئے اور اس کا سر سہلانے لگے۔

”زیادہ دل پر لوگی تو طبیعت بگڑ جائے گی۔ دیکھو اشمل بھی آیا ہے، صرف چند دنوں کے لئے۔ اس کے ساتھ اچھا وقت گزارو۔“ بابا خان اسے سمجھانے لگے۔

”صرف چند دن کے لئے کیوں؟“ شاہ خانم نے اشمل کو دیکھا جو اس خبر پر ابھی تک اُداس بیٹھا تھا۔ جلدی سے چونکا۔

”ہاں بس\_\_\_\_\_ وہ بھی یونیورسٹی ہنگامی حالت میں بند ہو گئی ہے، اس وجہ سے آگیا۔“ ”بس\_\_\_\_\_ شکر کریں اتنے دن بھی مل گئے۔ آپ سب کو دیکھ لیا۔“ وہ شاہ خانم کے چہرے پر پھیلتی نارا ضگی کو محسوس کر کے دھیرے سے مسکرایا اور پھر جھک کر فرش پر پڑے بیگ کی زپ کھولنے لگا۔

”ڈھیر ساری شاپنگ کی ہے آپ لوگوں کے لئے۔“

”ہر بار کہا ہے زیادہ دن کے لئے آیا کرو۔ ہر بار ایک ہفتہ رہ کر بھاگ جاتے ہو۔ کیا شہر کی زندگی اتنی ہی راس آگئی ہے؟“ وہ خفا ہو کر کرسی سے کھڑی ہو گئیں۔ ”نہیں چاہئے تمہاری کوئی بھی لائی ہوئی چیز۔“

”ارے ارے شاہ خانم! آپ تو خفا ہو گئیں۔“ اشمل گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور ان کے قریب آکر انہیں بازو سے تھام کر بولا۔

”شہر کی زندگی بہت پھیکی ہے۔ بس پڑھائی کی وجہ سے برداشت کر رہا ہوں۔ ورنہ سچ پوچھئے تو یہیں آجانے کو جی چاہتا ہے۔ کیوں اشترا! میں نے کبھی جھوٹ بولا ہے؟“ وہ ماحول کے کھنچائو کو کم کرنے کے لئے پُر مزاح انداز میں بولا تو اشترا اسراٹھا کر محبت سے دیکھنے لگی۔

”نہیں لالہ! آپ جھوٹ نہیں بولتے۔ مگر ہر بار حویلی والوں کو ناراض کر دیتے ہیں۔ صرف چند دن\_\_\_\_\_ ان دنوں میں شاہ خانم آپ کی صورت دیکھتی رہتی ہیں ڈھیر ساری باتوں کے لئے۔ آپ رکتے ہی نہیں۔“

”ہا\_\_\_\_\_ ہا\_\_\_\_\_“ اشمل خان زور سے ہنس پڑا۔ ”کیا کروں، مجبوری ہے اشترا!“ وہ شاہ خانم کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اتنا لاڈلا تھا میں تو پھر پڑھنے کے لئے کیوں بھیجا؟ رکتیں مجھے جاہل گنوار۔“ اس نے کچھ اس انداز سے کہا کہ شاہ خانم بے ساختہ مسکراہٹ کو نہ روک سکیں۔ انہوں نے ممتا بھری نظروں سے جوان تو انابیٹے کو دیکھا جو ان سے قد میں کہیں اونچا تھا مگر ان کے لئے ابھی بچہ ہی تھا۔

”ارے، ذولین کا کیا حال ہے؟“ اشمل نے دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے ذولین کے بارے میں پوچھا اور جھک کر بیگ سے چیزیں نکالنے لگا۔

ذولین کے نام پر شاہ خانم کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ ان کے نازک نتھنے پھولنے لگے تھے۔

اشارت ان کی ناگواری واضح طور پر محسوس کی تھی مگر خاموش رہی اور اشمیل کے پاس بیٹھ گئی۔ بابا خان جو کب سے ان کی نوک جھونک سے محفوظ ہو رہے تھے، ذولین کے نام پر جلدی سے بولے۔

”ہاں۔۔۔ ٹھیک ہے۔ وہ آج کل کوئی نیا تجربہ کرنا چاہ رہا ہے شفتالو کی فصل کے لئے۔ دیکھو کتنا کامیاب ہوتا ہے۔“ بابا خان اسے تفصیل بتانے لگے۔ وہ دلچسپی سے سننے لگا۔

”ہاں۔۔۔ اس کا آج تک کوئی تجربہ ناکام نہیں ہوا۔“ اس نے سر ہلایا۔

”یہ دیکھئے شاہ خانم! آپ کے لئے یہ شال لایا ہوں۔ بہت محبت سے خریدی ہے۔“ اس نے سیاہ پھولوں کی گرم شال خانم کی طرف بڑھادی۔

”تم ذولین سے مل لینا۔ وہ تمہارا بہت انتظار کر رہا تھا۔“ بابا خان کرسی سے اٹھتے ہوئے بولے۔

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ضرور، کیوں نہیں۔ میں اس کے ساتھ شکار کا پروگرام بھی بنانا چاہ رہا ہوں۔ پھر پتہ نہیں کب میرا حویلی آنا ہو۔“ وہ بابا خان سے باتیں کرتے ہوئے بیگ سے شاپنگ کی ہوئی چیزیں بھی نکال رہا تھا۔

شاہ خانم کی اندر کی ناگواری سے بے خبر،

اشارت کے دل کی تیز ہوتی دھڑکنوں سے بے نیاز،

اشمیل خان مسلسل ذولین خان کی باتیں کر رہا تھا۔ بے حد اپنائیت اور محبت سے۔ اور شاہ خانم کا دل چاہ رہا تھا کہ اس موضوع کو فوراً ختم کر دیں۔ ذولین سے اشمیل اور بابا خان کی یہ محبت ان کے اندر حسد اور غصے کو بھڑکانے لگی تھی۔ ضبط کے معاملے میں تو وہ ویسے بھی صفر تھیں۔ اچانک غصے سے کرسی سے اٹھیں اور کمرے سے نکل گئیں۔

ان کا یوں برہمی سے کمرے سے اٹھ کر باہر جانا اشمیل کو متحیر کر گیا۔ پھر اس نے استفسار نہ نگاہوں سے اشارت کی سمت

دیکھا جو پلکیں اوپر اٹھائے اس کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے پاس جواب تھا مگر بابا خان کی موجودگی کا احساس کر کے وہ خاموش رہی اور چہرہ جھکا لیا۔

آپ خود بھی اچھی طرح جانتے ہیں لالہ! ذولین سے نفرت ان کی نئی تو نہیں ہے۔ ان کی جڑیں تو بہت پرانی اور اندر تک پیوست ہیں۔“ اس نے صرف سوچنے پر اکتفا کیا۔

اشمیل کے آجانے سے اشارت کا دل کسی حد تک بہل گیا۔ زر سانگہ کا غم فراموش تو نہ ہوا مگر کسی حد تک کم ضرور ہو گیا تھا۔ ہاں رات کی تنہائی میں کبھی کبھی کسک دینے لگتا۔

وہ درپچے کا پردہ ہٹائے باغ کے اس احاطے پر نگاہیں جمائے کھڑی تھی جہاں اشمیل ذولین خان کے ہمراہ مریں بیچ پر بیٹھا تھا۔ وہ جو باتیں کر رہے تھے اسے کچھ سنائی نہیں دے رہی تھیں مگر اشمیل خان کی ہنسی کبھی کبھی اس کی سماعت سے ٹکرا جاتی۔ ذولین خان کے مسکراتے لب اُسے نظر آ رہے تھے اور وہ حیران ہوتی جا رہی تھی۔ یہ خاموش آنکھیں، یہ جامد لب، کیا مسکرا بھی سکتے ہیں؟

اتنی پُرسوں، اتنی سحر انگیز مسکراہٹ اس نے آج سے پہلے کہاں چھپا رکھی تھی جیسے باغ کے سارے پھول اس تبسم کے آگے ماند پڑ گئے ہوں۔ بڑی بڑی آنکھوں کے زمر دیں ہیرے کتنے روشن اور منور تھے۔

وہ بغیر پلکیں جھپکائے یہ مغرور چہرہ دیکھ رہی تھی جو آج متبسم تھا۔

”کیوں ذولین خان! پھر وہ ساری بے اعتنائیاں میرے حصے میں کیوں؟“ وہ بے رخی کا غبار صرف اور صرف میرے لئے کیوں؟“ اُس کا دل یکلخت اداس ہو گیا۔

اس نے اس کے حسین چہرے سے نگاہیں ہٹالیں اور پردہ کھینچ لینا چاہا کہ اشمیل نے اسے پکارا۔

”اشتارا!“ اس کی آواز خاصی اونچی تھی۔ اس نے دوبارہ درتچے سے باہر جھانکا۔

”جی لالہ!“ اس نے بھی اونچی آواز سے جواب دیا اور ذولین کی سمت سرسری نگاہ ڈالی۔ وہ اب دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ اُف، یہ بیگانگی \_\_\_ اُس کا دل کٹ گیا۔

”ادھر آؤ باہر اشتارا!“ اشمیل کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ اسے لامحالہ تکمیل کرنا پڑی حالانکہ اس کا دل قطعی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اس شخص کے سامنے جائے جس نے ہمیشہ ہی اس پر سحابِ غم ہی برسائے ہیں۔ ہر لمحہ اس کی ذات کی نفی ہی کی تھی۔

اس نے اپنی پشت پر بکھرے بالوں پر چادر پھیلا دی اور اس کے دونوں کنارے آگے لپیٹ لئے اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی لان کے اس احاطے کی طرف آگئی۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ \_\_\_ سارا دن کمرے میں بند رہتی ہو، بالکل چپ چاپ، کچھ ہنسا بولا کرو۔ پہلے تو تم ایسی نہیں تھیں۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ اس کے قریب آنے پر اشمیل نے اُسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”چہرہ دیکھا ہے کتنا زرد ہو رہا ہے \_\_\_ بیٹھو یہاں۔“ اس نے اس کی کلائی تھام کر اسے اپنے قریب گھاس پر بٹھالیا۔

”ٹھیک تو ہوں لالہ!“ اس نے لمبی لمبی پلکیں اوپر اٹھائیں، پھر جلدی سے جھکادیں۔ وہ سحر انگیز نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ گہری گہری سمندر صفت آنکھیں اتنے قریب تھیں کہ اس کے دل میں ایک بار ہلچل ہونے لگی۔

”ٹھ \_\_\_ ٹھیک ہی تو ہوں۔ آپ کو تو وہم ہو گیا ہے۔ شاید زرد شال کا عکس پڑ رہا ہے میرے چہرے پر۔“ اس نے اشمیل خان کی طرف دیکھا جو تشویش کی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

”چلو آؤ \_\_\_ باہر چلتے ہیں۔ موسم بھی اچھا ہو رہا ہے۔“ اس نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا تو وہ گھبرا گئی۔

”آؤ ذولین!“ اشمیل اور ذولین دونوں کھڑے ہو گئے۔ اشمیل نے اپنی جیکٹ کی جیب سے گاڑی کی چابی نکال کر ذولین کو تھمادی۔ ”آؤ اشتارا!“ اشمیل نے اُسے پکارا جو دم بخود بیٹھی تھی۔

ذولین خان کے ہمراہ جانے کے نام سے ہی اس کے اندر کا حال عجیب ہو رہا تھا۔ مگر انکار کرنا اشمیل خان کو خفا کرنا ہوتا اور وہ خفا ہو کر بھی اُسے زبردستی لے جاتا۔ وہ اس کے انکار کو اہمیت ہی نہ دیتا۔ ضدی تھا، لے جانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اس کا انکار بے معنی ہو کر رہ گیا۔ وہ لامحالہ کھڑی ہوئی مگر اندر سے اس کا دل بری طرح کانپ رہا تھا اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

ذولین گاڑی میں بیٹھ گیا تھا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ وہ اشمیل کے ہمراہ آئی اور کچھ سیٹ پر دبک کر بیٹھ گئی۔

اس کے بیٹھتے ہی ذولین نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

”زرسانگہ کا غم اپنی جگہ مگر یہ بھی تو سوچو کہ مرنے والوں کے ساتھ کوئی نہیں مر جاتا۔ اور پھر وہ اپنے خدا کے پاس بہت خوش ہوگی۔ وہ تو معصوم اور بے گناہ تھی نہ۔“ اشمیل راستے میں اسے سمجھاتا رہا۔ ”سمجھ رہی ہونا اشتارا!“ اس کی مستقل خاموشی پر اشمیل نے اسے پکارا تو اس نے جلدی سے جواب دیا۔

”جج۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ سمجھ رہی ہوں۔“ اس نے سر ہلادیا۔ ”مگر زندہ لوگوں کے نادر وارویے پُر دُکھی تو ہونا چاہئے نہ۔“ اس نے خالصتاً یہ جملہ ذولین خان کو سنانے کے لئے کہا تو اشمیل نے اُسے دیکھا۔

”کیا مطلب؟“



”بس کبھی کبھی لوگوں کے رویے دکھ دے جاتے ہیں۔ پتہ نہیں سب کے دل کیوں نرم نہیں ہوتے۔“ اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

ذولین خان کا مضبوط ہاتھ ایک لمحے کے لئے لرز اٹھا۔ وہ جانتا تھا کہ درپردہ اشترا اُسے ہی کہہ رہی ہے۔ اس نے صرف ایک نظر اُسے آئینے میں دیکھا۔ خوبصورت آنکھوں میں مٹامٹا کا جل، چہرے پر زرد اور گلابی رنگ کا امتزاج، چادر سے طلائی زلفیں بکھر کر ہوا کے جھونکے سے اڑ رہی تھیں۔ حزن میں عجیب سی جاذبیت تھی۔ اس نے جلدی سے نگاہیں ہٹالیں۔ وہ اس چہرے کے سحر میں ڈوب جانا نہیں چاہتا تھا۔ جو ہستی اس کے لئے نہیں تھی، اُسے قلب و نظر میں بسانے کا کیا فائدہ۔

”تم شاہ خانم کے بارے میں کہہ رہی ہو؟“ اشمیل کی آواز پر وہ چونکی۔

”آں۔۔۔۔۔نن۔۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔۔بس ایسے ہی، نہ جانے کیوں کچھ پرانی باتیں یاد آگئی تھیں۔“ اس نے بہ دقت تمام خود کو سنبھالا۔ یہ اشمَل لالہ سے وہ کیسی باتیں کرنے لگی تھی۔ اس نے رُخ کھڑکی کی طرف کر لیا اور اپنے خیالات کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ وہ اپنے اندر محبتے طوفان کو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

وہ اب پہاڑیوں سے گرتی آبشار کے پاس آگئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے سرسراتے جھونکے اور متحرک ندی کی آوازوں کا شور ماحول میں ایک طلسم پیدا کر رہا تھا۔ آبشار کا سفید پانی پتھروں پر گرتا اور اس کے ٹھنڈے چھینٹے جسم و جاں پر گرتے تو ایک کیف اور طراوت اندر تک سرایت کر جاتی۔

وہ ایک اُونچے پتھر پر بیٹھ گئی۔ ساری فضا دُھلی دُھلی ہوئی تھی، نکھری نکھری سی تھی۔ وادی اتنی وسیع کبھی نہ دکھائی دی تھی جتنی آج دکھائی دے رہی تھی۔ غم زدہ ہوتے ہوئے بھی اشتاراکو فضا سحر انگیز لگ رہی تھی۔ شاید ذولین خان کی موجودگی کا اثر تھا۔

اشمل، ذولین کے ہمراہ آبشار کے قریب ٹھلٹا رہا۔ کبھی اونچی پہاڑی پر وہ دونوں چڑھنے لگتے۔ اشارا کو یہ سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ زندگی کتنی عجیب ہے۔ سکون کے بعد طوفان اور طوفان کے بعد پھر سکون۔ کبھی لگتا ہے جیسے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ کبھی یوں لگتا ہے کہ ہر چیز کی زندگی پھر عود کر آئی ہے، ہر شے تھرکنے لگی ہے۔

وہ یو نہی بیٹھی سوچ رہی تھی۔ سامنے بڑے پہاڑ کے پیچھے سورج دھیرے دھیرے غروب ہو رہا تھا۔ آسمان شفق رنگ میں ڈھل رہا تھا۔ کچھ شفق رنگ کرنیں اشارا کے چہرے کو چھو جاتیں تو اس کا چہرہ جگمگانے لگتا۔ وہ یو نہی لاپرواہ سی بیٹھی تھی، اس رنگین منظر میں کھوئی ہوئی۔ مگر ذولین خان کے طاقت ور سینے میں مقید دل طوفان سے گزر رہا تھا۔ اُس کی نگاہیں اس حسین عورت پر اُٹھتیں تو اس کے اندر کی زنجیریں ٹوٹنے لگتیں۔ وہ جذبے پھر سے بیدار ہونے لگتے جن کو اس نے بڑی مشکلوں سے سلایا تھا۔ وہ رنگ پھر سے اُبھرنے لگتے جس سے وہ پہلو تہی کرتا رہا تھا۔

’کب تک ذولین! خان تم اپنے خیالات، اپنے احساسات پر بے حسی کی برف برسائو گے۔ برف کو بہر حال پگھلنا ہی ہوتا ہے۔‘

وہ جیسے ایک دم اس ماحول سے کٹ گیا۔ اشتار خان کے دھیان کی تیز ہوا اُسے دُور ہی دُور اُڑائے لے جا رہی تھی۔  
آج اُس نے شدت سے محسوس کیا کہ ازل کی بے نمو مٹی سے جس کو نیل نے سر اٹھایا تھا آج وہ جڑ پکڑ کر ایک تناور  
درخت بن چکی ہے۔ اس کے سینے میں مقید پتھر آج نہیں بلکہ اس روز بیدار ہو گیا تھا جب وہ خوبصورت آنکھیں اس  
کی انیکسی میں منتقل ہونے پر شکوہ کناں تھیں۔ گو کہ اس نے اپنے جذبوں پر مصلحت کی برف جمادی تھی مگر تمنا کا  
شعلہ بالآخر بھڑک کر ہی رہا۔ وہ قربتوں کے الم سے خوفزدہ تھا۔ یکلخت ہی اس کے دل میں یہ خواہش مچل کر رہ گئی کہ  
وہ اشتار کے قریب بیٹھ کر اس کا نازک ہاتھ تھام کر وہ سب کچھ کہہ دے جو آج تک نہیں کہہ سکا۔ اس کے سارے  
بہے اور ان بہے اشک چن لے، اس کی آنکھوں کے گہرے سمندر میں ڈوب کر اپنی زندگی کے ہولناک سناٹوں کی بے  
پناہ خامشی اور زخم زخم تنہائی سے چند ساعت بے گانہ ہو جائے۔



محبت کو لمحہ اذیت اور عفریت سمجھنے والا آج خود اس لمس کا خواہش مند تھا۔

ایک لمحے کے لئے تمام شکستگی کا احساس زائل ہو گیا۔

بازارِ سود و زیاں میں ہمیشہ زیاں ہی تو نہیں۔۔۔ آرزو حاصل رائیگاں ہی نہیں۔ سب کچھ کھو کر شاید یہاں اس کے مقدر میں اب کچھ پالینا ہی لکھا ہو۔

اس نے ایک گہری سانس سینے سے آزاد کی اور نگاہیں ڈوبتے سورج کی کرنوں پر جمادیں۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اس کی انا کا سورج بھی اب اسی طرح دھیرے دھیرے غروب ہو رہا تھا۔

... ☆ ☆ ☆ ...

ندرت کی ہنسی تھی کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ایرِ پیس سے اُبھرتی یہ کھلکھلاتی ہنسی ہشتمینہ کی ساعت پر چھ رہی تھی۔

”اس میں اتنا ہنسنے کی کیا بات ہے؟“ وہ چڑ گئی۔

”ہا۔۔۔۔۔ہا۔۔۔۔۔ہنسنے کی ہی تو بات ہے۔ یہ ریحان پر اچھ کو سو جھی کیا کہ تم سے اتنا بڑا مذاق کر بیٹھا۔ ہاہا  
۔۔۔۔۔“ وہ پھر زور سے ہنسنے لگی۔

”میں تمہارا گلابادوں گی ندرت! بند کرو یہ ہنسی۔“ وہ دھاڑی۔

وہ ندرت کو یہ قصہ سنا کر اب پچھتا رہی تھی کہ ریحان پر اچھے نے اُسے ہوٹل میں میٹنگ پر بلوا کر جوک کیا تھا۔ اب ندرت کی متواتر ہنسی اُسے سلگ رہی تھی۔

”یار! تم نے ریحان پر اچہ کامنہ نہیں توڑ دیا۔ تمہیں تو میں ایسا ہی سمجھتی تھی۔“ وہ اس کی ناراضگی پر اپنی ہنسی کو

بمشکل روکتے ہوئے بولی

”اس نے مجھ سے معذرت کر لی تھی۔“ وہ ریسپور تھا مے صوفے پر دراز ہو گئی۔

”چہ خوب ریحان پر اچہ کی معذرت پر تم نے اُسے معاف کر دیا۔ فرض کرو اگر یہ حرکت کوئی اور اسٹوڈنٹ تمہارے ساتھ کرتا تب؟ کیا تم اس کا سر نہ پھاڑ دیتیں؟“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ ندرت کی بات اچھی طرح نہ سمجھ سکی۔

”محض اس کی پادٹی کی سیکرٹری ہو اس لئے اس کی یہ حرکت تم نے برداشت کر لی ہے۔ نہ جانے اب آگے کیا کیا برداشت کرنا پڑے۔“ وہ طنز سے ہنسی تو ہنسمینہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

”اس کی پادٹی کی سیکرٹری بن کر میں بک نہیں گئی ہوں۔ تم جانتی ہو آج تک کسی کی ہمت نہیں پڑی کہ مجھ سے غلط انداز میں بات ہی کر لے۔ اور پھر میں نے کہا نا کہ ریحان پر اچھ کو اپنی اس حرکت پر افسوس تھا شدید۔“

[illegible]

”کردار، کردار۔۔۔۔۔ یہاں بھلا کس کا کردار مثالی ہے؟ \_\_\_\_ ہوازدی آئیڈیل پرسن؟“ اس نے ندرت کا جملہ کاٹ کر تڑخ کر کہا تو ندرت ہر جستہ بولی۔

”اشتمل خان ہے ایک آئیڈیل انسان \_\_\_\_\_ آئیڈیل لیڈر۔“

ندرت کی بات پر وہ لمحہ بھر چپ ہو گئی۔ اس کی نگاہوں میں چند دن پہلے کا واقعہ گھوم گیا۔ وہ اونچا لمبا، پہاڑی انسان جو واقعی آئیڈیل پرسن تھا مگر اس کے واسطے سے اس کے ذہن میں کوئی خوشگوار یاد نہیں تھی۔ اس نے ہمیشہ اس پر طنز ہی کیا تھا۔ اور پارٹی کے توسط سے صرف اور صرف اس کی ذات کو نشانہ بنایا تھا۔ اس نے لب بھینچ لئے۔ اس کی نگاہوں میں دو بھوری بھوری آنکھیں لہرا گئیں۔

”کہو، ہے نا آئیڈیل کیریئر؟“ ندرت چہک کر بولی۔

”اونہہ۔۔۔ یہ محض تمہارا کوئی قلبی جذبہ بول رہا ہے۔“ اس نے بھی ندرت پر چوٹ کرنے کا موقع ضائع نہ کیا۔ لیکن اس کی اس بات پر ندرت کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

”نہیں یار! کوئی قلبی جذبہ نہیں ہے۔ تمہیں تو پتہ ہے ہم بی ایس سی آئرز کے بعد سسرال سدھار جائیں گے۔“

”کون سے سسرال؟“ ہشیمینہ حیرت سے اچھلی۔ ”کب ہو رہی ہے تمہاری شادی؟“

”اچھا، انجان مت بنو۔۔۔ تمہیں بتایا تو تھا، بھابی کے انجینئر بھائی وقاص احمد سے۔“

”او۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ کیا معاملہ واقعی سیریس ہے؟ میں تو سمجھی یہ بھی تمہاری ان فضول باتوں کا ایک حصہ ہے۔“ ہشیمینہ پہلی بار کھل کر ہنس پڑی۔ اُسے بھی ندرت کو چڑانے کا موقع مل گیا تھا۔

”انتہائی بد تمیز لڑکی ہو تم۔“ وہ برامان گئی۔ ”اب میں اپنی شادی میں تمہیں قطعی نہیں بلاؤں گی۔“

”نہ بلانا۔۔۔ مجھے تمہارے انجینئر وقاص احمد عرف وکی کو دیکھنے کا شوق نہیں۔“ اس نے بھی برجستہ کہا۔

”ارے ہاں۔۔۔۔۔ شامل خان اپنی وادی گیا ہوا ہے آج کل۔“ ندرت پھر شامل خان کا ذکر لے بیٹھی۔ ”تمہیں پتہ ہے؟“ اس نے ہشیمینہ سے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ صاف انجان بن گئی۔ اس نے ندرت کو بتانا مناسب نہ سمجھا کہ شامل خان اس کی اکلوتی ممانی کا بھتیجا ہے۔ خواہ ندرت کو فضول بکواس کا نادر موقع مل جاتا۔

”ہو گی وہاں اس کی کوئی منگیتر ونگیتر۔۔۔ ہے نا؟“

”مجھے کیا پتہ؟“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ شامل خان اس بندھن سے ابھی تک آزاد ہے۔

”ویسے یہ شامل خان بہت گہرا انسان ہے۔۔۔ اگر کوئی منگیتر ونگیتر نہ بھی ہوئی تو ”وہ“ ضرور ہو گی۔“

”وہ“ سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ ہشیمینہ چونکی۔

ندرت زور سے ہنس پڑی۔ ”یار! کوئی پہاڑی دوشیزہ اس کی راہ تک رہی ہو گی، آنکھیں فرشِ راہ کئے، دید کی آس لئے، من انگنائیں ڈھیروں دیے جلائے اس کی منتظر ہو گی۔“ وہ کہتے کہتے ہنسنے لگی۔ مگر نہ جانے کیوں ہشیمینہ ابرار کے لب قطعی نہ مسکرا سکے۔ اس کا دل اتنی زور سے دھڑکا کہ سارا جسم لرز اٹھا۔ ذہن کے پردے پر بھرپور انداز میں اس کا سراپا اٹھ رہا۔

”ضروری تو نہیں اس کے وادی جانے کا یہی ایک مقصد ہو۔“ اس کے منہ سے اچانک یہ جملہ پھسل پڑا۔ وہ خود بھی حیران رہ گئی۔ اس کا تو آج تک کوئی راستہ بھی شامل خان کی طرف نہیں جاتا تھا۔

”ہاں ضروری تو نہیں۔ میں تو ایسے ہی مذاق کر رہی ہوں۔ اور بالفرض ایسی بات ہوئی بھی تو وہ کون سا ڈھنڈورا بیٹتا پھرے گا۔“ ندرت اس کے دل کی بدلتی حالت سے بے خبر بولتی رہی۔ ”میرے خیال سے اب یونیورسٹی کھلنے کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔۔۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔“

پھر ندرت نے ادھر ادھر کی کتنی ہی باتیں کر ڈالیں اور پھر فون رکھ دیا۔

مگر ہشتمینہ ابرار کے وجود پر ایک عجیب سی بے کلی طاری ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا ندرت نے تو اس سے ڈھیروں باتیں کیں، ہر موضوع پر، ہر شخص پر، مگر اس کے ذہن کے پردوں پر صرف اشمل خان کا چہرہ ہی کیوں ٹھہر کر رہ گیا۔ اس کے احساسات کی ساری حسیں سنسن کر رہ گئیں۔

وہ فون اسٹینڈ کے پاس سے ہٹ آئی۔ پلٹی تو بے اختیار اس کی نگاہ سامنے چمکتے قد آدم آئینے کے سامنے پڑی۔ اس کا حسین عکس اسی کو تک رہا تھا۔ انجان اور اجنبی انداز میں۔ خود اس کا عکس حیران تھا کہ آج اس کی سوچوں کی وادی میں اشمل خان کا سراپا کیوں لہرا رہا ہے۔ لاکھ ذہن جھٹکنے کے باوجود وہ عکس اتنی ہی مضبوطی سے جما ہے۔

وہ خالی خالی نظروں سے اپنے عکس کو تکتے ہوئے بالوں میں برش پھیرنے لگی۔ ریشمی بال یہاں وہاں بکھر رہے تھے مگر اس سے زیادہ اس کا ذہن منتشر ہو رہا تھا۔

اچانک اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے عکس کے پیچھے ایک اور حسین عکس ابھرنے لگا ہے۔ یہ عکس اشمل خان کا تھا۔

دلکش، پُرسوں۔

سجلی سجلی، اندر باہر کے اجالوں سے سرشار آنکھیں۔

’آف خدا یا!‘ اُس نے گہرا کر آنکھیں موند لیں اور پھر جب دوبارہ آنکھیں کھولیں تو وہ عکس غائب ہو چکا تھا۔

اس کا سارا چہرہ ٹھنڈے قطروں سے چمکنے لگا۔

’میرے اللہ! میں کہاں کھوئی جا رہی ہوں؟ ناآشنا رستے میری منزل تو نہیں ہیں۔‘

اس نے آئینے میں ایک نظر اپنے سراپا پر ڈالی اور پھر برش میز پر پٹج کر وہاں سے ہٹ گئی۔

’کیا تمہارے اندر بھی ایسے ہی نازک جذبے پلنے لگے اور تم ان نازک احساسات کی اسیر ہو گئیں؟‘

’نہیں۔۔۔۔۔‘ دل کی اس وحشت سے گہرا کر اس نے جلدی سے ایک میگزین اٹھا لیا اور کمرے کا داخلی دروازہ پورا کھول کر خود بیڈ پر نیم دراز ہو گئی اور باہر امی اور بھابی کی باتوں کے شور سے اپنے اندر کے شور کو کم کرنے لگی۔ لیکن سوچوں پر کس کا اختیار ہوتا ہے۔ میگزین ہاتھ میں تھا اور خیالات کا پرندہ اڑتا ہی چلا جا رہا تھا۔

اُس نے میگزین ریک پر واپس پٹج دیا اور پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور دراز سے گاڑی کی چابی نکال کر باہر نکل آئی۔

ذہن کو تمام پریشان اور الجھی الجھی سوچوں سے چھٹکارا دینے کے لئے تیز ڈرائیونگ کر کے بے مقصد سڑکوں پر گھومنا اس کا بہترین مشغلہ تھا لیکن اس وقت یہ مشغلہ ضرورت بن گیا تھا۔ وہ اپنے دل کو کسی بھی کمزور لمحے، کسی نازک جذبے کے حصار سے ہر ممکن طریقے سے بچانے کی خواہش مند تھی۔

غیر معروف سڑک پر وہ اپنی بلیک شیراڈ بھگاتی رہی۔ فٹ پاتھ پر لگے بڑے بڑے درخت تیزی سے پیچھے بھاگتے رہے۔ اچانک اس نے کچھ سوچ کر گاڑی کا رخ بازار کی طرف کر دیا۔ اُسے یاد آیا کئی دنوں سے وہ کاٹن کے سوٹ خریدنے کا سوچ رہی تھی مگر یونیورسٹی کی مصروفیات کے باعث وہ بازار کی طرف آہی نہ سکی تھی۔

وہ ایک بڑے بوتیک سینٹر پر جا کر رک گئی اور چند لمحے غور کرتی رہی کہ کیا خریدے کہ بالکل اچانک اس کی پشت پر ایک مردانہ آواز ابھری۔ نہایت بے تکلفانہ انداز میں کسی نے پکارا تھا۔

’ارے ہشتمینہ ابرار۔۔۔ آپ یہاں۔‘

وہ پلٹی تو ٹھٹک گئی۔ سراج کیانی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک بے حد فیشن ایبل لڑکی کھڑی تھی جو اس کے



لئے قطعی اجنبی تھی۔

اس کی آنکھیں بے اختیار چمکیں۔ ”تم یہاں؟“

”جی۔۔۔۔۔ بس، شاپنگ کرنا تھی نعیمہ کو۔“ اس نے ایک مسکراہٹ قریب کھڑی لڑکی پر ڈالی تو وہ بھی کھل کر مسکرائی۔

”آپ بھی شاپنگ کے لئے آئی تھیں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ مگر ہشمنہ کا دماغ دفعۃً اس دن یونیورسٹی میں کی گئی فائرنگ کی طرف چلا گیا جس میں سراج کیانی پیش پیش تھا۔ اس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ اُسے سراج کیانی کی اچھی طرح خبر لینی تھی۔ ارد گرد کے لوگوں کا خیال اس کے ذہن سے ایک لمحے کے لئے نکل گیا۔ وہ کہاں کھڑی ہے، کس جگہ ہے؟ وہ بھول گئی اور اچانک امو شٹل ہو گئی۔

”تم نے بدھ والے روز فائرنگ کی تھی نا، شامل خان کے جلسے کے دوران۔۔۔۔۔ اُس روز سے میں تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں۔ تم نے اتنی گھٹیا حرکت کیوں کی تھی؟“ وہ بھڑک کر بولی تو سراج کیانی اس اچانک اور غیر متوقع حملے پر بوکھلا گیا۔

”مم۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ ک۔۔۔۔۔ کب؟“

”بکومت۔۔۔۔۔ زیادہ انجان بننے کی ضرورت نہیں۔ میں ینگ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی سیکرٹری ہونے کے ناطے تمہاری ممبر شپ کینسل کر کے تمہیں اس فیڈریشن سے ایکسپیل کر سکتی ہوں۔ مجھے اتنا اختیار ہے۔“ اس کی آواز تیز ہو گئی۔ ادھر سے گزرنے والے لوگ حیرانی سے اس شعلہ جوالہ کو دیکھنے لگے۔ خود سراج کیانی سٹپٹا کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ آئی ہوئی لڑکی بھی اس سچویشن پر متحیر رہ گئی۔

”مس ہشمنہ! آپ کو شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔“ وہ ہستنگی سے پیچھے ہٹ گیا اور دو طرفہ بنی دیوار سے جا ٹکا۔

”مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو سراج! میں نے خود تمہیں شہزاد جمال پر فائر کرتے دیکھا تھا۔ میں چاہتی تو ان کے رپورٹ کروانے پر گواہ بن کر تمہارا نام لے سکتی تھی۔ مگر صرف ہماری فیڈریشن کی عزت کی خاطر اس اقدام سے باز رہی۔“ وہ قہر برساتی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

”پلیز، ہم مصروف فٹ پاتھ پر کھڑے ہیں۔“ سراج کیانی نے جلدی سے اُسے لوکیشن کا احساس دلایا۔ وہ بری طرح نجل ہو رہا تھا۔ لوگ اُسے ایک لڑکی سے ڈانٹ کھانا دیکھ کر نہ جانے کیا تاثر لے کر آ، جارہے تھے۔ اور سچ تو یہ تھا کہ اپنی چوری پکڑے جانے پر وہ کھسیا گیا تھا۔ ہشمنہ کی طرف سے کئے گئے اس اچانک حملے نے اس کے اوسان خطا کر دیئے تھے۔

”بات بدلنے کی کوشش مت کرو۔ یہ بتاؤ تم نے کس کی ایماء پر اتنی بڑی حرکت کی تھی؟ سراج کیانی! میں اپنی تقریر میں جس بات کے خلاف کہتی ہوں تم عملاً وہی کرتے ہو۔“ وہ غصے سے بولی۔

اس کی حرکت نے اسے شامل خان کے سامنے بے حد شرمندہ کیا تھا۔ شاید لاشعوری طور پر اس شرمندگی کے احساس نے اسے اتنا غضب ناک کر دیا تھا۔

”میں نے یہ حرکت ریحان پراچہ کی ایماء پر کی تھی۔“ وہ اب سنبھل کر دھیرے سے بولا تو وہ حیران رہ گئی۔ پھر چلائی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ ریحان پراچہ اس بات سے بے خبر ہے۔ وہ اس موقع پر موجود ہی نہیں تھا۔“

”بائی گاڈ۔۔۔۔۔ میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔“ سراج کا لہجہ سچائی کی چغلی کھا رہا تھا۔ ”مجھ سے ریحان پراچہ نے خود کہا تھا۔ اس وقت ہم دونوں آفس میں موجود تھے۔ اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو خود ریحان سے بات کر لیں۔“



”کیا \_\_\_؟“ ہشتمینہ ابرار سناٹے میں رہ گئی۔ اُسے لگا جیسے سراج کیانی کا یہ انکشاف اس کے سر پر پتھر بن کے لگا ہو۔

تو گوید ریحان پراچہ نے اُس سے اتنا بڑا جھوٹ بولا۔ اُسے اندھیرے میں رکھ کر، سوچے سمجھے منصوبے کے تحت یہ ساری کارروائی کی گئی تھی۔

اس نے سراٹھا کر سراج کیانی کو خالی خالی نگاہوں سے دیکھا۔ اس کی نگاہیں قطعاً جھوٹ نہیں بول رہی تھیں۔

”اوگاڈ \_\_\_ تو اس کا مطلب ہے ریحان پراچہ نے مجھ سے اتنا بڑا جھوٹ بولا۔“ اس کا تن من جل اٹھا۔ وہ غصے سے پلٹی اور تیز تیز قدم اٹھاتی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

سراج کیانی حیرت زدہ نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر ہولے سے مسکرا دیا۔

”تو ہشتمینہ ابرار! تم ابھی تک ریحان پراچہ کی اصلیت سے ناواقف ہو۔“

اُس نے نعیمہ کی طرف دیکھا، پھر سر جھٹک کر اس کا ہاتھ پکڑا اور دکان کے اندر داخل ہو گیا۔

☆☆☆...

”میرا فیصلہ غلط نہیں تھا زمان! تمہارے غلط رویے نے اسے غلط ثابت کر دیا ہے۔ کیا کمی ہے شاردائیں \_\_\_ کیوں

تم اس کے ساتھ ایڈ جسٹ نہیں ہو پاتے؟ اپنی بہن کا بھی خیال نہیں ہے تمہیں؟“

امی کی آواز اُس کے کمرے تک پہنچ رہی تھی \_\_\_ آج پھر وہ زمان بھائی سے الجھ رہی تھیں۔

”میں نے آپ کو پہلے ہی کہہ دیا تھا، میں شارداء کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کروں گا۔ زندگی مجھے گزارنی تھی امی! اور فیصلہ

آپ اور پیانے کیا۔ اب جو کچھ میں کر رہا ہوں اس کا اندازہ آپ کو اس وقت ہونا چاہئے تھا جب آپ نے میرے انکار پر

بھی اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنایا تھا۔“

”زمان \_\_\_!“ امی کی تیز آواز کانپ گئی۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں امی۔ آپ تو ماں تھیں۔ پھر ماہ گل اور میرے لئے کیوں بہتر نہیں سوچا؟“

”کیا غلط کیا ہے میں نے؟ \_\_\_ تم ناشکرے ہو۔“ امی بھڑک اٹھیں۔ ان کی آنکھوں میں غصے اور بے بسی کا رنگ

سمٹ آیا تھا۔ انہیں ماہ گل کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ شارداء اور زمان کے روز روز کے جھگڑوں نے اُس کی زندگی کو بھی

ان جھگڑوں کی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ انہیں آج بھی اپنے کئے کئے فیصلے پر پشیمانی نہیں تھی۔ البتہ زمان کے ناروا رویے

پر شاکی ضرور تھیں۔

”صرف صورت سب کچھ نہیں ہوتی امی! میری اس کے ساتھ ذہنی مطابقت نہیں ہو سکی ہے۔ وہ جو سوچتی ہے،

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ اور میں جو کچھ کہتا ہوں اُسے ناگوار گزرتا ہے۔ وہ میرے دل میں جگہ نہیں پا

سکی ہے۔“ زمان کا لہجہ بے حد کڑوا تھا۔ وہ صوفے سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ امی نے اسے دیکھا پھر دھیرے

سے بولیں۔

”تم اپنے دل میں وسعت پیدا کر لو زمان! \_\_\_ خود بخود ذہنی ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی۔“

”او نہہ، وسعت۔“ زمان بھائی استہزائیہ انداز میں ہنسنے۔

”تم کیا کسی اور لڑکی کو پسند کرتے تھے؟“ امی نے کچھ سوچ کر پوچھا تو زمان بھائی ایک لمحہ خاموش رہ گئے، پھر

دھیرے سے رخ درتچے کی طرف موڑتے ہوئے بولے۔

”ہاں \_\_\_ کرتا تھا کبھی۔ مگر اب ایسی کوئی بات نہیں۔ اُس لڑکی کا دھندلا سا تصور بھی نہیں ہے میرے ذہن

میں۔“

زمان بھائی کی بھاری آواز ماہ گل کی سماعت پر بر چھی کی طرح لگی۔ یہ کیسا مرد ہے جسے چاہا تھا کبھی، اب اس کا تصور بھی نہیں رہا۔ اور اب ایک بیوی کو معتبر درجہ دینے کے حق میں نہیں۔ ایسے مرد کے ساتھ کیسے کسی کی ذہنی ہم آہنگی ہو سکتی ہے جس کا دل اتنا تنگ ہو جو محض اپنی خواہش، اپنی سوچ پر فریق ثانی کو گھسیٹنا چاہے۔

”زمان! تم ماہ گل کی خاطر ہی کچھ سوچو۔“ امی کی آواز میں دُکھ مترشح تھا۔ تم کیسے بھائی ہو کہ بہن کے اُجڑنے کا تماشا دیکھتے رہتے ہو۔ ایک ماں کے آنسوؤں کا بھی احساس نہیں۔ اپنی زندگی صرف اپنے لئے ہی وقف نہیں کر لیتے زمان!“ امی صوفے پر ڈھے سی گئیں۔ ماہ گل کے غم نے انہیں اندر سے تھکا ڈالا تھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا امی! کہ مسعود شاہ کیوں ماہ گل سے انتقام لے رہا ہے۔ میرے اور شارد ا کے معاملے میں ماہ گل کو بیچ میں گھسیٹنا کہاں کا انصاف ہے؟“ زمان بھائی کی آنکھوں میں غصہ اُٹ آیا۔

”انصاف کا نام مت لو زمان! تمہارے منہ سے انصاف کا لفظ چلتا نہیں۔“ امی کے لبوں پر تلخ اور طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ ”مسعود شاہ بہن کے اُجڑنے کا تماشا یوں بیٹھا نہیں دیکھ سکتا، تمہاری طرح۔ وہ خود غرض بن کر صرف اپنی دنیا میں مگن نہیں رہ سکتا۔ خاندان والوں کی باتیں اُس کی غیرت کو جگاتی ہیں۔“ امی یہ کہہ کر صوفے سے کھڑی ہو گئیں اور کمرے سے نکل گئیں۔

امی کے لفظ تیر بن کر زمان بھائی کے دل میں کھب گئے۔ ایک عجیب سی کیفیت اس کی آنکھوں میں پھیل گئی۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔

امی باورچی خانے کی طرف جا رہی تھیں۔ اُسے غصے سے نکتا دیکھ کر ٹھٹکیں۔ وہ ان کے سامنے آگیا۔

”آپ نے مجھے بے غیرت ہونے کا طعنہ دیا ہے امی! میں آج ہی شارد ا کو لے کر آتا ہوں۔“ مگر \_\_\_\_\_ وہ لب بھیج کر ایک لمحہ رُکا، پھر بدستور تلخ لہجے میں بولا۔ ”وہ اپنی دنیا میں رہے اور میرے معاملات سے بے نیاز رہے تو اس

کے یہاں رہنے پر مجھے انکار نہیں ہو گا۔“ یہ کہہ کر وہ پلٹ کر بڑے بڑے قدم اٹھنا پورچ کی طرف بڑھ گیا۔ ماہ گل کھڑکی کا پردہ ہٹائے زمان بھائی کو پورچ تک جانا دیکھتی رہی۔ پھر امی کے مطمئن اور مسکراتے چہرے پر نگاہ پڑی تو کرب سے اس نے نچلا لب دانتوں میں دبایا۔ پھر ایک گہرا سانس سینے سے آزاد کیا۔

’او نہہ۔۔۔ ایک بیوی کو اتنا بے اختیار رکھنا کہ وہ شوہر کے معاملات میں مداخلت کی مجاز نہ ہو اس کے لئے کڑا امتحان ہی تو ہے۔ کوئی عورت اپنے مرد کی بے نیازی، بے مروتی برداشت نہیں کر سکتی۔ چاہے وہ کتنی ہی ظالم ہو۔ یا اس کی وسعت قلبی کے کتنے ہی ڈنکے بج چکے ہوں۔‘

اس کے دل پر ملال کی کثیف فضا چھا گئی۔

امی خوش تھیں کہ شارد ا بھائی کے آجانے سے ماہ گل بھی اپنے گھر کی ہو جائے گی۔ مسعود شاہ آکر اُسے لے جائے گا۔ ہاں ان کا یہ خیال بھی غلط نہیں تھا۔ ماں ہونے کے ناطے ان کی طمانیت سے بھری مسکراہٹ بھی اپنی جگہ درست تھی۔ وہ اپنے تئیں کسی طرح بیٹی کو آسودہ دیکھنے کی متمنی تھیں۔ مگر وہ کیا جانتیں کہ یہ صرف بہلاوا تھا۔

مسعود شاہ اگر سب کی نظروں میں غیرت مند بھائی تھا تو اس کے لئے ایک جابر شوہر تھا۔ اس کی غیرت اور حمیت اس کے لئے عذابِ جاں ہی رہی تھی۔ پھر کیسے وہ اس شخص کے ہمراہ جائے جو صرف اُسے اس لئے خوش رکھتا تھا کہ اس کی بہن اپنے گھر میں خوش رہے۔ اس کی زندگی میں تو آسودگی کا شائبہ تک نہیں تھا۔

اس کی زندگی تو صرف چند ماہ خوشیوں کا گہوارہ ہی تھی۔ اب تو ان خوشیوں کا دُھندلا سا عکس بھی ان آنکھوں میں نہیں رہا تھا۔ اس کے ماضی کے سمندر میں تو صرف دُکھ اور بے ثمر خواہشوں کا خزانہ دفن تھا۔

اس کی آنکھوں میں بنجر ماہ و سال بکھرے پڑے تھے اور حال کی کوئی تسلی بخش صورت نہ تھی۔

”نہیں مسعود شاہ! تم لاکھ غیرت مند سہی، کبھی میرے محبوب شوہر تھے۔ مگر میں نے اب تمہاری زندگی سے مکمل طور پر نکل جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

یہ فیصلہ کر کے ماہ گل نے ایک عجیب سا دکھ اپنے وجود میں سرایت ہوتا محسوس کیا۔ بہر حال زندگی یوں بھی کانٹوں سے پُر راستہ ہی تو ہے۔ وہ تو ہمیشہ ناسودگی کے جال میں خود کو قید محسوس کرتی رہی تھی۔ اب اس جال کو کاٹ کر بھی اس کے سامنے کوئی روشن شاہراہ نہ تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ مگر یہ لمحہ لمحہ شکستگی کا عذاب موت سے زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے۔ مسعود شاہ! تم ایک ساتھ ہی مجھے موت کے گھاٹ اُتار دو، یا پھر ہمیشہ کے لئے سمیٹ لو۔“

اس نے اپنی بھیگی پلکیں موند لیں۔ بہت سارے دکھ اس کی آنکھوں کے سامنے جاوداں تھے۔ غم کی گہری دھند میں اُسے کچھ بھی تو نظر نہیں آ رہا تھا۔

”ٹھک۔۔۔۔۔ ٹھک۔۔۔۔۔ ٹھک۔۔۔۔۔“

کوئی اس کا دروازہ مسلسل بجا رہا تھا۔ وہ چونکی اور جلدی سے آگے بڑھ کر دروازے کا لاک کھول دیا۔ سامنے ہی فروان کھڑا تھا۔

”کیا بات ہے آپ! سو گئی تھیں کیا؟ میں کب سے دروازہ بجا رہا ہوں۔“ وہ اندر آ گیا اور ماہ گل کو بغور دیکھا۔

”نہیں تو۔۔۔۔۔ بھلا یہ کون سا سونے کا ٹائم ہے۔“ اس نے بہ دقت تمام خود کو سنبھالتے ہوئے کہا اور مصنوعی مسکراہٹ سے لب سجائے۔

”ہوں۔۔۔۔۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ ماہی آپ کی سحر کی طرح اتنی بے اصول کب سے ہو گئیں۔۔۔۔۔ اور ویسے بھی بھوک لگ رہی ہو تو نیند کس کافر کو آسکتی ہے۔ کیوں؟ آپ کو بھی یقیناً بھوک

لگ رہی ہوگی۔“

فروان کی بات پر وہ مسکرائی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ کوئی خاص نہیں۔“ اس نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔ جب نگاہوں کے سامنے ڈھیر سارے دکھ ہوں اور کوئی روشنی کی رمت نظر نہ آرہی ہو تو زندہ رہنے کی یہ ساری احتیاجات ثانوی ہو کر رہ جاتی ہیں۔

”کیوں، آپ کو بھوک نہیں لگ رہی؟ دیکھئے تو، پورے دو بج گئے ہیں اور میں مارے فاقوں کے مر رہا ہوں۔“ فروان نے عجیب سی مسمی صورت بنائی کہ ماہ گل بے ساختہ ہنسی کو نہ روک سکی۔ بوجھل ماحول میں فروان کا جملہ لطیف احساسات جگا گیا۔

”بالکل بچے ہو۔“ وہ اس کے ساتھ باہر نکل آئی۔

”نہ۔۔۔۔۔ آپ! پلیز۔ یہ سراسر میرے چھ فٹ قد اور میری بھرپور جوانی کی توہین ہے۔“ اس نے برجستہ احتجاج کیا۔

”ہاں، تمہیں بچہ کہنا دراصل بچوں کی بھی توہین ہے نہ۔“ اس نے چھیڑا تو فروان ہنس دیا۔ وہ دونوں باتیں کرتے کھانے کی میز تک آ گئے۔ امی میز سجا رہی تھیں۔

”تم سحر کو لینے نہیں گئے فروان؟“ امی اسے دیکھتے ہی بولیں۔

”اس نے مجھے منع کر دیا ہے۔۔۔۔۔ کہہ رہی تھی کہ ہم سب فرینڈز ایک ساتھ آئیں گے۔ آج آخری پیپر ہے نا۔۔۔۔۔ شاید کچھ ہلاک کرنا تھا نہیں۔“ وہ امی کو تفصیلاً بتاتے ہوئے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

ماہ گل آپ کی چہرے پر سحر گل کے لئے پیار بھری مسکراہٹ بکھر گئی۔



”ہاں۔۔۔ آج وہ امتحانات سے فارغ ہو گئی۔ آخری پیپر دینے کے بعد ایسی ہی خوشی ہوتی ہے۔“ ماہ گل نے مسکرا کر کہا۔

اس وقت اچانک دروازہ کھلا اور سحر گل اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر عجیب بدحواسی چھائی ہوئی تھی۔ اس بدحواسی کا سبب کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔

آج بھی ہمیشہ کی طرح وہ گلی کے کنارے اپنی بائیک روکے کھڑا اس کا منتظر تھا۔ بلیک پینٹ اور پیلی شرٹ میں اس کا حلیہ اس روایتی عشاق جیسا تھا جو نہ جانے کتنوں کی زندگیوں میں زہر گھول چکے ہوتے ہیں۔ اس کا دم خشک ہونے لگا تھا۔ وہ پورے ایک ماہ سے نہ جانے کہاں سے آکر گلی کے کنارے کھڑا رہتا اور سحر گل جو نہی کالج بس سے اتر کر گلی میں آتی، وہ اسکو ٹر سے اتر کر اسکو ٹر دھیرے دھیرے گھسیٹتا ہوا اس کے پیچھے چلنے لگتا۔ کبھی کوئی گانا گنانے لگتا اور کبھی بہت کچھ کہنے کی خواہش لئے اس کے بے حد قریب سے گزرتا۔ پھر ٹھکنا، پلٹنا اور اسے دیکھ کر بھرپور انداز میں مسکراتا۔

آج بھی وہ اسکو ٹر روکے کھڑا تھا۔ سحر گل کا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔ اس نے قدم اور بھی تیز کر دیئے تھے۔ ہوا سے اڑتی چادر کو اس نے اچھی طرح جسم کے گرد لپیٹ لیا اور چہرہ جھکا کر انجان بنتی اس کے قریب سے گزر کر آگے بڑھنے لگی تو وہ دفعۃً اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”کبھی نظر اٹھا کر دیکھ بھی لیا کیجئے کہ کوئی آپ کے انتظار میں آنکھیں فرشِ راہ کئے کھڑا ہے۔“ اس نے والہانہ نگاہوں سے اس کی سہمی سہمی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا اور پھر ہاتھ میں تہہ کیا ہوا کاغذ اس کے ہاتھ میں پکڑے پرس کے اوپر ڈال کر تیزی سے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اُس کی یہ حرکت اتنی غیر متوقع تھی کہ سحر گل چند ثانیے بھٹی بھٹی آنکھوں سے سامنے دیکھتی رہ گئی۔ پھر اچانک ہوا

کے جھونکے سے کاغذ کی پھڑ پھڑاہٹ پر وہ چونکی۔ سفید تہہ کیا ہوا کاغذ اس سے پہلے کہ ہوا کے جھونکے سے نیچے گر جاتا، اس نے گھبرا کر اسے مٹھی میں جکڑ لیا۔ وہ اسکو ٹر پر بیٹھ کر غائب ہو چکا تھا مگر اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اس کی مٹھی سے پسینے کی لہریں بہنے لگیں۔ دل یوں دھڑ دھڑ کرنے لگا جیسے ابھی ساری پسلیاں توڑ کر باہر آکرے گا۔ رسوائی کا خوف یکلخت ہی اس کے سارے وجود پر طاری ہونے لگا۔ اس نے تھوک نگل کر حلق تر کیا، پھر آہستگی سے چورنگا ہوں سے گلی میں نگاہیں ڈالیں۔ اطراف کے بنگلوں میں گہری خاموشی اور مہیب سناٹا تھا۔ دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس نے اطمینان کا گہرا سانس سینے سے آزاد کیا اور جلدی جلدی بڑے بڑے قدم اٹھاتی اپنے بنگلے کی طرف بڑھنے لگی۔

باہر اُسے دیکھتے ہی اُس کے پالتو کتے بلڈ وگ نے شور مچانا شروع کر دیا تھا مگر وہ اس کے سفید نرم بالوں والے سر پر ہاتھ پھیرنے کی بجائے دھم سے ادھ کھلے گیٹ کو پورا کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

سب ڈرائنگ روم میں لپچ کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ فروان کی باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ پردہ ہٹا ہوا تھا اس لئے وہ سب سے نظر بچاتی ہوئی سیدھی اپنے کمرے کی طرف دوڑی۔

وہ کمرے میں بند ہو کر اپنے بکھرے حواس مجتمع کرنا چاہتی تھی۔ دل کی بے ہنگم دھڑکنوں کو قابو میں کرنا چاہتی تھی۔

ماہ گل آپنی جو کرسی ہٹا کر کھڑی ہوئی تھیں، سحر کو یوں چوری چھپے اپنے کمرے میں بھاگتا دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ نہ اس نے ہمیشہ کی طرح بلند آواز میں امی کو سلام کیا تھا، نہ ہاتھ میں پکڑا پرس یا بیگ سٹنگ روم کے کنارے لگی کرسی پر پٹخا تھا اور نہ امتحانوں کے بوجھ سے آزاد ہونے کی خوشی منائی۔ اس کا یہ خلاف معمول انداز دیکھ کر وہ متحیر رہ گئی۔

”سحر آگئی ہے کیا؟“ امی نے پوچھا تو ماہ گل نے سر ہلا دیا۔



”ہاں، شاید اپنے کمرے میں گئی ہے۔“

”واہ\_\_\_ اتنی خاموشی سے؟ آج تو اس کا آخری پیپر تھا۔ اُسے تو خوب شور شرابے کے ساتھ آنا چاہئے تھا۔“ فروان نیپکن سے ہاتھ صاف کرتا کر سی پیچھے دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔

اس کی آمد کا یہ نیا انداز سب ہی نے محسوس کیا مگر بے حد سرسری انداز میں۔ جبکہ ماہ گل کا ذہن الجھ رہا تھا۔

”جاؤ بلقیس! سحر کو کھانے کے لئے بلا لاؤ۔“ امی نے کچن کی سنک پر برتن دھوتی بلقیس کو پکارا تو وہ جلدی سے سحر گِل کے کمرے کی طرف بڑھی۔

فروان اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ امی پکن میں بکھری چیزوں کو ترتیب دینے میں مصروف تھیں اور ماہ گل سٹنگ روم کے کنارے صوفے میں دھنس گئی تھی۔

”وہ، سحر بی بی کہہ رہی ہیں انہیں بھوک نہیں ہے۔“ بلقیس نے آگرمی کو اطلاع دی۔

”اچھا، چلو۔۔۔ جب وہ کھانے آئے تو تم اُسے دے دینا۔ شاید اس وقت بھوک نہیں ہوگی۔“ امی نے اس غیر معمولی بات کا زیادہ نوٹس نہ لیا۔ مگر ماہ گل کے لئے یہ سب بہت مختلف تھا۔ وہ کچھ سوچ کر اٹھی اور سحر گل کے کمرے کی طرف بڑھی۔ اس کی حسیات بہت تیز تھیں۔ کسی کا خلافِ عادت انداز اس کی چھٹی حس کو بیدار کر دیتا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تو سحر گل انہی کپڑوں میں وہی چادر اوڑھے بستر پر اوندھے منہ پڑی تھی۔

”سحر! کیا بات ہے؟“ ماہ گل نے اس کے سرہانے بیٹھ کر آہستگی سے اس کے شانے پر اپنا نرم ہاتھ رکھا مگر دوسرے لمحے گھبرا گئی۔ ہولے ہولے سسکیاں لینے سے سحر گل کا بدن ہل رہا تھا۔

“! ”

”آپی۔۔۔ آپ۔۔۔“ سحر گل اٹھ بیٹھی۔

”تم — تم رورہی ہو؟“ ماہ گل نے اچنبھے سے اُسے دیکھا۔ اس کا پسینے سے ترچہرے اور سہمی ہوئی آنکھوں میں جھانکا۔ ”کیا بات ہے سحر؟“ اس نے سحر گل کے دونوں شانے تھام کر تشویش کی نظروں سے دیکھا تو ایک لمحے کے لئے سحر گل گھبرا گئی۔ کسی خوف نے اس کا دل اندر سے جکڑ لیا۔ فطری شرم اور ایک انجانے خوف نے اُسے ماہ گل کو سب کچھ بتانے سے گریز کیا۔

”وہ بس بس پپ پپ اچھا نہیں ہوا ہے آج میرا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے چہرہ جھکا لیا۔

ماہ گل کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اس کے اندر جھانک رہی تھیں، اس کے سینے کی تہہ میں چھپے ایک خوف کو محسوس کر رہی تھیں۔ پھر کیسے اس کی بات پر یقین کر لیتی۔

”ہاں آپی! بس اس لئے مجھے رونا آ رہا تھا۔ ورنہ“

”جھوٹ مت بولو سحر! تمہاری معصومیت اور سچی باتیں ہی تو مجھے پسند ہیں۔“ ماہ گل نے اس کا جملہ کاٹ دیا اور اس کا چہرہ اونچا کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھ سے کچھ مت چھپاؤ سحر! بتا دو سب کچھ۔ میں تمہاری اچھی دوست بھی تو ہوں نہ شہابش!“

سحر گل نے کرب سے لب کاٹ لئے، شرم سے اس کا چہرہ تپنے لگا۔

”آ۔۔۔۔۔ پی۔۔۔۔۔ بخدا میں نہیں جانتی اُس کو۔۔۔۔۔ وہ خود ہی بہت دنوں سے اسکوٹر پر گلی کے کنارے کھڑا ہوتا ہے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں سے جھڑی بہہ نکلی۔

”مم۔۔۔۔۔ میں نے کبھی غور سے بھی نہیں دیکھا آلی! آج یہ خط اُس نے میرے پرس کے اوپر پھینک دیا۔“

اس نے تکیے کے نیچے سے تڑاڑ پرچہ نکال کر ماہ گل کی طرف بڑھایا تو ماہ گل کا دل پوری قوت سے دھڑکا۔ دل سکڑا اور پھیلا اور رگوں میں خوف کے خدشے دوڑ گئے۔ اس نے پرچہ سحر گل کے ہاتھ سے لے کر کھولا اور پڑھنے لگی۔

وہی بے ہودہ اور گھسے پٹے فلمی ڈائلاگ سے بھرا محبت نامہ تھا۔ محبت کے موضوع پر بے لاگ تبصرے۔ خود کو مجنوں اور فرہاد سے زیادہ بہترین عاشق اور با وفا ظاہر کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی۔ ماہ گل نے لب بھینچ لئے اور ایک گہری سانس لے کر خط بند کر دیا۔ اس کی شریانوں میں دُکھ گردش کرنے لگا۔ نوجوانوں کی اس بے راہ روی پر وہ کٹ کر رہ گئی۔

اس نے خط کو مٹھی میں جکڑ لیا اور ایک نظر سحر گل پر ڈالی۔ وہ ایک نازک دور سے گزر رہی تھی۔ نرم و نازک شاخ کی مانند۔ جو کسی بھی تیز جھونکے سے جھک سکتی تھی، ٹوٹ سکتی تھی۔ اور جب اس نازک عمر میں حُسن کا بے ساختہ پن بھی ہو تو اچھے اچھوں کی عقلیں خط ہو جاتی ہیں۔ پاکیزہ اٹھنے والی نگاہیں بھی بہک جاتی ہیں۔ چھلکتی، لہکتی عمر جو کسی بڑے امتحان کی متحمل نہیں ہوتی اور پھر دنیا کسی وسیع منہ زور سمندر کی طرح ان کے آگے پھیلی ہوتی ہے۔

کوئی منہ زور موج اسے اپنی طرف کھینچ سکتی ہے۔ اگر ساحل پر کوئی ہاتھ تھا منے والا نہ ہو تو ڈوب جانا یقینی ہوتا ہے۔ اور وہ ہر حال میں سحر گل کا نازک ہاتھ تھام کر رکھنا چاہتی تھی۔ کسی ماں کی عمر بھر کی ریاضت ایک نازک برتن کی طرح چھناکے سے ٹوٹ جائے، یہ کب گوارا ہوگا۔

اس نے بہت نرمی اور شفقت سے سحر گل کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”اچھا کیا تم نے مجھے بتا دیا۔ اب اس کا توڑ مجھے ہی کرنا ہوگا۔“

”آ۔ آپ کیا کریں گی؟“ سحر گل کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ بڑی بڑی خم دار پلکوں کو بغیر چھپکائے ماہ گل کو دیکھنے لگی۔

”سوچوں گی اس کے بارے میں بھی۔“ ماہ گل اٹھنے لگی تو سحر نے جلدی سے اس کا بازو تھام لیا۔

”نن۔۔۔۔۔ نن۔۔۔۔۔ نہیں آپ! ایسے مرد بہت برے ہوتے ہیں۔ اگر اس نے۔۔۔۔۔ نہیں آپ! آپ کچھ مت کیجئے گا۔“

”سحر!“ ماہ گل نے اس کا جملہ کاٹ دیا۔ اس کی آنکھوں میں شرارے بھر گئے۔ ایسے آوارہ اور بد چلن مرد نہ جانے کتنی لڑکیوں کو اس طرح تعلیم سے محروم کر دیتے ہوں گے اور کتنوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا لیتے ہوں گے۔ اس کا توڑ ہونا چاہئے۔ سزا لڑکی کو نہیں، ایسے اوباش کو ملنی چاہئے کہ وہ آئندہ عبرت کدہ بن جائیں ہر نظر کے لئے۔ ماہ گل کا چہرہ غصے سے تپ اُٹھا۔

”تت۔۔۔۔۔ تو آپ۔۔۔۔۔ زرز۔۔۔۔۔ زمان بھائی سے کہہ دیں گی؟“ سحر گل کا دم خشک ہونے لگا۔

”ارے نہیں بے وقوف۔“ ماہ گل اس کے خوف پر ہولے سے مسکرا دی پھر اسے تھپک کر بولی۔

”میں سوچوں گی کوئی حل۔ فی الحال تو تمہارے ایگزام ختم ہو گئے ہیں، تم گھر میں ہی ہونا۔ بس ریلیکس رہو۔“

ماہ گل اُسے تسلی دے کر کمرے سے باہر آگئی۔ اس کا ذہن سخت منتشر ہو رہا تھا۔ اس خط نے اس کے اندر آگ بھردی تھی۔ نہ جانے کن والدین کی ایسی بے راہ روا و اولاد ہوگی۔ ملک کی روح کو زندگی بخشنے والے نوجوان ملک میں تیرگی پھیلا رہے ہیں۔ نوجوانوں کی ایسی حرکتوں پر اس کا دل ماتم کرنے لگا۔ اب اُسے ہی کوئی حل سوچنا تھا۔ وہ اپنے گھر کی جانب بڑھتی رسوائی کے قدم وہیں روک دینا چاہتی تھی۔

...☆☆☆...

اشمل خان گل بی بی سے مل کر واپس حویلی آیا تو احسن کا فون آگیا۔ اس نے یونیورسٹی کھل جانے کی اطلاع دی تھی۔

چنانچہ وہ دوسرے دن ہی واپس شہر جانے کی تیاری کرنے لگا تھا۔

شاہ خانم کے پاس رات کے بعام کے بعد آیا تو شاہ خانم نے منہ پھیر لیا۔ اس کے جانے پر وہ اس سے خفا تھیں جس کا برملا اظہار کر دینا چاہتی تھیں۔

”کیا ضرورت ہے تمہیں ہاسٹل میں رہنے کی \_\_\_ اتنے سال تو مجھ سے دور رہے ہو۔ یاد نہیں آتی میں؟“

”یہ بات نہیں ہے شاہ خانم! میں یکسوئی سے پڑھنا چاہتا ہوں \_\_\_ اور اب تو میرا آخری سال ہے۔ پھر تو مجھے تا عمر حویلی میں ہی رہنا ہے۔“

”تم ایک سال کی بات کر رہے ہو، میں تو ابھی تمہارے جانے پر خفا ہوں۔“ شاہ خانم نے اسے دیکھا پھر اپنی مخصوص کرسی پر تن کے بیٹھ گئیں۔ ”تمہارے آنے سے اس حویلی میں کچھ رونق ہو گئی تھی۔“

”آپ کے پاس اشترا ہے \_\_\_ پھر ذولین بھی تو ہے۔“ اشمل نے دانستہ ذولین کا ذکر کیا تو شاہ خانم کا چہرہ تن گیا۔

”ذولین کا نام مت لومیرے سامنے \_\_\_“ انہوں نے اشمل خان کو بری طرح جھڑک دیا۔ مگر اشمل ان کی ڈانٹ پر خاموشی اختیار کرنے کی بجائے ان کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

”کیوں شاہ خانم؟ \_\_\_ کیوں آپ ماضی کی وہ تلخ کتاب بند نہیں کر دیتیں؟ بلا تقصیر کے ذولین کو کیوں سزاوار سمجھتی ہیں؟“

”اشمل \_\_\_ بند کرو یہ موضوع۔“ شاہ خانم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ غصے سے کرسی سے کھڑی ہو گئیں۔

”نہیں بند کر سکتا میں یہ موضوع۔ بات کرنا چاہتا ہوں میں ذولین کے بارے میں۔“

”تو کرو اپنے باپ سے اس موضوع پر بات۔ میرا ذولین سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔“ شاہ خانم نے نخوت سے لب

بھیج لے اور دھم دھم کرتیں کمرے سے باہر نکل گئیں۔

اشمل غصے سے مٹھیاں بھینچتا الجھ کر شاہ خانم کو جاتے دیکھ رہا تھا۔

اشترا جو کنارے کھڑی ماں اور بیٹے کی یہ تلخ کلامی سن رہی تھی، اشمل کے قریب چلی آئی۔

”جاتے جاتے آپ کو شاہ خانم سے تلخ نہیں ہونا چاہئے تھالا! کسی تلخ بات کو بھلانے اور نفرت کو ختم کرنے کے لئے اتنے ماہ و سال کافی ہوتے ہیں۔“

اشمل نے اُسے دیکھا۔ اس کی ستار آنکھیں بجھی ہوئی تھیں اور ان میں دُکھ گردش کر رہا تھا۔

”نفرتوں کے یہ دروازے اگر بند ہو سکتے تو میں ہی سب سے پہلے آگے بڑھتی۔ یہ ذولین سے نفرت میرے دل میں تیر کی طرح پیوست ہوتی ہے۔“ اشترا کے لب کانپ گئے۔

اشمل بری طرح چونکا اور چند لمحے اس کا جھکا ہوا سراسی انداز میں رہ گیا۔ وہ عجیب نگاہوں سے اشترا کو تنکے لگا۔

”اش \_\_\_ تارا \_\_\_ کہیں تم \_\_\_ ذولین سے \_\_\_“ اشمل نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور اشترا بری طرح گھبرا گئی۔

یہ اشمل لالہ کے سامنے اس نے کیا کہہ دیا \_\_\_ کہیں اس کی آنکھیں، اس کا چہرہ وہ راز طشت از بام تو نہیں کر رہا جس کو وہ امانت کی طرح چھپاتی رہی تھی۔ اس نے جلدی سے پلکیں جھکا دیں اور قدم دروازے کی طرف بڑھا دیئے۔

”اشترا!“ اشمل نے اُسے پکارا تو وہ رک گئی اور پلٹ کر بولی۔

”پلیز اشمل لالہ! کوئی سوال مت پوچھئے۔ میں کسی جواب کی متحمل نہیں ہو سکتی۔“ اس کا لہجہ ملتیانہ تھا۔ وہ رکی نہیں اور قدم اٹھاتی کمرے سے نکل گئی۔



اشمل خان تھیر کے عالم میں گھر کر رہ گیا۔ اشتار کی آنکھوں میں مہکتے ذولین کے نام کے رنگ بہت واضح تھے۔ وہ لاکھ لبوں پر قفل لگائے رہی تھی مگر آج اس نے اس کی آنکھوں میں لکھی وہ تحریر پڑھ لی تھی۔

وہ چند ثنائے سُن سارہ گیا۔ پھر کرب سے لب بھینچ لئے۔ ’نہ جانے کیوں ہم جانے بوجھے صاف راستوں کو چھوڑ کر پُر پیچ راستے کا ہی انتخاب کرتے ہیں۔‘

پابندیوں کی زنجیریں جتنی مضبوط ہوتی ہیں، بغاوتوں کے علم اتنے ہی بلند ہوتے جاتے ہیں۔

وہ اپنی ساری حیرانگیاں، ساری سوچیں اپنے ذہن و دل سے جھٹک کر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

دوسرے دن ہی وہ شہر چلا گیا۔ شاہ خانم سے اپنی کج خلقی کی ڈھیروں معافیاں مانگ گیا تھا اور بہت جلد دوبارہ آنے کا وعدہ کر گیا تھا۔

اشتار کو لگا جیسے وہ اپنے ہمراہ یہ دکتارنگ اور روز و شب کی ساری رونقیں سمیٹ کر لے گیا ہو اور ایک گردشِ لیل و نہار چھوڑ گیا تھا۔

وہ سخت بے کل ہو گئی تھی۔ ایسے میں وہ لان میں ٹہلتے ٹہلتے ذولین خان کی انیکسی کی طرف آگئی۔

ذولین خان اس وقت انیکسی میں موجود نہیں تھا مگر اس کا دروازہ نیم وا تھا۔ وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر آگئی۔ صاف ستھری انیکسی میں گہرا سکوت تھا مگر ایک عجیب سی مدھر خوشبو بکھری ہوئی تھی جس سے وہ نمانوس نہ تھی۔ وہ جب بھی انیکسی میں آتی عجیب سے احساسات اُسے گھیر لیتے۔

کبھی بہت کچھ کھولنے کا غم حاوی ہو جاتا تو کبھی سب کچھ پالنے کا عزم نہ ہوتا۔ نئے اور انوکھے جذبے پھر پیدا ہونے لگتے اور اس کے ساتھ ڈھیر سارا کرب بھی روح میں سمٹ آتا۔

اس نے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو حیران رہ گئی۔ خاردار جھاڑیوں اور مہیب سنائے سے سجالان کا پچھلا حصہ اس کے سامنے تھا۔ عجیب ویرانی اور الجھی الجھی شاخوں کی سوکھی ٹہنیاں اور درختوں سے گرے ہزاروں خشک پتے ایک نامہربان گوشے میں جمع تھے۔

اُس نے پیلی گھاس اور اُجاڑے اس صحرا جیسے باغ کو دیکھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے بہاروں نے ادھر کا کبھی رُخ ہی نہیں کیا ہے۔ ایسا لگا جیسے ذولین خان کے دل پر بھی ایسے ہی خزاں آلود موسم نے بسیرا کر لیا ہے۔ یکخت اس نے گہرا کر درتچے کے دونوں پٹ بند کر دیئے۔ اس کے دل میں نمانوس سی وحشت چھانے لگی۔

’دلوں کی ویرانیاں اور اندھیرے کم کرنے کی سعی کے لئے انسان اُجالے اور مسرتوں کی جانب بھاگتا ہے اور تم۔‘ اُس نے تصور میں ذولین کو مخاطب کیا۔ ’اپنے اندر مزید اُداسیاں، ویرانیاں سمیٹ رہے ہو۔‘ یہ اُجاڑا جھاڑ منظر تو زندگی کی رنگینیوں کو ڈھونڈنے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔‘ اس نے جلدی سے درتچے کا بولٹ چڑھا دیا۔ یوں جیسے اب یہ کبھی نہیں کھلے گا۔

اچانک گھڑی کے الارم نے اُسے چونکا دیا۔ وہ گھبرا گئی اور جلدی سے پلٹ کر داخل دروازے کی جانب بڑھی۔ مگر پھر ٹھٹک گئی۔ سرسری اُٹھتی نگاہ ریک پر پڑے اپنے زرد رومال کی طرف اٹھی جو سلیقے سے تہہ کیا ہوا رکھا تھا۔ اپنا رومال یہاں دیکھ کر اُسے حیرانگی کا شدید جھٹکا لگا۔ یہ رومال وہ اکثر اپنے سنہری بالوں میں لگایا کرتی تھی۔ پھر یہ رومال اسے کہیں نظر نہ آیا اور آج اس کو یہاں ایک ظالم، نامہربان شخص کے کمرے میں اتنی حفاظت سے تہہ کیا ہوا دیکھ کر حیرانگی کا غلبہ فطری عمل تھا۔

وہ تیزی سے ریک کے قریب آئی اور اپنا رومال اٹھا لیا۔ مگر پھر اس کے نیچے سیاہ مخملی جلد والی ڈائری دیکھ کر اُس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ نہ جانے کیوں اُسے محسوس ہوا جیسے یہ ڈائری بہت اہم ہو اور اسے بہت حفاظت سے رکھا



گیا ہے۔

مگر ایک ایسا شخص جو زندگی کی لطافت اور نازک احساسات سے کوئی واسطہ نہ رکھتا ہو، جس نے ہمیشہ حُسن و عشق کے درپچوں میں جھانکنے سے گریز ہی کیا ہو اس کے پاس اس کی گنجائش ہی کہاں کہ وہ کوئی نازک احساسات ڈائری میں قلم بند کرے۔

اُس نے ذولین خان کے سرد مہر وجود کو نگاہوں میں لا کر سوچا مگر اس کے باوجود دل کے اندر یہ خواہش مچلی کہ وہ یہ ڈائری کھول کر دیکھے کہ جو شخص ایک گہرے سمندر کی طرح تھا، کسی سربستہ راز کی طرح شاید اس کی زندگی کے کچھ ورق اس کے سامنے کھل جائیں۔ اُس نے بے حد اہستگی سے اپنے نرم نرم ہاتھوں سے وہ گداز مٹھی ڈائری اٹھالی اور دھیرے سے کھول لیا۔!

وہ ڈائری اس کے سامنے کھلی پڑی تھی۔ جس کے پہلے صفحے پر ایک دمکتی نظم اُس کی خوبصورت ہینڈ رائٹنگ میں تحریر تھی۔

تیسری آہٹ

سلگتی دوپہر کو ایک پل میں شام کرتی ہے

اُترتی ہے سوادِ ہجر میں کچھ اس طرح جیسے

صدائے آشنا کوئی

گھنے، گہرے اندھیرے جنگلوں کی بے یقینی میں

روشنی کا کام کرتی ہے

آہ۔۔۔ مگر اب یہ خوبصورت آہٹ کئی دنوں سے میری سماعتوں میں رس گھولنے نہیں آئی۔ شاید اشتار خان نے میری بے اعتنائی اور کج خلقی سے سہم کر اپنے قدم پیچھے ہٹائے ہیں۔

میری سرد مہری نے اس کے نازک دل پر بہت کاری وار کئے ہیں۔ مگر اس کی ستار آنکھیں میرے دل کے اندر پلتے شوریدہ جذبوں کو دیکھ ہی نہیں پاتیں۔

مگر نہیں۔۔۔ قصور اس کا کہاں ہے۔ میں نے اپنے جذبوں پر سرد مہری اور بے اعتنائی کے اتنے دبیز پردے لگا رکھے ہیں۔ مگر اب ایسا لگتا ہے جیسے وہ سارے پردے دھیرے دھیرے

اُٹھ رہے ہیں۔ میں ہار گیا۔۔۔ اشتار خان کی لامتناہی چاہت کے سامنے اور معصوم محبت کے آگے۔

مگر اس بار کوئی ملال، کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔۔۔

اشتار ان انکشافات کی منہ زور لہروں میں چکرا کر رہ گئی۔ یہ ذولین خان کی تحریر تھی۔ جس نے اپنے دلی جذبات کھول کر اس میں بکھیر دیئے تھے۔ اس نے الٹ پلٹ کر بے یقینی سے دیکھا تو آگے لکھا تھا۔

”اشتار“ جو میرے لئے زندگی سے بھرپور نام ہے اور ایسا طمانیت انگیز نام جس کی خوشبو میرے اندر باہر اُجالے بکھیر دیتی ہے۔

میں وہ شام نہیں بھولا جب وہ آبخار کے قریب پتھر پر بیٹھی چھوٹے چھوٹے پھولوں کو عجیب بے چینی سے ایک ایک کر کے نوچے جا رہی تھی۔ پھر اچانک اُس نے دزدیدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا تو ان نشیلی آنکھوں کا فسوس میرے اندر شعاعیں سی بھر گیا۔۔۔ اس کی ملکوتی آنکھوں کی روشنی میرے دل کے در و دیوار پر پھیل گئی اور مجھے لگا جیسے میرے چاروں طرف اُجالا ہی اُجالا ہو گیا ہو۔



ذولین خان کی محبت کے احساس نے اس کے چہرے کو گلنار بنا دیا تھا۔ اس کا حُسن دوچند ہو گیا تھا۔ آنکھیں خمار آلود ہو گئی تھیں۔ چہرہ فطری حیا سے جھکتا چلا جا رہا تھا۔

ذولین خان بغیر پلکیں جھپکائے اُسے دیکھتا رہا۔

پھر اچانک وہ پلٹی اور انیکسی کے داخلی دروازے کی جانب بھاگی۔

☆☆☆...

الیکشن کی رونق اپنے عروج پر تھی۔ جگہ جگہ پولنگ بوتھ قائم تھے جن کو طلبہ و طالبات گھیرے ہوئے تھے۔

آج ہر پارٹی کے ممبرز کے دل کی رفتار عام دنوں سے مختلف ہو رہی تھی۔ جیت یا ہار کی خبر سننا تھی۔ نہ صرف پارٹی کے ممبران بلکہ ہر اسٹوڈنٹ آج ہر درجہ متجسس اور ایکٹو تھا۔ ہر اسٹوڈنٹ اپنے آپ کو اہم شخصیت سمجھ رہا تھا چونکہ اپنے ووٹ کی قدر و قیمت سے آگاہ تھا۔

پارٹیز کے اسپورٹرز اب بھی سب کو کنوینس کر رہے تھے۔ آخری وقت تک ایڑی چوٹی کا زور لگانے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف تھے۔ اس ساری افراتفری، شور شرابے سے بے نیاز ہشمنہ ابراہن آفس میں بیٹھی تھی۔ اس کے دل کی حالت عجیب تھی۔ نہ اس کے اندر وہ پہلی سی گرم جوشی تھی نہ ہار کا خدشہ تھا اور نہ جیتنے کی اُمنگ۔

ریحان پراچہ کی غلط بیانی پر اُس کا سارا جوش، وہ سارا تپاک سرد پڑ گیا تھا۔ وہ سخت ملول ہو گئی تھی۔ اُسے گہرا شک پہنچا تھا۔ سراج کیانی نے اسے بچہ سڑک پر صاف کہہ دیا تھا کہ وہ سب ہنگامہ اس نے ریحان کی ایما پر کیا تھا۔ اس کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں کس لیا ہو۔ سیکرٹری ہونے کے ناطے اس نے اپنی پارٹی کی پارسائی ثابت کرنے، اسے اونچا مقام دینے کے لئے جلسوں میں کیا کچھ نہ کہا تھا۔ وہ سب کتنا بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ ایسی سستی اور اوجھی سیاست کرنا اس کو سخت ناپسند تھا۔ اس نے اپنی پارٹی کی ساکھ مضبوط کرنے کے لئے انتھک محنت کی تھی۔ مخالف پارٹی کے

لیڈر اشمل خان کے طنز سہے تھے۔ محض ریحان پراچہ کی خاطر، اُس کو یونین کا صدر بنانے کے لئے اس نے ساری کلفتیں برداشت کیں۔ مگر ریحان پراچہ کی ذات کا یہ پرت آج اس کے سامنے کھلا تو وہ دنگ رہ گئی۔ ساری اُمنگیں، ساری گرم جوشی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ اُسے اب کوئی سروکار نہ تھا کہ کون سی پارٹی جیت رہی ہے اور کون شکست کا منہ دیکھے گا۔

وہ سخت کبیدہ سی کرسی میں دھنسی بیٹھی تھی۔ تبھی ندرت اس کے پاس آ بیٹھی۔

”کیا بات ہے ہشمنہ؟“ وہ اُسے یوں پڑمردہ دیکھ کر متحیر رہ گئی۔ ایک سرگرم عمل سیکرٹری کو عین الیکشن کے دن اتنا بد دل دیکھ کر وہ عالم تحریر میں گھر گئی۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“ میں تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ میں سمجھ رہی تھی کہ تم کہیں اسٹوڈنٹس کو کنوینس کرنے میں مصروف ہو گئی۔“ ندرت اپنا بیگ ٹیبل پر پٹچ کر اُس کے سامنے میز پر ہی بیٹھ گئی۔ اُس نے اشمل خان کی پارٹی کے ڈھیر سارے بیجز لگا رکھے تھے اور اس کے جھنڈے کے رنگ کا دوپٹہ پہن رکھا تھا۔

ہشمنہ نے اُسے دیکھا مگر برہمی کا کوئی تاثر اس کے چہرے پر نہیں اُبھرا۔ اُس نے تو محسوس ہی نہ کیا کہ وہ آج یو تھ فیلڈریشن کا چلتا پھرتا اشتہار بن آئی ہے۔

”کیا بات ہے ہشمنہ؟“ ندرت اُس کی مسلسل خاموشی پر تشویش سے بولی تو اُس نے ایک گہرا سانس سینے سے آزاد کیا۔

”بس سکون کی طلب ہو رہی تھی۔ اس لئے یہاں آ بیٹھی۔“

”کیا؟“ آج اور سکون کی طلب؟“ ندرت زور سے ہنسی۔ پھر اس کی جانب قدرے جھکتے ہوئے بولی۔ ”ڈیر! برا مت ماننا، آج تو لگتا ہے ریحان پراچہ کی پارٹی کے کسی بھی ممبر کو سکون شاید ہی نصیب ہو۔ آئی تھنک اشمل خان ہی



و کٹری اسٹینڈ پر پہنچے گا۔۔۔ ہی از دی نیچرل ونر۔“ ندرت نے انگلیوں سے وکٹری کا نشان بناتے ہوئے کہا تو ہشمنہ ابرار کے دل کو دھچکا سا لگا۔ بہر کیف وہ اپنی ڈھیر ساری محنت کو رائیگاں ہوتے دیکھنے کا دکھ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اُس نے اپنی پوری آنکھیں کھول کر ندرت کو دیکھا۔

”تم یہ کس طرح کہہ سکتی ہو؟ یہ تو کاؤنٹنگ کے بعد ہی فائنل ہو گا۔“

”بھئی میں تو اپنے اندازے کے مطابق کہہ رہی ہوں۔“ ندرت میز سے اتر کر کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکنے لگی۔

باہر ایک افراتفری اور بے قراری کا عالم تھا۔۔۔ یوں لگتا تھا جیسے زندگی کی ساری رونق، ساری بے قراری یہیں سمٹ آئی تھی۔

ندرت کی آنکھوں میں بھی زندگی تھرکنے لگی۔

”چلو ہشمنہ! باہر چلتے ہیں۔“ وہ پلٹ کر بولی اور کھڑکی کا پٹ بند کر کے ہشمنہ کی طرف آگئی۔ ”تم یوں دبی بیٹھی ہو۔ مجھے تو لگتا ہے دال میں کالا ضرور ہے۔ ورنہ تم اتنی مردہ دل تو نہیں ہو۔ اور کم از کم آج کے دن یہ گہری ادا سی۔“ ندرت کھوجتی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ ”ہے نا کوئی بات؟“ وہ قدرے اس کی سمت جھکی۔

”فضول۔۔۔ کوئی دال میں کالا والا نہیں ہے۔“ وہ اُسے دھکیل کر کھڑکی ہو گئی اور پھر چادر کو اچھی طرح لپیٹ کر چھوٹا سا بیگ کندھے پر ڈال کر اس کے ساتھ باہر آگئی۔

”دیکھو تو اسٹوڈنٹ کیسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہم دونوں کو دیکھ رہے ہیں۔“ ندرت اپنے اطراف اچھتی نگاہ ڈال کر ہنس کر بولی۔

”کہاں شامل خان کی پادٹی کی کارکن اور کہاں ینگ جنریشن فیڈریشن کی سرگرم سیکرٹری۔۔۔ شاید لوگوں کو ہم

دونوں کا یوں ساتھ ساتھ چلنا اچھا نہیں لگ رہا۔“ وہ دونوں دھیرے دھیرے چل رہی تھیں۔

”ٹھیک ہی تو ہے۔۔۔ مجھے تو ویسے بھی تم سے بات تک نہیں کرنی چاہئے۔ آج تم مکمل یو تھ فیڈریشن کا جھنڈا بن کر آئی ہو۔“ ہشمنہ نے اُسے تیز نظروں سے گھورا تو وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگی۔

”آخا۔۔۔ مس ہشمنہ ابرار! کیا آپ اپنے قیمتی ووٹ سے ہمیں محروم رکھیں گی؟“ احسن نہ جانے کہاں سے اٹکا۔ وہ ہمیشہ کی طرح دل جلانے والے انداز میں بولا تو ہشمنہ نے ہونٹیں کڑک کر ناگواری سے اُسے دیکھا۔

”میرا ووٹ اور آپ کے نام۔“

”جی۔۔۔ ہماری تنظیم کے نام۔“ اُس نے سرخم کرتے ہوئے کہا تو ہشمنہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

”مسٹر احسن! آپ کو اتنی خوش فہمی کب سے ہو گئی کہ میں، یعنی ینگ فیڈریشن کی سیکرٹری، شامل خان کے حق میں ووٹ دوں گی؟“ اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ مگر احسن ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔

”بھئی ندرت صاحبہ! میں تو آپ کی فرینڈ کو بہت باشعور سمجھتا تھا۔“ وہ ندرت کی طرف مڑتے ہوئے بولا تو ندرت بے ساختہ ہنسی کو روک کر جلدی سے بولی۔

”تو ٹھیک ہی سمجھتے تھے۔ ہشمنہ ابرار جتنی باشعور ہے، اتنی ہی غیرت مند بھی۔ وہ اپنی پادٹی سے بے وفائی نہیں کر سکتی۔ آپ جیسے لوگ اس کے قدم نہیں ڈگما سکتے۔“

”چہ۔۔۔ خوب۔“ احسن پُر زور انداز میں منسا۔

”چلو ندرت!“ ہشمنہ، ندرت کو مزید بولنے پر تیار دیکھ کر اُسے تقریباً کھینچتی آگے بڑھ گئی۔

”شامل خان کی پادٹی کی سرگرم کارکن صاحبہ! میری حمایت میں بول کر تم کیا ایکسپوز کر رہی تھی؟“ وہ منہ بنا کر



بولی تو ندرت اچھلی۔

”آں\_\_\_\_\_ہاں\_\_\_\_\_کیا\_\_\_\_\_کیا مطلب تمہارا؟“

”ظاہر ہے تم میری حمایتی تو قطعی نہیں ہو\_\_\_\_\_ورنہ اپنا ووٹ میرے حق میں ہی دیتیں۔“

”اف\_\_\_\_\_میں تمہیں کیسے سمجھائوں؟“ ندرت کی آنکھوں میں اُلجھن اتر آئی۔ وہ سر پکڑ کر بے بسی سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر سنجیدگی سے بولی۔ ”دیکھو ہشمنہ! دوستی اور رشتے ناطے اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ مگر ووٹر پر ایک بہت بھاری ذمہ داری ہوتی ہے جو اسے مکمل غیر جانبدار ہو کر نبھانا ہوتی ہے۔ میں جانتے بوجھتے ایک ایسے شخص کے حق میں ووٹ کیسے دے دوں جو اسٹوڈنٹس کے مسائل کے حل میں مخلص نہیں ہے۔ محض مفاد پرستی اور شوائف کے لئے الیکشن میں کھڑا ہوا ہے۔ ریحان پر اچہ کے بارے میں تم اتنا نہیں جانتیں جتنا میں جانتی ہوں۔“

ندرت یہ کہہ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی جہاں اُلجھن کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

وہ ندرت کی اس بات کو جھٹلانے کی بجائے اس کی سمت دیکھتے ہوئے کچھ سوچ کر بولی۔

”اشمل خان کتنا مخلص ہے اس کا اندازہ تمہیں کس طرح ہے؟“ وہ لا بھریری کے کشادہ شفاف زینے پر بیٹھ گئی۔

”ایک ووٹر ہونے کے ناطے میں دونوں میں سے بہتر اشمل خان کو سمجھتی ہوں۔ بظاہر اس کا کردار صاف رہا ہے۔ اور

پھر میں اشمل خان کے مخلص ہونے کا دعویٰ تو نہیں کر رہی ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ وہ اسٹوڈنٹس کے لئے کتنا

ایماندار ہے مگر\_\_\_\_\_“ وہ ایک لمحہ رک کر پھر اس کے قریب زینے پر بیٹھ گئی ہے۔ ”کچھ بھی ہے، اس کا منشور حقیقت

پسندانہ ہے۔ اور ابھی تک اس نے جلسے میں جو کچھ کہا ہے اس پر عمل بھی کیا ہے۔ پھر ریحان پر اچہ کی طرف سے

پھیلانی گئی وہ بدامنی کسی بھی امن پسند طالب علم سے چھپی نہیں ہے۔“ اس نے آخری جملہ طنزیہ انداز میں کہہ کر

ہشمنہ کو دیکھا۔

ہشمنہ نے لب بھینچ لئے۔ وہ واقعہ تو خود اس کے ذہن کو بھی جھنجھوڑے دے رہا تھا۔

”ہشمنہ ابرار! ریحان پر اچہ نے تمہیں اتنا چکا چوند والا بڑا عہدہ دے کر دراصل تمہیں اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔ تم

محض اب بے وفائی سے گریزاں ہو۔ ورنہ تو تمہارے لئے بھی ینگ فیڈریشن میں کوئی چارم نہیں ہے۔“

”شٹ اپ۔“ اس نے ندرت کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ”میں قطعاً کسی اُلجھن میں گرفتار نہیں ہوں۔“ اُس نے جلدی سے اضطراب پر خفگی کا پردہ ڈال دیا اور ندرت کو تیوری چڑھا کر دیکھنے لگی۔ وہ اپنی کمزوری یا پریشانی ندرت پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”تم سب کے بارے میں بے تکی اندازے لگانے میں بہت ماہر ہو گئی ہو۔“ وہ برہمی سے اُسے دیکھتی کھڑی ہو گئی۔

”تو کیا واقعی تم ریحان پر اچہ کو اشمل خان سے بہتر سمجھتی ہو؟“ ندرت اُس کی کلائی پکڑ کر اُس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

ہشمنہ کا چہرہ یکلخت کسی احساس کے تحت تپ اٹھا۔ اس نے اپنی لابی لابی پلکیں اٹھا کر ندرت کو دیکھا۔ کیسے دل جلانے والے انداز سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میں صورت کی بات نہیں کر رہی۔“ ندرت نے وضاحت کی، پھر زور سے ہنس پڑی۔

”تم اشمل خان کو میری چڑبند ہی ہو\_\_\_\_\_“ ہشمنہ اس کے ہاتھ سے اپنی کلائی چھڑاتے ہوئے تند لہجے میں بولی اور

رُخ پھیر لیا۔ نہ جانے کیوں ندرت کی آنکھوں میں مچلتی شرارت نے اُسے نروس کر دیا تھا\_\_\_\_\_اُسے لگا جیسے وہ اس

کے اندر کہیں جھانک رہی ہے۔ اور شاید وہ جذبے ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہے جو اشمل خان کے نام کے ساتھ

اس کے دل کے ساحل پر مچل رہے ہوں۔ ایک عجیب ہیجان خیز احساس اُسے اپنی گرفت میں لینے لگا۔

ندرت بھرپور انداز میں ہنستے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”چڑھوں\_\_\_ خوب کہی تم نے بھی۔ اگر اس چڑکی جگہ کوئی اچھا سادو سراجملہ لگا دوں میں تو؟“

”لگتا ہے تمہارے پاس فضول باتوں کا خاصا سٹاک جمع ہے\_\_\_ میں نے ابھی تک ووٹ نہیں دیا۔“ ہشمنہ اُسے تنیکھی نظروں سے دیکھتی بولی اور زینہ اتر کر آگے بڑھ گئی۔

”ہشمنہ ابرار! تم جیسی پاگل اور معصوم لڑکی میں نے آن تک نہیں دیکھی۔ میری باتوں کی اہمیت تمہیں ایک دن ضرور محسوس ہوگی۔ محض انا کا مسئلہ بنالیا ہے تم نے۔ ورنہ تو شامل خان نے تمہیں بہت نہ سہی، کچھ امپریس ضرور کیا ہے۔“ ندرت ہنستی ہوئی بولی۔ مگر ہشمنہ سنی ان سنی کر کے آگے بڑھ گئی۔

”گدھی لڑکی\_\_\_“ ندرت پیر پچ کر اُسے جانا دیکھتی رہی۔ پھر خود دوسری طرف جانے لگی۔

جوں جوں وقت سرکتا گیا، اسٹوڈنٹس کے دلوں میں عجیب عجیب احساسات جاگنے لگے۔ ہار یا جیت کس کا مقدر بنتی ہے؟\_\_\_ ایک اشتیاق سب کی آنکھوں میں پھیل گیا تھا۔

ہشمنہ کا بجھا ہوا دل بھی بیدار ہونے لگا۔ بہر کیف اُس نے اپنی فیڈریشن کے لئے سر توڑ محنت کی تھی۔ ایک ایک لمحہ اپنی تنظیم کا پرچم بلند کرنے کے لئے صرف کیا تھا۔ اب نتائج کی ساعت قریب تھی تو وہ کیسے غافل رہ سکتی تھی۔

بالآخر انتظار کی نامہربان ساعتیں بھی ڈھل گئیں۔ کوئی پانچ بجے کے قریب نتائج کا اعلان ہوا اور شامل خان خل زئی بھاری اکثریت سے فاتح قرار دیا گیا۔ یونیورسٹی میں ایک شور ہنگامہ مچا ہوا چہاڑیواری کو دہلائے دے رہا تھا۔ شامل خان کی فتح پر مسکراتے چہرے اور کھنکھتے قہقہوں نے جیسے آسمان سر پر اٹھالیا تھا۔

”یاد شامل! یہ اتنی بڑی خوشی مجھے تو سنبھالنی مشکل ہو رہی ہے۔ تم دیوانے کیوں نہیں ہوئے؟“ احسن اُس کے

مسرور اور مطمئن چہرے پر نگاہ ڈال کر مسرت سے مغلوب لہجے میں بولا تو وہ ہنس پڑا۔ آج اس کی ہنسی میں سارے جہاں کی شادابی اور شگفتگی گھلی ہوئی تھی۔

”صد شکر کہ مجھے اپنے جذبات پر کنٹرول ہے\_\_\_ دیوانہ بن گیا تو میرا وجود سب کے لئے بیکار ہی ہوگا۔“ اس نے کرسی سے اٹھ کر احسن کی پیٹھ تھپکی۔ ”تم بھی دیوانگی کو پرے ہی رہنے دو مائی ڈیئر فرینڈ! ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ سب کی توقعات پر پورا اترنا ہے۔ اور جس دن ہم واقعی کچھ کر دکھائیں گے اور سب کی توقعات پر پورا اتریں گے، دراصل وہی دن ہماری فتح کا ہوگا۔“

اس نے بے حد متانت سے کہا۔ اسی لمحے ایک شور اٹھا اور ایک بڑا غول آفس میں آگھسا۔ کسی کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار تھے تو کوئی مٹھائی کے ڈبے اٹھائے ہوئے تھا۔ سب نے شامل خان کو گھیر لیا۔

”مبارک ہو سوہنے یار!“ سب سے پہلے نعیم نے اس کے گلے میں بڑا سا گلاب اور موتیے کا مہکتا ہار ڈال دیا۔

”یہ فتح کا سب سے پہلا لڈو میری طرف سے۔“ افتخار نے اُس کے منہ میں بڑا سا لڈو ٹھونس دیا۔

پھر تو سب ہی جیسے خوشی سے شامل پر کود پڑے۔ دھڑا دھڑہا اُس کی گردن میں ڈالتے گئے۔ کوئی مٹھائی تقسیم کرنے لگا اور ایک دوسرے کے منہ میں لڈو ڈالنے لگے۔ اُونچے اُونچے قہقہے اُٹھتے رہے۔

”ابے شہزادے! تو کہاں پیچھے دبکا کھڑا ہے۔ ادھر آؤ سویٹ ہارٹ! تم نے تو اس فتح کے لئے گولی بھی کھائی ہے۔“ احسن پیچھے دبے شہزادہ جمال کو کھینچ کر شامل خان کے قریب لے آیا اور شہزادہ، شامل کے گلے لگ گیا۔ شامل خان نے بھی اُسے محبت سے لپٹا لیا۔

پھر وہ سب ہجوم شامل خان کو گھیرے ہوئے بڑے سے لان میں لے آیا۔

”زندہ بادا شمل یار!“

”جیئے جیئے شمل خان۔“

ایسا زبردست نعروں کا غلغلہ اٹھا کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ اتنے شور ہنگامے میں شمل خان کو اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ ان سب کے نرغے میں مسکراتا، سب کی مبارک باد وصول کر رہا تھا۔ اُس کے ساتھ چلتا احسن بھی سخت متوحش تھا۔

”یار! کہیں کچلے ہی نہ جائیں۔“ اسے اپنی جان کے لالے پڑتے محسوس ہوئے۔ نعیم کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

”تم اتنی آسانی سے نہیں مرو گے پیارے! سو کو کچل کر ہی مرو گے۔“

”ہاں، تمہیں تو سب سے پہلے کچلوں گا۔“ احسن نے اُسے گھورا۔

اشمل کو لان میں بنے بڑے سے اسٹیج پر چڑھا دیا گیا۔ وہ ڈانس پر ہاتھ مار کر اس شور و غل کو روکنے کی کوشش کرنے لگا۔

”میں آپ سب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنا قیمتی ووٹ میری نذر کیا۔ آج میری فتح میں آپ سب جوانوں کا ہاتھ ہے۔ لیکن میں اس دن کو اپنی فتح کا دن سمجھوں گا جب آپ لوگوں کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ جب میری ذات کسی کے لئے باعث تسکین ہوگی۔ دراصل یہی دن تو میری پرکھ کا دن تھا جس میں آپ لوگوں نے مجھے معتبر کر دیا ہے اور خود مجھے پہلی سیڑھی پر چڑھایا ہے۔ مگر اب بقیہ سیڑھیاں مجھے خود طے کرنی ہیں اور آپ کے اعتبار پر پورا اترنا ہے۔“

اشمل خان کی بھاری آواز گونج رہی تھی۔ سارے اسٹوڈنٹس ہمہ تن گوش تھے۔ ریحان پر اچہ تو چند ثانیے کے لئے

دنگ رہ گیا۔ فتح کا سہانا خواب دیکھنے والی آنکھیں تحریر میں گم تھیں۔ ہار کا

تصور ہی اس کے لئے قیامت خیز تھا۔

دولت کا گھمنڈ، پُرکشش پرسنلیٹی کا زعم سائے کی طرح اس کے ساتھ لپٹا رہا تھا۔

خواہش کے حصول کے لئے اس نے منفی راستہ اختیار کرنے میں کبھی عار محسوس نہ کیا تھا۔ اس نے اپنا مقصد صرف پانا، پانا اور سب کچھ پالینا بنا رکھا تھا۔ پھر وہ اتنی بڑی ہار کیسے برداشت کر لیتا۔ اپنی برتری قائم رکھنے کے لئے جائز، ناجائز ہر طریقہ اختیار کر چکا تھا۔ پھر بھی اتنی بڑی شکست اُس کا منہ چڑھا رہی تھی۔

وہ تڑپ اٹھا۔

اشمل خان کے نعرے اُس کے وجود میں آگ بھڑک رہے تھے۔

اُس کا دل پھیلا سکڑا اور رگوں میں خون نہیں انگارے دوڑنے لگے تھے۔

”نہیں، نہیں۔“ میں اتنی آسانی سے شکست نہیں کھا سکتا۔“ وہ نفرت اور غصے سے چیخ اٹھا۔

سراج کیانی نے اُسے دیکھا، پھر سر جھکا لیا۔

”بہر حال، جیت تو شمل خان کا مقدر بن گئی ہے۔“

”شٹ یور مائو تھ۔“ وہ بھڑک اٹھا۔ اس نے سراج کیانی کو آگ بھری نظروں سے دیکھا اور پھر غصے سے سامنے رکھی کرسی کو ٹھوکر لگائی۔

”ریحان پر اچہ نے آج تک کسی کی برتری قبول نہیں کی ہے۔ اسے نیچا دکھانے والا اب تک پیدا نہیں ہوا ہے۔ شمل کیا

ہے۔ ہنہ۔“



”تم بھول رہے ہو ریحان! یہاں فاتح وہی ہے جس کے گلے میں ہار ہے، جسے اسٹوڈنٹس نے چن لیا ہے۔ اشمٰل خان ہمارا فتور حریف تھا، سو جیت گیا۔“ سکندر پہلی بار بولا۔ اُس کے لہجے میں پسپائی تھی۔ اُس نے کھلے دل سے ہار تسلیم کر لی تھی۔

”تم بھول رہے ہو سکندر! کہ یہاں جیت اُس کی ہے جو بہت زیادہ طاقتور ہے۔ اور اپنی طاقت کا استعمال بھی جانتا ہے۔“ ریحان پر اچہ نے سکندر کو دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں اپنی برتری اور اپنے اثر و رسوخ کے مالک ہونے کا خمار ہلکورے لے رہا تھا۔

”تو اب تم کیا کر سکتے ہو؟“ سراج کیانی نے اُسے حیرت پاش نظروں سے دیکھا۔

”فی الحال کچھ نہیں۔“ اُس نے لب بھینچ لئے۔ اُس کی آنکھوں میں اشمٰل خان کیلئے نفرت کی چنگاریاں بھڑک رہی تھیں۔ ہزیمت کا احساس اُسے اندر ہی اندر جلا رہا تھا۔

ہشمنہ ابرار کی ساری محنت اکارت گئی۔

اُس کا اسٹوڈنٹس کے سامنے بہتر انداز میں آنے کا ڈرامہ بھی فلاپ ہو گیا۔ اُس نے اپنے اندر کے منفی ریحان کو چھپا کر ایک نئے ریحان پر اچہ کے روپ میں سب کے سامنے آکر اپنی ساکھ بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی، مگر محض ایک دن بلکہ چند گھنٹوں میں وہ سب اکارت گئی۔

اُسے لگا جیسے لوگ باہر اُس پر ہنس رہے ہوں گے، اُس کا مذاق اڑا رہے ہوں گے، اُس کی ناکامی پر لمبے لمبے اور مزاحیہ فقرے چست کر رہے ہوں گے۔

”اشمٰل خان \_\_\_“ اُس نے نفرت سے اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں۔ اُس کے لفظ اُس کی سماعت پر ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔ صرف وہی تھا جس نے اُسے اس فتح سے دُور کر دیا، اس کی برتری کے احساس کو خاک میں

ملا دیا۔ اس شکست کا احساس اُسے اکسار ہا تھا۔

باہر فتح کا جشن منایا جا رہا تھا۔ ریحان پر اچہ کو ووٹ دینے والے بھی کئی اسٹوڈنٹس اب اس خوبصورت جشن میں پیش پیش تھے۔ چڑھتے سورج کے پجاری کے مصداق وہ بڑھ چڑھ کر اشمٰل خان کو مبارکباد دے رہے تھے۔

جیسے جیسے اشمٰل خان کے نعرے لگ رہے تھے۔

ہشمنہ ابرار کو تو لگ رہا تھا جیسے سارا آسمان اُس پر آگرا ہو اور اُس کی رُوح دب کرنے سسک سکتی ہو اور نہ کھل کر قہقہے لگا سکتی ہو۔ نہ وہ اس خوشی مناتے انبوہ کثیر میں شامل ہو کر خود بھی مسرت کا جام پی سکتی تھی نہ ریحان پر اچہ کی شکست پر اُس کے ساتھ بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کر رو سکتی تھی۔

اُسے لگا جیسے اُس کا وجود عمیق گہرائیوں میں اترتا چلا جا رہا ہو۔ ایسی فضاؤں میں جہاں کچھ بھی نہیں تھا، جہاں صرف دل دوڑتا رہی تھی۔

ہار کا گہرا دکھ اور

اپنی محنت کے عبث جانے کا کرب۔

اُس کا دل اُدا سی میں گھر کر رہ گیا اور رُوح جیسے غم واندوہ میں دب کر رہ گئی ہو۔

آنکھیں بے اختیار چھلک اُٹیں۔ اُسے اشمٰل خان کے جیتنے کا اتنا دکھ نہیں تھا جتنا اپنی بے غرض اور بے لوث محنتوں کے عبث جانے کا دکھ تھا۔ اُسے ریحان پر اچہ کے ہارنے کا غم نہیں تھا، اپنی سسکی کا احساس مارے دے رہا تھا۔ ہائے! اتنی ذلت تو میں نے آج تک کبھی اٹھائی نہیں۔ اُس کا دل لہو لہو ہو رہا تھا۔ وہ کامن رُوم کے دروازے پر کھڑی تھی۔

وہیں دروازے سے لپٹ کر بلک بلک کر رونے لگی۔ یکسر سارے ماحول سے کٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے





”جانتی ہوں۔۔۔ اب تعارف کی کہاں ضرورت رہ گئی ہے مسعود شاہ! اب تو ہم ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف ہو چکے ہیں۔“ اُس کا لہجہ دُکھ کے ساتھ استہزاء سیہ تھا۔

ایک لمحے کو مسعود شاہ خاموش رہ گیا، پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”کیسی ہو؟“

”جیسی تم چھوڑ گئے تھے، اس سے کچھ بہتر ہوں۔“

”پلیز ماہی!“ وہ اُس کے کاٹ دار لہجے پر تڑپ گیا۔ اس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ نمایاں ہو گئی۔ ”میں مانتا ہوں کہ تم نے بھی کچھ دکھ اٹھائے ہیں۔ مگر میں بھی مجبور رہا ہوں۔ تم شاید اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ میں نے یہ سارے دن سخت بے سکونی میں گزارے ہیں۔“

”مرد اور مجبور \_\_\_ خوب۔“ وہ زور سے ہنسی۔ ”نہیں مسعود شاہ، نہیں۔ مرد اس وقت مجبور ہوتے ہیں جب سارے اختیارات ان کے ہاتھ سے نکل چکے ہوں یا بستر مرگ پر ہوں۔ اور تم تو اب بھی با اختیار ہو۔“

”ایسے اختیارات کا کیا فائدہ ماہی جن میں اپنا سکونِ دل بھی نہیں حاصل کر سکا۔“ اُس کا لہجہ دھیمّا ہو گیا۔ ”کاش ماہی! میں بے اختیار ہی ہوتا۔“

”مت یہ ڈرامہ کرو مسعود شاہ! امت عورتوں والا لہجہ اپنائو۔ تم ایک بھڑکتی آگ ہو مسعود شاہ، جس میں میرا وجود بھسم ہو چکا ہے۔ تم نے کبھی اعتدال کا راستہ اختیار ہی نہیں کیا۔ تم لوگوں کی باتوں سے نہیں ڈرے بلکہ صرف زمان خان سے انتقام لینے کے لئے مجھے کانٹوں پر گھسیٹتے رہے ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ عورت شارد اکے روپ میں ہو یا ماہ گل کے، بے قصور ہے۔ تمہارے ان سفاکانہ رویوں نے نہ شارد اک کو سگھ لوٹایا ہے اور نہ زمان خان کو تڑپایا ہے۔ تم سارے مرد صرف اپنی انا کے دائرے میں گھومتے رہتے ہو، اپنے لئے جیتے ہو، اپنی انا کی تسکین چاہتے ہو، کسی بھی طرح۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُس کے اندر ایک آتش فشاں پیا تھا۔ ایک کرب کا سمندر

قضا

ایک ناآسودگی کا جال تھا جو کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔

”یاتم بزدل ہو مسعود شاہ! یا جابر \_\_\_\_ اور میں ایک بزدل یا جابر شخص کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ میں آنسو پی پی کر تھک چکی ہوں۔ میں اب یہ تنور موسم نہیں سہا سکتی۔ نہیں سہا سکتی مسعود شاہ!“

”ما۔۔۔۔۔ ہی!“ مسعود شاہ بے قرار ہو گیا۔ ”اتنے الزام تم نے مجھ پر لگا دیے ہیں ماہی!“

”نہیں مسعود! یہ الزام نہیں ہے۔ اب میں اس قابل بھی نہیں رہی کہ تمہیں آئینہ دکھا سکوں۔ میں تو خود آئینے کی طرح ٹوٹ چکی ہوں۔ کرچی کرچی ہو گئی ہوں۔ اب اپنا آپ سمیٹا بھی نہیں جا رہا۔“

”میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔“ اُس نے اپنا فیصلہ سنایا تو وہ بھڑک اٹھی۔

”نہیں مسعود! پلینز مت آنا۔ ماہ گل ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہونے کو تیار ہے مگر اب وہ جھک نہیں پائے گی۔“ اُس کا لہجہ اچانک پتھر ہو گیا۔ ”اگر ہو سکے تو شارد کو بھی لے جاؤ، ہمیشہ کے لئے۔ ایک غیرت مند بھائی بن کر اُسے تحفظ دو۔ زمان خان کے پیروں کی دُھول مت بننے دو اُسے۔ یہاں قربانی بھی رائیگاں ہے۔ یہاں جھکے ہوئے سر پر کوئی تاج نہیں رکھتا، بلکہ کچل دیا جاتا ہے۔“ اس نے مسعود شاہ کو اور کچھ بولنے کا موقع نہیں دیا اور ریسپور کریڈل پر بیٹھ دیا۔

اُس نے جلتی آنکھوں سے فون کو دیکھا۔

ایک۔۔۔۔۔ دو۔۔۔۔۔ تین۔۔۔۔۔ چار۔۔۔۔۔ گھنٹی مسلسل بج رہی تھی اور اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کی سماعتوں پر کوئی آہنی ضربیں پڑ رہی ہوں۔

”مجھے لمحہ لمحہ امتحان میں مت گھسیٹو مسعود شاہ!“ اُس کے لبوں سے ایک سسکاری آزاد ہو گئی اور اُس نے آہستگی سے فون اٹھالیا۔

”تمہیں یہ سارے شکوے مجھ سے نہیں زمان سے کرنے چاہئیں۔ جابر میں نہیں، تمہارا بھائی ہے۔ بلا جواز شارد کو اپنے ظلم کا نشانہ بنا رہا ہے۔ مسعود شاہ کی چبھتی آواز ابھری۔

”تم سب اندھے ذہن سے سوچنے والے مرد ہو۔ تم سب اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہو جو مظالم ڈھانے کا کوئی جواز نہیں رکھتے۔ اس میں چاہے میرا بھائی ہو، شوہر ہو یا کوئی اور۔“

”میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔“ اُس نے اُس کی بات نظر انداز کر دی۔ اُس کا لہجہ اب ملتی نہیں تھا۔ ماہ گل کی روح تک سلگ اٹھی۔

”اگر مجھے لے جانا چاہتے ہو تو پہلے اسٹیپ پر مجھے لکھ کر دو کہ شارد کے دُکھ کا حساب تم مجھ سے نہیں مانگو گے۔ مجھے وہ عزت دو گے جو میرا حق ہے۔ بے گھری کا یہ طمانچہ اب مجھ سے نہیں جھیل جائے گا۔“ وہ نفرت اور غصے سے چیخ اُٹھی۔ ”بولو مسعود شاہ! چپ کیوں ہو گئے؟“ وہ اُسے خاموش پا کر تلخی سے ہنسی۔

”میں تمہارا شوہر ہوں اور تمہاری کسی بھی شرط کا پابند نہیں ہوں۔ میں تمہیں بغیر شرط کے بھی لے جانے کا حق رکھتا ہوں۔“ اُس کی مردانگی عود کر آئی۔ وہ غصے سے بولا مگر ماہ گل متاثر نہ ہوئی۔

”میں اپنی زندگی پر پورا اختیار رکھتی ہوں۔ اسے جس طرح بھی چاہوں گزاروں۔ اور اب میں زندہ رہنے کی طرح زندہ رہوں گی۔ تم سے الگ اپنی زندگی خود بناؤں گی۔“

”ما۔۔۔۔۔ ہی۔۔۔۔۔“ وہ غصے سے پھنکارا۔ ”تم بھول رہی ہو کہ تمہیں آزاد کرنے یا نہ کرنے کا اختیار میرے ہاتھ میں ہے اور میں ایسا کوئی جذباتی فیصلہ تمہیں کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

”چہ، خوب۔۔۔ تم مردوں کو اسی اختیار پر تو گھمنڈ ہے۔ سارا غرور اسی اختیار کا تو ہوتا ہے۔ مگر میں تمہارا گھمنڈ خاک میں ملا دوں گی۔“ وہ زور سے ہنسی اور پھر ہنستی ہی چلی گئی۔

”ماہ گل!“ مسعود شاہ چلایا۔ ”تم کیا آزاد ہونا چاہتی ہو؟“ اُس کے لہجے میں استعجاب تھا۔ ایک لمحہ کے لئے ماہ گل کا سارا بدن کانپا، ہنسنے سے اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ وہ تیزی سے رخساروں پر لڑھکتے گئے۔ اُس نے جلتی آنکھیں بند کر لیں اور دل کے اندر کے شور کو دباتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔۔۔ ہاں مسعود شاہ! اب میں دنیا کے سارے جھمیلوں سے آزاد ہونا چاہتی ہوں۔ ان تمام عذابوں سے، اس قید سے، ان آہنی زنجیروں سے جو میرے پیروں میں کسی زہریلے سانپ کی طرح لپٹی ہوئی ہیں۔ میں اس جس زندہ ماحول سے نکل جانا چاہتی ہوں جہاں میں سانس روکے کھڑی ہوں۔“ وہ ہسٹیریا کی انداز میں چلا رہی تھی۔ مگر دوسری سمت مسعود شاہ فون رکھ چکا تھا۔

”میں لمحہ لمحہ اس کا عذاب نہیں جھیل سکتی۔ کسی نئے دُکھ کی پذیرائی کرنے کی اب سکت مجھ میں نہیں ہے۔ نہیں ہے مجھ میں سکت۔ آئی ہیٹ یو مسعود شاہ!“ وہ فون اسٹینڈ پر سر جھکا کر بلک اٹھی۔ درد کی بھرپور ٹیسیں بدن کو جھلسائے دے رہی تھیں۔

”خدا یا! کب ختم ہوں گی آخر یہ درد کی راتیں۔۔۔۔۔“

”ماہی۔۔۔“ شارد ابھائی نے دھیرے سے اُس کے شانوں کو تھما۔

”تم نے اچھا نہیں کیا ماہی!“ انہوں نے اس کا چہرہ اپنی سمت کیا۔ ”تم تو پھر بھی مجھ سے اچھی ہو کہ مسعود بھائی تم سے محبت تو کرتے ہیں۔“

”نہیں، بھابی! نہیں۔“ اُس نے بھابی کی بات کی نفی کی۔ ”یہ محبت نہیں ہے، اذیت ہے عمر بھر کے لئے۔ محبت



کرنے والے انسان ایسے نہیں ہوتے۔“

”ماہ گل! مسعود بھائی جابر نہیں۔ ہاں شاید بزدل ہیں۔ مگر ماہی! جابر شوہر سے بزدل مرد پھر بھی بہتر ہوتے ہیں۔“

شارد ابھائی کا لہجہ درد انگیز تھا۔ ان کی آنکھوں میں اپنی اُجاڑ زندگی کا عکس سمٹ آیا۔ وہ تو بلا جواز زمان کے ستم کا نشانہ بن رہی تھیں۔ اس کے مظالم پر قطرہ قطرہ پگھل رہی تھیں۔

اس کی محبت کے لئے تڑپی تھیں۔

اس کی نگاہِ التفات کی منتظر تھیں۔

زندگی کے اس نئے سفر پر اگر اس نے کچھ پایا ہی نہیں تھا۔ کوئی لمحہ بھی تو ان کا اپنا نہیں تھا۔ کوئی خوشگوار یاد جس کے سہارے وہ بقیہ عمر ہی بتا دیتیں۔

وہ سارے کوئیل کوئیل خواب تو زمان خان کی بیوی بن کر نہ جانے آنکھوں سے نکل کر کہاں بہہ گئے تھے۔ اب تو ان آنکھوں میں بیتے دنوں کی دھول چھ رہی تھی اور آنے والے دنوں کا خوف سینے کی تہہ میں لپٹ کر رہ گیا تھا۔

ماہ گل نے اُسے دیکھا تو چند لمحے کو اُسے اپنا دکھ کم تر محسوس ہونے لگا۔ اپنا غم نگاہوں کے سامنے سے ہٹ گیا اور شارد کا زرد زرد مضمحل چہرہ رہ گیا۔ وہ پہلے ایسی تو نہیں تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن میں ہمہ وقت معصوم شرم سجی رہتی۔ دھیمی پیاری مسکراہٹ جو گلاب لبوں کو ہمہ وقت گھیرے رہتی۔ یہ عارض وہ تو نہیں تھے۔ اب تو یہ چہرہ گرد غم سے بالکل بدل چکا تھا۔ ماہ گل کا دل سوختہ پروانے کی مانند بکھرتا چلا گیا۔ اُس نے دھیرے سے شارد کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھاما۔

”شارد! تمہیں نہیں آنا چاہئے تھا۔ زمان بھائی کے پیروں کی دھول نہیں بننا چاہئے۔ زمان خان نے تمہیں کیا دیا ہے۔ ایک سسکتی زندگی۔ پھر تم کیوں اپنا وجود دیوں روندنے چلی آئی ہو۔ یہاں فریاد رس کوئی نہیں ہے۔“

اس کی بات پر شارد ابھائی نے اُسے دیکھا اور پھر ایک گہری سانس لے کر صوفے پر خود کو گرا لیا۔

”لبنی اس بے وقعتی اور تذلیل پر تو کبھی کبھی مر جانے کو دل چاہتا ہے۔ مگر ماہی! مرنا بھی زندہ رہنے کی طرح ہی کٹھن اور مشکل ہے۔ جانتی ہو ماہی! تمہارے علاوہ میری دو اور بھابیاں ہیں۔ جن کی نگاہوں میں ترحم کی ایسی چھن ہوتی ہے کہ دل چاہتا ہے زمین پھٹ جائے اور میں اس میں اسی لمحے سما جاؤں۔ شوہر کی ناپسندیدہ بیوی اور تضحیک کا نشانہ بنی عورت میکے میں بھی مجرموں کی طرح رہتی ہے۔ میں صفیہ اور عنبر بھابی کی نگاہوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ میں زمان کے ظلم سہ لوں گی۔ مگر ہر آتی جاتی عورتوں کی زبانوں کے خنجر اپنے سینے میں نہیں اُتار سکتی۔“

وہ سسکا اُٹھیں۔

آج ماہ گل کے سامنے انہوں نے اپنا آپ کھول کر رکھ دیا تھا۔ کتنے دُکھ ان کی آنکھوں کے سامنے جاوداں ہو گئے اور آنسوؤں کی صورت لڑی لڑی بہنے لگے۔

ماہ گل کا لہجہ پھٹنے لگا۔ غم کے اس بوجھ سے اس کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ جھک کر شارد ابھائی کے قدموں میں بیٹھ گئی اور ان کے گھٹنوں پر اپنے کانپتے لب رکھ دیئے۔

مسعود شاہ کو واقعی اس کی ضرورت نہ رہی یا پھر اس کے انکار اور سخت رویے نے اُسے کبیدہ کر دیا تھا۔ ماہ گل کے جذباتی فیصلے نے اُسے آتشیں کر دیا تھا۔ اس نے پھر ماہ گل کو فون نہ کیا۔

امی تو ماہ گل سے ناراض ہو بیٹھی تھیں۔

”تو، تو پڑھی لکھی، سمجھ دار لڑکی ہے ماہی! تجھے تو جاہل عورتوں جیسا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہئے۔“ ان کی آنکھوں میں ناراضگی کے ساتھ دُکھ تھا۔

”عورت چاہے جاہل ہو یا پڑھی لکھی، ان کے دُکھ، ان کے احساسات ایک ہی ہوتے ہیں امی! اس معاشرے میں نہ



تعلیم نے عورت کے دکھ کو کم کیا ہے اور نہ اونچی سوسائٹی نے۔ عورت تو اس تنگ و تاریک، پُر تیج ہیبت ناک سفر پر گامزن ہے برسوں سے۔ نہ تعلیم نے اس کے راستے منور کئے ہیں اور نہ دولت کے انبار نے اس کی خوشیوں کی ضمانت دی ہے۔“ اس نے امی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں سارے جہاں کا گلہ سمٹ آیا تھا۔ ایک تیرگی تھی کہ دل کے در و دیوار میں پھیلتی ہی چلی جا رہی تھی۔

اس کی غم ناک آنکھوں سے کئی ستارے گر کر ٹوٹے تو امی تڑپ اٹھیں۔

”ماہی! میرے ساتھ کچھ دنوں کے لئے وادی چلو۔ شاہ خانم بہت کہتی ہے اور اسی ہفتے مجھے جانا ضروری ہے۔“ انہوں نے ماہ گل کے ملول وجود کو اپنی پناہوں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

”وادی! میں؟“ اُس نے حیرت سے استفسار کیا۔ ”آپ کا جانا ضروری کیوں ہے؟“

”تمہیں نہیں پتہ۔“ امی اس کی پھیلی پھیلی آنکھوں میں جھانک کر ہولے سے مسکرائیں تو اس نے سر نفی میں ہلایا۔

”نہیں۔“ پھر اچانک چونکی، کہیں اشتار اور فروان۔“ اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں اور دل زور سے دھڑکا۔

”ہاں۔“ امی اس سے الگ ہو کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ”فروان اور سحر بھی امتحان سے فارغ ہو گئے ہیں۔ انہیں بھی لے چلوں گی۔“

”امی!“ اس کے رگ و پے میں تھکن سی بڑھ گئی۔ ”کیا اشتار اراضی ہو جائے گی؟ میرا مطلب ہے فروان اور۔۔۔؟“

”ماہی!۔۔۔!“ امی نے اس کا جملہ کاٹ دیا۔ ”تمہیں میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ اشتار بہت معصوم لڑکی ہے اور شاہ خانم کی کہی ہوئی بات کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں بول سکتی۔“

”یہی تو دکھ ہے امی! کہ اگر جبر بھی کیا گیا تو وہ شارد کی طرح سہ لے گی۔“ اس نے بہت جلدی نگاہوں سے امی کو دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔ وہ پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ جانتی تھی کہ امی کے اس فیصلے کے سامنے اس کی ساری دلیلیں عبث جائیں گی۔ وہ تو اپنے اور شارد کے دکھ میں اتنا ڈوب چکی تھی کہ اب کسی کے حق میں لڑنے کے قابل بھی نہ رہی تھی۔

”ماہ گل! کیا تم نہیں جانو گی میرے ساتھ حویلی؟“ امی نے اُسے جانا دیکھ کر پکارا۔ ”اشتار تمہیں یاد کرتی ہے۔“

”جانوں گی۔۔۔ کب جا رہی ہیں آپ؟“ وہ پلٹ کر پوچھنے لگی۔

”بس چند دن کے اندر۔“ امی صوفے سے اٹھتے ہوئے بولیں اور اس کے قریب آکر محبت سے کہنے لگیں۔ ”تیرا بھی دل بہل جائے گا۔ تھکے ذہن کے لئے آب و ہوا کی تبدیلی اچھی رہتی ہے۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو ماہ گل نے سر جھکا لیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

سحر گل ابھی نہا کر نکلی تھی۔ اس کے لمبے بالوں میں پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔ وہ لان میں بیٹھ کر انہیں سلجھانے لگی تھی۔ تبھی بل ڈوگ زور زور سے بھونکنے لگا جیسے کسی اجنبی شخص کو دیکھ لیا ہو۔

”ارے کیا ہوا ڈیر؟ کیا دن میں بھی چور گھس آیا؟“ وہ بلڈوگ کے شور پر کرسی سے کھڑی ہوئی اور بڑبڑاتی ہوئی بڑے گیٹ کی جانب بڑھی۔

”بھوں، بھوں، بھوں۔۔۔“ اُس کی آواز تیز ہو گئی تھی۔

”لگتا ہے بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ خود ہی قیاس کرتی گیٹ کے قریب آئی اور بڑا سا کنڈازور لگا کر کھول دیا۔

”دل سے مانگی دعائیں اتنی جلدی قبول ہو جاتی ہیں آج یقیناً آگیا۔“ یہ آواز، یہ چہرہ اس کے لئے نا آشنا قطعی نہیں تھا۔ وہ آنکھوں میں وارفتگی کی چمک لئے، لبوں پر مسکان سجائے بلڈوگ سے خود کو بچائے گیٹ کی دوسری جانب کھڑا تھا۔ سحر گل کا سارا وجود سُن سا ہو گیا۔

...☆☆☆...

ذولین نظریں اٹھائے اشتاراکو دیکھ رہا تھا۔ اُس کا ڈھلاؤ دھلا چہرہ، پشت پر بکھری ریشمی زلفیں، پیشانی پر بندھا ہوا زرد ریشمی رومال۔ ذولین خان کے اتنے غور سے دیکھنے پر اشتاراکا چہرہ گرم ہو گیا۔ اس نے لرزتی پلکیں جھپکائیں۔

”اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہیں ذولین خان؟“ وہ اس کی محویت سے خود کو گھمٹتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

”سوچ رہا ہوں اور افسوس کر رہا ہوں ان لمحوں پر جو تمہیں دکھ دیتے ہوئے گزار دیئے۔“ وہ چلتا ہوا اس کے قریب آ رہا۔

فوارے کا ترنم تالاب کے بدن میں ہلچل مچا رہا تھا۔ ڈھلتی شام نے سارے ماحول کو خوابیدہ سا کر دیا تھا اور اشتاراکا خان بھی اس لمحے کوئی خوابیدہ گلاب لگ رہی تھی۔

ذولین کی محبت نے اس کے دل کے آنگن کو مسرتوں کے گلہائے رنگارنگ سے بھر دیا تھا۔ اس کے التفات نے اس کی محبت کو اوج عطا کیا تھا۔

وہ بے حد مسرور تھی۔

اس کے بہت سے بنجر لمحوں کا شہر بہار کے گلزار گلابوں کی طرح ملا تھا۔ ذولین خان اس سے نفرت نہیں کرتا تھا بلکہ

اس کی محبت اپنے دل میں بسائے رہا تھا۔ اس نے اپنی لرزتی ریشمی پلکیں جھکادیں۔

”ذولین خان! ان لمحوں کی خراشوں نے تو مجھے جینے کا سلیقہ سکھایا ہے۔ میری محبت کی سچائی اور ثابت قدمی نے ثابت کیا ہے۔ اور اب یہ پھول میرے دامن میں جو آپ ڈال رہے ہیں ان کی خوشبو میرے شب و روز کو مہکائے گی۔ اس راہ میں اگر تو میں رازِ سرشاری سے آگاہ ہوئی ہوں۔“

اُس کی دھیمی خوبصورت آواز ذولین کی سماعتوں پر پھوار کی طرح پڑ رہی تھی۔ اُس نے اپنی سبز آنکھیں مسلسل اُس کے چہرے پر مرکوز رکھی تھیں۔

سورج کی ٹھنڈی ٹھنڈی کرنوں سے کہیں زیادہ اشتاراکا خان کا چہرہ روشن تھا۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے صاف و شفاف پانی کے تال کے نیچے طلسماتی چراغ جل رہے ہوں۔

وہ تالاب کے کنارے اس کے سامنے سنگ مرمر کی سطح پر بیٹھ گیا۔

”اشتاراکا! اُس نے اہستگی سے اپنے گرم ہاتھوں میں اس کے دونوں ٹھنڈے ہاتھ تھام لئے۔“ جانتی ہو یہ دنیا، یہ زندگی میرے لئے کسی کشش کا باعث نہیں تھی۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ میں اس شور مچاتی متحرک دنیا کا ایک بے حس جزو کیوں بن کر رہ گیا ہوں؟ جگمگاتے منظر میرے دل کو کیوں منور نہیں کرتے۔ مگر پھر اچانک میرے اُجڑے ہوئے دل میں تمہاری محبت کی طراوت پھیل گئی اور مجھے لگا جیسے شفق کی ڈھیر ساری جگمگاہٹوں نے میرے وجود کا احاطہ کر لیا ہو۔ ایسی جگمگاہٹ جس کے سامنے سارے فانوس ماند تھے۔“ اس نے محبت اور مسکراہٹ کی بے پناہ لطافت کے ساتھ اشتاراکو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ صبح میرے لئے بہت جاذبیت اور تازگی لئے ہوئے تھی۔“

تالاب کی سطح پر رنگ برنگے پھولوں اور سورج کی کرنوں کے عکس تھرک رہے تھے۔ مگر اشتاراکو ذولین خان کا وہ حسین اور سحر انگیز عکس تک رہی تھی جو اُس کی مشام جاں کے لئے راحت تھا۔

ذولین خان کے لہجے میں چاہتوں کے چراغ جل رہے تھے اور آنکھوں میں وہ دنوازرنگ جھلک رہے تھے جو اس کے لئے تسکین کا باعث تھے۔

”اشٹارا! میں قربتوں کے الم سے خوفزدہ تھا مگر یہ سچ ہے کہ میری نگاہیں تمہیں فاصلوں سے چاہتی آئی ہیں۔ تمہارا یہ معصوم چہرہ میری آنکھوں کی روشنی بنا رہا ہے۔ مگر اشٹارا! اب یہ روشنی مجھ سے چھن تو نہیں جائے گی۔“

”ذولین خان!“ اشٹارا نے تڑپ کر پلکیں اُپر اٹھائیں مگر پھر جلدی سے جھکادیں۔ اُس کی شفاف سبز جھیلوں میں اُسے نظر بھر دیکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

ذولین خان اس کی شرم پر محظوظ ہو کر کھل کر مسکرایا اور ہولے سے اس کا ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا۔ آفتاب دھیرے دھیرے غروب ہو رہا تھا۔ ہوا کے جھونکے تیز ہوئے تو نئی نئی نکلی ہوئی کونپلوں کی خوشبو فضا میں پھیل گئی۔ شفق پھولی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے حویلی کے اطراف کھڑے پہاڑوں کی چوٹیاں سرخ ہونے لگیں۔ پھر آہستہ آہستہ تاریکی بڑھنا شروع ہوتی چلی گئی۔

وہ دونوں یونہی بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

اچانک حویلی کی ساری بتیاں جل اٹھیں اور یکلخت ہر شے مصنوعی روشنی سے دکنے لگی۔

تب وہ دونوں چونک گئے۔

اس تیزی سے گزرتے لمحوں کا انہیں قطعی احساس ہی نہ ہوا تھا۔ معاً اشٹارا کے دل پر شاہ خانم کا خوف پھیلنے لگا۔

اس نے خوف زدہ نظروں سے اطراف میں دیکھا۔ باغ کا یہ حصہ ابھی خاموش تھا اور شاہ خانم کے کمرے کی جانب کھلنے والی کھڑکی بھی ابھی بند تھی۔ اُس نے شکر کا سانس لیا۔ پھر کہیں سے زبیل کی آواز آئی تو وہ گھبرا کر کھڑکی ہو گئی اور

رہائشی حصے کی جانب بھاگی۔

”خان زادی! ایسا لگتا ہے جیسے ڈھیر ساری خوشیاں تمہارے دامن میں آگری ہیں۔“ زبیل رات دودھ دینے اس کے پاس آئی تو اُسے آئینے کے سامنے بیٹھا مسکراتے دیکھ کر اس نے دھیرے سے کہا تو اشٹارا کے لبوں کی تراش میں بکھری مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”مجھے نہیں بتاؤ گی خان زادی؟ میں تو تمہاری خوشیوں میں خوش ہونا چاہتی ہوں۔“ زبیل دودھ کا گلاس کارنر ٹیبل پر رکھ کر اس کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔

”کیا بتاؤں زیبے! کوئی ایسی بات ہی نہیں۔“ اس نے بتانے سے گریز کیا۔ آپو آپ ڈھیر ساری شرم اس کے اندر آسمانی۔ اب وہ اسے کس طرح اور کن لفظوں میں آگاہ کرتی کہ ذولین خان کے دل کے دروازے اس کے لئے وا ہو گئے ہیں۔

وہ آج نہیں بلکہ کئی عرصے سے اس کے دل پر راج کر رہی تھی۔ اس کی محبت سے اس کا پورا وجود منور تھا۔

”بات تو کوئی نہ کوئی ضرور ہے اشٹارا بی بی! ورنہ تو یہ چہرہ اتنا گلابی کیوں ہو رہا ہے۔ کہیں ذولین خان \_\_\_\_“ زبیل نے اسے کھوجتی نظروں سے دیکھتے ہوئے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور ہنس پڑی۔

”تم کہتی تھی نازیبے! کہ ذولین خان پتھر ہے \_\_\_\_ مگر وہ پتھر نہیں ہے۔ وہ تو ریشم سے بھی زیادہ نرم ہے۔“ اس کے لہجے میں سارے جہاں کی حلاوت سمٹ آئی اور دھڑکنوں کی رفتار میں اضافہ ہو گیا۔

”زبیل! ایسا لگتا ہے جیسے یہ دل پھٹ جائے گا۔ میں اتنی زیادہ خوشی کیسے سنبھالوں زیبے؟“ اس نے اچانک زبیل کے ہاتھ تھام لئے۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے اور پلکوں کے کناروں پر دستارے چمک اُٹھے۔ زبیل نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر تھپکی دی۔



”خدا تمہیں لمبی عمر دے خان زادی! اور یہ خوشیاں پا کر تم نہال ہو جاؤ۔“ زبیل کا دل مسرت سے بھر گیا تھا۔ آج اتنے برسوں بعد اس نے اشارا کو اتنا مسرور، اتنا شاداں دیکھا تھا۔

زبیل نے اس کے خندہ زن حُسن کو دیکھا اور اپنی روح کی خاموشیوں میں اس کے لئے بہت سی دعائیں مانگ لیں۔

...☆☆☆...

”محنت کے رائیگاں جانے کا دکھ بہت گہرا ہوتا ہے ہشمنہ! میں جانتا ہوں۔ مگر مضبوط لوگ اپنی شکست کے آنسوؤں کو بہنے نہیں دیتے۔“ اشمل خان اچانک اس کے سامنے آکا۔ ”میں تو تمہیں بہت بہادر، بہت مضبوط لڑکی سمجھتا رہا تھا۔ مگر تم تو \_\_\_“ خلافِ عادت اس کے لہجے میں نرمی مترشح تھی۔ اس نے آپ کی بجائے اسے اپنائیت سے تم کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

ہشمنہ نے رخ موڑ کر اس طویل قامت اور نشیلی آنکھوں والے شخص کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر طنز کی پرچھائیں نہ تھیں۔ لہجے میں کوئی کاٹ نہ تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ اندر ہی اندر بکھر کر رہ گئی۔ واقعی اپنی شکست کا اعتراف یوں آنسوؤں سے کر کے اس نے بزدلی کا ثبوت دیا تھا۔

اپنی شکست کو یونہی عام روایتی روتی دھوتی لڑکیوں کی طرح قبول کر لیا تھا۔ اُس کا دل اور بھی اُداس ہو گیا۔

رگوں میں ڈھیر سا اکرب بکھر کر رہ گیا۔

”مجھے مبارک نہیں دو گی ہشمنہ؟“ وہ بے حد متانت سے بولا تو اس نے اپنے کانپتے لب دانتوں میں دبا کر اسے دیکھا۔

”میں تو منتظر تھا کہ تم \_\_\_“

”ضروری نہیں کہ بہادر لوگ اپنے حریف کو گلہ ستے بھی پیش کریں کہ میں تو ویسے بھی بقول آپ کے بزدلی کا ثبوت

دے رہی ہوں۔“ اس کے لہجے میں غصہ لہرا گیا۔ وہ پلٹ کر قدم اٹھاتی کا من روم میں چلی آئی۔

اشمل خان کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ اس کے پیچھے اندر چلا آیا۔ کمرہ خالی تھا اور گہرا سکوت چھایا تھا۔ چند لمحے ان دونوں میں سے کسی نے اس سکوت کو توڑنے کی سعی نہ کی۔

ہشمنہ نے کرسی پر خود کو گرا لیا۔ وہ اشمل خان کی موجودگی پر سسکیوں کو دبا رہی تھی۔ مگر دل کی گہرائیوں سے اُٹتے ہوئے یہ نوکیلے آنسو اب بھی رخساروں پر بھٹک رہے تھے۔

اشمل خان کی معنی خیز نگاہیں مسلسل اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اور ہشمنہ ابرار کے دل میں عجیب سی وحشت چھا رہی تھی۔ یہ مسخر کر دینے والی قوت رکھتی آنکھیں اُسے پریشان کئے دے رہی تھیں۔

”پلیز اشمل خان! مجھے تنہا چھوڑ دیں۔“ اس نے چہرہ جھکا کر مالتی لہجے میں کہا۔

”تمہیں ریحان پر اچہ کی شکست کا دکھ ہے یا میری فتح کا تمہیں کوئی پرسنل شک ہوا ہے؟“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے اسے مخاطب کیا تو وہ چونکی اور سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ مگر نہ جانے کیوں زیادہ دیر اس چہرے کی سمت نہ دیکھ پائی۔

”میری آپ سے کوئی ذاتی یا خاندانی دشمنی نہیں ہے اشمل خان! یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔“ وہ چڑ گئی۔ کیا حق پہنچتا تھا اس شخص کو اس کی بے بسی کا تماشہ دیکھنے کا۔

”خدا نہ کرے \_\_\_“ وہ برجستہ بولا اور پھر ہولے سے ہنس دیا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے اس کے قریب آکر اس کے جھکے سر پر پھیلے ریشمی بالوں پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے بولا۔

”اگر میرے مقابلے پر ریحان پر اچہ کی بجائے تم ہو تیں تو مجھے تمہاری تنظیم کی یہی شکست پر یقینا رنج پہنچتا۔“

مگر \_\_\_\_\_ میں یہ کہنے میں قطعی عار محسوس نہیں کروں گا کہ ریحان پراچہ کی ہار نے مجھے اپنی فتح سے بھی زیادہ خوشی بخشی ہے۔ وہ اس قابل ہر گز نہیں تھا کہ جیت اس کا مقدر بنتی۔“ اس کے لہجے میں سنجیدگی کے ساتھ تیزی تھی۔ وہ رکا نہیں اور قدم اٹھاتا کہ من روم سے باہر نکل گیا۔

ہشیمینہ ابرار کی سوچوں میں تلاطم برپا کر کے \_\_\_\_\_ اس کے درد کی آگ کو بڑھا کر۔

”اُف خدا یا \_\_\_\_\_“ بے بسی کے آنسوؤں سے خود اس کا دل ہی زخم زخم ہو رہا تھا۔

اشمل خان نے تمام اراکین پارٹی کو اور اس خوشی میں شریک اسٹوڈنٹس کو جشنِ مسرت منانے سے سختی سے روک دیا تھا۔

اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ کوئی جشن نہیں ہو گا، نہ کوئی ہنگامہ۔ کیونکہ یہ جیت میرے پاس ان تمام اسٹوڈنٹس کی امانت ہے۔ ابھی جشن منانے کا موقع نہیں آیا۔ ابھی ہم نے ان کے لئے کچھ نہیں کیا۔ یہ خوشی کے شادیانے اس وقت بجنے چاہئیں جب ہم ان کی توقعات پر پورا اتریں گے۔ جب یہ درس گاہ واقعی امن کا گہوارہ بن جائے گی اور یہ خطہ تمام ہنگاموں سے پاک ہو جائے گا۔

سب نے اس کے فیصلے کو سراہا۔ اُس کی قدر و منزلت ہر نگاہ میں بڑھ گئی۔ خود ہشیمینہ کے لئے بھی وہ کسی شک سے کم نہ تھا۔ وہ تو سوچ رہی تھی کہ اس فتح پر وہ ہر رات جشن منائیں گے اور شکست خوردہ پارٹی کے زخموں کو ہرا کرتے رہیں گے۔ مگر اب اشمل خان کا یہ فیصلہ اسے بھی حیران کر گیا۔ اس کی شخصیت کا یہ دلکش پہلو اس کے سامنے آیا تو وہ دل ہی دل میں اسے سراہے بغیر نہ رہ سکی۔

دوسرے دن وہ ریحان پراچہ کے آفس میں بیٹھی تھی۔

”یہ ہار اب ہمیں قبول کر لینی چاہئے اور اشمل خان کی پارٹی کے سامنے اپنے مسائل رکھ کر اس کا بہتر حل حاصل کر

سکتے ہیں ہم۔“ اس نے متانت سے کہا۔ وہ ساری رات خود کو سنبھالتی رہی تھی اور اشمل خان کی فتح کو ذہنی طور پر قبول کرنے پر آمادہ کرتی رہی تھی۔ سیاہ چادر کے ہالے میں دمکتا چہرہ حزن اور سنجیدگی کی آمیزش سے اور بھی جاذب نظر لگ رہا تھا۔ وہ چند ثانیے اُسے دیکھتا رہا۔

”اسٹوڈنٹس کے مسائل ہی ہمارے اپنے مسائل ہیں۔ ہمیں اشمل خان کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے۔ تاکہ اگر وہ واقعی مخلص ہے تو اپنا کام احسن طریقے سے انجام دے سکے۔

”اونہہ، تعاون۔“ ریحان پراچہ زور سے ہنسا۔ ”ہشیمینہ ابرار! ریحان نے آج تک کسی کے ساتھ تعاون نہیں کیا۔ ہار ایک الگ چیز ہے مگر اشمل خان کے سامنے گٹھن ٹیک دینا مجھے کبھی قبول نہیں ہو گا۔“ اس کے لہجے میں تلخی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ہشیمینہ نے اُسے دیکھا۔

”میں سمجھی نہیں \_\_\_\_\_ اسٹوڈنٹس نے اشمل خان کو اپنا لیڈر چن لیا۔ اب ہمارے پاس کیا رہ جاتا ہے؟“

”بہت کچھ۔ ابھی کسی نے میری طاقت دیکھی نہیں ہے۔“ اس کے لبوں پر پراسرار سی مسکراہٹ لہرانے لگی۔

ہشیمینہ اُلجھ سی گئی۔ اس نے سرانج کیانی کی طرف دیکھا جو خود ریحان پراچہ کی طرف متوجہ تھا مگر بے حد مطمئن اور نارمل انداز کے ساتھ۔ گویا ریحان پراچہ کی گفتگو کا پس منظر بے حد احسن طریقے سے سمجھ رہا تھا یا اسے سمجھا دیا گیا تھا۔

”ہمارے حمایتی اب بھی ہمارے پاس ہی آتے ہیں اپنے مسائل لے کر۔“ وہ کرسی پر ٹپک کر ہشیمینہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں \_\_\_\_\_ یہی تو میں کہتی ہوں کہ اب ان مسائل کو ہمیں اشمل خان کے سامنے پیش کرنا چاہئے اور ان کا موثر حل

حاصل کرنا چاہئے۔ ایک طرح سے یہ اشمل خان کی بھی آزمائش ہو گی۔“

”اونہہ۔۔۔ شامل خان۔۔۔ شامل خان۔“ ریحان پراچہ سلگ اٹھا۔ اس نے زور سے اپنے سامنے رکھی تپائی پر لات ماری۔ ”میں شامل خان کو یونین کالیڈر قبول نہیں کرتا اور نہ کروں گا۔“

”ریحان۔۔۔“ ہشمنہ کا چہرہ تپ اٹھا۔ ریحان پراچہ کی اس حرکت پر اسے اپنی ہتک کا احساس ہوا۔ وہ غصے سے کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”سس۔۔۔۔۔ سوری۔۔۔۔۔ ویری سوری۔“ وہ جلدی سے سنبھل گیا۔ اس نے ہشمنہ کے تپتے چہرے کی طرف دیکھا اور لب بھینچ لئے۔

”دراصل ہم اسٹوڈنٹس کے مسائل خود حل کرنا چاہتے ہیں۔“ سراج کیانی نے یکدم پیدا ہونے والے ماحول کے تناؤ کو جلدی سے ختم کرنے کی کوشش کی۔

”پلیز مس ہشمنہ! آپ تو سیکرٹری ہیں۔۔۔ آپ کو تو ریحان پراچہ کی حمایت کرنا چاہئے۔“

”حمایت۔“ اس نے سراج کو دیکھا۔ ”کس بات کی حمایت؟ میں کسی غلط بات کی حمایت نہیں کر سکتی سراج! یہ تم جانتے ہو اچھی طرح۔“ اُس کی تیوری چڑھ گئی۔ وہ بدستور خفگی سے بولی۔

”ہمیں شامل خان کو آزمائش میں ڈالنا چاہئے کہ آیا وہ واقعی اسٹوڈنٹس کے مسائل حل کرنے کا اہل ہے یا نہیں اور اگر وہ اس قابل ہو تو ہمیں اس سے مکمل تعاون کرنا چاہئے۔“ وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ مگر اس کا چہرہ ابھی تک انگارہ ہو رہا تھا۔ ریحان پراچہ نے اُسے دیکھا۔

”کاش ہشمنہ! تم میرے دل کے تاروں میں یوں ہنگامہ نہ مچاتیں۔۔۔ میرے دل کی مسند پر نہ بیٹھی ہو تیں تو میں تمہاری باتوں کا جواب اپنے اس انداز میں دیتا جو میری ذات کا خاصا ہے۔ مگر اے حسین دوشیزہ! تمہاری خفگی میرے دل کو گوارا نہیں۔“

وہ نیم وا آنکھوں سے چند ثانیے اسے دیکھتا رہا۔ تپتے چہرے کے ساتھ وہ بولتی اس وقت بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ ریحان پراچہ کے جذبوں میں ایک طوفان بپا ہو گیا۔ اس کا دل بہکنے لگا۔ مگر وہ جلد ہی سنبھل گیا۔ اس وقت جذبات کی زد میں بہنا نہیں چاہئے تھا۔ اس کے لئے بہت وقت تھا۔ ابھی اس کا مقابلہ شامل خان سے تھا اور اسے اپنی شکست کا بدلہ لینا تھا۔ ہر ممکن، ناممکن طریقے سے۔

”یہ بہت ضروری ہے مسٹر ریحان! یہ اپنی شکست کا اعتراف نہیں بلکہ وسعت قلبی کی نشانی ہے۔“

”بہت خوب۔۔۔ میں آپ کی وسعت قلبی کی داد دیتا ہوں مس ہشمنہ! مگر میرا نقطہ نظر کچھ اور ہے۔ میرے طریقے کچھ مختلف ہیں۔ میرے اور میرے ساتھیوں کے کچھ مطالبات ہیں۔“ ریحان پراچہ بولا۔

”ہاں۔ اور یہی مطالبات تم۔۔۔۔۔۔“

”نہ۔۔۔۔۔ نہیں ہشمنہ ابرا! ریحان پراچہ نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ”میں اپنے مطالبات شامل خان کے ذریعے نہیں منوا سکتا۔ بلکہ میں اپنی طاقت کا استعمال کر کے۔۔۔۔۔ یعنی۔۔۔۔۔“ وہ ایک لمحے کے لئے رکا اور مسکرایا۔ شفاف میز کی سطح پر ہشمنہ کی گردش کرتی انگلیاں رک گئیں۔

”یعنی۔۔۔؟“

”یعنی سر حیدر کو اغواء کر کے۔“



”ررررر ریحان۔۔۔۔۔“ ہشمنہ کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ اس نے بے یقینی اور خوف کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ ریحان پر اچہ کو دیکھا۔

اُس کے تو گمان میں بھی نہ تھا کہ ریحان پر اچہ اس حد تک پستی میں گر سکتا ہے۔ ایک ایجوکیٹڈ گھرانے کا لڑکا اتنی اوچھی سوچ بھی رکھ سکتا ہے۔

اُس کا سارا بدن لرز اٹھا۔

ایک محترم استاد کو وہ محض اپنی غرض کے لئے آلہ کار بنائے گا۔

”اف خدا یا!“ اُس کا سر چکرانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے سے لپکنے لگے۔

”ریحان پر اچہ۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ تم سر حیدر کیانی کو کڈنیپ کرو گے؟“ اس نے تحیر آمیز بے یقینی سے دیکھا۔

”مجبوری ہے مس ہشتمینہ! اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔۔۔۔۔“

”شٹ اپ!“ وہ اس کا جملہ کاٹ کر دھاڑی۔ ”تم اتنے کم ظرف ہو، ایسے اوجھے ہتھکنڈے استعمال کرو گے۔۔۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں جس پادری کے لئے اتنی تگ و دو کرتی رہی، اپنی ساری محنت جس تنظیم کے لئے صرف کی اس کا لیڈر خود اتنا پست ذہن کا ہو گا۔“

وہ کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی اور ریحان پر اچھ کو قہر اکود نظروں سے دیکھنے لگی۔ ”ایک استاد کی بے قدری اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ خود اس کا اسٹوڈنٹ جسے وہ تعلیم دیتا رہا ہو اس کے بارے میں اتنا غلط سوچے۔ اُسے محض اپنے مفاد کے لئے چارہ بنائے۔ ویری سیڈر ریحان پر اچھ! تم نے اپنی برسوں کی تعلیم محض ایک غلط سوچ اور گھٹیا جملے پر ضائع کر دی۔“

اس کی رگوں میں انگارے دوڑنے لگے تھے اور چہرہ لال بھجھوکا ہو رہا تھا۔

”ارے مس ہشمنہ! تم تو سیریس ہو گئیں۔ اتنا ہرٹ ہونے کی کیا ضرورت تھی؟“

ریحان پر اچھٹا گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ہشمنینہ اس حد تک مشتعل ہو جائے گی۔ اس کے قریب بیٹھا سراج بھی اس غیر متوقع صورتِ حال پر پریشان ہو گیا۔ اُسے ریحان پر اچھٹا کی جلد بازی پر غصہ آنے لگا۔ کیا ضرورت تھی اسے اپنے مستقبل کے پلان سے آگاہ کرنے کی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہشمنینہ ابراہیم مضبوط کردار اور عالی خاندان کی لڑکی ہے۔ جو ایسی حرکتیں تو کیا، غلط بات بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اور سچ تو یہ تھا کہ ریحان پر اچھٹا کے حق میں جو ووٹ ڈالے گئے تھے وہ بھی ہشمنینہ کے اعلیٰ کردار اور اس کی شرافت کے پیش نظر دیئے گئے تھے۔

اب اس کا اس بات پر بھڑکنا تو قدرتی عمل تھا۔

اُستادوں کا احترام کرنے والی ہشمنینہ کے لئے یہ بات کسی شک سے ہر گز کم نہ تھی۔ معاملے کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے سراج کیانی سنبھل کر فوراً بولا۔

”پلیز ہشمنہ! آپ بیٹھے۔ دراصل آپ ریحان کے مذاق کو نہیں سمجھ سکیں۔“

”کیا۔۔۔ مذاق؟“ وہ یوں اُچھلی جیسے اس کے پیروں کے آگے سانپ ڈال دیا گیا ہو۔ ”یہ مذاق ہے۔۔۔“

”نہیں سراج!“

”ہاں۔۔۔۔۔ہاں، بالکل۔ یہ محض ایک جوک ہے۔ تم نے سیریس لے لیا ہے۔“ ریحان پر اچھ بھی سر ہلانے لگا۔ اسے بھی ماحول کے تناؤ کا اور اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔



”منافقت سے کام مت لو۔ تمہاری آنکھیں تمہارے اس جھوٹ کا ساتھ قطعی نہیں دے رہیں۔“ اس نے ایک نخوت بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

اس کی آنکھوں میں پھیلے مکر وہ جذبات اور وحشیانہ چمک کو نفرت سے دیکھا۔

”براہ مہربانی آئندہ تم مجھ سے کوئی واسطہ رکھنے کی کوشش مت کرنا۔ میں تم جیسے منافق اور گھٹیا سوچ رکھنے والے شخص سے بات کرنا تو درکنار صورت دیکھنا بھی پسند نہیں کروں گی۔“ وہ تنننا کر بولی اور آفس سے باہر نکل گئی۔

ریحان پر اچہ کتنے ہی ثانیے گنگ کھڑا رہا۔

یکخت ہی اُس کا خون کھول اٹھا۔

آج پہلی بار کسی لڑکی نے اس کی یوں کھلے عام بے عزتی کی تھی۔ اس لڑکی نے جسے شاید اپنے بے پناہ حُسن پر ناز تھا۔ اپنی پارٹی پر فخر تھا۔ اس کے منہ پر الفاظ کے بھرپور طمانچے مارے تھے اُس نے۔

اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

”اونہ۔۔۔ بہت زعم ہے تمہیں اپنی پارسائی کا ہشمنہ ابرار!۔۔۔ اس طرح کے بہت سے غرور میں خاک میں ملا چکا ہوں۔ ایسی بہت سی لڑکیوں کی اکڑ نکالنا جانتا ہوں۔“

اُس نے سامنے رکھی تپائی پر زور سے لات ماری اور سلگتا ہوا آفس سے باہر نکل گیا۔

ریحان پر اچہ کی فضول باتیں سن کر ہشمنہ کاموڈ خراب ہو رہا تھا۔ اس سے پھر ایک پیریڈ بھی نہ لیا گیا اور وہ گھر چلی آئی۔

اپنی کم فہمی پر اُسے رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا کہ وہ اتنا عرصہ ریحان پر اچہ کو کیوں نہ سمجھ سکی۔ اس کے ہاتھوں بے وقوف بنتی

رہی۔ لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھرے۔

بظاہر وہ اسے ایک لاپرواہ اور آزاد طبع بندہ سمجھ کر مطمئن رہی۔ وہ اس کے دل میں پلتے اتنے مکر وہ جذبوں سے غافل رہی۔

سوچ سوچ کر اس کی روح کی آگ اور بھی بھڑک رہی تھی۔ ندرت کی کہی ہوئی باتیں اُسے آج سچ ثابت ہوتی لگ رہی تھیں۔ اس نے کتنی بار اس سے کہا تھا۔

”ریحان پر اچہ، اسٹوڈنٹس کے مسائل میں ہر گز مخلص نہیں ہے۔ محض مفاد پرستی اور شوائف کے لئے وہ الیکشن میں کھڑا ہوا ہے۔ ریحان پر اچہ کے بارے میں اتنا تم نہیں جانتیں جتنا میں اور دوسرے لوگ جانتے ہیں۔ اس نے یہ لبادہ تو اب اوڑھا ہے۔“

ندرت نے ایسے جملے ایک بار نہیں کئی بار کہے تھے اور اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اس کی بات پر کان نہیں دھرے تھے۔

وہ ساری رات بے قراری سے کروٹیں بدلتی رہی۔

اپنی کم فہمی کا ماتم کرتی رہی۔ خود کو ملامت کرتی رہی۔

صبح اٹھی تو سارا وجود بو جھل ہو رہا تھا۔ اس نے ناشتہ نہیں کیا اور صرف گرم گرم دودھ پی لیا۔

بھابی نے اُسے دیکھا اور مسکرا دیں۔

”لگتا ہے اشمٰل خان کی فتح کا ڈکھ ابھی گیا نہیں ہے۔“

”نہیں بھابی! اچھے انسان کی فتح پر دکھ نہیں ہوتا۔ چاہے وہ ہمارا حریف ہی کیوں نہ رہا ہو۔“ اس نے کہا تو بھابی بری



طرح چو نکلیں۔

”اِس \_\_\_ یہ تم کہہ رہی ہو؟“ انہوں نے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا جیسے اس کی دماغی حالت پر شک ہونے لگا ہو۔

”ہاں، یہی حقیقت ہے \_\_\_“ اس نے بھابی کی حیران آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا اور زور سے ہنس پڑی۔

”یہ تم اتنی اعلیٰ ظرف کب سے ہو گئی ہو؟“ اس نے اپنا بیگ میز سے اٹھانا چاہا اور بھابی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”کہیں اشمل خان کا جادو تو نہیں چل گیا \_\_\_ مطلب کیو پٹس کا۔“

”جی نہیں \_\_\_“ اس نے جلدی سے ان کا جملہ کاٹ دیا اور خفگی سے ان کی طرف دیکھا اور پھر ان کی مسکراتی آنکھوں سے نظریں ہٹا کر جلدی سے بیگ اٹھا کر باہر بھاگی۔

یونیورسٹی آئی تو سڑک پر ہی ندرت اس سے آنکرائی۔

”اے \_\_\_ سنا تم نے۔“ وہ جیسے اسی کی منتظر تھی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے متعجب ہو کر اُسے دیکھا۔

”کل شام سر حیدر کیانی کو کسی نے اغواء کر لیا ہے۔ پوری یونیورسٹی میں کھلبلی مچ گئی ہے۔ خاص کر سارے لیکچرارز میں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیا؟“ ہشمنہ اپنی جگہ سُن سی رہ گئی۔ اُسے لگا جیسے اس نے اس کے سر پر پتھر دے مارا ہو۔

”بہت سے اسٹوڈنٹس پر شک کیا جا رہا ہے۔“ ندرت قدرے اس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں گویا ہوئی۔ مگر ہشمنہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

یہ جگہ ایسی باتوں کے لئے قطعی موزوں نہیں تھی۔ اس نے ندرت کو ایک نظر دیکھا اور پلٹ کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھی۔

”اے \_\_\_ مگر تم کہاں جا رہی ہو؟“

”اشمل خان کہاں ہے؟“ وہ اس کے سوال کو نظر انداز کر کے پلٹ کر بولی تو ندرت اچھل پڑی۔

”کیا \_\_\_ کیا \_\_\_ تم اشمل خان پر شک کر رہی ہو؟“

”شش۔۔۔۔۔ آہستہ۔“ اس نے اس کی پاٹ دار آواز پر اسے تنبیہی نظروں سے گھورا تو ندرت کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

”میں کسی پر شک نہیں کر رہی ہوں۔ صرف سوال پوچھا ہے تم سے۔“ اس نے بدستور سنجیدگی سے پوچھا۔

ندرت نے اسے دیکھا۔ شاید اس کے چہرے کے تاثرات سے کچھ اخذ کرنا چاہا مگر کچھ نہ جان سکی۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی مستور تھی۔

”وہ ہے۔ یونیورسٹی آیا ہے۔ مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”اوکے۔“ اس نے ندرت کے تمام سوالات کو نظر انداز کر دیا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ”میں جا رہی ہوں گھر۔ سنو، یوں میرے گھر بھاگ جانے پر کہیں تم مجھ ہی پر شک نہ کرنے لگ جانا۔“ اس نے اگنیشن میں چابی ڈال کر ندرت کے ہونق چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا تو ندرت زور سے ہنسی۔

”بڑی بد تمیز ہو۔۔۔ مگر یاد! تمہارا یوں بھاگنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔“

”نہ سمجھ میں آنے والی کوئی بات نہیں۔“

”مگر کچھ پتہ بھی تو چلے۔ یہ آنا فانا اور جاننا۔۔۔۔۔“ ندرت کا آگے کا بقیہ جملہ حلق میں ہی لہرا کر رہ گیا۔ وہ زن سے گاڑی اس کے قریب سے گزار کر آگے لے گئی۔

”عجب گدھی لڑکی ہے۔“ ندرت اڑھتی دھول کو دیکھتی رہ گئی۔ پھر پلٹ کر اندر آگئی۔

ہشمنہ کے ذہن کے تاروں کو ندرت نے یہ خبر سنا کر جیسے جھنجھوڑ دیا تھا۔ اس کے ذہن کی ساری طنابیں سن سی ہو گئی تھیں اور سوچوں کی ساری سونیاں ایک ہی جگہ اٹک کر رہ گئی تھیں۔

سر حیدر کیانی کا اغواء۔۔۔۔۔ جس میں ریحان پر اچہ سو فیصد ملوث تھا۔ اُسے اس بات کا یقین تھا۔

”تو ریحان پر اچہ! تم نے اپنی پستی میں اتر کر بالآخر دکھا دیا۔ اپنا یہ رُوپ زیادہ عرصہ نہ چھپا سکے۔“

اس نے گاڑی اپنے بنگلے کے سامنے روک دی اور جلتے ہوئے ذہن کے ساتھ اندر آکر سیدھی اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔ امی کو سلام کیا اور نہ بھابی کو منہ دکھایا۔ وہ جانتی تھی بھابی اس کے یوں واپس آجانے پر ضرور سوال کریں گی اور وہ اس وقت کسی طرح کے جواب دینے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اس کا ذہن سخت پرانگندہ ہو رہا تھا۔

ریحان پر اچہ کی اس حرکت نے اُسے گہرے دکھ میں دھکیل دیا تھا۔ اس کی نظر میں استاد کا اغواء گناہِ عظیم تھا۔

ایک لفظ بھی سکھانے والا معلم ہوتا ہے۔ کجا سر حیدر جنہوں نے ان سب کو پورے ایک سال تعلیم دی۔ کورس سے ہٹ کر زندگی کی اونچ نیچ سے آگاہ کیا۔ اچھے بُرے کی تمیز سکھائی اور سارا سال وہ اپنے لیکچرز میں اخلاق کی اہمیت پر زور دیتے رہے۔ اب خود اپنے ہی ایک اسٹوڈنٹ کے ناشائستہ اور نادر رویے کا شکار ہو گئے۔

اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون کھول اٹھا تھا۔

ریحان پر اچہ سے اُسے شدید ترین نفرت محسوس ہونے لگی۔ اُس نے گاہے بگاہے پہلے بھی اپنی باتوں اور رویوں نے شک پہنچایا تھا مگر آج۔۔۔ اُس کی رگوں میں نفرت کا زہر دوڑنے لگا۔ وہ اضطرابی انداز میں ٹہلنے لگی۔

سر حیدر کے اغواء کا صرف اسے ہی علم تھا۔ دوسرے لوگ شکوک و شبہات میں گرفتار تھے اور اس وقت اسے محض خاموش تماشائی بن کر نہیں بیٹھنا چاہئے۔

اس کے سینے میں طوفان اٹھا۔

یہ راز اسے کھول دینا چاہئے۔۔۔ مگر کس کے سامنے؟

وہ ٹہلتے ٹہلتے رک گئی۔

اُس کی آنکھوں کے سامنے کئی چہرے بنے اور مٹے۔

’ایسی کوئی شخصیت ہو سکتی ہے جو معاون ثابت ہو سکتی ہو؟‘

’اوہ خدایا۔۔۔ کیا کروں؟‘ اس نے تھک کر ہونٹ چبا ڈالے۔

یکلخت اس کے تصور میں ایک مغرور چہرہ، ایک مضبوط سراپا اُلہرایا۔

وہ شہر ننگ آنکھیں اپنے پورے سحر اور تمام تر رعنائیوں کے ہمراہ تخیل میں اٹھہریں۔ ”اشمل خان“ اُس کا دل پوری قوت سے دھڑکا اور کتنے ہی لمحے اپنی اس ناہمواری کے ساتھ دھڑکتا رہا۔

’ہاں اشمل خان۔۔۔ جو اس وقت اپنا بھرپور کردار ادا کر سکے گا۔‘

اس کے دل نے اشمٰل خان کو چن لیا اور عقل حیران رہ گئی کہ وہ اشمٰل خان سے کب اور کیسے متاثر ہو چکی ہے۔ کیا محض اس کی فتح نے متاثر کر دیا ہے؟

’اوہ گاڈ\_\_\_\_‘ اُس نے گھبرا کر سر کو جھٹکا جیسے اپنے ذہن و دل کے قریب کسی انجانے سے، نا آشنا سے دُھند کے تنگ ہوتے دائرے سے خود کو بچانے کی سعی کی ہو۔

اور پھر کچھ سوچ کر تیزی سے فون کی طرف بڑھی۔ مگر پھر سوچ کر اس کے قدم رک گئے۔

اس وقت اشمٰل خان یقیناً اپنے آفس میں موجود ہو گا اور اس کا فون کرنا سے دوسروں کی نظر میں مشکوک کر سکتا تھا۔ یوتھ فیڈریشن کا کوئی بھی ممبر اس کی آواز با آسانی پہچان سکتا تھا\_\_\_\_ ضروری تو نہیں تھا کہ اشمٰل خان ہی فون ریسیو کرے۔

ایک انجانے خوف نے اُسے روک دیا۔ وہ فون کے پاس سے ہٹ گئی۔ اب اُسے انتظار کرنا تھا۔ طویل انتظار کہ کب اشمٰل خان ہاسٹل پہنچتا ہے۔

اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ ابھی گیارہ بج رہے تھے۔ اس کے چہرے پر اُلجھن کے آثار گہرے ہو گئے۔ اس نے خود کو بیڈ پر گرالیا اور تکیہ پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

پھر نجانے کس لمحے نیند نے آگھیرا۔ بھابی کی تیز آواز بھی اُسے اُٹھانہ سکی۔

’اے ہشمنہ! تم کب آئیں؟\_\_\_\_ اور چھپ کر سو بھی گئیں۔‘ ان کی حیرت آمیز آواز ابھری۔ ’اے

ہشمنہ\_\_\_\_‘ بھابی نے جھک کر اسے تقریباً جھنجھوڑ ڈالا۔ ’ایسی گہری نیند\_\_\_\_ تو بہ، کب سے آکر پڑی ہو یہاں؟‘

’کیا قیامت آگئی ہے؟‘ اس نے کروٹ بدل کر بھابی کو گھورا۔

’لمبی تان کر سو گئیں۔‘

’سونا جرم ہے کیا؟‘ وہ اٹھ بیٹھی اور بکھرے بالوں کو سمیٹنے لگی۔

’جرم تو نہیں مگر\_\_\_\_‘

’میں صبح ہی آگئی تھی واپس۔‘

’ایں\_\_\_\_ کیا؟‘ بھابی اُچھل کر رہ گئیں۔ ’صبح\_\_\_\_ مگر کیوں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟‘ ان کی آنکھوں

میں حیرانگی، تشویش کا روپ دھار گئی۔ انہوں نے اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔

’ارے نہیں ڈاکٹر بھابی! طبیعت بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی ٹھیک ہے۔‘ اس نے مسکرا کر ان کا ہاتھ اپنی پیشانی سے ہٹا دیا اور ایک لمبی جمائی لے کر تکیے کو اٹھا کر گود میں بھینچ لیا۔ بھابی کھسک کر اس کے قریب آ گئیں۔

’تو پھر بتاؤ نا\_\_\_\_ ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ تم واپس آ کر یوں چھپ چھپائے لیٹ گئیں اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی۔‘ بھابی کی تفتیشی رگ پھڑکنے لگی۔ تجسس کی لہریں مچنے لگیں۔ اُسے بے ساختہ ہنسی آگئی۔

’آپ کو تو سی آئی ڈی ہونا چاہئے۔ یہ اتنی تفتیش۔‘

’نہ بتاؤ\_\_\_\_ دفع ہو۔‘ بھابی خفا ہو کر بیڈ سے کھڑی ہو گئیں۔ ’میں تو تمہیں لنچ کے لئے بلانے آئی تھی۔ کچھ خبر ہے ڈھائی بج رہے ہیں۔‘

’کیا\_\_\_\_‘ بھابی کے جملے پر وہ چونکی۔ ’اوہ، ڈھائی بج گئے\_\_\_\_‘ اُس نے وال کلاک کی طرف دیکھا اور پھر بستر سے چھلانگ لگا کر فون کی طرف لپکی۔

’واقعی مجھے نیند آگئی تھی۔ وہ بھی بے وقت۔‘ اس نے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے خود کو ملامت کی۔



”کیوں ڈھائی بج گئے ہیں تو کیا ہوا؟“ بھابی اس کے یوں اُچھلنے اور فون کی طرف بڑھنے پر حیران ہو رہی تھیں۔ پھر ان کو دوسرا جھٹکا لگاجب ہشیمینہ ایک نمبر ڈائل کر کے اشمل خان کو بلانے کا کہہ رہی تھی۔

”جی\_\_\_ میں اشمل خان خل زئی سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ وہ بیس نمبر کمرہ میں ہیں۔ پلیز انہیں بلا دیجئے۔“

بھابی متعجب سی اس کی طرف بڑھیں۔

”ہش\_\_\_\_ مینہ\_\_\_\_“

”شش\_\_\_\_ ہشیمینہ نے جلدی سے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے کچھ پوچھنے سے باز رکھا پھر جلدی سے سیدھی کھڑی ہو گئی۔ دوسری جانب اشمل خان کی شستہ اور گجھیر آواز ابھری۔

”یس\_\_\_ اشمل خان اسپیکنگ۔“

”مم\_\_\_\_ میں ہشیمینہ بول رہی ہوں۔“ اس کی آواز دھیمی ہوتے ہوئے لڑکھرائی۔ دوسری طرف ایک لمحے کے لئے سناٹا چھا گیا۔ بالکل غیر متوقع بات تھی۔

نہ اشمل خان کے گمان میں تھا اور نہ ہشیمینہ ابرار نے کبھی سوچا تھا کہ اسے کبھی خود اشمل خان سے رابطہ قائم کرنا پڑے گا۔

دونوں طرف چند ثانیے خاموشی رہی۔ پھر اشمل خان کی آواز ابھری۔

”جی\_\_\_ خیریت ہے؟“

”جی دراصل مجھے کام تھا آپ سے۔ آپ کو بے وقت ڈسٹرب کرنے پر معذرت خواہ ہوں۔“

”ارے نہیں ہشیمینہ ابرار! مجھے مسرت ہوئی کہ تم نے مجھے اس قابل سمجھا۔ میرے لائق کوئی خدمت؟“ اس کا لہجہ

سادہ مگر پُر تجسس تھا۔ ہشیمینہ ہونٹ دانتوں میں چبا کر سوچنے لگی پھر جلدی سے بولی۔

”میں سر حیدر کیانی کے اغواء کے سلسلے میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی جیسے پہلی بار اشمل خان سے مخاطب ہوئی ہو۔ حالات نے ان کے درمیان ایک گہری دیوار خود بخود کھڑی کر رکھی تھی جسے اشمل خان کے رویے اور ہشیمینہ ابرار کے غصے نے اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔

ہشیمینہ کی انا نے قدم پیچھے روک رکھے تھے ورنہ دونوں اس دیوار کے پیچھے کھڑے عجیب سے خلفشار میں گرفتار اس دیوار کو ڈھانے کے خواہاں تھے۔

”ہوں\_\_\_ سر حیدر کیانی کا اغوائی\_\_\_ ہاں، بہت پست حرکت ہے۔ مگر تم اس سلسلے میں\_\_\_\_“

”میں یہاں فون پر آپ سے کچھ نہیں کہہ سکوں گی۔ میرا مطلب ہے میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ مجھے وقت دیں گے؟“ اس کی خود اعتمادی آہستہ آہستہ لوٹ رہی تھی۔

”وائے ناٹ\_\_\_ کل یہیں آفس میں\_\_\_\_“

”نہیں\_\_\_“ اُس نے جلدی سے اس کا جملہ کاٹ دید۔ ”میں کسی کی نظر میں نہیں آنا چاہتی۔“ اُس نے صاف گوئی سے کہا۔ اشمل خان معاملے کی سنگینی کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔

”اوکے\_\_\_ پھر جہاں چاہو۔“ اس نے گویا سارا بوجھ اس پر ڈال دیا۔

ہشیمینہ کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

”کیفے لالہ زار میں\_\_\_\_ آج شام کو۔“ اُس نے یہ کہہ کر اس طرح پلکیں جھکا دیں جیسے اشمل خان اس کے بالکل سامنے ہے اور اس کی پُر تجسس آنکھیں اس کے چہرے پر مرکوز ہوں۔ اس کی نرم نرم ہتھیلیوں سے پسینہ بہہ نکلا۔

”اوکے \_\_\_“ اُس کے منہ سے رضامندی کا ایک لفظ نکلتے ہی ہشمنہ نے جھٹ ریسور کریڈل پر رکھ دیا اور پھر ایک گہری سانس لے کر پلٹی تو اپنی بے ساختہ ہنسی کو نہ روک سکی۔ بھابی ہونق سی کھڑی اس کے چہرے کو دیکھے جا رہی تھیں۔

”ادھر آئیں \_\_\_ آپ کو بتا ہی دوں۔ ورنہ خدا نخواستہ اتنی پیاری آنکھیں پھٹ ہی نہ جائیں۔“ وہ ان کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی اور ان کا بازو تھام کر انہیں اپنے بیڈ تک لے آئی۔

...☆☆☆...

وہ اُسے اپنے روبرو وارفتگی سے اپنی جانب دیکھتا پا کر کتنے ہی ثانیے گنگ رہی۔

سکون سے گزرتے ہوئے شب و روز میں اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ شخص مجنوں کا جانشین یہاں تک پہنچ جائے گا۔

’یا خدا \_\_\_ اس سے کیا چوک ہو گئی؟‘ اس کے جسم سے پسینہ موتی کی لڑیوں کی صورت بہنے لگا۔

”میں نے اس دہلیز پر قدم رکھتے ہی شدت سے یہ دعا مانگی تھی کہ یارب دیدار محبوب نصیب ہو۔“ اس کی آواز تیر کی طرح اس کی سماعت سے ٹکراتی ہوئی اس کے دل میں پیوست ہو گئی۔ مارے خوف کے اس کا سارا وجود کانپنے لگا۔ اس کی قوت گویائی سلب ہونے لگی۔ وہ آڑی تر چھی شوخ نگاہیں اس کے جسم کے آر پار ہو رہی تھیں۔

”آہ \_\_\_ آپ کیوں آئے ہیں؟“ اس نے بے حد مشکلوں سے پھنسی پھنسی آواز کھینچ کر باہر نکالی اور جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ کیونکہ وہ اس کے بالکل قریب اکھڑا ہوا تھا۔ مسکراتا، بے حد نڈر انداز لئے جو اس کے خوف نے اُسے بخش دیا تھا۔

”ارے یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔“ وہ زور سے ہنسا۔ ”صرف تمہیں دیکھنے آیا ہوں سحر گل! صرف تمہیں۔“

”آف \_\_\_ وہ یوں بدک کر پیچھے ہٹی جیسے اس کے پیروں میں کسی نے بم رکھ دیا ہو۔ اس کی پیشانی جلنے لگی۔ رسوائی کا خوف اس کی رگوں میں دوڑنے لگا۔

”شرم آئی چاہئے آپ کو \_\_\_ ایک شریف لڑکی کو بلاوجہ تنگ کر رہے ہیں۔ میں تو آپ کو جانتی تک نہیں۔“ اس نے اپنی پوری ہمتیں مجتمع کر لیں۔ آج وہ نڈر بن کر گھر تک آگیا تھا، کل کلاں کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔ یہ سوچ کر وہ اندر ہی اندر لرزنے لگی۔ وہ اپنے آپ میں ہمت پیدا کرنے لگی۔ اس نے ایک سرسری نگاہ سنسان گلی میں ڈالی اور پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

وہ بالکل خائف نہیں تھا۔ اُلٹا اس کے جملے پر تمسخرانہ انداز میں مسکرا دیا تھا۔

”میں اپنے بھائی سے آپ کو مار بھی لگواسکتی ہوں۔“

”ہوں \_\_\_ خوب \_\_\_ میں نے تم سے محبت کی ہے ڈیر! اور پھر تم نے بھی تو میری حوصلہ افزائی کی ہے۔ میں اس سفر میں تنہا ہر گز نہیں ہوں۔“

”کیا \_\_\_“ اُس کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”جھوٹ بول رہے ہو تم \_\_\_ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ ورنہ \_\_\_“ اس کی آواز غصے کی یورش سے پھٹنے لگی۔

”خط و کتابت تو جاری رہی ہے نا ہمارے درمیان۔“

”ذلیل انسان \_\_\_“ بے اختیار اس کا ہاتھ اٹھا اور اس کے رخسار پر آپڑا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی خونخوار



”آں۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔نہیں وہ بس ایسے ہی۔“ اس نے جلدی سے اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹتے ہوئے کہا اور تقریباً بھاگ کر پور ٹیکو کے ساتھ لان بھی عبور کر گئی۔ فروان اُسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔

بکھرے بال، متوحش چہرہ، روئی روئی آنکھیں۔ اور اس وقت مین گیٹ پر اس کا کھڑا ہونا۔ وہ اُلجھ سا گیا۔ کوئی بات ہے ضرور۔ وہ سوچنے لگا۔ وہ اندر آیا تو سامنے ہی ماہ گل آپی اُسے نظر آئیں۔

”تم آگئے فرو۔ کیا بات ہے؟“ انہوں نے اس کے چہرے پر تردد کی پر چھائیں دیکھ کر حیرت سے استفسار کیا۔

”سحر کہاں ہے؟“ وہ ان کا جملہ نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

”شاید کمرے میں ہے۔۔۔ کیوں، خیریت تو ہے؟“ ماہ گل کا ماتھا ٹھنکا۔ ”کیا بات ہے فروان؟“

”ارے نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی کام تھا۔“ اس نے ماہ گل آپی کے چہرے پر پھیلتی تشویش کو دیکھا تو جلدی سے سر جھکا کر بے مقصد مسکرا دیا۔

”فروان!۔۔۔ ماہی! ادھر آؤ۔ فون ہے شاہ خانم کا۔“ امی کی آواز پر دونوں چونک پڑے۔

”فون ہے آنٹی کا۔۔۔ بڑے دنوں بعد یاد کیا ہمیں۔“ وہ مسکرایا۔

”ہاں۔۔۔ میں نے اشارہ سے کہا تھا کہ تم تو فون ہی نہیں کرتیں۔“ ماہی آپی مسکرا اُٹھیں۔ فروان ان کے پیچھے لائونج کی طرف بڑھ گیا۔

سحر گل کا دل سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے اس کے ہاتھوں میں کسی نے بہت سے انگارے پکڑا دیئے ہوں۔ اُسے جلتے شعلوں میں دھکیل دیا گیا ہو۔

بدنامی، رُسوائی، جلتی آگ، ہی تو ہے۔ ایک بھڑکی ہوئی آگ جس کے بعد کچھ باقی نہیں رہتا۔ صرف راکھ کا ڈھیر۔۔۔

”نہیں، مجھے اس آگ میں خاکستر نہیں ہونا۔ خدایا، میرے دامن کو اس آگ سے بچائے رکھنا۔“

کرب سے اس نے آنکھیں بھینچ لیں۔

گھڑی کی سوئیاں بہت تیزی سے چکر لگا رہی تھیں۔ اس کے دل کی حالت سے بے خبر۔ وقت تیزی سے سرک رہا تھا۔

دھوپ تیزی سے ڈھل رہی تھی اور شام کے سائے درپچوں پر پھیل رہے تھے۔ اس کے ذہن میں بے اختیار جھماکا سا ہوا۔ ایک خیال بجلی کی طرح چمکا۔ وہ تیزی سے فون کی جانب لپکی۔ فضہ کمال کا فون نمبر اُسے زبانی یاد تھا۔ اس نے سوچا فضہ یقیناً اس سارے معاملے سے آگاہ ہوگی اور اس کی اچھی اور بہترین رفیق ہے۔ یقیناً اس کی مدد کرے گی اور اپنے کزن کو اس گھنائونی حرکت سے باز رکھے گی۔

اس نے دھڑکتے دل اور ڈھیر ساری امیدوں کے ساتھ فضہ کا نمبر ڈائل کیا تو دوسری جانب فضہ کی کھنکھاتی آواز ابھری۔

”فضہ! میں سحر گل بول رہی ہوں۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”ارے سحر! تو۔۔۔ کیسے یاد کر لیا۔۔۔ وقت مل گیا مجھ جیسی بے کاری لڑکی سے بات کرنے کا؟“ اُس نے حسب عادت اُسے لتاڑا۔ ”پورے پندرہ دن بعد اپنی آواز سن رہی ہو کم بخت! میں تیری طرف ہی آنے کا سوچ رہی تھی مگر پھر سوچا چھوڑا ایسی بے مروت اور بے وفا لڑکی کا منہ دیکھنے سے کیا فائدہ۔“ وہ اپنی کہے جا رہی تھی۔

”فضہ!“ سحر گل کی سسکاری نکل گئی اور فضہ بری طرح چونکی۔

”کیا بات ہے سحر گل! تم رورہی ہو۔۔۔ ایں، کیا ہو گیا۔۔۔ گھر میں تو خیریت ہے نا؟ تمہارا بلڈ وگ تو ٹھیک ہے یا پھر۔۔۔۔۔“



”سب ٹھیک ہے، سوائے میرے۔“ وہ فون کو اسٹینڈ سے اٹھا کر صوفے کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے رندھے لہجے میں بولی۔

”یار سپنس مت پھیلاؤ کیا ہو گیا ہے بتاؤ نا!“ فضہ کی آواز میں تشویش اُٹ آئی۔

وہ کتنے ہی ثانیے بے آواز آنسو بہاتی رہی اور اپنی آواز صاف کرنے لگی یا شاید اُسے بتانے کے لئے مناسب لفظ ڈھونڈ رہی تھی۔

”سحر! بتاؤ نا کیا بات ہے؟ یار! اب مجھے غیب کا تو علم ہے نہیں کہ صرف آنسوؤں سے سب کچھ جان لوں۔ ہاں البتہ میرے لب نمکین ہو گئے ہیں۔ شاید تمہارے آنسوؤں کا ذائقہ چکھ رہی ہوں۔“ وہ آخری جملہ اسے نارمل کرنے کے لئے بولی۔ مگر سحر گل نے جیسے اس کا کوئی لفظ سنا ہی نہیں یا سمجھ نہ سکی۔ دھیرے سے بولی۔

”فضہ! میرا مسئلہ تمہارے گھر تک بھی آسکتا ہے۔“ یا شاید وہیں سے شروع ہوتا ہے۔ میں نہیں جانتی تمہارے اس کزن کو نہ اس کے نام سے واقف ہوں۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ وہ ایک آوارہ مزاج شخص ہے اور مجھے رسوائیوں میں دھکیلنے کے درپے ہے۔“

”سحر!“ فضہ کا لہجہ ایک دم ڈھیلا ہو گیا۔ ”کہیں تم منصور کے بارے میں تو نہیں کہہ رہی ہو؟“

”میں اس کا نام نہیں جانتی۔“ اس کا رندھا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”وہ شخص میری زندگی میں رسوائیاں بھر دینا چاہتا ہے۔ یہ محبت کا کون سا طریقہ ہے فضہ! یوں سرعام ایک لڑکی کو تکتے رہنا، پھر اُسے محبت نامہ بھیجنا اور ایک دن اس کے گھر تک چلے آنا اور دھمکی کے ساتھ اسے ملاقات کا حکم دینا۔“ وہ پھر پڑی۔ کوئی تو تھا اس کا ہمدرد و غمگسار۔ اس کی باتوں کو سن کر اسے ملامت نہ کرنے والا بلکہ اس کا حل سوچنے والا۔

”میں مرجائوں گی فضہ! اسے سمجھاؤ۔“ وہ جس راستے پر خود ہے، اسی پر مجھے بھی گھسیٹنا چاہتا ہے۔ وہ سراسر تباہی

کا راستہ ہے۔“

”ٹیک ایزی سحر!“ فضہ کی آواز ابھری۔ ”میں شاید کچھ بھی نہیں سمجھ سکی۔ سوائے صرف اس کے کہ منصور کا اگلا ٹارگٹ اب تم ہو۔“

”کیا۔۔۔۔۔۔ تم ان سارے معاملات سے لاعلم ہو؟ جبکہ اس نے آج مجھ سے ملنے کا مقام تمہارا گھر ہی چنا ہے۔“ سحر گل کے لہجے میں حیرانگیاں سمٹ آئیں۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا، فضہ کمال اس بات سے لاعلم ہو جبکہ وہ لڑکا جس کا نام منصور ہے اسی کے گھر اسے بلارہا تھا۔

”نہیں فضہ! تم پہلو تہی کر رہی ہو۔ تم جانتی ہو سب کچھ ورنہ۔“

”بائی گاڈ سحر! اس نے مجھے ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔ مگر ہاں۔۔۔“ وہ چونکی۔ ”وہ ابھی آدھا گھنٹہ پہلے ہی آیا ہے اور مجھے سٹنگ روم میں بلارہا تھا۔ بقول اس کے وہ مجھ سے کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا ہے۔ آئی تھنک وہ اہم باتیں یہی ہوں گی۔ اُسے پتہ ہے کہ آج ماما اور پاپا ایک پارٹی میں جا رہے ہیں شام چار بجے۔ اُس نے تمہیں کون سا وقت دیا ہے؟“ فضہ نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں سوچ اور تشویش کے رنگ بھر گئے۔

”پانچ بجے۔۔۔“ اُس نے یوں بتایا جیسے اپنی موت کا مقررہ وقت اُسے بتا رہی ہو۔ اور پھر ایک تیز سسکاری لے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”ہوں۔۔۔۔۔۔ بڑا مکار ہے وہ۔“ فضہ نے ایک گہری سانس کھینچ کر باہر نکالی۔ ”وہ میرا سیکنڈ کزن ہے۔۔۔۔۔۔ میری تائی کا پوتا۔ شروع ہی سے اس کا ہمارے گھر بہت کم آنا جانا ہے۔ دراصل تائی پہلے ہمارے قریب ڈیفنس میں رہتی تھیں۔ پھر ہم لوگ دور چلے گئے، میرا مطلب ہے یہاں آگئے۔ مگر وہ اتنا رہا۔ بہت آزاد اور بے باک طبیعت پائی ہے مسٹر نے۔“ وہ رکی، پھر دھیرے سے بولی۔ ”وہ تمہیں کب سے جانتا ہے۔ کسی اور کو اس معاملے کی خبر

ہے؟“

”صرف ماہی آپلی جانتی ہیں۔ جب اس نے خط دیا تھا مجھے اور اس کے بعد ایگزام کے ختم ہونے پر گھر بیٹھ گئی تھی تو مجھے بھی سکون ہو گیا تھا اور ماہی آپلی بھی مطمئن تھیں۔ مگر اب وہ گھر تک آگیا ہے۔“ اُس نے فضا کو ساری تفصیل بتا دی۔ ”میں نے یہ بات ماہی آپلی کو نہیں بتائی فضا! تم نہیں جانتی جب وہ اس کا خط پڑھ رہی تھیں تو اس وقت مجھے کتنی ذہنی اذیت ہوئی تھی۔ مجھے اپنا آپ بے حد حقیر اور پست لگا تھا۔ میں مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہی تھی۔ اب میں انہیں بتا کر ویسے ہی عذاب سے دوچار نہیں ہو سکتی اور پھر جب کہ ان کے پاس کوئی حل بھی نہیں۔“

”میں جانتی ہوں تمہارا پر اہلم سحر! ٹیک اٹ ایزی۔“ فضا نے اسے از حد آزر دہ ہوتے دیکھ کر تشفی دی۔ ”سنو، میں تمہیں ایک گھنٹے بعد فون کروں گی۔ وہ آیا بیٹھا ہے۔ ذرا اس کا بھی تو حال دل سنوں۔“ وہ ہنسی۔ سحر گل کے اندر کرب کی ایک تند لہر دوڑ گئی۔

”اُسے سمجھنا فضا! ورنہ میں جیتے جی مرجائوں گی۔ ایک شریف گھرانے کی بیٹی کے لئے یہی اذیت کیا کم ہے کہ وہ کسی کی ہوس زدہ نگاہوں کے حصار میں ہے۔ اب لوگ گھر پر انگلی اٹھائیں گے۔“ فضا نے ایسا نہیں ہونا چاہئے۔“

”تم فکر مت کرو۔ میں اُسے سمجھائوں گی۔ اچھا، خدا حافظ۔ اور ہاں، ایک گھنٹے کے بعد میں فون کروں گی۔ تم انتظار کرنا۔“ فضا نے فون رکھ دیا۔

وہ خود بھی ریسور کریڈل پر ڈال کر اس پر سر جھکا کر بقیہ آنسو بھی بہانے لگی۔

وہ اپنے آپ کو سخت بے اختیار محسوس کر رہی تھی۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے اس کی عزت اس چراغ کی مانند ہے جسے تیز ہوا

میں رکھ دیا گیا ہو اور آنے والا کوئی بھی تیز ہوا کا جھونکا سے بچھا دے گا۔

اس کی روح تک تھرا اٹھی۔

کیا فضا اُسے سمجھالے گی؟ اُس کی منتیں کر کے ہی۔ مگر۔۔۔۔۔ کیا وہ اس کی منتوں اور التجائوں کو شرف قبولیت بخشے گا؟“

اس کی آنکھیں اس کے تصور میں آئیں تو اُسے جھر جھری آگئی۔

زندگی کے گزرتے لمحوں میں تو اُسے گمان بھی نہ ہوا تھا کہ وہ یوں اچانک کسی آہنی جال میں جکڑ لی جائے گی۔ یوں سرِ راہ چلتے محبتوں پر تو اُسے کبھی یقین ہی نہ تھا۔ اس نے کتنے قصے سن رکھے تھے۔ اس کی کالج کی لڑکیاں خود ایسے قصے کہانیوں میں ملوث تھیں اور وہ انہیں دیکھ کر دکھ سے سوچتی تھی کہ محبتیں اتنی ارزاں کب سے ہو گئیں۔ محبتوں کی مقدار اتنی وافر کہاں ہے۔ کہ اب یوں راہ چلتے ہوئے ملتی رہیں۔ محبت کوئی عام سا پھول تو نہیں ہے کہ سرِ راہ اور ہر گھر کے باہر نکلی ہوئی کیاری میں آگا ہوا ہے۔ وہ تو ایسا نادر پھول ہے جو ہزاروں کانٹوں میں کہیں گھرا، چھپا ہوتا ہے۔ اسے بہت محنت اور جانفشانی سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اگر اس طرح راہ چلتے ہوئے محبتیں ملتی رہیں تو ہر گھر خوشیوں کا گہوارہ نہ ہوتا۔ ہر آنگن میں سرائوں کے دیے نہ جھلملا رہے ہوتے۔۔۔۔۔ آہ، مگر اب تو وہ خود ایسی سستی محبت کے جال میں جکڑ گئی تھی۔ اس کے لئے ایسی محبت کبھی بھی کشش کا باعث نہ رہی تھی۔

اُس نے ماہی آپلی کو دیکھا جو بے لوث خلوص اور محبت کے لئے جانے کب سے ہاتھ پھیلائے کھڑی تھیں۔

اُس نے شاردابھانی کو دیکھا تھا جو بے لوث خدمت کے بدلے صرف چند قطرے محبت کی خواہاں تھیں۔ مگر اب بھی ان کے نصیب میں وہ ٹمٹماتا دیا نہیں رقم ہوا تھا۔

اب وہ بھلا کیسے، کیوں کر منصور کی ایسی اچھی محبت پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتی جبکہ اس کے سامنے رسوائی سے

بھری شاہراہ پھیلی تھی۔ تاریک اور آگ اُگلتی۔

اچانک فون کی گھنٹی چیخ اُٹھی۔ وہ بری طرح چونکی۔ فون چونکہ اس کی گود میں پڑا تھا، اس نے حیرت سے دیکھا اور پھر دوسری گھنٹی پر ہی ریسور اٹھا لیا۔ دوسری جانب فضا کمال تھی۔

”ہیلو سحر! تم پانچ بجے میرے گھر آجانا۔“ وہ اس کی آواز سنتے ہی بولی۔ اور سحر گل کو اپنا آپ چکرنا محسوس ہوا۔

”فضہ۔۔۔۔۔ فضہ۔۔۔۔۔“

”ہاں سحر! دیکھو، ضرور آجانا۔۔۔۔۔ خدا حافظ۔“ دوسری جانب رابطہ کٹ گیا اور وہ بھٹی بھٹی آنکھوں سے ریسور کو گھورتی رہ گئی۔

...☆☆☆...

شاہ خانم تو منہ لپیٹے اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھیں۔ بدلتے موسم نے ان پر اچانک حملہ کر دیا تھا۔ زکام نے ان کی خوبصورت ناک کو قابل رحم بنا دیا تھا اور ایسے میں وہ از حد چڑچڑی ہو رہی تھیں۔ ملنا جلنا بھی ترک کر کے کمرے میں بند تھیں۔

ایسے میں اشارانے گل بی بی کے گھر جانے کی اجازت بابا خان سے مانگی تھی تو انہوں نے بلا تردد اُسے اجازت دے دی۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ شاہ خانم کے کمرے کی طرف بڑھی تھی۔

گل بی بی کے گھر کے لئے اجازت لینا ہمیشہ اس کے لئے دشوار تھا۔ شاہ خانم کی ڈھیر ساری خفگی، ان کا غصہ برداشت کر لینے کے بعد بھی اکثر وہ مایوس ہی لوٹ آئی تھی۔ اور آج جب کہ شاہ خانم کی طبیعت بھی ناساز تھی اور موڈ بھی اُس نے یوں ہمتیں مجتمع کرتے ہوئے ان کے کمرے کی طرف قدم بڑھایا تھا۔ تبھی بیٹھک میں بابا خان نے اسے روک

لیا اور اُسے گل بی بی کے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ وہ خوش ہو گئی۔

”اشارا!“ بابا خان نے اُس کے دھڑکتے ہوئے چہرے کو محبت سے دیکھا۔ ”کیا گل بی بی سے بہت محبت ہے تمہیں؟“ ان کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور خوشی بھی۔ اشارانے انہیں دیکھا۔

”اُن سے خونی رشتہ ہے میرا بابا خان! اور وہ آپ کی بہن، میری پھوپھی ہیں۔ میرا یہ عمل تو فطری ہے۔“ اس نے سچائی سے کہا تو بابا خان کا چہرہ چمک اٹھا۔ انہوں نے ایک گہری اور قدرے

طمأنیت بھری سانس لیتے ہوئے اسے دیکھا۔

”تم شاہ سے بہت مختلف ہو اشارا بیٹی! میں اکثر سوچتا ہوں کہ۔۔۔۔۔ خیر۔“ انہوں نے لب بھینچ لئے۔

”جی بابا خان!“ وہ ان کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ ان کے خاموش ہو جانے پر بولی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ کچھ نہیں۔“ تم جائو۔ اور ہاں، جلدی آجانا۔“ انہوں نے سر ہلاتے ہوئے تاکید کی اور دوسرے ہاتھ میں پکڑی کتاب کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ خوش اور مسکراتی ہوئی بیٹھک سے باہر آ گئی۔

خوشی اور غم میں اُسے شاندا نہ ہمیشہ یاد رہتی تھی۔ اس کی شفیق اور محبت کرنے والی گل بی بی کو ان جذباتوں میں ہمیشہ اپنے دل میں موجود پاتی تھی۔ وہ بے پناہ خوش تھی۔

ایک الوہی کیفیت میں گرفتار۔

ذولین خان نے اُسے کیسا فخر بخش دیا تھا کہ وہ بہت معتبر ہو گئی تھی۔ اس سیاہ ڈائری کا ایک ایک لفظ اب بھی اس کی



سماعتوں میں گونج رہا تھا۔ اس کی رگوں میں دوڑتے خون میں طمانیت انگیز ٹھنڈک بھر رہا تھا۔ یہ احساس کتنا خوش آئند تھا کہ اس کے باوجود بظاہر بے حس اور بد مزاج نظر آنے والے شخص کے لئے روشنی بنا ہوا ہے۔

سرشاری وقت سے وہ اب آگاہ ہوئی تھی۔

سرشارتے ریشمی لمحے اس کے اطراف جیسے بکھر گئے تھے۔

زندگی کی ساری رنگینیاں، ڈھیر ساری خوشیاں اس کی منتظر تھیں اور اپنی اس بہکی بہکی بد مست خوشی میں وہ اپنی پیاری شاندارانہ کو کیسے بھول جاتی۔ وہ گل بی بی کے گھر آئی تو شاندارانہ اُسے دیکھ کر کھل اٹھی۔

”کیسے یاد آگئے ہم لوگ حویلی کی خان زادی کو؟“ وہ اس سے لپٹتے ہوئے شکوہ کرنا قطعی نہ بھولی۔

اشدارانہ نے محبت سے اسے گھورا۔

”حویلی کی خان زادی نہیں، اشدارا کہو۔ اس لئے کہ تمہارے پاس اشدارا آئی ہے۔ شکوہ تم خان زادی سے ہی کرنا۔“ وہ یہ کہہ کر مسکرائی تو شاندارانہ نے اسے دیکھا۔ اس کی سنہری آنکھیں دمک رہی تھیں اور بے تحاشا سرخ لب انوکھے اور دلفریب انداز میں مسکراہٹ بکھیر رہے تھے۔

”کیا بات ہے۔۔۔ بہت خوش لگ رہی ہو۔“ اس نے اپنی عادت کے مطابق اسے کھوجتی نظروں سے گھورا مگر دوسرے ہی لمحے اشدارانہ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں پر اپنے دونوں نرم ہاتھ رکھ دیئے۔

”بس بس۔۔۔ نظر مت لگا دینا۔“

”کیا۔۔۔ کیا۔۔۔“ وہ اس کے ہاتھ ہٹا کر چیخی تو اشدارا بھرپور قہقہہ لگا کر اس سے بچنے کے لئے اندر بھاگی۔

”ارے اشدارا بیٹی! تم آئی ہو۔“ گل بی بی اسے دیکھ کر پلنگ سے اٹھنے لگیں۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے گل بی بی؟“ وہ انہیں سر شام بستر پر دیکھ کر گھبرا گئی اور ان کے قریب آگئی۔

”ہاں۔۔۔ طبیعت تو بہتر ہے۔ شکر ہے اللہ کا۔ بس ذرا ٹھنڈک نے پیروں کو جیسے جما کر رکھ دیا ہے۔ بے کار سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ بتاؤ، حویلی میں خیریت تو ہے۔۔۔ کس کے ساتھ آئی ہو تم؟“

”بابا خان سے اجازت لے کر آئی ہوں۔ شاہ خانم کی طبیعت ناساز ہے۔ انہیں زکام ہو رہا ہے۔“

”ہاں، برف پگھل رہی ہے۔۔۔ شروع دنوں میں یہی سب ہوتا ہے۔ کل ذولین بھی آیا تھا، اسے بھی حرارت تھی۔“ گل بی بی کے منہ سے ذولین کی بیماری کا سن کر وہ پریشان ہو گئی۔

”اکیلا انیکسی میں پڑا رہتا ہے۔۔۔ نہ اپنا دھیان رکھتا ہے نہ کچھ۔ میں نے کہا بھی کہ میرے گھر ہی دو دن رہ لے مگر غیرت تو ان لڑکوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔۔۔ مجال ہے جو ایک گھنٹے سے زیادہ کبھی یہاں بیٹھا ہو۔ کبھی تو ہوا کے گھوڑے پر سوار آتا ہے۔“ گل بی بی کے لہجے میں اس کے لئے محبت بھی تھی اور تشویش بھی۔

”ویسے اماں! آپ نے دیکھا نہیں، بخار میں بھی ذولین لالہ خوب چمک رہے تھے۔۔۔ شاید زندگی میں پہلی بار وہ اتنی زیادہ بار مسکرائے تھے۔“ شاندارانہ نے جانے کب سے اشدارا کی کرسی کی پشت کے پاس کھڑی تھی، جھک کر بولی اور پھر اشدارا کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”اور آج اشدارا بھی بڑی خوش ہے امی! آپ نے غور نہیں کیا، اس کا چہرہ عام دنوں سے کہیں زیادہ دھنک بکھیر رہا ہے۔ یہ سردی کا تو غالباً اثر نہیں۔ بات کچھ۔۔۔۔۔“

”بہت بد تمیز ہے۔“ اشدارانہ اسے بازو پر زور سے چٹکی لی۔ ”فضول مت بکو۔ کم از کم گل بی بی کا ہی خیال کر لو۔“ اس نے آہستگی سے اُسے ڈپٹا۔



”خدا ہمیشہ خوش رکھے سب کو۔ جائو، تم ذرا قہوہ بنا لاؤ اس کے لئے۔“ گل بی بی نے شاندا نہ سے کہا تو وہ پلیٹی اور تہی پُر زور انداز میں مسکرائی۔ ذولین خان اندر داخل ہوا تھا۔

”آئیے، آئیے ذولین لالہ! \_\_\_ آج تو ہمارے گھر چاند اور سورج ایک ساتھ اُتر آئے ہیں۔“ اس کے جملے پر اشتارا چونک کر پلیٹ تو ذولین پر نگاہیں پڑیں۔

وہ شاندانہ کی اس شرارت کو نظر انداز کرتا گل بی بی کے پاس آیا تو اسے دیکھا اور بے حد دلفریب انداز میں مسکرایا۔  
مسکراہٹ میں بے تکلفی اور اپنائیت کا ملا جلا تاثر تھا۔

اس کی مسکراہٹ میں بے حد خوبصورت رنگ تھے جو اشتاراکے رخساروں کو سرخ کر گئے۔ اس نے اپنی بھاری پلکیں جھکا دیں۔

”اُؤ ذولین! ابھی میں تمہارا ہی ذکر کر رہی تھی اشترا سے۔“ گل بی بی بولیں۔ وہ ان کے سرہانے بیٹھ گیا۔ اشترا کے بالکل سامنے۔

”اس کی موجودگی میں بھی میرا ہی ذکر کرتی ہیں آپ۔۔۔ بہت خوش نصیب ہوں میں۔“ اُس نے اچھٹی نگاہ اس کے گرم ہوتے رخساروں پر ڈال کر گل بی بی کو دیکھا تو وہ ہنس دیں۔

”تمہاری طبیعت اب کیسی ہے۔۔۔ کل تو بخار میں پھنک رہے تھے۔“ انہیں اچانک یاد آگیا تو اس کی کشادہ پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

”ارے اتنا معمولی بخار میرا کیا بگاڑ لیتا گل بی بی! آپ بھی خوب ہیں۔ ابھی تک یاد رکھا ہے اس بخار کو۔“

”شاید تم سے یہی ذکر کر رہی ہوں گی گل بی بی۔“ اس نے براہِ راست اسے مخاطب کیا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ

گل بی بی کے گھر وہ اس سے اس طرح بے تکلفی سے بات کر رہا تھا \_\_\_\_\_ کم از کم شاندا نہ کے لئے یہ لمحہ حیرت تھا۔ اس نے چونک کر ذولین کو دیکھا اور پھر زیر لب مسکرا دی۔ گویا صلح ہو گئی تھی۔ وہ بھی بے حد شاندار طریقے سے۔

اُسے واقعی بے حد مسرت ہوئی اور ساتھ ہی تجسس کی لہر اٹھی کہ یہ انقلاب کب اور کیسے آئے۔

اشتراک اس کی نگاہوں سے خود کو پگھلتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اس کے استفسار پر چونکی۔

”ہاں۔۔۔ آپ نے مجھے یا حویلی میں کسی کو بھی نہیں بتایا۔ کم از کم بابا خان کو ہی بتا دیتے۔“ اس کے لبوں پر شکوہ مچل گیا۔ وہ ان لوگوں سے اتنی غیریت برت رہا تھا یا اپنی طرف سے اتنا لا پرواہ تھا۔

”ارے آپ لوگوں نے تو میری اتنی بیماری کو ہوا بنا لیا ہے گل بی بی! کیا اتنی سی بے معنی بات کا پر و پیگنڈا کرتا میں۔“

”پاگل ہو تم تو۔“ گل بی بی نے اسے گھورا۔ ”اتنی لاپرواہی اچھی نہیں ہوتی۔ کل کلاں خدا انخواستہ کوئی بڑی بیماری بھی ہو گئی تو تم یو نہی لاپرواہی برتنے رہنا۔“

”بڑی بیماری کا علاج وہ خود ہی ڈھونڈ لیں گے اماں! ہو سکتا ہے ڈھونڈ بھی لیا ہو۔“ شاندا نہ ذو معنی لہجے میں بولی تو ذولین خان نے اس کی بات کا پس منظر سمجھتے ہوئے اسے دیکھا۔

”ارے تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو۔ میں نے تمہیں قہوہ بنانے کے لئے بھیجا تھا۔“ گل بی بی نے اُسے خشمگیں

نگاہوں سے دیکھا تو وہ گھبرا کر باورچی خانے کی جانب بھاگی۔ اشتارا بھی کرسی سے کھڑی ہو کر اس کے پیچھے لپکی۔

”پوچھ سکتی ہوں کہ یہ خوبصورت انقلاب کس دن، کس وقت اور کس طرح پیش آیا۔“ شاندا نہ پانی سے بھری پتیلی چولہے پر چڑھاتے ہوئے بولی تو اشتار نے باورچی خانے کی کھڑکی سے پشت ٹکا کر اُسے دیکھا۔

”مجھے تو تم دونوں بلا وجہ احمق بنا رہے ہو۔ اور بالا ہی بالا نہ جانے کب صلح کر لی۔ نہ صرف صلح بلکہ۔۔۔۔۔ اے،

یوں کیوں گھور رہی ہو \_\_\_\_\_ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔“ وہ اس کی سنہری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ”کہو، ہے نا؟“

”ہوں \_\_\_\_\_ کیا کہوں، کیا بتائوں۔ الفاظ ہی نہیں میرے پاس۔“ اس نے اپنی خوابیدہ پلکیں موند لیں۔ شاندا نے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”کیوں \_\_\_\_\_ کیا صرف آنکھوں کی زبان میں گفتگو ہوئی ہے یا مسکراہٹوں کی زبان میں؟“

اس کی بات پر اشتار کا چہرہ سرخ ہو گیا \_\_\_\_\_ کتنا سچ کہا شاندا نے۔“ اس نے سوچا۔

ذولین خان کی مسکراہٹ میں بہت خوبصورت گفتگو ہی تو ہوئی ہے۔ جس کا مفہوم اس کے لہجے کے ہزاروں حصے میں سمجھ لیتا تھا۔

”کیوں \_\_\_\_\_ ٹھیک کہانا؟“

”بہت بد تمیز ہو گئی ہو شان \_\_\_\_\_!“ اس نے آنکھیں کھول کر اسے جھینپی نگاہوں سے گھورا۔ ”منگنی کا اثر لگتا ہے۔“

”ہا، ہا، ہا، \_\_\_\_\_“ شاندا نے کابر جستہ قہقہہ لبوں سے آزاد ہو گیا۔ ”خوب \_\_\_\_\_ ایک انگوٹھی پہن لینے سے انسان سمجھ دار نہیں ہو جاتا۔“

”یہ تو تم سمجھ داروں کی بات کر رہی ہو۔“

”بالکل \_\_\_\_\_“ وہ ڈھٹائی سے بولی اور پھر ٹرے میں کپ سجاتے سجاتے اس کی طرف پلٹ کر بولی۔ ”میں نے تو ابھی تک ان موصوف کو دیکھا تک نہیں۔ ایک تصویر بھی نہیں دیکھی۔“ اس کی شکل پر عجیب بے چارگی تھی۔

اشتار کو ہنسی آگئی۔

”تو جا کر کہو نا گل بی بی سے کہ میں ان دیکھے، ان جانے شخص سے شادی نہیں کر سکتی جب تک اس موصوف کی صورت نہ دیکھ لوں \_\_\_\_\_ بلکہ اس سے مل نہ لوں۔“

”ہشت \_\_\_\_\_ بد تمیز۔“ شاندا نے جلدی سے اس کا منہ دبایا۔ ”میں تو مذاق کر رہی ہوں تم سے۔ تم تو چیخ کر اماں کو ہی سنار ہی ہو۔ جوتے تھوڑی کھانے ہیں۔ اب ان سے یہ فرمائش کروں

جا کر۔ اونہ \_\_\_\_\_ اب تو قسمت پھوٹ چکی ہے۔“ وہ قہوہ جلدی جلدی پیالیوں میں بھرنے لگی۔ پھر اشتار کے مسکراتے چہرے پر ایک نگاہ ڈال کر ٹرے اٹھا کر باہر نکل گئی۔

گل بی بی ابھی تک اسی زاویے سے بیٹھی ذولین سے باتوں میں مصروف تھیں اور موضوع شاندا کی شادی کا ہی تھا۔

”اس کے سسرال والے اب شادی مانگ رہے ہیں \_\_\_\_\_ مگر میں نے ابھی تاریخ نہیں دی۔“

”کیوں \_\_\_\_\_؟“ ذولین نے ٹرے میں سے قہوے کی پیالی اٹھاتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

”اشناس آیا تھا نا \_\_\_\_\_ پچھلے ہفتے تو کہہ رہا تھا کہ ہشمنہ کی چھٹیاں آنے پر شادی کا ہنگامہ رکھئے گا۔ اسے یہاں آنے کا بہت شوق ہے۔ اور پھر شاندا سے بہت محبت ہے اسے۔“

ہشمنہ کے ذکر پر شاندا نے، اشتار کی طرف مڑی جو کرسی کی پشت تھا مے کھڑی تھی۔

”جانتی ہو تم ہشمنہ کو؟“

”آں \_\_\_\_\_ ہاں \_\_\_\_\_ تمہاری پھوپھی کی بیٹی ہے شاید۔“

”شاید نہیں یقیناً۔ بہت پیاری ہے \_\_\_\_\_ کبھی یہاں آئی نہیں۔ پر بہت سے گلے ہیں مجھے اس سے۔“ اس نے قہوہ کی

ایک پیالی اشتراکے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ اسے پھوپھا جان نے یونیورسٹی بھی بھیجا ہے تیس مارخان بننے کے لئے۔“ وہ یہ کہہ کر زور سے ہنسی۔ اور ایک میں ہوں، کالج کی صورت تک نہیں دیکھی ہے۔“

”تم زیادہ پڑھ کر کون سی بقراط سقراط بن جاتیں۔۔۔ رہتی تو وہی شاندا نہ اور شہباز خان کی منگیت۔“ اشتراک سے چڑانے کے لئے بولی۔

اسی دم حور مینا اندر داخل ہوئی۔ وہ پڑوس میں اپنی سہیلی کے گھر سے ہو کر آئی تھی۔

”اشتراک اپنی! آپ کا ڈرائیور معمور جان آیا ہے۔ آپ کو لینے۔“ اس نے کہا تو اشتراک جلدی سے چونکی۔ اتنا وقت گزر چکا تھا، اسے احساس تک نہ ہوا۔

”ارے اتنی جلدی چلی جانو گی اشتراک!“ گل بی بی اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ذولین بھی اچانک کھڑا ہو گیا۔

”میں بھی اب جانوں گا گل بی بی!۔۔۔ اور اشتراک! میں معمور جان کو واپس بھیج دیتا ہوں۔ تم میرے ساتھ ہی جانا۔ میں اب سیدھا حویلی ہی جانوں گا۔“ اس نے پلٹ کر اشتراک کو مخاطب کیا تو اشتراک گھبرا گئی۔ شاندا نہ کو بھی حیرت کا شدید جھٹکا لگا مگر دوسرے ہی لمحے مسکرا دی۔

”واہ جناب۔۔۔ ذولین لالہ کی جرأت اور دلیری کی داد دینی چاہئے۔“ وہ ذولین کو داخلی دروازے سے باہر نکلتا دیکھ کر ہنسی۔

”شان۔۔۔ شاہ خانم۔“ وہ متوحش سی شاندا نہ کی طرف بڑھی۔ ”میں ذولین کے ساتھ۔۔۔۔۔“

”ظاہر ہے جب تم دونوں کی ایک ہی منزل ہے تو سفر بھی۔۔۔۔۔“

”تم تو فضول ہی بکنا۔“ اس نے شاندا نہ کی بات کاٹ دی اور پلٹ کر دروازے کی جانب بھاگی۔

گل بی بی نماز کے لئے اٹھنے لگیں اور اٹھتے ہوئے انہوں نے شاندا نہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اشتراک سے کہو کہ ذولین کے ساتھ جانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔۔۔ شاہ خانم کو اب تھوڑا بد لانا چاہئے۔ ذولین دل سے کدورتیں نکال کر فاصلے ختم کرنا چاہتا ہے۔ مجھے تو خوشی ہوئی ہے کہ اس نے اشتراک کو سمجھنے کی کوشش تو کی۔“ ان کا چہرہ دمک رہا تھا۔

ذولین کا اشتراک کے لئے نرم رویہ رکھنا انہیں طمانیت بخش گیا۔

اشتراک باہر آئی تو معمور جان جاچکا تھا اور ذولین اپنی گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا۔

”آؤ بیٹھو۔“ اُس نے اسے دروازے میں خوفزدہ و پریشان استادہ دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں تحکم تھا۔

”ذولین۔۔۔۔۔ وہ آگے بڑھی۔ مگر تذبذب کی کیفیت میں پھر رک گئی۔ ”معمور جان کو آپ نے واپس بھیج دیا۔“

”ہاں۔۔۔ کیا میں معمور جان سے زیادہ باختیار نہیں ہوں؟“ اس نے قدم بڑھا کر اس کے قریب رکتے ہوئے ٹھوس لہجے میں پوچھا تو وہ گڑبڑا گئی۔

”محبت میں اعتماد پہلی شرط ہے اشتراک! اور تم۔۔۔“

”نہیں ذولین! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔“ وہ تڑپ گئی۔

”اچھا تو پھر تم ہی سمجھا دو۔ مگر گاڑی میں بیٹھ کر۔“ اس کا لہجہ بہت پیارا اور نرم تھا۔ اشتراک تذبذب اور خوف کو پرے دھکیل کر سیٹ پر بیٹھی۔

”شکریہ اس اعتبار کا۔“ اس نے تشکر آمیز نظروں سے اسے دیکھا اور پھر گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔

وہ سر جھکائے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کئے ہوئے بیٹھی تھی۔

”اشتارا! میں تو سارے خوف، سارے اندیشے پیچھے چھوڑ کر اس سفر پر نکلا ہوں۔ بہت باحوصلہ ہو کر۔ مگر ایسا لگتا ہے جیسے تم نے اندیشے اور وسوسے اب جمع کرنا شروع کر دیئے ہیں۔“

اس نے گاڑی دھیمی رفتار سے چلاتے ہوئے اس کے جھکے سر پر ایک نگاہ ڈالی۔

اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”ذولین خان! ہم لڑکیاں منزل کے سامنے ہوتے ہوئے بھی سو طرح کے اندیشوں میں گھری رہتی ہیں۔ ہر لمحہ ایک نیا خوف دل پر دستک دینے چلا آتا ہے۔ کبھی ہم بلاوجہ اندھیرے سے ڈرتے ہیں تو کبھی بہت تیز روشنیوں میں بھی دل دھڑکنے لگتا ہے۔ بے نام اندیشے اس سفر کے مسافر کو پیچھے ہٹانے کے لئے ہوتے ہیں۔ پھر شاید ہمیں اپنی محبت کی شدتوں سے آگاہ کرتے ہیں۔“

اس نے گاڑی بہت خوبصورت جگہ روک دی جہاں سبزہ ہی سبزہ تھا۔ اس کے اطراف اونچے اونچے پہاڑان کے عزم کی طرح تنے ہوئے تھے۔ کسی کسی جگہ کے کونوں کھدروں سے مترنم جھرنے بہہ رہے تھے اور مسلسل گرتے پانی کے نیچے بنفشی پھولوں کے رنگ بھی نکھر آئے تھے۔

وہ دونوں نیچے اتر آئے۔ اشتارا کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ دونوں جنت میں آگئے ہوں۔ پہاڑ، چمن زار سب مل کر ایک مدھر گیت گارہے ہوں۔ ترنم ریز فضا بھی سریلے راگ الاپ رہی ہو۔

”میں کئی بار آچکا ہوں۔ مگر پہلے مجھے یہ خطہ کبھی اتنا دلکش اور خوبصورت محسوس نہیں ہوا تھا۔“ وہ بولا۔ اس کی

آنکھیں اشتارا کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

وادی کا یہ حصہ بہت خوبصورت تھا مگر اس سے کہیں زیادہ دل کش منظر تو اشتارا کی صورت میں اس کے سامنے تھا۔ اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔

کسی جگہ، کسی منظر کا حسن دراصل ہمارے اپنے اندر کا حسن ہوتا ہے۔ ہمارے اپنے دل کی رنگینیاں سارے ماحول کو رنگین بنا دیتی ہیں۔ جس طرح ہمارے اندر کی اداسیاں سارے ماحول کو سوگوار کرتی ہیں۔“ وہ اس کے سامنے اونچے بڑے پتھر پر بیٹھ گیا۔

اُس نے آہستگی سے پلکیں اٹھائیں اور ذولین خان کی آنکھوں کے سمندر میں اپنے ڈوبتے عکس کو چند ثانیے تکتی رہی۔

”مجھے نہیں پتہ تھا کہ محبت ہمارے اندر اتنی توانائیاں بھر دیتی ہے۔ ہماری ساری وحشتوں کو چوس لیتی ہے۔“

”میں بہت بدل گیا ہوں نا اشتارا!“ اس نے اس کی گلاب گلاب انگلیاں اپنی مضبوط انگلیوں میں تھام کر پوچھا۔

”پتہ نہیں، آپ بدلے ہیں یا میں۔ بس مجھے تو اپنی تقدیر بدلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔“ اس کی آواز بہتے

جھرنوں کی طرح دھیمی اور پیاری تھی۔

”تمہارا مقدر میں ہوں تو اس طرح میں ہی بدلا نا۔“

اس نے مسکرا کر کہا تو وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ ذولین خان کو لگا جیسے یکنخت ہر شے مسکرا اٹھی ہو۔ تتلیاں محور قص ہو گئی ہوں۔

”تم اس طرح ہنستی رہو اشتارا! تم ہنستی ہوئی بہت اچھی لگتی ہو۔“ اس نے اس کے گلاب چہرے کو دیکھتے ہوئے بہت

سچائی سے کہا تو اشتارا کا چہرہ تمنا اٹھا۔ اس کے سچے جذبوں کی روشنی سے دلتی آنکھوں کی کرنیں اس کی نس نس میں



اُترنے لگیں۔ ایک خوشگوار احساس اس کے دل میں ہلکورے لینے لگا۔ آسودگی کی چاندنی اس کی رگ رگ کو چھو گئی۔

☆☆☆...

وہ الجھے ذہن کے ساتھ جلدی جلدی تیار ہو رہا تھا۔

وہ پریشان نہیں تھا مگر شدید حیران تھا۔ ہشمنہ ابرار اس سے کیا کہنا چاہتی ہے؟ کوئی اہم خبر؟ کسی سر بستہ راز سے آگاہی دینا چاہتی ہے؟ اگر کوئی ایسی بات ہے تو اس نے اس کا ہی انتخاب کیوں کیا۔ یہ بات اس کے لئے حیران کن تھی اور شاید اس کی ساری سوچیں اسی کے گرد گھوم رہی تھیں۔

کیا وہ اس سے محض مذاق تو نہیں کر رہی؟ برش ڈریسنگ پر رکھتے ہوئے ایک اور خیال اس کے ذہن کی منتظر سطح سے ٹکرایا۔ اس سے کوئی انتقامی کارروائی کے طور پر مذاق مگر نہیں، ہشمنہ ابرار جیسی سنجیدہ اور باوقار لڑکی سے ایسی بھونڈی حرکت کی توقع کم از کم، اس کا دل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مختلف خیالوں کے جال میں مبتلا تھا۔ کوئی سرا بھی تو ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

اس نے اسپرے کرتے ہوئے آئینہ میں اپنا سرا پادیکھا اور پھر ہولے سے مسکرایا۔ اب جبکہ وہ ہشمنہ ابرار کے پاس جا ہی رہا ہے تب ہی وہ گتھی خود ہی سلجھ جائے گی۔ بلاوجہ ہی وہ الجھ رہا ہے۔

وہ دراز سے گاڑی کی چابی نکال کر پلٹا تو ٹھٹک گیا۔ احسن پلنگ کے کنارے پھیل کر بیٹھا تھا اور اسی کی جانب متوجہ تھا۔ اس کے پلٹنے پر مسکرا کر پلنگ سے نیچے اُتر آیا۔

”اب پوچھ سکتا ہوں کہ یہ اتنا اہتمام کس کے لئے؟“

”تم کب آئے؟“ اور اتنی خاموشی سے۔ حیرت ہے کہ تم اتنی دیر خاموش بھی رہ سکتے ہو۔“ اس نے اپنی گھڑی

اٹھاتے ہوئے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا اور گھڑی کو کلائی پر باندھنے لگا۔

”ارے ہم میں تو بہت سی مخفی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ آپ نے کبھی جھانکنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ خیر، میں نے تم سے پوچھا تھا کہ اتنا اہتمام کس کے قتل کا سامان ہے؟“

”کیا اسے اہتمام سے تیار ہونا کہتے ہیں؟“ اشمل خان نے معصومیت سے پوچھا تو احسن نے بے اختیار دل پر ہاتھ رکھ دیا۔

”واللہ! اس سادگی پر کون نہ مر جائے۔ سینٹ کی پوری بوتل اسپرے کر دی اور بقول تمہارے ’یہ خوشبو میں خاص خاص جگہوں پر جانے کے لئے استعمال کرتا ہوں۔‘

وہ اُسے گھیرنے کے موڈ میں تھا جبکہ اشمل خان جلد از جلد یہاں سے بھاگ جانے کی فکر میں تھا۔ اس نے پلنگ کی پائنٹی پر ٹک کر جلدی جلدی پشاور کی چپل پہنے۔ احسن کی بات پر وہ خود بھی چونک گیا۔

شاید لاشعوری طور پر وہ خاص چیز استعمال کر گیا تھا۔ بہترین تراش خراش کا سوٹ، دمکتی گھڑی اور قیمتی خوشبو۔

اس نے تو کبھی بال بھی ڈھنگ سے نہیں بنائے تھے۔ بس ہاتھ آئے برش کو بے ترتیبی سے بالوں پر جلدی جلدی پھیر لیتا تھا۔ جس گچھے کا دل جہاں چاہا جم گیا۔ مگر آج اس کے سنہرے چمک دار بال سلیقے سے سر پر سجے ہوئے تھے۔

”احسن! میں بہت اہم کام سے جا رہا ہوں اور بے حد الجھا ہوا ہوں۔“ اُس نے احسن کے خطرناک تیور بھانپتے ہوئے گویا ایک انکشاف کیا۔

”جی! مگر الجھاؤ تو کہیں نظر نہیں آیا۔“ وہ اس کے سلجھے سراپے پر نظر ڈال کر معنی خیز تبسم کے ساتھ گویا ہوا اور پھر اس کے عین سامنے آتے ہوئے اس کے خوبصورت چہرے پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے بولا۔

”کیا اس اہم کام میں میری موجودگی کوئی دخل پیدا کر دے گی؟ جبکہ میں تو از حد بے ضرر ہوں۔ اور کسی حد تک تجربہ کار بھی ہو سکتا ہوں۔ تمہاری ہیلپ ہی کر دوں۔ تم تو ویسے بھی کورے ہو۔“

احسن کی اس بات پر اشمیل نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ کیا سمجھ رہا تھا، اس کا اظہار برملا کر رہا تھا۔ اشمیل خان کو ایک لمحہ اس کی عقل پر ماتم کرنے کو دل چاہا۔ اس نے اچانک رسٹ واپس پر نگاہ ڈالی۔ سُوئیاں تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ اُس نے ہشمنہ کو اترتی شام کا وقت دیا تھا اور وہ یونیورسٹی میں وقت کا پابند بلا وجہ مشہور نہیں تھا۔

احسن کی بے وقت آمد ہمیشہ اس پر بلائے ناگہانی کے طور پر مسلط ہوتی تھی۔

”ویسے بڑے چھپرے ستم نکلے اشمیل خان!“

”احسن! تم ”ہی“ اور ”شی“ کے چکر سے باہر نکل آؤ۔ میرے اہم کام کی نوعیت وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔“ اس نے سنجیدگی سے اُسے ڈپٹ دیا۔

”تو مجھے بتانے سے گریز کیوں؟ دوست ہوں تمہارا۔“

احسن چڑ گیا اور اسے دروازے سے نکلے دیکھ کر اس کے سامنے ڈٹ گیا۔

”تمہارے اس رویے سے میرا مشکوک ہونا فطری بات ہے۔“

”ہاں\_\_\_ اپنی اپنی فطرت کی بات ہے۔“ وہ اُسے جلانے کے لئے بھرپور انداز میں ہنسا۔ احسن نے منہ بنا کر

قدرے ناراضگی سے اشمیل کی سمت دیکھا۔

”یہ حقیقت ہے کہ فی الحال میں کچھ نہیں جانتا کہ مجھے کیوں بلایا گیا ہے۔ میرے سامنے بھی سوائے حیرت کے کچھ نہیں۔“ اس نے احسن کے شانے پر ہاتھ رکھ کر سنجیدگی سے کہا تو احسن اُچھل پڑا۔

”کیا\_\_\_“ اُس نے اشمیل خان کے بے حد سنجیدہ چہرے کو دیکھا اور پھر تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ ”کہیں تمہارے ساتھ فراڈ تو نہیں کیا جا رہا ہے؟\_\_\_ تمہاری جان کو خطرہ ہو سکتا ہے اشمیل!“ وہ اب خود بھی سنجیدہ بلکہ کسی حد تک پریشان ہو گیا۔ آج کل جو حالات اس کے سامنے تھے ان حالات میں کسی کا اشمیل کو تنہا بلا کسی خطرے سے خالی نہیں ہو سکتا تھا۔ ”تمہیں اس طرح تنہا بلکہ اس طرح نہتا نہیں جانا چاہئے اشمیل!“ احسن کے اس مشورے پر بے ساختہ اس کے گداز لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس کے تصور میں ہشمنہ کا نازک سراپا اُکھرا۔ بھلا ایسا سراپا اس جیسے مضبوط مرد کے لئے کیا خطرہ بن سکتا ہے۔

”نہیں\_\_\_ مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں باحفاظت واپس آجائوں گا۔ پھر تمہیں ضرور تفصیل بتائوں گا۔ اوکے۔“ وہ اُسے پریشان چھوڑ کر دروازے سے باہر نکل گیا۔

وہ لالہ زار کے ہال میں سبھی میزوں میں سے ایک کنارے والی میز منتخب کر کے وہاں آ بیٹھی۔ وہ بہت پرشمرہ ہو رہی تھی۔

اس کی بے قرار نگاہیں داخلی دروازے کی جانب اٹھیں اور پھر جھک گئیں۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے کندھوں پر بھاری بوجھ رکھا ہے اور فی الوقت اسے اٹھانہ دیا گیا تو اس بوجھ سے اس کے کندھے شل ہو جائیں گے۔ اس نے اپنا یہ بوجھ اٹھوانے کے لئے اشمیل خان کو منتخب کیا تھا۔ اس پر بھروسہ کر کے وہ قطعی پشیمان نہیں تھی۔

”آف\_\_\_“ اُس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ریحان پر اچے کے دھوکے کی کہانی اس کے اعصاب کو اس طرح متاثر کرے گی جیسے ساری دنیا بد مزہ اور بد رنگ ہو گئی تھی۔

اس کے دل کے آتش فشاں میں ایک الانو سا پک رہا تھا۔

وہ اپنی لابی پلکیں جھکائے بے قراری سے میز کی شفاف سطح پر بے مقصد انگلیاں پھیر رہی تھی۔

اشمل خان نے اسے بغور دیکھا۔ جھکی جھکی لرزتی پلکوں اور دانتوں میں دبے تراشیدہ لبوں سے وہ اس کی پریشانی محسوس کر رہا تھا۔

”شاید میں کچھ لیٹ ہو گیا۔“

”ارے آ آپ \_\_\_“ وہ اس مانوس آواز پر چونکی۔ اور اس کا اٹھا ہوا سر چند ثانیے اسی زاویے سے رہ گیا۔ لیکن گہری بھوری صاف و شفاف صحت اور جوانی کی تمام رعنائیوں سے بھرپور آنکھوں کی محویت زیادہ دیر برداشت نہ کر سکی۔ اس نے پلکیں خفیف سے انداز میں جھپک کر سر جھکا لیا۔

”نہیں \_\_\_ اتنے لیٹ تو نہیں ہوئے۔ میں بھی بس ابھی آئی ہوں۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔ بلیک پیٹ اور وہائٹ شرٹ میں وہ نکھر نکھرا، بہت مختلف روپ میں اس کے سامنے تھا۔ کرسی

کھینچ کر جھک کر بیٹھنے پر تیز خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تو وہ غیر محسوس طور پر چونکی۔ مگر اس نے سر نہیں اٹھایا۔ ایک عجیب سی سوگواری اور بے کلی اس کے وجود پر چھاتی چلی گئی۔

”میں آپ کی ممنون ہوں اشمل خان کہ آپ نے اپنا قیمتی وقت مجھے دیا۔“

”کیا ہم روایتی جملوں سے ہٹ کر کھل کر بات نہیں کر سکتے؟“ وہ مسکرایا۔ وہ اس کی اس کیفیت سے محظوظ ضرور ہوا تھا۔ ہمیشہ تنی گردن اور غصے سے بل کھاتی ہشمنہ ابر اس وقت ایک بالکل نئے اور انوکھے روپ میں اس کے سامنے تھی۔

شکست خوردہ

اور بے حد تھکی ہوئی۔

”سر حیدر کوریحان پراچہ نے کڈنیپ (انگوئی) کیا ہے۔“ اس نے بغیر تمہید، بغیر حیل و حجت بتا دیا۔

”مگر تم یہ بات کیسے جانتی ہو؟“ وہ حیرت سے بولا۔ چونکہ اُسے شک ریحان پراچہ پر ہی تھا مگر ہشمنہ کا مہر ثبت کرنے والا انداز اسے حیران کر گیا۔

ہشمنہ نے آہستگی سے اپنی مغموم پلکیں اوپر اٹھائیں۔

”اس نے اس واقعہ سے دو دن پہلے ہی مجھے اپنے اس منصوبے سے آگاہ کر دیا تھا۔ مگر پھر میری برہمی پر اس نے اس بات کو مذاق کہہ کر ٹال دیا تھا۔“

”ہوں \_\_\_ چونکہ تم اس کی پارٹی کی سیکرٹری تھیں وہ تمہیں اس کام کے لئے اعتماد میں لینا چاہتا تھا۔ اور ظاہر ہے۔۔۔۔۔۔“

”وہ اس معاملے میں میری حمایت چاہتا تھا۔“ وہ اس کا جملہ کاٹ کر جلدی سے بولی۔

”تم اس کی فیڈریشن کی سرگرم سیکرٹری ہو۔“ اشمل خان کے لہجے میں ہلکا طنز سمٹ آیا۔ وہ تڑپ گئی۔

”میں نے کبھی کسی غلط بات کی حمایت نہیں کی۔ محض فتح کے لئے میں نے اپنے ضمیر کا سودا نہیں کیا۔“ اس کا لہجہ

تیز ہو گیا۔ ”یہ اور بات ہے کہ میں نے غلط پارٹی کو چن لیا۔ اپنے لئے اور اس کے لئے اپنی ساری محنت کی۔ جس کا

مجھے شدید افسوس بلکہ پچھتاوا ہے۔“ وہ ندامت اور خفت کے ساتھ آہستگی سے اعتراف کرتے ہوئے بولی۔ ”میں نے

کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ریحان پراچہ اتنی پستی میں بھی اتر سکتا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں آبی لہریں مچل اٹھیں۔

اسے ریحان پراچہ کا وہ گھٹیا رویہ، اس کی آنکھوں کی وحشیانہ چمک اب بھی دل میں چبھ رہی تھی۔ وہ اسے سیکرٹری کا

عہدہ دے کر درحقیقت اس کے ساتھ دل لگی کر ناچاہ رہا تھا۔ اس عہدے کو محض سیڑھی بنا کر وہ اس کے دل تک

اترنا چاہتا تھا۔

اس کی روح کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی۔

”اشمل خان! ریحان پر اچہ بہت پست انسان ہے۔ مجھے اس ایک ایک لمحے کا پچھتاوا ڈس رہا ہے جو میں نے اس کے ساتھ، اس کی پارٹی کی فتح کے لئے صرف کیا تھا۔“ اس کے رخساروں پر حزن کی آمیزش شدید ہو گئی۔ اس افسردگی نے اس کے چہرے پر ایک عجیب و قار پیدا کر دیا تھا۔

اشمل خان اس کے بے حد سرخ ہوتے چہرے کو دیکھتا رہا۔

اسے اس لمحے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اس کی تسلی و تشفی کا معاملہ کس طرح کرے جب کہ اس کے اور ہشمنینہ کے درمیان ہمیشہ سے ایک دیوار تنی رہی تھی۔ ایک اجنبیت کی فضا قائم رہی تھی۔ مگر آج وہ اس کے سامنے اس کی ہمدردی اور تسلی کی ضرورت مند تھی۔

”ریحان پر اچہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ مجھے اپنی جیت سے زیادہ ریحان کی ہار کی خوشی ہے۔ غلطیاں انسان سے ہی ہوتی ہیں۔ تم اسے کوئی بھیانک خواب سمجھ کر بھلا دو اور خود کو سنبھالو۔“ اس کا لہجہ نرم اور دوستانہ تھا۔

وہ جو اس کے خلاف دن رات سلگ سلگ کر سوچتی رہتی تھی اب اسے اس نرم اور شفیق انداز کے سامنے عجیب سی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔

ایسی بے بسی جو خود اس کا دل چیرے دے رہی تھی۔

”خود کو سنبھالو ہشمنینہ!“ وہ اس کے کانپتے لبوں اور سرخ چہرے کو دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولا۔

وہ اپنی مایوسی اور خفت کو پیش کرنا سخت حماقت سمجھتی تھی۔ اسے ہمیشہ سے اپنی ذات کا رنج تھا مگر آج، اس لمحے اسے

کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ کوئی ایسا مغرور احساس نہ جاگا۔ بس اب وہ کھل کر رونا چاہتی تھی۔ بے تحاشا اور پھوٹ پھوٹ کر۔

گرم گرم آنسو اچانک ہی اندر گرنے کی بجائے باہر ہی اُبل پڑے۔ وہ میز کی چکنی سطح پر سر رکھ کر بلک اٹھی۔

وہ جو ہمیشہ اس کا گہرا اور زبردست حریف رہا تھا، اس وقت ایک ہمدرد اور غمگسار سا تھی بنا اس کے سامنے تھا۔ اپنی خوبصورت آنکھوں میں نرم دل روشنی اور لہجے میں غم خوار تابندگی لئے ہوئے جیسے اس کا جنم جنم کا دوست رہا ہو، ہمدرد رہا ہو۔ اس کی غلطیوں پر بجائے اسے نادم کرنے کے اسے دلار سے سمجھا رہا تھا۔

”آہ۔۔۔“ ایک تیز سسکاری اس کے لبوں سے نکل گئی۔ ”میں خود اپنی ہی نظروں میں گر گئی ہوں اشمل خان! بہت بڑا دھوکا کھایا ہے۔“ اس کے گرم گرم آنسو اس کے درد کو اور بھی صیقل کر

رہے تھے۔ انا، بھرم اور مان کے ٹوٹنے نے اُسے از حد نڈھال کر ڈالا تھا۔

”مجھ سے ندرت نے کہا تھا ایک بار کہ ریحان پر اچہ نے مجھے چکا چوند عہدہ دے کر شاید اسیر کر لیا ہے۔ ہاں، ٹھیک ہی کہا تھا۔“ اس نے آنسوؤں سے بو جھل آنکھیں اوپر اٹھائیں تو وہ لب بھینچے اس کے دکھ پر مضطرب سا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اچانک چونکی۔

”کیا آپ یہ بات پہلے سے جانتے تھے کہ سر حیدر کا کڈ نیپر ریحان پر اچہ ہے؟“

اس کی بات پر وہ پہلی بار ہولے سے مسکرایا۔



”نہیں۔۔۔ شک ضرور تھا۔ اور ظاہر ہے ہر کسی کا شک ایک بارے ہوئے لیڈر کی جانب ہی جاسکتا ہے۔ مگر میرا شک قوی تھا۔ میں اُسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔۔۔ اُس کے سابقہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے اس سے اس طرح کی کسی بھی جارحانہ حرکت کی توقع کی جاسکتی تھی۔“

وہ ریحان پراچہ کے بارے میں اتنا کچھ جانتا تھا۔ بلکہ سب ہی جانتے تھے۔ بس وہ ہی بے خبر تھی۔ اُس کا دل کٹ سا گیا۔ اس کی آنسوؤں سے بھری ہوئی پلکیں جھک گئیں۔ اشمل خان کے الفاظ اُسے شرمندہ کئے دے رہے تھے جیسے وہ یہ انکشاف ریحان پراچہ کے بارے میں نہیں، خود اس کے بارے میں کر رہا تھا۔ اس کے آنسو اور بھی تواتر سے بہنے لگے۔

”ہشمنہ!“ چند لمحے توقف کے بعد اس کی بھاری آواز گونجی۔

تسلی آمیز۔

بے حد نرم۔

اُس نے بے اختیار پلکیں اٹھائیں۔

دوسرے ہی لمحے اس کا نرم ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھ میں تھا۔ اس کی نس نس میں برقی لہریں سی اترتی چلی گئیں۔

وہ چونکی اور حیرت سے یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ اس کا ہاتھ اس کے گرم اور مضبوط ہاتھ میں کیسے آگیا۔ اس نے خود بڑھایا تھا بے خودی میں۔۔۔ یا اس نے تھام لیا تھا۔

”ٹیک ایزی۔۔۔ یہی زندگی ہے۔ اور یہی زندگی کے تجربات۔“ اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ بس ایک لمحہ۔ اور ہشمنہ ابرار کو ایسے لگا جیسے وقت کی نبضیں تھم گئی ہوں۔ اس کے احساسات کے تار جھنجھٹا اٹھے۔ اُس

کی مضبوط گرفت میں اُس کا ہاتھ کانپا اور یہ کپکپاہٹ اشمل خان نے واضح طور پر محسوس کی اور جلد ہی ہاتھ پر اپنی گرفت ہٹا لی۔ ایک لمحہ خود اس کے دل کی سطح میں ارتعاش پیدا ہوا۔ ایک نمانوس سا احساس ٹکرایا اور صحیفہ دل پر انوکھی خواہش رقم ہوتی چلی گئی۔

وہ کچھ خفیف سا ہو گیا۔ یہ حرکت اس سے لاشعوری طور پر سرزد ہو گئی تھی۔

”تلخ واقعات کو ذہن سے اسی وقت کھرج دینا چاہئے جیسے ہم نے اس کا ذائقہ چکھا ہی نہیں۔“ اس نے اپنی خاموشی کو توڑا۔ مگر وہ چپ رہی۔ اور کئی لمحے اس خاموشی کے ساتھ پرواز کر گئے۔

ہشمنہ ابرار نے اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر پلکیں جھکا کر دھیرے سے ماتحتی لہجے میں بولی۔

”آپ۔۔۔۔۔ پلیز اس بات کا تذکرہ کسی سے مت کیجئے گا۔“

”کس بات کا؟“ وہ چونکا۔

”یہی کہ میں نے آپ کے شک پر یقین کی مہر ثبت کی ہے۔“ اس نے کہا تو اشمل خان کے گداز عنابی لبوں کے گوشے میں دلفریب مسکراہٹ بکھر گئی۔

”تم تو بہت بزدل لڑکی نکلیں ہشمنہ ابرار!“ اس نے شگفتہ انداز میں لطیف سا طنز کیا۔ مگر وہ برامانے بغیر بولی۔

”کسی عورت کی بہادری، تنگ دل مرد برداشت بھی تو نہیں کر سکتے۔ بہر کیف یہ دنیا تو پھر مردوں کی ہے۔“ اس کا جملہ برجستہ تھا۔ اشمل خان نے اسے دیکھا۔ اب وہ خود کو کسی حد تک نارمل کر چکی تھی۔

دل کی ساری بھڑاس نکال لینے کے بعد مطلع صاف ہو چکا تھا۔ نم نم رخساروں پر خوشگوار لانی سبک پلکیں گرتی

اٹھتیں بے حد بھلی لگ رہی تھیں۔

”آپ کو تو میری اس ہارنے دلی مسرور کیا ہوگا۔“ اس نے بچھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ فاصلوں کی ساری طنابیں ان کے درمیان سے ٹوٹ چکی تھیں۔

اجنبیت کی دھند چھٹ گئی تھی۔

اب وہ کسی اچھے مگر نئے دوست کی طرح ایک دوسرے سے ہم کلام تھے۔

”نہیں ہشمنہ!“ وہ اس کی بات پر سنجیدہ ہو گیا۔ ”جب مجھے علم ہوا کہ تم انکل ابرار کی بیٹی ہو اور گل بی بی کے خاندان کی فرد تو یقیناً جانو مجھے دکھ ہوا کہ تم ایک بہت غلط سیاست میں گھر گئی ہو اور یہ فیلڈ تمہارے لئے قطعاً موزوں نہیں ہے۔ اس وقت میرے دل میں ایک یہی جذبہ موجزن تھا۔ اور اب مجھے خوشی ہوئی ہے تو اس لئے کہ تم وقت پر سنبھل گئی ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے اتنا اعتبار بخشا۔ کوئی اپنے حریف کو اتنی جلدی اس وقت ہی باعتبار سمجھتا ہے جب وہ شروع سے ہی دل سے اس کا دشمن نہ ہو بلکہ کسی حد تک اس کے خلوص کا دل سے معترف ہوتا ہے۔“ اس

نے بے حد سلجھے ہوئے انداز میں گویا سے جتا بھی دیا۔

اس کے رخسار تپ اٹھے۔ ہاں، وہ سچ ہی کہہ رہا تھا۔ وہ لاکھ اس کا سخت حریف تھا مگر وہ اس کے کردار کے بارے میں کبھی کوئی غلط لفظ یا غلط خیال نہیں رکھتی تھی۔ وہ اس کے خلوص اور بے داغ کیریئر کی دل سے معترف ضرور تھی۔ یہ اور بات تھی کہ منہ سے اقرار کرنا اس کی انانے گوارا نہیں کیا تھا۔

اور آج بھی وہ اپنی انا کا پاس لئے خاموش بیٹھی رہی۔ معاً اس کی نگاہ نے شیشے کے پار دیوار پر اُگتے ہوئے پھولوں کے بنفشی سایوں کو سمٹتے دیکھا تو اسے وقت کے گزرنے کا احساس ہوا۔ اس کے دل پر حزن کی آمیزش اب بھی شدید

تھی۔ ایک خلش اب بھی چبھ رہی تھی۔ مگر وہ بوجھ جو یہاں آتے ہوئے اس کے شانوں پر تھا وہ اتر چکا تھا۔ بس اپنی بے بسی اور ندامت کا دکھ تھا۔

وہ کھڑی ہو گئی۔

”میرے خیال سے بہت وقت ہو گیا ہے۔ میں نے آپ کا بھی وقت ضائع کیا۔ اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔“

وہ بھی کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے رسمی اور وضع داری نبھانے والے جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

”ہشمنہ! کیا تم مجھے ریحان پر اچہ کی رہائش کا پتہ بتا سکتی ہو؟“ اُس نے پوچھا تو ہشمنہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ پسلیوں میں دبا دل پوری طاقت سے سکڑا اور پھیلا۔ اس نے سراٹھا کر عجیب دکھ بھرے انداز میں اشمٰل خان کو دیکھا۔

”اشمٰل خان! میں نے کبھی اس کی رہائش گاہ پر قدم نہیں رکھا۔“ اُس کی آنکھیں بھرا آئیں۔ بڑے بڑے ہیرے جھلملا گئے۔

”نہیں۔۔۔ میرا مطلب یہ قطعاً نہیں ہے۔“ وہ لمحہ بھر کو گھبرا گیا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس کی بات کا کوئی غلط مطلب اخذ کرے گی۔ شاید وہ اس وقت سخت زور درنج ہو رہی تھی۔ اپنے آپ کو مجرم اور گناہ گار محسوس کر رہی تھی۔ مگر وہ اس حد تک کبیدہ تھی، اس کا اسے اندازہ ہر گز نہیں تھا۔

وہ اس کی وضاحت سے بغیر اچانک پلٹی اور تیز تیز قدموں سے ہوٹل کے بڑے سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

اشمٰل خان نے لب بھینچے۔ اُسے دیکھا۔ ”ہشمنہ ابرار! تم تو بہت مختلف لڑکی نکلی۔ میرے اندازے سے زیادہ احمق اور پاگل۔“ وہ اُسے جاتا دیکھتا رہا جب تک وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

...☆☆☆...

کتنے پیارے ہیں یہ مہمان جو گھراتے ہیں

میرے انگن میں ستارے سے اتر آتے ہیں

اس کی آواز اُسے عین کانوں کے نزدیک سنائی دی۔

”کیا میں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟“ وہ عقب سے نکل کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اُسے اپنے دل کی دھک دھک سے جیسے کانوں کے پردے لرزتے ہوئے محسوس ہوئے۔ سانس یوں رکا جیسے دل کسی نے مٹھی میں لے کر دبایا ہو۔

اسے دیکھ کر اس پر بے بسی کا غلبہ شدت سے طاری ہو گیا اور دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہا۔ وہ یہاں نہیں آنا چاہتی تھی مگر اچکی تھی۔ بہت بڑی غلطی کر چکی تھی۔ مگر باوجود خواہش کے پلٹ کر بھاگ نہیں سکتی تھی کہ اندیشوں کا ایک تند سیلاب اب اس کے ہمراہ تھا۔

”مجھے اعتبار بخشا۔ بے حد ممنون ہوں۔ اندر چل کر پلینز مجھے معتبر کر دو۔“ وہ گرم گرم سرگوشی اس کی سماعت پر پگھلے ہوئے سیسے کی طرح گری۔

”ف۔۔۔۔۔ فضہ کہاں ہے؟“ اس نے چھوٹے سے لان کے اطراف نگاہیں دوڑائیں۔ وہ لان میں قدم رکھنے کے بعد ایک انچ بھی نہ ہلی تھی۔ اس کا خیال تھا فضہ ہی اس کا استقبال کرے گی اور وہ یہیں رک کر اس سے بات کر لے گی۔ دو ٹوک بات \_\_\_\_\_ مگر اس مجنوں کے بچے کو دیکھ کر اس کا دل مارے وحشت کے بکھرے لگا تھا۔

موسم میں قدرے خنکی ہونے کے باوجود سیاہ چادر میں اس کا جسم پسینے سے بھیگ گیا تھا۔

وہ آنکھوں میں وفورِ شوق کا جہاں آباد کئے اُسے دیکھ رہا تھا۔

عجیب و حشیانہ اور بھوک کی چمک لئے۔

مکروہ مسکراہٹ اور یکدم ہی سب جیسے پالینے کی خواہش۔

”پلیز \_\_\_ فضہ کہاں ہے؟ بلا دیں اسے۔“ اس نے خشک حلق میں تھوک نگلا۔

”ہوں۔۔۔ فضہ اندر ہے۔ یہاں تک آجانے کے بعد پھر یہ بے اعتباری کیوں؟“ اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور سحر گل کو لگا جیسے وہ پستی میں گرتی جا رہی ہو۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ اس پر اعتبار کر کے چلی آئی ہے۔ اس کی خوش فہمی پر اس کا رواں رواں کانپ اٹھا۔

”یہ کوئی کھیل نہیں ہے منصور صاحب!“ اس کے منہ سے بے اختیار یہ دکھ بھرا جملہ پھسل پڑا۔

”خوب \_\_\_ چلئے، میرے نام سے تو واقفیت ہوئی آپ کو۔“ وہ مسکرا پڑا اور اس کا جملہ نظر انداز کرتے ہوئے اس کے دل پر ایک اور تیر پیوست کر دیا۔ اچانک سامنے سے فضا آتی نظر

آئی۔ بے حد سنجیدہ چہرے کے ساتھ اس کی طرف بڑھی۔

”فضہ۔۔۔۔۔ فضہ۔۔۔۔۔“ وہ اسے دیکھ کر خود بھی تیزی سے اس کی جانب بڑھی۔ اور پھر دونوں ایک دوسرے کے مقابل رک گئی۔

سحر گل کا دل شدت سے چاہا کہ وہ فضا کا چہرہ نوچ لے یا اس کا گلابا دے کیونکہ اس نے اسے تباہی سے بچانے کی بجائے اس دلدل میں پھنسا دیا۔

”فضہ۔۔۔۔۔ فضہ! یہ سب کیا ہے؟“ بے اختیار اس کی خوبصورت آنکھوں سے آنسوؤں کا جھرنّا پھوٹ پڑا۔

فضہ نے اُسے دیکھا اور پھر ایک نظر سامنے کھڑے منصور پر ڈالی جواب ناریل کے سڈول تنے سے ٹیک لگا کر سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ ان دونوں کی طرف متوجہ تھا۔ مسکراتے لبوں سے نکلتے سگریٹ کے دھوئیں میں اس نے خفیف



سا اشارہ کیا اور فضہ اُسے تھام کر اندر لے آئی۔

”فضہ! اسے کیا ہو گیا ہے؟“ وہ سٹنگ روم کے کنارے والی کرسی پر ٹک کر نوکیلے لہجے میں بولی۔ ”میں اس کی محبت کا اعتبار کر کے یہاں نہیں آئی۔ بلکہ اس قصے کو ختم کرنے آئی ہوں۔“

”تم اس سے خود ہی بات کر لو۔“ فضہ نے سپاٹ لہجے میں کہا تو سحر گل کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

”فضہ تم \_\_\_“ اس کی آنکھوں میں بے یقینی لہرائی۔ وہ تو اس کی بے حد اچھی اور مخلص ہمیشہ سے دوست رہی تھی۔ مگر آج وہ اسے کیوں تنہا خطرے کی طرف دھکیلنے کے درپے ہے۔ یہ کیسی دوست تھی جو بجائے اس کی مشکل سہل کرنے کے اسے رسوائیوں کی طرف بھیج رہی تھی۔

”فضہ! چائے دو اپنی مہمان کو اور مجھے بھی۔“ وہ نہ جانے کب سے ان دونوں کے پیچھے چلتا ہوا سٹنگ روم کے دروازے پر رک گیا تھا۔ اس کی آواز پر وہ اچھلی اور پھر دھڑکتے دل کے ساتھ فضہ کو دیکھنے لگی جو اس کے حکم کی تعمیل کے لئے سٹنگ روم سے باہر نکل رہی تھی۔ وہ سگریٹ میز پر رکھی ایش ٹرے میں مسل کر اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ گرے کرتے شلوار میں وہ خوش شکل اور بظاہر مہذب شخص دکھائی دے رہا تھا۔ مگر اس کی حرکتیں اُسے ایک بگڑا ہوا شخص ظاہر کر رہی تھیں۔

”سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اپنی اس بے پایاں مسرت کا اظہار کس طرح کروں؟ وہ ایک مصرعہ ہے نا کہ \_\_\_ ہم خوش ہوئے اتنے کہ پریشاں نظر آئے \_\_\_“ یہ کہہ کر ہولے سے ہنس دیا۔ وہ دم سادھے اُسے غصہ اور بے بسی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔

”ہاں تو بس سحر صاحبہ! ہم خوش اتنے ہیں کہ پریشان لگ رہے ہیں شاید \_\_\_ مگر تم اتنی پریشان کیوں ہو؟“ وہ اُسے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مجھ پر اعتبار کرو۔ اتنا برا نہیں ہوں جتنا تم شاید خیال کر رہی ہو۔“

سگریٹ کے دھوئیں میں اس نے انتہائی نفرت سے اسے دیکھا اور اپنی ساری ہمتیں مجتمع کرتے ہوئے بولی۔

”میرا اور آپ کا کوئی تعلق نہیں منصور صاحب! اور آپ جو تعلق قائم کرنا چاہتے ہیں یہ جبراً نہیں بن سکتا۔ اور میری نظر میں آپ جیسے شخص صرف آوارہ اور بد معاش ہوتے ہیں۔“ اس نے اپنے اندر کا زہر باہر نکالا تو وہ کمال ڈھٹائی سے مسکرانے لگا۔

تپتے چہرے، شرارے برساتی آنکھوں والی اس لڑکی کا ایک لفظ بھی اُسے برا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اس میدان کا ماہر کھلاڑی رہ چکا تھا۔ نیا شکار جال میں آنے سے پہلے پہل اسی طرح پھڑپھڑاتا اور مچلتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی کے ساتھ ساتھ شکاری کے لئے نفرت اور غصہ ہوتا ہے مگر \_\_\_ پھر نفرت اور غصہ بے چارگی اور مجبوری کے تلے بالآخر دب جاتا ہے۔

”تمہیں دیکھ کر میرے اندر نئے احساسات سراٹھانے لگے ہیں۔ کیا محبت کرنا جرم ہے؟ سحر گل! یہ تو لاشعوری عمل ہے، کب اور کیسے کون پسند آجائے۔“ اُس نے جذبے لٹاتی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا تو سحر گل کا جسم پسینے کی یورش سے ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے نفرت سے ہونٹ سکڑ کر اسے دیکھا، اتنی ذلت اٹھانے کا تو تصور بھی اس کے پاس نہ تھا۔

یہ کھلے اور بے باک جملے، یہ بھوک کی نگاہیں اُسے اپنے وجود میں پیوست ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

”میں آپ سے اس موضوع پر قطعی بات نہیں کرنے آئی۔ بلکہ کسی طرح کے موضوع پر نہیں۔ صرف یہ کہنے آئی تھی برائے مہربانی میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ آپ کو کسی وقت کوئی اور پسند آجائے گی۔ یقیناً آپ کے لئے یہ سب کچھ نیا ہر گز نہیں ہے۔“ وہ صوفے سے کھڑی ہو گئی۔

اسی وقت فضہ اندر داخل ہوئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی لوازمات کی ٹرے درمیانی ٹیبل پر رکھ دی۔



”فضہ! میں نے دوستی کے نام پر بہت بڑا دھوکا کھایا ہے۔“ اس نے فضہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ فضہ کے لئے اس کے اندر نفرت کا ایک تیز دھواں اٹھا۔ ”میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنی پستی میں بھی گر سکتی ہو۔ دوستی کی آڑ میں مجھے اتنا بڑا دھوکا دو گی۔ نفرت ہے مجھے تم سے۔ ایسے درندے تم جیسی لڑکیوں کی شہ پر ہی پلتے ہیں۔“ اُس نے ایک قہر آلود نگاہ منصور پر ڈالی اور سٹنگ روم سے باہر بھاگی۔

”سحر\_\_\_\_ سحر\_\_\_\_“ فضہ بے تابانہ اس کے پیچھے لپکی۔

”فضہ! اُسے روکو\_\_\_\_ جانے نہ پائے۔“ منصور کی تیز آواز اُسے اپنی پشت پر سنائی دی تو اس کے قدم اور بھی تیز ہو گئے۔ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی مین گیٹ سے باہر نکل کر گلی میں بھاگی۔ شام کا مدھم سورج ڈوبنے کو تھا۔ گلی میں مدھم تاریکی اور سناتا تھا۔ مگر اس لمحے نہ اُسے گہری ہوتی تاریکی سے خوف تھا اور نہ اس ویرانے سے۔

خوف تھا تو صرف فضہ کے گھر سے۔

منصور کے عفریت سے۔

اس کے قدم تیز تیز اٹھنے لگے۔ تبھی اچانک سفید کار کے ٹائر اُس کے بے حد قریب چرچرائے۔ وہ اپنی جگہ کسی سنگی مجسمے کی طرح ساکت و جامد رہ گئی۔ لمبے بال ڈھیلی چوٹی سے نکل کر بکھر گئے تھے۔ آنکھیں خوف و دہشت سے پھیل گئی تھیں اور بڑی سی چادر سر سے ڈھلک کر شانوں پر بے ترتیب سی پڑی تھی۔

اس وقت اس کا حلیہ کسی طرح بھی شریفانہ نہیں لگ رہا تھا۔

فروان نے بے حد غور سے اسے دیکھا۔

”فف\_\_\_\_ فروان!“ اُس کے لب کپکپائے۔ مگر دوسرے ہی لمحے فروان کی سرخ انگارہ ہوتی آنکھوں نے اُسے سہا کر ایک قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

منصور کی دہشت اس کے دل سے نکل گئی۔

اُسے اب اپنے اطراف آگ ہی آگ نظر آنے لگی۔

اور اُس نے مجرموں کی طرح چہرہ جھکا لیا۔

☆☆☆☆...

احسن کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے رک گیا۔ اس پر سخت کوفت سوار تھی۔ صبر اور انتظار کے معاملے میں وہ ہمیشہ سے صفر تھا اور اب اشمل خان کا طویل انتظار اُسے جھنجھلائے دے رہا تھا۔ کسی نے اُسے بلایا تھا۔ کیوں بلایا تھا؟ اور اب تک وہ واپس کیوں نہیں آیا تھا؟ یہ سارے سوالات اس کے ذہن میں مچل رہے تھے اور اُسے پریشان کر رہے تھے۔ وہ شدت کے ساتھ اشمل خان کی واپسی کا منتظر تھا۔ اس کی بے قرار نگاہیں کبھی وال کلاک سے ٹکراتیں، کبھی کھلے درتچے سے سرمئی ہوتی شام کا جائزہ لیتیں تو کبھی رسٹ وایچ کو خوا مخواہ گھورنے لگتیں۔

اُس کی اس حد درجہ بے قراری میں اس وقت کمی ہوئی جب اشمل خان کمرے میں داخل ہوا۔ ڈھیلے ڈھیلے قدموں سے چلتا وہ احسن کی جانب بڑھا اور اس کی طرف دیکھ کر بے ساختہ مسکرا اٹھا۔

”کیا میرے جانے کے بعد سے ابھی تک یو نہی گشت میں مصروف ہو؟“

”تم سب بے مروت دوست میں نے زندگی بھر نہیں دیکھا۔ لگتا تھا واپس ہی نہیں آتا تمہیں۔ خدا نخواستہ۔“ وہ خونخوار

نظروں سے گھورتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔ ”دیکھ لو سُو کھی ٹہنیوں کی طرف \_\_\_ مت پوچھو انتظار کیا ہے۔“ اُس نے گلدان میں سبے پھولوں سے ایک ٹنڈ منڈ ٹہنی نکال کر اس کے آگے لہرائی۔ ”بس اس سے مختلف حال میرا نہیں ہے۔ حد ہوتی ہے انتظار کی بھی۔ لگتا تھا کسی حسین دوشیزہ نے تمہیں ڈنر پر مدعو کیا تھا۔“ اس نے کہا تو شامل خان کے چہرے پر ایک رنگ اگر گزر گیا۔ اُس نے احسن کے شانوں سے تھام کر صوفے پر بٹھا دیا۔

”اتنا غصہ صحت کے لئے خراب ہوتا ہے۔“

”بہت غصہ آ رہا ہے مجھے \_\_\_ اتنا غصہ تو مجھے اپنی منگیتر کی ناراضگی پر بھی نہیں آتا۔ اچھا بتاؤ مجھے تفصیل کے ساتھ، بغیر تمہید کے۔“

”احسن!“ اُس نے یک بیک سنجیدہ ہوتے ہوئے احسن کو دیکھا۔ سر حیدر کا اغواء کرنے والا ریحان پر اچہ ہے۔“

”کیا۔۔۔۔۔“ احسن اُچھلا۔

”ہاں \_\_\_ ہمارے شک پر یقین کی مہر ثبت ہو گئی ہے۔“

”پوچھ سکتا ہوں یہ مہر کس نے ثبت کی ہے؟“ احسن ابھی تک حیران تھا۔

”نہیں \_\_\_ یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔ اور پھر یہ جاننا تمہارے لئے ضروری نہیں ہے۔ بس ہمارے لئے یہی کافی ہے کہ سر حیدر کا کڈ نیپر ریحان پر اچہ ہی ہے۔ اور اب ہمیں اس سے مقابلہ کرنا ہے۔“ وہ قطعیت سے کہہ کر صوفے سے کھڑا ہو گیا۔

احسن اُلجھا اُلجھا اس کے پیچھے لپکا۔

”اچھے دوست ہو تم \_\_\_ مجھے اتنا بے اعتبار سمجھتے ہو۔“

”احسن! مجبوری ہے۔ بات اعتبار کی نہیں وعدے کی ہے جو میں نے اس سے کیا ہے۔ اور ویسے بھی میں خود بھی اس کی تشہیر نہیں چاہتا۔“ اس نے پلٹ کر احسن کو دیکھا جو برے برے منہ بنا رہا تھا۔

”او کے باس! وعدے کی بات ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ مگر یاد! حیرت ہے، اگر وہ پراچہ کی پارٹی کا ہے تو بہت بے وفانکلا اور اگر اس کا دشمن ہے تو بڑا شاطر ہے۔“

”احسن۔۔۔۔۔ احسن۔۔۔۔۔ اس معاملے کو طول دینے سے فائدہ؟ اب آگے کی سوچو۔ بلکہ میرا تو خیال ہے اس موضوع کو ابھی یہیں رہنے دو۔ صبح ڈسکس کریں گے۔“

”تھک گئے ہو کیا؟“ احسن نے اسے بغور دیکھا۔

”نہیں۔“ اس نے سر نفی میں ہلایا اور درتپے سے باہر جھانکنے لگا۔

سورج مدھم ہوتا ہوا اپنی تابناکی کے ساتھ غروب ہو رہا تھا اور اس کے سامنے پہاڑوں کے اوپر ہولے ہولے شفق پھوٹ رہی تھی۔

وہ شاید اتنے عرصے میں پہلی بار اتنے انہماک سے درتپے میں کھڑے ہو کر ڈوبتے سورج کا منظر دیکھ رہا تھا۔ ہوا کے تیز جھونکے اس کے چہرے سے ٹکرا کر ایک عجیب سی طراوت اس کے اندر پیدا کر رہے تھے۔

احسن بے حد حیرت اور غور سے اس کے اس خلاف معمول رویے کو دیکھ رہا تھا۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ شامل خان اتنے انہماک سے نیچر کی خوبصورتیوں کا مطالعہ کرے۔

”تمہاری پُر سکون جھیل میں کسی نے پتھر تو نہیں پھینک دیا؟“ احسن سے مزید نہ رہا گیا۔ اس کا شوخ جملہ شامل کو چونکا گیا۔

”اں\_\_\_\_“ وہ پلٹا اور پھر احسن کی مسکراتی نگاہوں سے ایک لمحہ کے لئے گڑبڑا گیا۔

”یہ سارے انداز تو دل کے موسم کے بدلنے پر ہوتے ہیں۔ نظاروں کو اتنے غور سے دیکھا جا رہا ہے جیسے ان میں کسی کا عکس تلاش کر رہے ہو۔ کسی کی مسکراہٹ ڈھونڈ رہے ہو اور پھر اس سے اپنے دل کو\_\_\_\_“

”احسن! فارگاڈ سیک۔“ اشمل خان نے جلدی سے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ”اس سے زیادہ فضول باتیں میں نے آج تک نہیں سنیں اور نہ مجھے محبت پر تمہارا بے لاگ تبصرہ سننا ہے۔“ وہ اسے گھور کر ہاتھ روم کی جانب بڑھا۔

”چہ، خوب۔“ احسن زور سے ہنسا۔ ”تمہیں کس نے کہا کہ یہ سارے انداز محبت کے ہوتے ہیں۔“

”اُف\_\_\_\_“ اشمل خان کا چہرہ گہرا گلابی ہو گیا۔ احسن اسے ہر طرف سے گھیرنے کے موڈ میں تھا اور وہ خوب تاڑنے والی نگاہیں رکھتا تھا۔ وہ اس کے سامنے مزید رکنا عبت سمجھ کر ہاتھ روم میں جا گھسا۔

”ہوں۔۔۔۔۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی بات ہے ضرور\_\_\_\_ ورنہ تم یہ فرار کا راستہ نہ چنتے۔“ اس نے ہاتھ روم کے بند دروازے کو گھورا اور پھر براسا منہ بنا کر اپنے بیڈ پر آ گیا۔

دوسری صبح یو تھ فیڈریشن کے تمام اراکین کے علم میں یہ بات اچکی تھی۔

اشمل خان کے پہنچنے سے پہلے ہی احسن نے اپنا بوجھ ہلکا کر دیا تھا۔ شہزاد تو حسب عادت مشتعل ہو گیا۔

”مجھے تو پہلے ہی یقین تھا۔ مگر اشمل خان نے میری بات سنی نہیں۔“

”ٹھیک ہی تو ہے\_\_\_\_ بغیر ثبوت کے ہم کسی پر الزام تو لگانے سے رہے۔“ افتخار نے اُسے ڈانٹا۔ اس کا یوں بھڑکنا اسے ناگوار گزرا تھا۔

”اونہہ\_\_\_\_ یہاں ثبوت کے لئے کون خوار ہوتا ہے؟“

”ہراچھا آدمی۔“ احسن کا جملہ برجستہ تھا۔ وہ براسا منہ بنا کر رہ گیا۔ تبھی اشمل خان اندر آیا۔ اس کے ہمراہ نعیم جان بھی تھا۔ وہ دونوں اسی موضوع پر باتیں کر رہے تھے۔

”اشمل خان! میں نے پہلے ہی یقین سے کہا تھا نا کہ سر حیدر کے کیس میں سو فیصد ریحان ملوث ہے۔“ شہزاد کے جذباتی خون نے پھر جوش مارا تو سب بے اختیار مسکرائے۔

”ہاں شہزاد! تم یقیناً ذہین اور سمجھ دار لڑکے ہو۔ مگر سوسائٹی میں رہنے کے کچھ تقاضے اور ضوابط ہوتے ہیں اور ہر سمجھ دار اور شریف آدمی کو ان ضابطوں کی پابندی کرنی چاہئے۔ ہم کسی طرح بھی محض اپنے شک پر کوئی عملی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے۔ میں تمہارے جذباتوں کی قدر کرتا ہوں۔ تم نے اس فیڈریشن کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔“ اشمل خان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تھکی دی۔

”وہاں ٹانگ بھی تڑوائی ہے۔ یاد ہے۔“ احسن نے کہا تو نعیم جان کا بلند قہقہہ گونج اٹھا جبکہ شہزاد جھینپ گیا۔

”یار احسن! کبھی تو سنجیدہ اور خاموش ہو جایا کرو۔“ افتخار اس کی بے وقت کی شوخی پر سلگ اٹھا۔ ماحول کی سنجیدگی کو وہ برقرار رکھنا چاہتا تھا کیونکہ سر حیدر کا کڈنیپ مذاق نہیں تھا۔ یہ ایک سنجیدہ اور نازک مسئلہ تھا جس کا اب ان سب کو مل کر حل ڈھونڈنا تھا۔

ایف آئی آر درج ہو چکی تھی مگر پولیس اس سلسلے میں ابھی تک ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی۔

”ہمیں سب سے پہلے ریحان پر اچہ کی رہائش گاہ تک پہنچنا ہے۔“ چند لمحے توقف کے بعد اشمل خان کی آواز ابھری تو سب بیک وقت اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔ اس نے افتخار پر نگاہیں ڈکاتے ہوئے کہا۔ ”جہاں تک یاد پڑتا ہے تم نے ریحان کا ذاتی بنگلہ دیکھا ہے۔“

”ہاں\_\_\_\_“ افتخار نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہم لوگ پولیس کی ہمراہی میں۔۔۔۔۔“



”نہیں۔ اتنی جلدی ہمیں اس معاملے میں پولیس کو شامل نہیں کرنا چاہئے۔“ اشمل خان نے اس کا جملہ کاٹ دیا۔  
 ”ضروری نہیں ہے کہ سر حیدر کو اس نے اپنی اسی رہائش گاہ پر رکھا ہو۔“

”میرے خیال سے تو ریحان پراچہ ان کاموں کا اتنا ماہر نہیں ہے کہ اس نے اس طرح کی اور جگہیں بنا رکھی ہوں۔“  
 نعیم جان نے اپنا خیال پیش کیا۔

”مگر وہ اس میدان میں اتنا ناڈی بھی ہر گز نہیں۔“ احسن اس کی بات سے متفق نہ ہوتے ہوئے بولا۔ پھر اشمل خان کے متفکر چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اشمل! یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔ ریحان پراچہ نے سر حیدر کو اگر اپنی رہائش گاہ کے کسی احاطے میں ہی رکھا ہے تو میں تصدیق کر لوں گا۔“

اس کی اس بات پر اشمل خان سمیت سب ہی نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ یہ پہلا اتفاق تھا جب احسن سنجیدگی کے ساتھ کسی معاملے کی ذمہ داری محسوس کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی مستور تھی۔

”بات جب استاد کی عزت اور اپنی غیرت کی آجائے تو سنجیدگی ایک فطری عمل ہوتا ہے۔ ایک جو کر بھی سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ اور پھر صد شکر کہ میں تو\_\_\_\_“ اُس نے سب کی نگاہوں سے جھانکتے تھیر کو محسوس کرتے ہوئے کہا اور ہولے سے مسکرایا۔ ”میں اس تنظیم میں محض مزاح کارنگ بھرنے نہیں شامل ہوا ہوں۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ ہر وقت کی سنجیدگی سے خائف رہتا ہوں۔ کیا ہو جائے اگر بندہ کبھی کبھی اونچے اور بامقصد زناٹے دار قہقہے لگالے۔“ اُس نے یہ کہتے ہوئے اشمل خان کے چہرے کو نگاہوں میں رکھا۔ اس کی بات پر اشمل نے اُسے مسکراتی نظروں سے گھورا۔

”بس کافی ہے اتنا۔“ اس نے اسے مزید بولنے سے بھی روک دیا۔ وہ سنجیدگی سے پھر اوٹ پٹانگ موضوع کی

طرف آرہا تھا اور اسے یہیں روکنا بے حد ضروری تھا۔

”مجھے خوشی ہوئی احسن کہ یہ کام تم نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔“ اشمل خان کو تو واقعی مسرت ہو گئی تھی۔

...☆☆☆...

ریحان پراچہ نے سر حیدر کیانی کو ابھی تک اپنی ذاتی رہائش گاہ پر ہی رکھا تھا۔ شاہنواز پراچہ اور مسز شاہنواز کو اکلوتے اور لاڈلے بیٹے کی ان کارروائیوں سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ رہائشی حصے سے ذرا فاصلے پر بنی انیکسی کی سرگرمیوں سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔ ان کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ یہ ساری سرگرمیاں ان کے بیٹے کی دلچسپیاں اور فارغ اوقات کے مشغول ہیں۔ شاہنواز پراچہ نے اُسے بے تحاشا آزادیاں دے رکھی تھیں جو خطرناک صورت حال اختیار کر گئی تھیں۔ اکثر دہشت گردی کے کیسوں میں ریحان پراچہ کا نام موجود تھا مگر شاہنواز پراچہ کی سوسائٹی میں بنی مضبوط ساکھ اور وسیع تعلقات کے باعث وہ تمام کیسز سے خارج کر دیا جاتا تھا۔ اس نے اپنے باپ سے صرف ایک ہی جملہ سنا تھا۔ ”جیو اور اپنے لئے جیو۔“ خوب عیش سے جیو۔“ لفظ ”جینے دو۔“ اس کے ذہن کی ڈکشنری میں نہیں لکھا گیا تھا۔ پھر وہ کیونکر ”جینے دو“ کے مقولے پر عمل پیرا ہوتا۔

اپنا مفاد، اپنی غرض، اور اپنی خواہشات کو اولیت دینا ہی اس کا نصب العین تھا۔

شاہنواز کی تھپکیوں نے اُسے بے حد نڈر بنا دیا تھا۔

کسی بھی منفی کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اُسے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑتا تھا۔ جانتا تھا کہ اس کے ہاتھ ہتھکڑی سے ہمیشہ محفوظ رہیں گے۔ یہ زعم اُسے اس کے باپ نے ہی عطا کیا تھا۔ ہاں البتہ بیگم شاہنواز کبھی کبھی بے حد خوفزدہ ہو جاتیں اور ایسے میں وہ شوہر ہی سے الجھ جاتیں۔

”خدا کے لئے اسے آپ ہی سمجھائیں۔ ہر غلط کام میں اس کا نام سرفہرست ہوتا ہے۔ کبھی اسے کوئی آنچ نہ آجائے۔“



بہر کیف یہ آگ کے کھیل ہیں۔“

”اور آپ کے بیٹے کو کچھ نہیں ہوتا۔ یہ آگ اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔“ ریحان کے قہقہہ کے ہمراہ شاہنواز پراچہ کا بلند قہقہہ بھی شامل ہو جاتا۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے بیگم! تم کیوں ڈرتی ہو؟ میں جو موجود ہوں۔ اور پھر یہ جوانی ہوتی ہی ایسی ہے۔ اس میں جان کر آگ میں کودنا اچھا لگتا ہے۔“

اس طرح کے سارے جملے ریحان پراچہ کے لئے تقویت کا باعث بنتے۔

یونین کے انتخابات کے دوران شاہنواز پراچہ نے اس کے لئے خزانے کا منہ کھول دیا تھا مگر غیر متوقع نتائج پر وہ بھی نہ صرف حیران بلکہ مشتعل ہو گئے تھے۔

”تم اگر کہو تو میں اس لڑکے کو، کیا نام ہے، ہاں اشمیل خان کو ٹھکانے لگا دوں؟“ بیٹے کا پڑمردہ چہرہ بھلا وہ کب دیکھ سکتے تھے۔ اونچے اونچے قہقہے لگانے والا بیٹا آج کبیدہ دل اور ہزیمت کے احساس سے چور چور تھا۔ انہیں تڑپا ہی گیا تھا۔

”نہیں پاپا! یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کی ساکھ بہت مضبوط ہے۔ ایک ہجوم ہے جو اسے پسند کرتا ہے۔ کئی بڑے

لوگ بھی اس کے ہمراہ ہیں۔ اس کی پارٹی کے ڈھونگ پر فریفتہ ہیں۔“ اس کی روح میں اپنی ہزیمت کا احساس اب تک سلگ رہا تھا۔ اور سر حیدر کیانی کا اغواء اس کی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہوا تھا۔ وہ اشمیل خان کو جھکانے، اُسے نیچا دکھانے کے لئے پاگل ہو رہا تھا۔ اس کی رگوں میں اس کی نفرت اُڑی جا رہی تھی۔

”سر حیدر کو اس نے اپنی انیکسی میں ہی رکھا ہوا ہے۔ اور اب اسی شام انہیں کہیں اور منتقل کرنے کا ارادہ ہے۔“

احسن نے یہ اطلاع اشمیل خان کو دی اور پھر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ دونوں نعیم جان کی رہائش گاہ میں آئے تھے۔ اس کے بے حد اصرار پر لہجہ پر مدعو تھے۔

”اب کیا ہو گا؟“ احسن، اشمیل خان کی مسلسل خاموشی پر بولا۔

”ذرا یہ فون دینا۔“ اشمیل خان نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے نعیم جان سے کہا تو اس نے جلدی سے ریک پر رکھا فون اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

دوسرے ہی لمحے وہ ڈی۔ ایس۔ پی منظور احمد کا فون نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

”ہیلو۔۔۔“ رابطہ ملتے ہی منظور احمد کی آواز ابھری۔

”ہیلو۔۔۔ اشمیل اسپیکنگ سر!“

”اوہ ینگ مین۔۔۔ کیسے ہو؟“ منظور احمد کی پُر جوش آواز ابھری۔

”ٹھیک ہوں۔ سر حیدر کیانی کے کڈنیپ کے سلسلے میں ہی فون کیا ہے۔“ اس نے وضاحت کی۔

”ہوں۔۔۔ میں بھی اسی کیس کے سلسلے میں مصروف ہوں۔ کئی اسٹوڈنٹس کو اریسٹ تو کیا ہے۔۔۔ دیکھو۔“

”اور جو اس کیس میں ملوث ہیں وہ تو آزاد ہیں سر! ابھی تک۔“ اشمیل خان نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”میرے خیال سے تم ریحان پراچہ نامی لڑکے کی بات کر رہے ہو۔ شک ہے تمہیں اس پر؟“

”شک تھا۔۔۔ مگر اب یقین سے کہہ رہا ہوں۔“

”دیکھو ینگ بوائے! شاہنواز پراچہ ایک بہت بڑا صنعت کار اور معزز شخص ہے۔ ہمیں بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا

پڑتا ہے۔ ورنہ الٹی آستیں گلے پڑ جاتی ہیں۔ سمجھ رہے ہونا؟“ وہ یہ کہہ کر زور سے ہنسنے لگا۔ اشمل خان کی پیشانی پر شکنیں گہری ہو گئیں۔

”پولیس کو اتنا اختیار ہوتا ہے سر! کہ وہ شک پر بھی تفتیش کر سکتی ہے۔ یہاں پر تو بات یقین کی ہے۔ شاہنواز پراچہ نے اس ملک کو خرید نہیں لیا ہے۔ نہ کوئی بھی صنعت کار یا جاگیردار اپنے کندھوں پر اس ملک کو رکھے چلا رہے ہیں۔ یہاں بلا امتیاز آپ کو کارروائی کرنی چاہئے۔“

”تم جذباتی ہو رہے ہو۔“

”ایک محترم استاد کی تذلیل پر جذباتی ہونا فطری عمل ہے سر! آپ کیا چاہتے ہیں کہ ہم سب محض تماشائی بنے رہیں؟ آنکھوں دیکھے ظلم پر مہربہ لب رہیں اور چند روپوں کے عوض بڑے بڑے لوگ اس ملک کا بگاڑ کرتے رہے؟ اپنے وقتی کھیل میں عزت دار لوگوں کا مذاق بناتے رہیں؟ میں سب جانتا ہوں سر! آپ ڈرتے ہیں، محض اپنی نوکری جانے سے۔ یا شاید بے حس ہیں اس قانون، اس نظام کی طرح جو ہمیشہ سے صاحب اقتدار کے ہاتھوں کھلونا بنا رہا ہے۔ جو مظلوموں کے لئے بظاہر بنایا گیا ہے مگر مجرموں کی سرپرستی کرتا رہا ہے۔ بزدل اور مفاد پرست لوگوں کو یہ وردیاں نہیں سجتیں سر!“ وہ سخت برا فروختہ ہو رہا تھا۔ اس کی بھوری بھوری آنکھوں میں سارے جہاں کی نفرت گھل گئی تھی۔

ڈی۔ ایس۔ پی کی ہچکچاہٹ اسے سب کچھ سمجھائے دے رہی تھی۔

”یہ قانون کے سائے میں لا قانونیت کا ناقابل برداشت کھیل کب تک جاری رہے گا۔ کسی کو تو آگے بڑھنا ہے سر!“

”میں تمہارے جذباتوں کی قدر کرتا ہوں ینگ مین! مجھے شرمندہ مت کرو۔ تم جانتے ہو بیٹا! کچھ اختیارات ہمیں

سوچنے جاتے ہیں اور کچھ بڑے اختیارات بڑے لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں۔“

”آپ اپنا فرض پورا کریں سر! آگے دیکھا جائے گا۔“ اس نے قدرے سنبھل کر کہا تو ڈی ایس پی منظور احمد چند لمحے گہری سوچ میں گم ہو گیا پھر دھیرے سے بولا۔

”بات یہ ہے کہ اگر ریحان پراچہ اس میں انوالو ہے تو میں مانے لیتا ہوں۔ لیکن اگر اس کی رہائش گاہ سے سر حیدر بازیاب نہ ہوئے تو؟“

”نہیں۔۔۔ یہ ناممکن ہے۔ میں یقین سے کہہ رہا ہوں کہ اس وقت سر حیدر، ریحان پراچہ کی انیکسی میں موجود ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے سر! آپ کارروائی تو کیجئے۔ اور بالفرض ایسا نہ ہو تو بے شک مجھے الزام دہی کے کیس میں اریسٹ کر لیجئے گا۔ میں تیار ہوں۔“

”اشمل۔۔۔“ احسن نے اس کے آخری جملے پر گھبرا کر اس کا بازو دبایا۔ مگر اشمل خان اپنے جلال میں تھا۔

”اوکے۔۔۔ پھر میں ابھی متعلقہ افراد کو ہدایت جاری کرتا ہوں۔ بلکہ میں خود بھی شاہنواز پراچہ کی رہائش گاہ پر روانہ ہو رہا ہوں۔ اوکے ینگ مین! اب تو خوش ہو؟“

”اوہ تھینک یو سر!“ اشمل خان کھل اٹھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی منظور احمد نے ہمیشہ اس کی حوصلہ افزائی کی تھی اور آج بھی اسے مایوس نہیں کیا تھا۔

اس نے ریسپور کریڈل پر رکھا تو احسن جلدی سے بولا۔

”اشمل خان! اگر ریحان پراچہ نے سر حیدر کو کہیں اور منتقل کر دیا تو؟“ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔ اُس کے اس خوف نے اشمل خان کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

”اگر ایسا ہی ہوا پھر \_\_\_؟“ احسن کے خوفزدہ چہرے سے محفوظ ہوتے ہوئے اس نے کہا۔

”تو شاہنواز پراچہ تم پر ہتک عزت کا دعویٰ دائر کر دے گا اور پھر تم نے خود ہی کہہ دیا کہ اس الزام پر۔۔۔۔۔“

”اُحسن! یہ تو پھر اپنے مفاد کے گرد چکرانے والی بات ہوئی نہ۔ میں اپنے آپ کو بچانے کے لئے منہ چھپا کر بیٹھ جاؤں اور بچتا رہوں۔ نہیں اُحسن! میں صرف اسی جامعہ کو ہی نہیں اس پورے معاشرے کو بدلنے کے خواب دیکھتا ہوں۔ بے حس، بے راہروی، جبر اور ظلم کے خلاف میں نے آواز اٹھائی ہے تو محض شواف کے لئے نہیں۔ ٹیکِ اٹ ایزی۔“

اس نے اُحسن کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اُسے بٹھادیا۔ ”مجھے یقین ہے کہ ڈی۔ ایس۔ پی منظور احمد ہمیں کوئی اچھی نوید ہی دے گا۔“ اس کے لہجے کے ساتھ اس کی آنکھوں میں بھی یقین کے ڈھیروں جگنو چمک رہے تھے۔

اس نے خود کو دوبارہ کرسی پر گرالیا۔ ”کیوں نعیم!“ اس نے نعیم جان کو دیکھا۔

”نالوویٹ اینڈ \_\_\_\_\_ سی وہاٹ ہیپین۔“ اس نے شانے اچکائے۔

”ہیول ٹیک پازیٹو اسٹیپ۔ (مجھے یقین ہے وہ کوئی مثبت قدم اٹھائیں گے)“ اشمیل خان کا لہجہ بدستور پُر اعتماد رہا۔

... ☆ ☆ ☆ ...

اُسے لگ رہا تھا جیسے وہ زمین میں گر پڑتی چلی جا رہی ہے۔ اندر ہی اندر اس کی روح اس کے جسم سے کھینچتی چلی جا رہی ہو۔  
اُسے اپنی سانس بند ہوتی محسوس ہوئی۔

فروان گاڑی سے اتر کر اس کے قریب آیا۔ اپنے انہی احساسات اور کھولتے ذہن کے ساتھ۔

”ففففف۔۔۔۔۔ فروا۔۔۔۔۔ ن۔۔۔۔۔“ اُس کے لب کی پکیا گئے۔ اسے کچھ بولنے یا سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا۔

فروان کے مضبوط ہاتھ اس کے رخساروں پر لگتا پڑتے گئے اور پھر اس نے اچانک اسے گھسیٹا اور گاڑی کا دروازہ کھول

کر چھلی سیٹ پر دھکیل دیا۔

”ماہی آپنی کاگڈ وچچھلی سیٹ پر اٹس کریم کھارہا تھا۔ اس حملے پر سہم کر دروازے سے چپک گیا۔“

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم یوں امی پاپا کی عزت کو گلیوں میں رولتی پھرو گی۔ کس منہ سے تم نے پھر گھر کی جانب قدم بڑھائے تھے۔۔۔ بولو۔“ اس نے پلٹ کر خونخوار نظروں سے اسے دیکھا۔

سحر گل چکرا کر رہ گئی۔ ”نہیں، نہیں فروان! تم جو سمجھ رہے ہو باخدا ایسا نہیں ہے۔ میں تو ماں باپ کی عزت کا پاس رکھنے کے لئے گئی تھی۔“ اس کا دل چیخ اٹھا۔ احتجاج کی پُر زور لہریں دل سے اٹھیں مگر اندر ہی کہیں گھٹ کر رہ گئیں۔ آنکھیں بے اختیار برسنے لگیں۔

”میں کئی دنوں سے تمہیں نوٹ کر رہا تھا۔ مگر اتنا اندازہ نہیں تھا سحر! کہ تم \_\_\_ تم اس قدر پستی میں بھی گر سکتی ہو۔“ وہ غصے اور بے بسی کے مشترکہ احساس کے ساتھ اسٹیئرنگ پر ہاتھ مار کر چیخا۔ ”امی کی تربیت میں کہاں چوک رہ گئی؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں فروان!“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔ ڈھیر سارے آنسو باہر اُبل پڑے۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر بلک اٹھی۔

گاڑی گھر کے سامنے رکی تو وہ غصے سے کھولتا نیچے اُترا۔

”میرا دل چاہتا ہے کہ تمہیں شوٹ کر دوں۔“ اس کی طرف کا دروازہ کھول کر اسے باہر کھینچا۔ ”بولو سحر! تم نے یہ سب کیوں کیا۔۔۔ کیوں کیا؟“

”نف۔۔۔۔۔فروان۔۔۔۔۔مم۔۔۔۔۔میں بے قصور ہوں۔“ وہ فروان کے مضبوط ہاتھوں میں کسی ٹوٹی



ڈالی کی طرح ڈول رہی تھی۔

”اونہہ۔۔۔۔۔ بے قصور۔“ اس نے خون آسٹام نظروں سے اسے دیکھا اور پھر ایک جھٹکے سے اسے گاڑی کی پشت پر دھکیل دیا۔ خود بڑے بڑے قدم اٹھاتا اندر کی طرف بڑھ گیا۔

ماہی آپنی کچن سے باہر نکلیں تو فروان کو دیکھ کر ٹھٹکیں۔ لال بھبھو کا چہرہ اور غصے سے بڑے بڑے قدم اٹھاتا وہ کمرے کی طرف بڑھا تھا۔ وہ حیران رہ گئیں۔ ابھی کوئی ایک گھنٹہ پہلے تو وہ مسکراتا ہوا گڈو کو ان کے پاس سے اٹھا کر لے گیا تھا اس نے کریم کھلانے۔ انہوں نے کتنا منع کیا تھا کہ گڈو کو زکام ہے، اس کریم نہ کھلانے۔ مگر وہ ان کی بات نظر انداز کرتا گڈو کو کاندھے پر ڈال کر پورچ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اور اب اتنے بدلے بدلے موڈ میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔ وہ گھبرا کر تیزی سے اس کے پیچھے لپکیں۔

”فروان! کیا ہوا؟“ وہ دروازہ کھول کر اندر آ گئیں۔ فروان جو توں سمیت صوفے میں دھنسا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے اس کے پاس آئیں۔

”آپی! یہ۔۔۔۔۔ یہ سحر نے کیا کر دیا؟“ اس نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ سرخ سرخ انگارہ آنکھیں۔ ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ یا الہی! خیر، اب کوئی نیا امتحان۔“

”س۔۔۔۔۔ سحر نے کیا کیا ہے فرو؟“ ان کی آواز کانپ کر رہ گئی۔ ایک لمحے کے اندر ہی کتنے وہم ذہن کی دہلیز پر دستک دینے چلے آئے۔ وہ خوفزدہ سی نظر آنے لگیں۔ ”بتاؤ نا فروان۔ کیا ہوا سحر کو۔ کیا کر دیا اس نے؟“ انہوں نے باقاعدہ فروان کو جھنجھوڑ دیا۔

”آپی! سحر کے قدم بہت غلط راستے کی طرف اٹھے ہیں۔ خدایا، میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مئی جیسی عورت سے تربیت پانے والی سحر اتنی پست اور گری ہوئی حرکت کرے گی۔ اُس نے ہم سب کی عزت کو روند ڈالا ہے۔ ہاں آپی!

اُسے کہتے کہ وہ کہیں اور چلی جائے خدا کے لئے۔ اس گھر سے دور۔ ورنہ۔۔۔۔۔ ورنہ میں۔“ وہ یکدم جنونی ہو گیا۔

اُس کا ایک ایک لفظ ماہ گل کے جسم و جاں میں ترزو ہو گیا۔ انہیں لگا جیسے ان کے دل کو تیز خنجر کے لبوں نے چھو لیا ہو یاد فتنہ کسی نے پھانسی کا پھندا ان کے گلے میں ڈال دیا ہو۔ ان کا سارا وجود سن ہو گیا۔

”میں نے اسے پچھلی گلی کے کنارے سے پکڑا ہے۔ اسے پوچھئے وہ کہاں گئی تھی۔ کسی شخص نے اُسے۔۔۔۔۔“

”نن۔۔۔۔۔ نہیں فروان!“ ماہ گل نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی آواز دہادی۔ ”خدا کے لئے کہو یہ سب جھوٹ ہے۔۔۔۔۔ ہاں فروان! ایسا نہیں ہو سکتا۔“

”ایسا ہو گیا ہے آپی! اور اگر ایسا نہیں ہو تو اب اس کے ہونے میں کس باقی نہیں رہی۔“ وہ ماہ گل کا ہاتھ جھٹک کر تلخی سے بولا اور صوفے سے اٹھ کر اضطرابی انداز میں لگا۔ اس کی شریانوں میں خون اُبل رہا تھا اور ذہن کی طنائیں تنی جا رہی تھیں۔ ”میں اُسے کئی دنوں سے نوٹ کر رہا تھا۔ اُس کے یہ قدم جان کر اٹھے ہیں۔ کسی مجبوری۔۔۔۔۔“

”خدا کے لئے فروان! چپ ہو جاؤ۔“ وہ اس الزام پر تھرا اُٹھیں۔ اُن کی نگاہوں تلے وہ منظر گھوم گیا۔ اس لڑکے کا سحر گل کے پیچھے آنا۔ پھر محبت نامہ دینا۔ اُف، تو کیا سحر اُس کے دام میں

گرفتار ہو گئی جان کر؟۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ اُن کا دل اس بات پر یقین کرنے کو تیار ہی نہ تھا۔ مگر فروان اُسے جس حالت میں گھر لایا ہے، اسے بھی وہ کیسے نظر انداز کر دیں۔

”میرا دل چاہتا ہے کہ میں اسے شوٹ کر دوں آپی! اور خود کو بھی۔“ وہ از حد روہانسا ہو گیا۔ کرسی پر ڈھکے گیا جیسے



پیروں میں مزید جان نہ رہی ہو۔

ماہ گل نے اُسے دیکھا۔ اس کا بھی تو کچھ قصور نہ تھا۔ اُس کا یہ غصہ، یہ جنون، یہ ہیجان فطری تھا۔ کوئی غیرت مند بھائی یہ حرکت تو کجا بہنوں کے منہ سے کوئی ایسی غلط بات بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ بھائی تو بہنوں کا مان ہوتے ہیں اور بہنیں ان کی عزت۔ پھر بھلا وہ اس عزت کی حفاظت کیونکر نہ کریں؟ اور ایسے میں عزت پر آنچ لانے والوں کے ہاتھ جڑ سے کاٹ دینے میں تامل نہیں کرتے۔ مگر جب بہن بھی شامل ہو تو کچھ بعید نہیں ہوتا کہ دہرے قتل کے مرتکب ہو جائیں۔

یا اللہ۔۔۔ یہ ان کے گھر میں کیسی آفتیں نازل ہو رہی ہیں؟ کہاں، کب اور کیسا جرم اس گھر کے مکینوں سے سرزد ہوا ہے جس کی پاداش میں نہ ختم ہونے والی سزائیں نازل ہو رہی ہیں۔“ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا دل تھام لیا۔ اور پھر فروان پر ایک نگاہ ڈال کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ ان کے تھکے ہوئے قدم اب سحر گل کے کمرے کی طرف اٹھ رہے تھے۔

...☆☆☆...

”خان زادی! بابا، راول کو وادی کے سکول میں داخل کرانا چاہتے ہیں پر بی بی جان راضی نہیں ہوتیں۔ وہ کہتی ہیں کہ اس کو پڑھا کر کیا حویلی میں شاہ خانم کا منشی لگوانا ہے۔ کھی، کھی۔۔۔“

وہ نوراء کی چھوٹی بیٹی تھی۔ اپنی بی بی جان کے سے انداز میں بول کر زور زور سے ہنسنے لگی۔ اشارہ کو بھی ہنسی آگئی۔

”تم نے کہا نہیں انہیں کہ پڑھ لکھ کر منشی نہیں ڈاکٹر بنے گا راول۔“ اس نے اسے اپنے قریب کھینچ کر بٹھالیا۔ اُسے لطف آ رہا تھا نوراء کی بیٹی چمن گل سے باتیں سن کر۔

”نہیں، راول ڈاکٹر نہیں بن سکے گا۔“

”ارے کیوں بھئی؟“ وہ حیران ہوئی۔

”اس لئے کہ وہ ڈاکٹر کی دوائی کبھی پیتا ہی نہیں ہے۔ بابا کہتے ہیں کہ جو بیماری میں دوائی نہ پیئے گا وہ دُبلا ہو جائے گا۔ اور دُبلے ڈاکٹر نہیں ہوتے نہ۔ راول کا ڈاکٹر بھی تو انناں موٹا سا ہے اور ہمارا راول تو بہت دُبلا ہے۔“

”ہا، ہا۔۔۔ تو دُبلے منشی ہوتے ہیں۔“ وہ ہنستی چلی گئی۔ اُسے چمن گل کی معصومیت پر بے تحاشا ہنسی آرہی تھی۔ اس نے بے ساختہ چمن گل کو اٹھا کر گود میں بٹھالیا۔ ”تم تو خوب موٹی تازی ہو۔۔۔ تم تو ڈاکٹر بن سکتی ہو۔“ اس نے مسکرا کر اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے شرارت اور محبت سے اس کے موٹے موٹے رخسار چھوئے۔ گلابی لبوں سے پھوٹتی ہنسی، سنہری آنکھوں کی بھرپور توانائیاں اور رخساروں پر بکھری شگفتگی کو ذولین خان اپنی انیکسی کے درپے سے لگا دیکھ رہا تھا۔ نوراء کی بیٹی کے ساتھ بیٹھی بات بات پر ہنستی وہ اُسے بہت بھلی لگ رہی تھی۔ اُسے خاص تعجب ہوا۔

”کیا میری محبت، میرے التفات نے اسے یہ ہنستا مسکراتا رنگ بخشا ہے؟“ اُس نے تھیر سے سوچا۔ بھلا جو خود تشنگی کا سوکھا میدان رہا ہو، وہ کسی اور کو کیا سرشار کر سکے گا۔“

”نہیں! اشارہ مہروز! میں تو خود تم سے سیراب ہوا ہوں۔۔۔ تم تو خود آپ جو ہو۔ نرم اور محبت کی بے شمار بوندوں سے بھری ہوئی۔ تمہارے قریب آکر میں نے اپنا آپ پایا ہے۔ دوڑتی بھاگتی، بے رونق زندگی میں جیسے یک دم خوش کن ٹھہراؤ آگیا ہو۔“

وہ بے حد محبت اور دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھنے لگا۔ یہ سنہری بالوں اور سنہری آنکھوں والی لڑکی اس کے لئے یکدم کتنی اہم ہو گئی تھی۔ دل اور زندگی کے لئے کتنی ضروری۔ اُسے پالینے کا تصور ہی خوش آسند تھا۔

وہ تالاب کے کنارے کھڑی ہو گئی تھی۔ زبیل اُسے شاہ خانم کے بلاوے کا پیغام دے گئی تھی۔ اس نے سر ہلا کر

زیل کو جواب دے دیا اور پھر چمن گل کو گود سے اُٹار کر پٹی تو معاً اس کی نگاہیں اس جانب اُٹھیں جہاں سبز نگینوں کی محویت اور عنابی لبوں پر پھوٹی مسکراہٹ کا ایک جہاں آباد تھا۔ ایک شرمیلی سی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔

ذولین خان درتچے سے ہٹ کر انیکسی کے ورنڈے کی رینگ کے پاس اکھڑا ہوا تھا۔ اشارہ اس کی طرف آئی۔ اس کی انگلیوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی جس نے اشارہ کو متعجب کر دیا۔ اس سے پہلے اس نے ذولین خان کو کبھی سگریٹ پیتے نہیں دیکھا تھا۔

”آپ سگریٹ پیتے ہیں؟“ اس کا لہجہ حیرت آمیز تھا۔

”ہوں۔۔۔ جب بہت اُداس یا خوش ہوتا ہوں تب پی لیتا ہوں۔“ اس نے سگریٹ کا کونالوں میں دبا کر چھوڑ دیا اور ہلکا دھواں فضا کے سپرد کیا۔

”تو آج کس احساس نے سگریٹ پینے پر اکسایا ہے؟“ وہ مسکرائی۔ سفید براق کرتے شلوار میں آستینیں کہنی تک فولڈ

کئے دھیرے دھیرے سگریٹ پیتا وہ اُسے بے حد مختلف اور بہت خوبصورت لگا تھا۔ سبز آنکھوں کی سبیل سبیل روشنیاں اس کے دل تک کو منور کر گئیں۔ کب اتنا یقین تھا کہ زندگی کے سارے خوبصورت لمحے اس کی ہتھیلیوں پر

اُتر آئیں گے۔ سنا ہے کہ عورت تو چاہنے والے کی خوشبو تک بے کراں انبوہ میں پہچان لیتی ہے۔ دل کے احساسات سمجھنا اس کے لئے کیا مشکل ہے۔ جبکہ چہرے اور نگاہیں اس کے ترجمان ہوں۔ اُس نے قدرے جھک کر اشارہ کی

آنکھوں میں جھانکا۔ اُس کا مہکتا لہجہ پُر شوق تھا اور نگاہیں محبت کا ایک خزانہ لٹائے دے رہی تھیں۔ سچ ہی تو کہہ رہا تھا۔

اشارہ نے سوچا۔ خود اس کے چہرے پر محبت پالینے کا نشہ ٹوٹ

ٹوٹ کر بکھرا ہوا تھا اور آنکھیں ایسی آب جو محسوس ہوئیں جن میں آس پاس کے رنگین اور دلکش سبزہ زار کے بے شمار رنگوں کا عکس تھا۔ اس کی سیاہی مائل سرخ پلکیں رخساروں پر جھک گئیں۔

”ٹھیک کہا تم نے ذولین خان! مگر کبھی وہم سا جانتا ہے کہ ہم جو محسوس کر رہے ہیں، محض ہماری خوش فہمی نہ ہو۔ دل تو ویسے بھی وہ خوش فہم ہوتا ہے کہ ایک ساعت میں ہزاروں امیدیں باندھ بیٹھتا ہے۔“

”کیا اب بھی یہ وہم دامن گیر ہے؟“ اس نے اسے ایسی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا کہ وہ پگھل گئی۔

”اب میں چلوں گی۔ شاہ خانم نے مجھے بلایا ہے۔“ اس نے جلدی سے پلکوں کی باڑھ جھکالی۔

”سوری۔ میری موجودگی نے تمہیں ڈسٹرب کر دیا۔“ وہ سیدھا اکھڑا ہوا گیا۔

”وہ تو ہمیشہ سے کرتی آئی ہے۔“ اس نے مسکرا کر پلٹ کر کہا اور اس کے چہرے کی گہری ہوتی مسکراہٹ کو دیکھے بغیر رہائشی حصے کی جانب بھاگ لی۔

شاہ خانم اپنے کمرے میں تھیں اور دیوار سے لگی الماری کے قریب بیٹھی تھیں۔ اُسے اندر آنا دیکھ کر ان کے جڑے لبوں سے مسکراہٹ بکھر گئی۔

”کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟“ وہ ان کے قریب اکھڑی ہوئی۔ اس کا اشارہ ان کے زکام کی طرف تھا۔

”ہاں اللہ کا شکر ہے۔۔۔ تم بیٹھو۔“ انہوں نے اپنے قریب ایک اور کرسی کھینچ دی جس پر وہ بیٹھ گئی۔

”کہاں ہوتی ہو؟“ سارا سارا دن غائب رہتی ہو۔ اپنی صورت دکھانا چھوڑ دی ہے مجھے۔“ انہوں نے خلاف

عادت اسے نرمی سے ڈانٹا۔ ”گل بی بی کے گھر گئی تھیں تم؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی۔“ وہ گھبرا گئی۔ ”وہ بابا خان سے اجازت۔۔۔“

”ہاں مجھے پتہ ہے۔ کیسی طبیعت ہے گل بی بی کی؟“ انہوں نے اس کا جملہ کاٹ دیا اور گل بی بی کی خیریت پوچھی تو وہ ایک لمحہ عالم تحریر میں گھر گئی۔ یہ آج شاہ خانم اتنی مختلف کیوں محسوس ہو رہی تھیں؟ کیا یہ بیماری کا اثر ہے یا پھر موسم کا۔۔۔ یا کوئی نرم گداز گوشہ جاگ اٹھا تھا؟ اُسے حیرت کے ساتھ خوشی ہوئی۔ ایک میٹھا میٹھا احساس دل کی سطح پر لہرا کر رہ گیا۔

”ہاں۔۔۔ گل بی بی آپ کو سلام کہہ رہی تھیں۔ وہ شاندانہ کی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔“

”اچھا۔۔۔ کب ہو رہی ہے شان کی شادی؟“ شاہ خانم نے چونک کر پوچھا۔

”ابھی تو نہیں۔۔۔ ان کی نند کی بیٹی ہشیمہ ہے نا، اس کی چھٹیاں جب آئیں گی تب۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ اسے وادی آنے کا بہت شوق ہے اور شاندانہ کی شادی اس کے آنے کا اچھا بہانہ ہے۔“ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ بتایا۔

”ہوں۔۔۔ اچھا ہے۔ اولاد کے فرض سے تو جتنی جلدی ہو سکے سبکدوش ہو جانا چاہئے۔“ ان کی آواز قدرے دھیمی تھی۔ آنکھیں بظاہر اشارہ کے چہرے پر جمی تھیں مگر آنکھوں میں سوچ کے ڈھیروں رنگ تھے۔

”یہ کیا ہے شاہ خانم؟“ اشارہ کی نگاہ ان کی گود میں رکھے سرخ مخملی ڈبوں پر پڑی تو اس نے پوچھا۔

”ہاں، ہاں۔۔۔“ وہ اُس کی آواز پر چو نکلیں۔ ”ہاں، یہ دیکھو۔“ انہوں نے اوپر رکھا بڑا سا ڈبہ اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ ”الماری ایسے ہی آج کھول کر صفائی کرنے لگی تو یاد آیا یہ ڈبہ تو عرصہ ہوا کھولا ہی نہیں ہے۔ میرے جہیز کے زیور ہیں۔ یہ سیٹ تمہارے لئے نکالا ہے۔“

”آخہ۔۔۔ اتنا پیارا۔۔۔ سچ شاہ خانم! اتنا خوبصورت۔۔۔ کسی ماہر جیولر نے ہی بنایا ہے۔“

شاہ خانم مسکرائیں۔ ”پسند آیا تمہیں؟“

”بہت، بہت پیارا ہے۔ میں اسے پہن کر دیکھوں؟“ اس نے بے حد معصومیت سے اجازت چاہی۔

”ہاں، ہاں۔۔۔ تمہارے لئے ہی تو نکالا ہے۔ اسے ذرا پہن کر دکھاؤ۔“ انہوں نے کہا تو اشارہ نے احتیاط سے اسے ڈبے سے نکال کر اپنی شفاف سفید گردن پر رکھا تو جیسے روشنی چاندی سے ٹکرائی تھی۔ شاہ خانم نے اپنی ہی نظر لگ جانے کے ڈر سے پلکیں جھپک دیں۔

”کیسا لگ رہا ہے؟“ اُس نے شاہ خانم پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر اٹھ کر ڈریسنگ کے آئینے میں اپنا سراپا دیکھا، پھر دلکشی سے مسکرائی۔

پتہ نہیں کیسا لگ رہا تھا اپنی آنکھوں سے دیکھنا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

”ماشاء اللہ۔۔۔ بہت پیارا لگ رہا ہے۔“ شاہ خانم نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ پھر دوسرا ڈبہ کھول کر بولیں۔ ”یہ دیکھو۔۔۔ یہ میں نے اشمیل خان کی دلہن کے لئے رکھا ہے۔ یہ بری کا ہے میرا۔ تمہاری بی جان نے مجھے پہنایا تھا۔“

”کیا۔۔۔ اشمیل لالہ کی دلہن؟“ وہ چونکی۔ جملہ کتنا نیا نیا مگر خوش آئند تھا۔ ابھی تک اس حویلی میں ایسا کوئی جملہ سنا ہی نہیں تھا۔ وہ تیزی سے ان کے قریب آئی۔ اشمیل لالہ کی شادی، ان کی دلہن۔۔۔ کیسا گد گد آنے والا احساس تھا۔ ”کب۔۔۔۔۔ کب ہوگی شاہ خانم! اشمیل لالہ کی شادی۔۔۔ اور کس سے؟“ اس نے بے تابانہ انداز میں پوچھا تو شاہ خانم ہنس دیں۔

”ارے پاگل! ابھی کہاں۔ وہ لڑکا تو حویلی میں ہوا کے گھوڑے پر سوار آتا ہے۔ مگر ہاں، لڑکی میں نے ڈھونڈ رکھی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے شاہ خانم کی آنکھوں میں ایک عجیب سی روشنی جل اٹھی۔



”سحر گل اچھی لڑکی ہے نا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”کیا\_\_\_سحر\_\_\_اپنی سحر گل؟“ مارے خوشی کے اشتار کی آواز ہلکی چیخ کی صورت میں نکلی۔

☆☆☆...

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہماری آنکھیں بلکہ ہمارا پورا وجود بصارت کا روپ دھارے روشنی میں ایک ہی نکتے کے گرد چکر اتار ہتا ہے۔

مگر کبھی بالکل اچانک یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے پیچھے روشنیوں کا ایک انبار چلا آ رہا ہے\_\_\_ اور ہم کم فہم صرف آگے منہ کئے ایک معمولی نکتے کے گرد گھومتے چلے جا رہے ہیں۔ مگر پھر بھی پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے خوفزدہ۔

یہ واہمہ کہ پیچھے پلٹتے ہی وہ روشنی کا انبار جادوئی ہو اور دھوئیں کے غول کی طرح غائب ہو جائے اور ہم اس روشنی کی معمولی لکیر سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔ بس ایسے ہی واہمے، ایسے ہی خوف کبھی ہمیں ڈھیروں روشنیوں سے دور کر دیتے ہیں اور ہم اسی نکتے کے گرد ساری عمر اپنے قیمتی لمحے گزار دیتے ہیں۔ قانع ہو جاتے ہیں کہ یہی ہمارا نصیب ہے\_\_\_ بس اتنا\_\_\_ اس سے آگے وہم یا کم فہمی کی چادر ہمیں نکلنے نہیں دیتی۔

ہاں، اشمل خان بھی خلوص، محبت اور نیکی کا ایسا ہی روشن مینارہ تھا جو میرے پیچھے پیچھے تھا اور میں اسے بھی اپنا واہمہ سمجھی اور غلط پارٹی میں آگئی۔ یہ سوچ کر کہ یہیں اس نکتے میں میرے شوق کی تکمیل ہے۔ مگر کہاں؟

اب پیچھے مڑتی ہوں تو ڈھیر ساری شرمندگی اور خفت سراٹھانے نہیں دیتی۔ اور وہ نکتہ تو ظاہر ہی تھا جو دھوئیں سے بھی کم تر تھا۔

اب نہ میرے آگے روشنی ہے اور نہ پیچھے پلٹنے پر کوئی پُر تپاک خیر مقدم۔

آہ\_\_\_ میری کم فہمی نے مجھے تباہ کر ڈالا۔

یہ\_\_\_ اشمل خان! تمہاری نیک نیتی اور خلوص نے مار ڈالا۔

اس کی آنکھوں میں دُکھ کی کائی دبیز ہو گئی۔

اشمل خان سے ملنے کے بعد اس کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی جسے وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ ایک ناآشناسی دھند اس کے دل و دماغ پر چھائی جا رہی تھی۔ وہ بہت بجھے بجھے دل کے ساتھ یونیورسٹی آئی۔ ندرت نے اُسے جامعہ کی سڑک پر ہی گھیر لیا۔

”ایک زبردست نیوز\_\_\_ جس کو سننے کے لئے تمہیں یقیناً دل، گردے، کلیجے، پھیپھڑے وغیرہ سب سنبھالنے ہوں گے۔“ وہ یہ کہہ کر زور سے ہنسی۔

”کیا مطلب؟“ ہشمنہ نے اُسے دیکھا اور پھر ایک طائرانہ نگاہ جامعہ کے اندر تک ڈالی۔ ایک عجیب افرا تفری اُسے بھی محسوس ہوئی۔ کوئی انوکھا یا کوئی بے حد اہم مسئلہ نمودار ہوا تھا شاید۔

”تمہیں تو دکھ ہو گا۔ مگر سچی، مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ ایمان سے، دل بلیوں اچھل رہا ہے۔“ وہ اس کے قریب منہ کر کے بولی۔

ہشمنہ نے اُسے گھورا۔

”اب بتا بھی دو\_\_\_ مجھے کیا دکھ مل رہا ہے؟ اب تو شاید کوئی کسر نہیں رہی۔“ اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”سر حیدر کیانی بازیاب ہو چکے ہیں اور ریحان پراچہ اریسٹ کر لیا گیا ہے۔ موصوف کو رنگے ہاتھوں پکڑا جا چکا ہے۔“



اس کی رہائش گاہ پر اشمل خان کے کہنے پر چھاپہ پڑا تھا۔ “ندرت نے اُسے پوری تفصیل بتا ڈالی تو وہ اپنی جگہ سُن سہی رہ گئی۔

”سراج اور کوئی دو اور لڑکے بھی تھے۔ سارے کے سارے اندر کر لئے گئے ہیں۔ ایمان سے، ہے ناز بردست نیوز؟“ مارے خوشی کے ندرت کی مسکراہٹ تھم نہ رہی تھی۔

ہشتمینہ ابراہیم کی آنکھوں کی پتیلیوں میں کتنے ہی لمحے سوائے حیرت کے کچھ نہ اُبھرا۔

”تمہیں یقیناً دکھ ہوا ہوگا۔ بلکہ گہرا صدمہ۔ آخر تمہاری پڑٹی کے لیڈر کی ایسی درگت جو بنی ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے چونک کر جلدی سے کہا۔ ”بہت اچھی خبر سنائی ہے تم نے ندرت! تم نے تو واقعی میری ساری اُداسی دُور کر دی۔ ریحان پر اچہ اب اپنی صحیح جگہ پہنچا ہے۔ اسے تو بہت پہلے وہاں پہنچا دینا چاہئے تھا۔“ اُس کی آواز اور اس کے لہجے میں سچی مسرت تھرک رہی تھی۔

”کیا تـم تـم بھی؟“ ندرت کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ وہ منہ کھولے ہونق بنی اسے دیکھنے لگی مگر وہ آگے بڑھ گئی۔ اُسے اسی حیرانگی میں چھوڑ کر۔

”ہشمنہ! \_\_\_ کیا کہا تم نے ابھی؟“ ندرت اس کے پیچھے لپکی اور پھر اس کے سامنے آکر منہ اٹھا کر اسے یوں دیکھنے لگی جیسے اُسے ہشمنہ کی دماغی حالت پر شک گزرا ہو یا پھر اپنی سماعت پر۔

”ہوں۔۔۔ وہی جو تم نے سنا۔ بہت اچھی خبر سنائی ہے تم نے۔“ وہ پہلی بار دھیرے سے مسکرائی۔

”یا اللہ۔۔۔ یہ انقلاب کب رونما ہوا؟ تم تو ریحان پراچہ کی برائی برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ اب یہ یکایک کیا بھید ہے اس میں؟“ ندرت پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ وہ کھوجتی نظروں سے اسے گھورنے لگی۔

”یاد ہے ایک بار تم ہی نے کہا تھا مجھ سے کہ ریحان پر اچہ نے اتنا بڑا اور چکا چوند عہدہ دے کر مجھے در حقیقت الجھاد دیا ہے۔ ورنہ ینگ فیڈریشن میں میرے لئے کوئی چارم نہیں ہے۔ اور میں دل سے اشمیل خان کی خوبیوں کی معترف ہو چکی ہوں۔“ اس نے چلتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”تو بس ریحان پر اچہ کی اصلیت میرے سامنے کھل چکی ہے اور اشمیل خان کی خوبیوں نے اپنا لوہا منوالیا۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی لانی، گداز پلکوں کی باڈھ رخساروں پر جھک گئی۔

”یا اللہ۔۔۔“ ندرت کا ہاتھ بے ساختہ دل پر آٹھہرا۔ ”اتنا بڑا انکشاف۔ اُف۔۔۔۔۔“ ویسے کہیں یہ چڑھتے سورج کے پجاری والی بات تو نہیں؟“ ہشمنہ اس کی بات پر بھڑکی۔

”تم مجھے اتنی پست اور فضول سی لڑکی سمجھتی ہو۔۔۔ بولو۔۔۔ کیوں کہی تم نے اتنی غلط بات؟“ وہ برہم ہو گئی۔

”اچھا۔۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔۔ بابا غلطی ہو گئی۔ مانا کہ ریحان پر اچہ کی تو حرکتوں نے آپ کی آنکھیں کھول دیں اور اشمٰل خان نے اپنی خوبیوں سے اپنا لوہا منوالیا۔“ وہ یہ کہہ کر ایک لمحہ رکی اور پھر شوخ نظروں سے اس کے سامنے آکر مسکرا کر بولی۔

”اور کیا کیا منوالیا آپ کے سامنے؟“

”ندرت کی بچی \_\_\_“ اُس کا چہرہ تپ اٹھا۔ اس نے غصے سے اسے گھورنا چاہا مگر نہ جانے کیوں وہ اُس کی شریر آنکھوں میں زیادہ دیر تک نہ جھانک سکی۔ اس کی دھڑکنیں عجیب سے انداز میں تیز ہو گئیں۔ اور ندرت تو پاتال سے گوہر نکالنے والی ہستی تھی۔ اس نے اس کے دل میں جھانک کر ان نئی آہٹوں کو سن لیا جنہیں ہشیمینہ اپنے آپ سے بھی چھپانا چاہتی تھی۔

”ہوں۔۔۔ آج ان کی خوبیوں نے آپ کو متاثر کیا ہے۔ کل اس کی آنکھوں نے، پھر اس بن ادھوری محسوس کرتے ہوئے اسے اپنا سب کچھ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔“

”تم نہایت فضول اور بے کار لڑکی ہو۔“ وہ اسے دھکیل کر آگے بھاگی۔ ”بس تم ہر بات کا ایک ہی مطلب لینا۔“

”ویسے ایمان سے یہ بھی بڑی زبردست نیوز ہے۔“ ندرت دھکا کھا کر کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ مگر ہشتمینہ سنی ان سنی کرتی دوسری جانب نکل گئی۔

سر حیدر کے آفس سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹک گئی۔ اشمل خان ان کے آفس سے نکل رہا تھا۔ وہ بھی اس کے سامنے رک گیا۔

”بہت مبارک ہو۔“ وہ اس کے مقابل آکر رکنے پر بولی۔

”کس بات کی؟“ اس نے دانستہ حیرانی ظاہر کی۔

”سر حیدر کو بازیاب کرانے کا سہرا تو آپ کے سر ہے۔“

”اوہ \_\_\_“ وہ دلکشی سے مسکرایا۔ ”مگر اس میں زیادہ کریڈٹ تو تمہیں جاتا ہے۔“ وہ پُر شوق نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”مجھے؟“

”میرے شک کو یقین تم نے بخشا تھا۔“

”ارے \_\_\_“ وہ جھینپ سی گئی۔ سرمئی چادر کے ہالے میں دمکتا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”سر حیدر تو خیریت سے ہیں نا؟“ وہ سوچ کر جلدی سے بولی۔

”ہاں۔۔۔ شکر ہے۔۔۔ بس کچھ کمزوری ہو گئے ہیں اور قدرے دُکھی بھی ہیں۔ آخر اپنے ہی شاگرد کی اس حرکت پر ملول ہونا تو فطری بات ہے۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ یہ موضوع ہی اتنا نازک تھا۔

”ریحان پر اچہ کا جرم ناقابل معافی ہے۔ اسے اس کی سخت سزا ملنی چاہئے۔ اور پھر اس پر تو کئی اور کیس بنتے ہیں جامعہ سے ہٹ کر بھی دہشت گردی کے۔“

”بہت دکھ ہوتا ہے اشمٰل خان! جب ایک اچھے خاصے تعلیم یافتہ اور متمول گھرانے کے لڑکے ایسی اوجھی حرکت کرتے ہیں۔ صحت مند ذہن اور صحت مند جسم تو اس ملک کے مسائل حل کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ انہیں کوئی ذاتی مسائل درپیش نہیں ہوتے۔ انہیں تو بڑھ چڑھ کر ملکی ترقی کے کاموں میں حصہ لینا چاہئے۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہے۔ تمام مسائل سے بے فکرے نوجوان اصلاحی کاموں کی بجائے تخریب کاری میں ملوث نظر آتے ہیں۔۔۔ یہ المیہ ہے آج کا۔“ وہ قدرے متاسف ہو کر بولی۔

”بالکل ٹھیک کہتی ہو تم ہشمنہ! یہ سب کچھ اتنا بڑھ چکا ہے، ان کے پیچھے اتنے مضبوط ہاتھوں کی سپورٹ ہے کہ انہیں گرانابہت مشکل ہو گیا ہے۔“

”اشمل! کال ہے تمہاری۔“ نعیم جان تیزی سے اس کے قریب آیا۔ اس کی اطلاع پر وہ دونوں چونکے۔

”میری کال؟“

”ہاں، ڈی ایس پی منظور احمد کی ہے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔اچھا۔۔۔۔۔میں آتا ہوں۔“ اس نے سر ہلایا اور نعیم جان کو جواب دے کر ہشمنہ کی طرف مڑا۔ ”پلیز تم میرے آفس میں بیٹھو۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔۔۔۔۔ ضروری باتیں۔“ اس نے آخری لفظ پر زور دیا۔ وہ جو جانے کے لئے پلٹی تھی اس کی بات پر رکی اور قدرے حیران ہوئی۔

”جی\_\_\_ معافیاں مانگنی ہیں نہ۔ کچھ دانستہ اور کچھ نادانستہ کہے ہوئے جملوں کی۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ اپنی اسی دلکشی اور بے پناہ شگفتگی کے ساتھ۔

”پلیز!“ وہ اُسے گوگو کی کیفیت میں دیکھ کر بولا تو وہ ہولے سے مسکرا دی اور اپنے اسی اعتماد کے ساتھ چلتی ہوئی آفس کی جانب بڑھ گئی۔

احسن اُسے آفس میں داخل ہوتے دیکھ کر بری طرح چونکا اور قدرے ششدر ہو کر ہشمنہ ابرار کو گھورنے لگا۔

یہ پہلی بار ہوا تھا کہ تنے تنے چہرے والی ہشمنہ بے حد شائستگی اور نرم چہرے کے ساتھ قدم اٹھاتی ان کے آفس آئی تھی۔

”مجھے ویکم نہیں کہیں گے؟“ اُسے احسن کے ہونق چہرے کو دیکھ کر بے ساختہ ہنسی آئی مگر اس نے بہ دقت تمام اسے لبوں پر پھیلنے سے روک لیا۔

”کک۔۔۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔۔۔ موسٹ ویکم۔“ وہ جلدی سے چونکا اور کرسی کھینچ کر اسے پیش کی۔ ”پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کی اور اشمل کی دوستی کو کتنے گھنٹے گزرے ہیں؟“ اس کے تجسس نے سر ابھارا۔ ”سنا ہے آپ کی اشمل خان سے کچھ رشتہ داری بھی نمودار ہوئی ہے۔ مگر یہ دوستی اس رشتہ سے ہر گز نہیں لگتی۔ بلکہ یہ تو صرف چند گھنٹے پیشتر کا انقلاب لگتا ہے۔“

”آپ کیا اس آفس کی چوکیداری ہی کرتے رہتے ہیں؟ کوئی پیریڈ اٹینڈ نہیں کرتے؟“ اس نے بڑی خوبصورتی سے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔

”کسی نہ کسی کو تو چوکیداری کرنا ہی ہے نہ۔ یہاں کے ہلڑ باز لڑکے سارے سامان کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔“ اس نے کہا تو ہشمنہ مسکرا دی۔

”خوب\_\_\_ ہلڑ بازی گروپس کو آپ تنہا کیسے قابو میں کر سکتے ہیں؟ جبکہ اسلحہ سے آپ لوگ گریزاں ہیں۔“ اس کے لہجے میں شرارت آمیز طنز تھا۔

احسن بھرپور انداز میں ہنس دیا۔

”تو گویا ہشمنہ صاحبہ! آپ نے ہماری اس خوبی کا اعتراف کر لیا۔“ احسن اُسے گھیرنا چاہتا تھا۔ وہ گھما پھرا کر اشمل خان سے اس کی دوستی کی باز پرس کرنا چاہتا تھا۔

”صداقت اپنا آپ منوالیتی ہے۔“ اس نے کھلے دل سے اشمل خان کو سراہا تو احسن متحیر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ہشمنہ ابرار اس حد تک بدل چکی ہے\_\_\_ یہ اشمل خان کی سحر انگیز شخصیت کا کمال تھا یا پھر ریحان پراچہ کی حرکتوں نے اُسے ینگ فیڈریشن سے متنفر کر دیا ہے۔ اس نے اپنی اس سوچ کو سوال کا روپ دے دیا۔

”ریحان پراچہ کی غلط ریپوٹیشن نمایاں ہونے کے باعث آپ نے وہ راستہ بدل دیا ہے یا۔۔۔۔۔ اشمل۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے ہماری پارٹی کی صداقت نے آپ کو رائے بدلنے پر مجبور کر دیا ہے؟“

احسن کی بات پر وہ سٹپٹا گئی۔ مگر ابھی کوئی جواب دینے نہ پائی تھی کہ اشمل خان آفس میں داخل ہوا۔ سرخ سرخ چہرے کے ساتھ۔ اس کی ستواں ناک کے نتھنے غصے سے پھول رہے تھے۔ اس کے ساتھ نعیم جان بھی تھا۔

اس نے زور سے دروازے کو اپنے پشاور کی چیل کی نوک سے دھکیلا تھا۔ ”اتنا بے بس ہے یہ قانون\_\_\_ صاحب عشرت لوگوں کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ گیا ہے۔“ اس کا لہجہ آگ بھرا ہوا تھا۔

”کیا ہوا اشمل خان؟“ احسن گھبرا کر کرسی چھوڑ کر اس کی طرف بڑھا۔

”وہی جو ہوتا آیا ہے اور شاید ہوتا رہے گا۔ اس لئے کہ مفاد پرست لوگوں نے قانون کی وردیاں پہن لی ہیں۔“



”کیا ریحان پر اچہ کورہا کر دیا گیا ہے؟“ ہشمنہ اس کے جملوں سے صحیح نتیجہ اخذ کرتے ہوئے بولی تو اشمل خان نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر زور سے لب بھینچ لئے۔

احسن سنائے میں رہ گیا۔ ”مگر اشمل! ڈی ایس پی منظور احمد نے تو ہمیں یقین۔۔۔۔۔“

”اونہہ! ڈی ایس پی منظور۔۔۔۔۔ اُس سے اوپر کے لوگوں نے اپنا ضمیر بیچ دیا ہے۔“ اُس نے نفرت سے ہونٹ سکڑے اور پھر خود کو کرسی پر گرا لیا۔

اس لمحے اُسے اپنا آپ سخت بے بس اور بے کار محسوس ہو رہا تھا۔ استادوں کی عزت سرعام اچھالنے والے، معاشرے میں بگاڑ پیدا کر کے جامعہ کا نظام درہم برہم کرنے والوں کے لئے کسی قسم کی زنجیریں نہیں ہیں۔ کیسا نظام ہے یہ۔۔۔ کیسے سدھرے گا یہ معاشرہ؟۔۔۔ کیسے تعلیمی ماحول امن میں سانس لے گا؟۔۔۔ قانون نے اپنا وقار بیچ دیا ہے۔ ان کے ہاتھوں میں زنجیریں پہنانے والوں نے خود ان کی دولت اور ان کے اثر و رسوخ کی زنجیریں اپنے ہاتھوں اور پیروں میں ڈال لی ہیں۔“

وہ سخت دل گرفتہ ہو رہا تھا۔ بھوری بھوری آنکھوں میں دُکھ ہلکورے لینے لگا۔

”اشمل خان! آپ اتنی جلدی مایوس ہو گئے۔“ ہشمنہ کے دل پر گھونسا سا لگا۔ اتنا مضبوط شخص اتنی جلدی ڈھے جائے، اُسے یہ کب گوارا تھا۔ ”نہیں اشمل خان! آپ جیسے بلند حوصلہ اور مضبوط کردار کے انسان کو اتنی جلدی مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ یہ تو اچھائی اور رسوائی کی راہ میں آنے والی معمولی رکاوٹیں ہیں۔ برائی ایک نقطہ ہوتی ہے مگر جلد ہی اس کا دائرہ بڑا ہو جاتا ہے۔ مگر سچائی کے دائرے کو وسیع کرنے کے لئے بہت وقت درکار ہوتا ہے اور بہت ہمت، حوصلہ۔ آپ میں یہ ساری خوبیاں ہیں۔ آپ ہی پہلی چوٹ میں ہمت ہار دیں گے تو ان لوگوں کا کیا ہوگا جنہوں نے آپ سے ڈھیروں امیدیں باندھ رکھی ہیں؟ اور جو جامعہ کے مستقبل کا خوش آئند تصور محض آپ کے توسط سے دیکھ

رہے ہیں۔“

وہ اس کے سامنے کھڑی اس کا عزم تازہ کر رہی تھی۔۔۔۔۔ اس کے گرفتہ دل کو تھپک رہی تھی۔

اشمل خان نے اپنی بھاری پلکیں اٹھا کر اس نازک سی مگر باہمت لڑکی کو دیکھا۔ اس لمحے وہ اسے اپنے دل کے بے حد قریب محسوس ہوئی۔

”آپ کے چہرے پر مایوسی کی ہلکی دھند بھی نہیں ہونی چاہئے اشمل خان! اس لئے کہ آپ تو خود شفاف اور روشن راستہ دکھانے والے ہیں۔“ وہ نگاہیں ملنے پر دھیرے سے مسکرائی تو اشمل خان کے لبوں پر بھی دلفریب مسکراہٹ بکھر گئی۔

”اوکے۔۔۔ ٹھیک کہتی ہو تم۔ مجھے اتنی جلدی آپ سیٹ نہیں ہونا چاہئے تھا۔“ وہ کرسی سے اٹھ گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات یکدم بدل گئے تھے۔ رگوں میں کھولتا خون پھر متوازن ہو گیا۔

”احسن! تم تو بے کار ہی میرے دوست بنے ہو۔۔۔۔۔ دوست تو دیکھو، ہشمنہ جیسی ہونی چاہئے۔“ اس نے اپنی جگہ گم صم کھڑے احسن پر چوٹ کی اور پھر ہشمنہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جانے کیسے رنگ تھے کہ ہشمنہ کی دراز پلکیں سحر انگیز آنکھوں پر سایہ فگن ہو گئیں۔

”ہاں، ہاں، ہاں۔ جب نئے دوست بنتے ہیں تو پرانوں میں سو کیڑے نظر آتے ہیں۔“ احسن کھسیا ہٹ اور قدرے ناراضگی سے اشمل خان کو گھورنے لگا۔

نعیم جان زور سے ہنس پڑا۔

”دیکھیں۔۔۔ دیکھیں مس ہشمنہ! حاسدوں کے چہرے ایسے ہی ہوتے ہیں۔“ اس نے احسن کے چہرے کو

دیکھتے ہوئے اپنی ہنسی بمشکل روکی۔ ”ابھی سے آپ سے جیلیں ہو گیا۔“

”تو اس میں جیلیں ہونے کی کیا بات ہے؟“ احسن جلدی سے بولا۔ ”میری جو حیثیت اشمیل کے دل میں ہے، وہ مقدم ہے۔ اور مس ہشمنہ کی حیثیت وہ نہیں، جو میری ہے۔ میرا مطلب ہے کہ میں تو اس کا دوست ہوں اور یہ۔۔۔۔۔۔“

”احسن!“ اشمیل خان نے بالکل اچانک قدرے تیز آواز میں اس کا جملہ کاٹ دیا۔ احسن کی معنی خیز مسکراہٹ نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ آگے کیا کہنے والا تھا۔

”میرا شاید پیریڈ شروع ہو گیا ہو گا۔ میں چلتی ہوں۔“ ہشمنہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کے دل کی رفتار یک دم غیر ہموار سی ہو گئی تھی۔ وہ بہر حال اتنی کم فہم، سادہ لوح ہر گز نہ تھی کہ احسن کے معنی خیز تبسم اور اس کے ادھورے جملے کا مفہوم نہ سمجھ پاتی۔

اس کے جاتے ہی نعیم جان بھی اپنا پیریڈ لینے چلا گیا جبکہ اشمیل بگڑے تیوروں کے ساتھ احسن کی طرف بڑھا۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے فضول انسان ہو احسن! کم از کم کچھ کہنے سے پہلے سوچ تولیا کرو۔ ورنہ خاموش ہی رہو۔“

”ارے واہ۔۔۔۔۔۔ میں کیوں فضول ہونے لگا؟ صرف اس لئے کہ تمہارے دل کے اندر تک جھانک آیا ہوں یا اس لئے کہ۔۔۔۔۔۔“

”نہیں۔۔۔۔۔۔ اس لئے کہ تم ساری غلطیوں کو اس کرتے ہو۔ سراسر فضول اور بے کار باتیں جو کوئی معنی نہیں رکھتیں۔“

”ہا۔۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔۔۔“ احسن کا ہتھکڑی چھت کو پھاڑے دے رہا تھا۔ اشمیل خان نے لب بھینچ کر غصے سے اسے

دیکھا۔

”ارے یار! محبت تو آنکھوں، لہجے، مسکراہٹ اور انداز سے پہچان لی جاتی ہے۔ کس کس پر پردہ ڈالو گے؟ مسکراہٹیں چھپالو گے، لہجہ بدل لو گے۔ مگر ڈیز! آنکھیں کہاں چھپائو گے جو ہر راز طشت از بام کرنے پر تلی ہوئی ہیں؟“

احسن کی بات پر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

”کیا احسن واقعی ٹھیک کہہ رہا ہے؟۔۔۔۔۔۔ اس کی آنکھیں کیا اس کے دل کی بدلتی حالت کی غمازی کر رہی ہیں؟۔۔۔۔۔۔ کیا ہشمنہ ابرار کو دیکھ کر رگوں میں مچلتے خون میں جو تیزی آ جاتی ہے اس کو یہ آنکھیں ظاہر کر دیتی ہیں؟۔۔۔۔۔۔ اگر نہیں تو پھر یہ احسن۔۔۔۔۔۔ اُف خدا یا۔۔۔۔۔۔ اُس نے جلدی سے رخ موڑ لیا اور الماری کی طرف بڑھ گیا۔“

”احسن! اس وقت میں تمہاری فضول بکواس سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ پلیز، میں بے حد سیریس ہوں۔“ اس نے ترشی سے کہا۔ ”ریحان پر اچہ اور اس کے ساتھیوں کی رہائی نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔“ اس نے یہی ہتھیار استعمال کر کے احسن کی زبان کو لگام دے دی۔

”ہاں واقعی۔۔۔۔۔۔ مسئلہ تو ذرا ٹیڑھا ہے۔ اگر ریحان پر اچہ اس طرح کے کام کر کے رہا ہو جاتا ہے تو جامعہ کے امن و امان کے لئے سنگین خطرہ ہے۔“

”ریحان پر اچہ نے سر حیدر کے کڈنیپ کے منصوبے سے پہلے ہی ہشمنہ کو آگاہ کر دیا تھا۔“ اس نے چند فائلیں میز پر رکھ کر احسن کی طرف دیکھا۔

”کیا۔۔۔۔۔۔ احسن اچھل پڑا۔“

”ہاں۔۔۔۔۔۔ وہ اس کی سیکرٹری تھی اور مجھے ہشمنہ ہی نے بتایا تھا۔ ہمارے شک کو یقین میں بدلاتھا۔ مگر اب یہ مسئلہ پیدا ہو

سکتا ہے۔“ وہ ہنوز سنجیدہ تھا۔ احسن تو کئی لمحے آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھتا رہا۔

جس وقت مجھے ہشمنہ نے یہ بات بتائی تھی، اس وقت سکندر، لالہ زار میں اپنی فیملی کے ہمراہ آیا تھا اور میرے خیال میں ہم دونوں کو اس نے دیکھ لیا تھا۔“

”کیا۔۔۔ کیا۔۔۔ یعنی تم اس دن لالہ زار میں ہشمنہ سے ملنے گئے تھے؟“ احسن پر تو یکے بعد دیگرے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹے گئے۔

”ہاں۔۔۔“ اشمیل کے لبوں کی تراش میں مدہم سی مسکراہٹ بکھری اور پھر جلد ہی سمٹ گئی۔ ”میں بہت پریشان ہوں۔ اگر ریحان پر اچہ کے علم میں یہ بات آگئی کہ مجھ سے ملاقات میں

ہشمنہ نے اس کے منصوبے سے آگاہ کر دیا ہے تو پھر۔“

احسن بھی پریشان سا ہو گیا۔

”وہ ہشمنہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔ اس سے کچھ بعید نہیں احسن! اُس کی شہرت اس معاملے میں کوئی اچھی نہیں ہے۔“ اس کی کشادہ پیشانی پر شکنوں کا جال پھیل گیا تھا۔ یہ بات اس کے ذہن میں ہشمنہ کے افس سے نکلنے ہی درآئی تھی اور وہ پریشان سا ہو گیا تھا۔ اس نے یہ کہہ کر احسن کی جانب دیکھا جو گہری سوچ میں گم ہو گیا تھا۔

”کیوں نہ ہم قبل از وقت ہشمنہ کو باخبر کر دیں۔“ اس نے کچھ توقف کے بعد سراٹھا کر کہا۔

”ارے نہیں۔۔۔ محض ایک وہم پر اُسے پریشان کیا کرنا۔“ اشمیل خان نے اس کی تجویز کی نفی کر دی اور پھر ایک

گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”خیر چھوڑو۔ ارے ہاں، کامران نیازی میرے پاس آیا تھا۔ جانتے ہونا تم اُسے؟

ایم اے کا خاصا ہونا ہار لڑکا ہے۔“

”ہاں۔۔۔“ احسن نے سر ہلایا۔

”اس کی کچھ مالی پریشانی ہے۔ یہ فائل لو اور اس کا نام درج کر لو اور خود ہی اس سے مل کر اس کی فیس وغیرہ کا مسئلہ حل کر دینا۔“ وہ احسن کو تاکید کرتا ہوا افس سے باہر نکل گیا۔ تبھی اکنا مکس ڈیپارٹمنٹ کے کوریڈور میں اُسے پروفیسر محبوب مل گئے۔

”کہاں ہوتے ہوینگ بوائے؟ نظر ہی نہیں آتے۔“ اس کے سلام کے جواب میں پروفیسر محبوب کے ہونٹوں پر شفیق مسکراہٹ بکھر گئی۔

”سرس۔۔۔۔۔ بس کچھ مصروفیت بڑھ گئی ہے۔ آپ کی خدمت میں حاضری نہیں دے سکا۔ سر حیدر کے انغواء نے بہت ڈسٹرب کر دیا تھا۔“

”ہاں، ہاں۔۔۔ یہ حیدر کے ساتھ بہت برا ہوا۔ دیکھ لو، یہ معلمی کا پیشہ بھی اب جان جو کھوں کا کام ہو کر رہ گیا ہے۔“ پروفیسر محبوب کے لہجے میں تاسف تھا۔ ”لیکن بیٹا! اچھے لوگوں کو ہمت نہیں ہارنا چاہئے۔ تم بہت اچھے لڑکے ہو۔ اب تم نے بالکل ٹھیک جگہ سنبھال لی ہے۔ اگر چند لڑکے تم جیسے اور مل جائیں تو جامعہ کا ماحول ایک بار پھر بہتر ہو جائے۔ بس خدا تمہیں پریشانیوں سے بچائے رکھے۔“

”سر! مسائل تو پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ بس دعا کریں کہ ہم میں ان سے نبرد آزما ہونے کی ہمت برقرار رہے۔“

”اوہ، یس۔۔۔ وائے ناٹ۔ آئی ویش یو گڈ لک۔ ارے ہاں۔۔۔ میں تمہیں ایک مسئلے سے آگاہ کرتا ہوں۔ لڑکوں

نے حامد عثمانی کی کلاس کا بائیکاٹ کیا ہوا ہے۔ بھئی اس بگڑی ہوئی صورت حال کو سب سے پہلے کنٹرول کرو۔“

”جی سر!۔۔۔ میں نے بھی اس بارے میں سنا تو ہے۔ مگر سر! میرا خیال ہے یہ اتنا غلط بھی نہیں ہے۔ میں سر حامد

عثمانی کی بے حد عزت کرتا ہوں۔ اس لئے کہ وہ ہمارے محترم استاد ہیں۔ لیکن سر! گستاخی معاف، فلاسفی ایک مشکل



اور اہم سبجیکٹ ہے۔ میں مانتا ہوں سر حامد عثمانی بے حد ذہین استاد ہیں۔ مگر میرے خیال میں نہ تو وہ اس سبجیکٹ پر محنت کر رہے ہیں نہ ہی اسٹوڈنٹس کو صحیح ٹائم دے رہے ہیں۔ جو اسٹوڈنٹس پڑھنا چاہتے ہیں انہیں یقیناً ان کی خواہش کے مطابق استاد ملنا چاہئے جو انہیں مطمئن کر سکے۔“ اس نے بے حد دلیرانہ انداز میں حق بات کہہ دی تو پروفیسر محبوب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”تم واقعی دلیر اور مضبوط لیڈر ہو۔۔۔ تم جیسے حق بات کہہ دینے والے نوجوانوں کی ہی ہمارے ملک کو ضرورت ہے۔ ٹھیک ہے، میں یہ مسئلہ وائس چانسلر تک پہنچا دوں گا۔ ویسے مجھے امید ہے اب یہ مسئلہ ضرور حل ہو جائے گا۔ یونین کے دباؤ پر۔“ سر محبوب نے آخری جملہ مسکرا کر کہا۔

”ہمارا مطلب کسی استاد کی دل آزاری کرنا نہیں ہے سر! مگر یہ ضرورت ہے اسٹوڈنٹس کی۔ اور پھر یہ تو خوش آئند بات ہے کہ وہ اپنی پڑھائی کے بارے میں کافی سنجیدہ ہیں۔ پھر استاد کو بھی شاگردوں کے قلب میں تھوڑی وسعت پیدا کر لینی چاہئے۔“ اس نے اپنا نقطہ نظر بیان کیا۔

”بالکل۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ عثمانی اس بات کو زیادہ مانتے نہیں کریں گے۔“ سر محبوب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یقیناً سر!۔۔۔ اچھا سر! اب اجازت دیجئے۔“ اس نے سر تسلیم خم کر کے مسکرا کر پروفیسر محبوب کو پہلے آگے بڑھنے کا راستہ دیا اور پھر خود دوسری طرف مڑ گیا۔

...☆☆☆...

وہ اپنے آپ کو بمشکل گھسیٹتی ہوئی کمرے تک لائی تھی۔ پورا بدن پسینے سے بھیگ چکا تھا۔ اس نے چھت کے پتکھے کو ایک نظر دیکھا۔ اسی لمحے اس کا جی چاہا، وہ دوپٹہ باندھ کر لٹک جائے۔ اُف۔۔۔۔۔ ایسی رسوائی۔۔۔۔۔ اتنی بے اعتباری۔ اس حد تک نامعتبر ٹھہرا دی گئی تھی وہ۔ مریوں نہ گئی اسی لمحے جب فروان کی آنکھوں میں اجنبیت کا پہلا

تاثر اُبھرا تھا۔ اور اب ماہی آپنی سوالیہ نظروں سے اُسے تک رہی تھیں۔ مگر اُسے لگ رہا تھا جیسے ان کی نگاہیں تلوار بن گئی ہوں اور سیدھی اس کے دل کے آر پار ہو رہی ہوں۔ اُس نے اپنی لال لال درد سے تپتی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور پھر جھکا دیں۔

”فروان نے جو کچھ۔۔۔۔۔ آ۔۔۔۔۔ آپ سے کہا ہے بخدا وہ سب کچھ غلط ہے۔“

”میں صرف تمہارے منہ سے سننے آئی ہوں۔ فروان نے مجھے جو کچھ بتایا ہے اس میں کتنی صداقت ہے، یہی پوچھنے آئی ہوں۔“ ماہ گل کے لہجے میں ہمیشہ کی طرح حلاوت نہ تھی بلکہ بے حد اجنبیت اور کٹھور پن تھا۔ سحر گل کا دل کرچی کرچی ہو گیا۔

”آپی۔۔۔۔۔“ اُس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر چکر اکر دوبارہ لڑھک گئی۔

”سحر! کیا تم اتنی پستی میں گر سکتی ہو؟ تمہارے قدم اتنے کمزور تھے کہ غلط راستوں پر اٹھ گئے؟ نہیں سحر! میرا دل نہ جانے کیوں یقین کرنے کو تیار نہیں ہو رہا۔“ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”آ۔۔۔۔۔ پی! اس دل کو یقین کرنے بھی مت دیجئے گا خدا را۔ آپ کے علاوہ اور کون ہے جو میری بے گناہی کی گواہی دے گا۔“ وہ بے اختیار اس کے شانے پر سر رکھ کر سسکا اٹھی۔ ماہ گل نے اُسے رونے دیا۔ پھر دھیرے سے بولی۔

”مجھے سب کچھ بتا دو سحر۔۔۔۔۔ سب کچھ۔ مگر بالکل سچ سچ۔ ایک حرف بھی جھوٹ نہ ہو۔ بتاؤ سحر!“ ماہی آپنی نے اس کا سر ہولے سے تھپکا۔ ”تم نے آج تک مجھ سے جھوٹ نہیں بولا۔ آج بھی میرے اس اعتماد اور اعتبار کا بھرم رکھ کر بتانا۔“

اُس نے اپنی سرخ آنکھیں اٹھا کر اپنی شفیق اور محبت کرنے والی آپنی کو دیکھا اور پھر سر جھکا کر دھیرے دھیرے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ منصور کا کہا ہوا ایک ایک لفظ۔ فضہ کا دھوکا۔۔۔ اور اپنی حماقت۔۔۔ اُس نے سب کچھ کھول کر

ماہی آپنی کے سامنے رکھ دیا۔

”میں قسم کھا کر کہتی ہوں آپنی! میں نے تو اس گھر کی عزت کی خاطر قدم باہر نکالا تھا کہ اس شخص کو واسطہ دے کر میں ایسی حرکتوں سے باز رکھ سکوں۔ یقین جانئے، میرا اور کوئی مقصد نہیں تھا۔“ وہ ایک بار پھر رونے لگی۔

ماہ گل دُکھ کے گہرے احساس کے ساتھ کتنے ہی لمحے گم صم اُسے دیکھتی رہ گئیں۔ ان کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت رہ گئیں۔ ایک گہری تھکن ان کی نس نس میں سرایت کر گئی۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہ کیا کہہ دیا سحر! تو نے۔ اس قدر بے خوف ہو کر۔۔۔ مجھے اندازہ نہیں تھا۔ کیوں چھپایا تم نے یہ سب کچھ مجھ سے؟“ انہوں نے بے بسی سے لب کاٹتے ہوئے کہا اور پھر بیڈ کے کنارے سے اٹھ کر اضطرابی انداز میں اپنے ہاتھ مسلتی ہوئی اسے دیکھنے لگیں۔

”تم نے اپنے آپ کیسے اخذ کر لیا کہ میرے پاس اس مسئلے کا کوئی حل نہیں۔ اور تمہارا یہ اقدام کون سا اچھا حل ہے بے وقوف لڑکی!“ انہیں اب غصہ آگیا۔ ”سچ پوچھو تو سحر! میں نے آج تک اتنی احمق لڑکی نہیں دیکھی۔ فرض کرو، اگر خدا نخواستہ اس گھر کی عزت پر حرف آجائے، تمہاری یہ نادانی تمہیں لے ڈوبتی پھر؟“

”خدا نہ کرے آپنی!“ سحر تڑپ اٹھی۔ ”اب کیا ہو گا آپنی!۔۔۔“ وہ مایوس ہونے لگی اور پھر نڈھال سی ہو کر گٹھنے پر سر رکھ دیا۔ ”کتنی نامعتبر ہو گئی ہوں آپنی! ناکردہ جرم نے مجھے کتنا سوا کر ڈالا۔۔۔ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی گناہ گار ہوئی ہوں۔ کون کرے گا اب میری پارسائی کا یقین۔ کیسے فروان کی نگاہوں کا سامنا کر سکوں گی؟ اس کے دل نے تو مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بے اعتبار بنا ڈالا۔ کاش۔۔۔ کاش موت آجائے ابھی اور اسی وقت۔“ وہ رو دی۔

”سحر۔۔۔!“ ماہ گل کا دل خون ہو گیا۔ اس نے اس کے قریب بیٹھ کر اُسے گلے سے بھینچ لیا۔ یہ اس کی چھوٹی اور معصوم بہن جو فرشتوں جیسی پاکیزہ ہے، اس کے شفاف دامن پر کیوں کر حرف آئے۔ اسے ناکردہ جرم کی سزا کیوں

ملے۔ ابھی تو اس نے زندگی کی رنگینی میں قدم رکھا ہے۔ ابھی تو اس نے خوشیوں کی تیلیوں کو چھونا ہی سیکھا ہے، قید نہیں کیا۔ پھر ابھی سے کیوں اس کے مقدر میں ایسے دُکھ رقم ہو جائیں۔ یہ تو بے گناہ ہے۔ پھر اسے کیونکر تارکیاں ملیں۔

”نہیں۔۔۔ نہیں سحر! فروان تو جذباتی ہے۔ اُس کی آنکھوں پر صرف غلط فہمی کا پردہ اڑا ہے جو اتر جائے گا۔“ ماہی نے اُسے محبت سے تسلی دی۔

”سچ آپنی! کیا فروان میری بے گناہی کا یقین کر لے گا؟“ اس نے بے یقینی سے ماہ گل کو دیکھا۔

”ہوں۔۔۔۔۔ بالکل۔۔۔۔۔ اُسے یقین کرنا پڑے گا۔ اُسے یہ ہر گز حق نہیں پہنچتا کہ تمہارے معصوم وجود پر کوئی شبہ بھی دل میں لائے۔ وہ ابھی نادان ہے، چھوٹا ہے۔ یہ جو بھائی ہوتے ہیں ناسحر! یہ بہنوں کو اپنی عزت سمجھتے ہیں۔ غیرت مند ہوتے ہیں اس لئے ایسے معاملوں میں بہت جذباتی ہو جاتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ معاشرے کی کوئی غلاظت ان کی دہلیز کو نہ چھو پائے۔ محافظ ہوتے ہیں نا بہنوں کے۔ تم دل چھوٹا مت کرو۔۔۔ میں اُسے سمجھاؤں گی۔ تمہیں تو وہ بہت چاہتا ہے۔ بہت پیار کرتا ہے تم سے۔ پھر بھلا کیسے تمہاری بے گناہی کا یقین نہ آئے گا۔“ ماہ گل نے اُسے دیکھا اور پھر نرم نرم رخساروں کو اپنے ہاتھ سے صاف کیا۔

”آئندہ ایسی نادانی کبھی مت کرنا۔۔۔ تم آگ کی طرف بڑھی تھیں۔ صد شکر کہ جلنے سے بچ گئیں۔ یہ مرد ہوتے ہی ایسے ہیں۔ چالاک، عیار۔ خوبصورت لفظوں کی ان کے پاس کمی نہیں ہوتی۔ اور ایسے لڑکے تو لہجوں اور نگاہوں سے نادان لڑکیوں کو اسیر کرنا جانتے ہیں۔ اور جب کوئی معصوم مگر مضبوط کردار کی لڑکی سے مقابلہ ہوتا ہے تو اونچھے ہتھکنڈوں پر اتر آتے ہیں اور بلیک میل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ان سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ بڑوں کو ضرور آگاہ کرنا چاہئے۔ کمزوری کا کوئی پہلو انہیں نہیں دکھانا چاہئے۔ تم نے مجھے نہ بتا کر بڑی غلطی کر دی۔ مگر خیر، آئندہ خیال

رکھنا۔“

”ماہی آپ! بس فروان کی نگاہوں اور دل میں میرے لئے وہی اعتبار، وہی پیار لوٹادیں۔ میری وہی پارسائی۔۔۔۔۔“  
فروان کی سلگتی نگاہوں کا تصور کر کے وہ ایک بار پھر بکھرنے لگی۔

ماہ گل نے اس کے بوجھ کو کسی حد تک کم کر دیا تھا۔ مگر فروان تو قتلِ عمد پر تیار تھا۔ اس نے ماہ گل کو ملتی نظروں سے دیکھا

”آ۔۔۔۔۔ آپ فروان سے۔۔۔۔۔“

”میں نے کہانا۔۔۔۔۔ وہ کیونکر تمہاری بے گناہی کا یقین نہیں کرے گا۔ اب تم اپنے آپ کو سنبھالو۔ دیکھو، ابھی گھر کے دوسرے افراد جو ابھی تک لاعلم ہیں ایسا نہ ہو کہ بات پھیل جائے اور پھر فردِ آفرد آسب کو مطمئن کرنا پڑے۔“ ماہ گل نے کہا تو سحر گل سہم گئی اور دوپٹے کے کنارے سے جلدی جلدی بھیگا چہرہ رگڑنے لگی۔ اُسے تو یہ خیال ہی نہ رہا تھا کہ اس گھر میں دوسرے افراد بھی ہیں۔ اور پھر ایسی باتیں تو تند و تیز ہوا میں نازک تنکے کی طرح ہوتی ہیں جو اڑ کر نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہیں۔

ماہی آپ نے اس کے زخموں پر بہت نرمی سے مرہم رکھا تھا۔ وہ جان لیوا دکھ جو کچھ دیر قبل اُسے خود کشی پر اکسا چکا تھا، کتنا ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ اس کے بے قرار دل کو کتنی تقویت ملی تھی۔ اتھل پتھل دل میں ٹھہراؤ آگیا تھا۔ مگر اب بھی ایک تھکن تھی، ایک خوف سینے کی تہہ سے آزاد نہ ہو رہا تھا۔

”نہ جانے فروان، ماہی آپ کی بات پر یقین لاتا بھی ہے یا نہیں۔“ اُس نے آپ کی کو باہر جاتے دیکھ کر سوچا۔

ماہ گل اس کے کمرے سے نکل کر فروان کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ مگر کمرہ خالی تھا۔ فروان گھر میں موجود نہیں تھا۔

”فروان دیر سے آنے کا کہہ کر گیا ہے۔۔۔۔۔ شاید اُسے کوئی ضروری کام تھا۔“ شاردابھابی نے اُسے بتایا اور وہ سوچ کر رہ گئی کہ یقیناً وہ اتنا پ سیٹ ہے کہ فرار کی راہ ڈھونڈ رہا ہے۔ مگر فروان! تمہیں اب سکون اس وقت ملے گا جب دل کا بوجھ ہلکا ہو گا۔ اور یہ بوجھ اصل حالات جان کر ہلکا ہو گا۔“

”کوئی ضروری کام تھا فروان سے؟“ بھابی نے اُسے منتظر دیکھ کر کچن کی طرف جاتے جاتے رک کر پوچھا تو وہ چونک گئیں۔

”آ۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ نہیں، کوئی خاص کام تو نہیں۔ بس گڈ وکوز کام ہو گیا ہے۔ وہ ہوتا تو ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔“ اس نے شاردابھابی کی کھوجتی نگاہوں کو دیکھ کر جلدی سے بہانہ بنایا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ آئس کریم بھی بہت کھاتا ہے نہ۔ کل زمان بھی لے گئے تھے۔ میں نے منع بھی کیا کہ ماہی نے اسے آئس کریم کھانے کو منع کیا ہے پر وہ نہیں مانے۔ موسم بھی ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ میں جو شانہ بنادوں؟“ انہوں نے جلدی سے پیش کش بھی کر دی۔ انہیں اپنے بھائی مسعود شاہ کا بیٹا دل و جان سے عزیز تھا۔ اور وہ تو تھا بھی اتنا پیارا، خوبصورت، صحت مند اور خوب شرارتی۔ اور پھر شاردابھابی خود اولاد جیسی نعمت سے ابھی محروم تھیں۔ بلکہ انہیں محروم رہنے کی سزا دے دی تھی زمان خان نے۔

”میں ابھی بنادیتی ہوں جو شانہ۔ یوں چٹکی بجاتے ہی زکام غائب ہو جائے گا۔“ وہ ماہ گل کو خاموش پا کر بولیں اور ان کا جواب سنے بغیر کچن میں چلی گئیں۔ ماہ گل نے کوئی تردد نہیں کیا۔ وہ ذہنی طور پر بہت اپ سیٹ تھی۔ اور اس کا ذہن فروان ہی میں الجھا ہوا تھا۔ وہ اتنے غصے میں اور منتشر ذہن کے ساتھ نکلا ہے باہر۔۔۔۔۔ خدا اُسے خیر سے رکھے۔

رات کو ڈنر پر بھی فروان نہیں آیا۔ ماہ گل بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔ پھر نہ جانے کتنی رات ہو گئی۔ رات کے کوئی



بارہ بجے کے قریب وہ گھر واپس آیا۔ ماہ گل لان میں ہی بیٹھی تھی۔ فروان نے لان کے راستے اندر بڑھنا چاہا تو ٹھٹک گیا۔

”آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟“ وہ ان کے قریب آیا۔

”ہاں۔۔۔ تمہارا انتظار کر رہی تھی۔“ وہ کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی اور اس کی طرف بڑھیں۔

”میرا انتظار؟“ وہ متعجب ہوا۔

”ہاں۔۔۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ کس موضوع پر، یہ تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔“ فروان کے لب بھینچ گئے۔

”میں اس موضوع پر اب کوئی بات نہیں سننا چاہتا۔“ اس نے تند لہجے میں کہا اور پلٹ کر اندر کی طرف بڑھنے لگا۔

”فروان۔۔۔“ ماہ گل کا لہجہ تیز اور تحکم آمیز ہو گیا۔ ”بہنیں اگر بڑی بھی ہوں تو بھائیوں کے اونچے قد کے سامنے، ان کے رتبہ کے سامنے چھوٹی لگتی ہیں۔ مگر ضروری نہیں کہ ان کی باتیں اس قابل نہ ہوں کہ سنی نہ جائیں۔“

”آپی۔۔۔“ وہ زچ ہو گیا۔ ”میں بہت تھک گیا ہوں۔ اور میں سونا چاہتا ہوں۔“

”نہیں۔۔۔ میں جانتی ہوں تمہیں اس وقت نیند نہیں آئے گی۔“ انہوں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا جہاں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ ”یہ جو تم اپنے دل پر بوجھ لئے فرار کی راہ ڈھونڈنے کی سعی میں ہو، ذہن پر چھائے اس عفریت سے نجات پانے کی کوشش میں ہو۔ مگر اس پریشانی کا حل نہ گھر سے باہر ہے نہ سڑکوں پر۔ اس کا حل یہیں، اسی گھر میں ہے۔ میری باتوں میں ہے۔ اگر تم توجہ سے سنو تو۔ آؤ میرے ساتھ کمرے میں۔“ ماہ گل نے کہا اور آگے بڑھ گئی تو وہ بھی بادلِ خواستہ ان کے پیچھے چلا آیا۔

ماہ گل اپنے کمرے میں آئیں تو بیڈ کے کنارے پر گڈو گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اس نے ٹیبل لیمپ آن کر دیا اور فروان کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود پلنگ کی پائنٹی پر بیٹھ گئی۔

”فروان! تمہارا غصہ اپنی جگہ درست تھا۔ تمہاری یہ پریشانی بجا ہے۔ مگر ہم نے جو نتیجہ اخذ کر لیا ہے وہ ہر گز نہیں ہے۔ سحر گل اتنی قصور وار نہیں ہے جتنا تم نے سمجھ لیا ہے۔ خدا نے ہماری عزت کی لان رکھ لی ہے فروان!“ انہوں نے رات کے سکوت کا احساس کرتے ہوئے آواز کو قدرے آہستہ رکھتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ آپ سچ کہنے کے لئے۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔ میں نے صرف سچ کہنے کے لئے تمہیں بلایا ہے اور تمہیں سننا ہے ہر حال میں۔“ ماہ گل نے اس کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”فروان! تمہیں یہ حق ہر گز نہیں کہ تم بغیر ثبوت کے اتنا کیک الزام لگا دو۔ تمہیں پہلے پوری صورتِ حال کو جاننا چاہئے کہ معاملہ کیا ہے۔“ وہ ایک لمحے کو رک گئیں۔

فروان دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پیوست کئے مضطرب سا بیٹھا تھا، یکدم کھڑا ہو گیا۔

”تو پھر مجھے بتائیے وہ کہاں گئی تھی اور کہاں سے بھاگ کر نکلی تھی؟ کیوں وہ اتنی خوفزدہ تھی؟ کیوں اس نے میری کسی بات کو رد نہیں کیا؟ صفائی میں ایک لفظ نہ بول پائی۔“

”آہستہ فروان!“ انہوں نے جلدی سے اُسے وقت کی نزاکت کا احساس دلایا۔ ”میں نہیں چاہتی کہ یہ بے بنیاد بات زیادہ پھیلے۔“ ان کے لہجے میں برہمی تھی۔ فروان نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

”فروان! اگر کسی انسان پر کوئی غیر متوقع الزام لگا دیا جائے، ایسا الزام جو اس شخص کے لئے بے پناہ ذہنی کا باعث ہو تو سارے لفظ گرفت سے نکل جاتے ہیں۔ زبان ایسے حادثے میں گنگ رہ جاتی ہے اور قوتِ گویائی سلب ہو کر رہ جاتی ہے۔ خاص کر جب الزام لگانے والا اس کا سگا ہو۔ اور پھر حالات بھی خود بخود ایسے ہو جائیں کہ اس کی باتوں کو غیر یقینی

بنادیں تو خاموش رہنا مجبوری ہو جاتی ہے۔ سحر بھی اپنی صفائی میں تم سے اس لئے کوئی لفظ نہ کہہ سکی تھی کہ اس وقت جو حالات تھے انہوں نے اس کے حق میں سارے لفظوں کو بے حیثیت بنادیا تھا۔ اُس کی اپنی قوت گویائی بھی تمہارے غصہ اور اچانک عمل نے سلب کر دی۔ جانتے ہو، وہ تو اس گھر کی عزت کو بچانے کے لئے نکلی تھی۔ مگر تم نے اُسے گناہ گار بنا ڈالا۔

”آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔۔۔ پلیز کھل کر کہئے۔“ فروان کے پلے کچھ بھی نہ پڑ رہا تھا۔ وہ اور بھی الجھ رہا تھا۔

”پہلے میری ایک بات سن لو فروان! بہنیں اس لئے بھائیوں کو کبھی اپنے راز میں شریک نہیں کرتیں کہ وہ کمزور پر ہی اُلٹ پڑتے ہیں۔ نام نہاد غیرت و حمیت کے جوش میں مجرم کے ساتھ ملزم کو بھی پیٹ ڈالتے ہیں۔“ ماہ گل کا لہجہ کڑوا ہو گیا۔ اسی لمحے اس کی آنکھوں کے سامنے مسعود شاہ کا سراپا لہرایا جو اپنی نام نہاد غیرت کے زعم میں اُسے روند گیا تھا۔

”میں سب جانتی تھی۔ منصور ہے اُس لڑکے کا نام جو سحر گل کو کافی عرصے سے پریشان کرتا رہا ہے۔“

”کیا۔۔۔ کون؟۔۔۔ آپ نے مجھے نہیں بتایا۔“ فروان ایک دم اُچھل پڑا۔

”سنو پہلے میری بات۔“ میں نے اُسے روک دیا۔ ”وہ بات آئی گئی ہو گئی تھی۔ سحر نے گھبرا کر مجھے بتادیا تھا۔ اس لڑکے نے فضول ساخت جبراً اُسے دے دیا تھا مگر سحر ایگزام ہو جانے کے بعد گھر میں مقید ہو گئی تو ہم دونوں مطمئن ہو گئے کہ اب وہ بلا خود بخود ٹل جائے گی۔ مگر یہ ہماری خام خیالی تھی۔ وہ لڑکا گھرتک آگیا اور سحر نے مارے خوف کے مجھے یہ بات نہیں بتائی کہ اس لڑکے نے دھمکی دے کر ملاقات کی فرمائش کی ہے۔ خود اس کی دوست فضلہ کے گھر پر۔ بس یہی اس سے سب سے بڑی غلطی سرزد ہو گئی۔ جانتے ہو فروان! اُس نے مجھ سے کیوں چھپایا؟“ انہوں نے فروان کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں دُکھ کے جالے دبیز ہو گئے۔

”اس خوف سے کہ اس کا تدارک میں فروان یا زمان بھائی کے ہاتھوں کروں گی اور وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ بات بھائیوں کے علم میں آئے۔ یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے فروان! کہ بھائی یوں تو بہنوں کے محافظ بنتے ہیں مگر جہاں کہیں ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں وہ سدا بہنوں کو قصور وار جان کر ان کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بہن بے قصور ہے۔ یہ دنیا مردوں کی ہے۔ مرد ہزار چالیں چل کر معصوم لڑکیوں کو نہ جانے کیسے کیسے لفظوں میں اسیر کرتے ہیں۔ اگر مرد اپنی اونچی چھت سے لڑکی کو تاکتا ہے تو قصور تو مرد ہی کا ہوتا۔ جبکہ تم بھائی اس شخص کی آنکھیں پھوڑنے کی بجائے بہنوں پر پابندیاں شدید کر دیتے ہو۔ ان کے آگے ہزار پردے ڈال دو گے کہ وہ خود اپنی نظروں میں مجرم بن جائیں گی۔ سارا مسئلہ یہیں سے شروع ہوتا ہے فروان!“ ماہ گل کی آواز رندھ گئی۔ انہوں نے چہرہ جھکا لیا۔

”اس گھر میں عورت کو مرد کے ہاتھوں دُکھ مل رہے ہیں۔ یہ عورت کا المیہ نہیں تو کیا ہے۔“ انہوں نے سراٹھا کر فروان کو دیکھا۔ وہ مضطرب سا نہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

”سحر کو بھی اسی خوف نے یہ غلط قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ وہ اس لڑکے کو اس حرکت سے باز رہنے کا واسطہ دینے لگی مگر پھر اسے آگے بڑھتے دیکھ کر فرار چاہا۔ اُسے وہاں سے تو فرار مل گیا مگر گلی میں نکلتے ہی تم نے اس کے اپنے ہوتے ہوئے بھی اس کی راہیں مسدود کر دیں۔ اُسے ایک نئے کرب میں ڈال دیا۔ بجائے اس کے کہ مجرم کو سزا دیتے، تم اسے ہی ختم کر دینے نکلے۔ پھر بھائیوں پر کیسا مان، تحفظ کا کیسا احساس جاگے جب تم بغیر تحقیق ہی اُسے مرنے مارنے پر تل گئے۔ اُسے گھر کی چھت کے نیچے ہی رسوا کرنے کے درپے ہو گئے۔“

”آپنی! سحر واقعی بے قصور ہے؟“ فروان کی کیفیت عجیب سی ہو گئی۔ وہ ماہ گل کے قریب آکر اس کے گھٹنوں کے پاس بیٹھ کر انہیں بے یقینی کے سے انداز میں دیکھتا رہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ہاں فروان! نہ صرف بے قصور ہے بلکہ فرشتوں جیسی پاک اور معصوم۔ اُسے تو تم پر بڑا مان ہے۔ اُسے تو ہمیشہ سے یہ زعم رہا تھا کہ تم اسے اچھی طرح جانتے ہو۔ ذہنی ہم آہنگی ہے۔ ایک ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے ہو۔ وہ تو ہمیشہ یہ کہتی تھی کہ مجھے کوئی سمجھے نہ سمجھے، فرو مجھے سمجھتا ہے۔ ہم دونوں کچھ کہے بنا بھی ایک دوسرے کی بات سمجھ لیتے ہیں۔ پھر۔۔۔ پھر فروان! تم نے اس کو کیوں اتنی اذیت دی؟“ انہوں نے اس کے ریشمی بالوں میں ہاتھ پھیر اور بے آواز رو دیں۔

”اوہ خدایا۔۔۔ مجھے یہ سب خبر ہوتی تو بخدا میں ایسی حرکت کامر تکب ہر گز نہ ہوتا۔ مجھے معاف کر دیں آپنی۔۔۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دیں۔“ وہ بچوں کی طرح ہلکا اٹھا۔

”ارے پاگل ہو تم تو۔۔۔ چلو اٹھو۔“ ماہ گل اس کے یوں رونے پر بے قرار ہو گئی اور اُسے کندھوں سے تھام کر کھڑا کیا۔

”آپنی! میں ابھی سحر سے معافی مانگتا ہوں۔“ وہ پلٹ کر کمرے سے نکلنے لگا تو ماہ گل نے اُسے روک دیا۔ اس کے دل سے اتنی وزنی سل لڑھکتی چلی گئی۔ فروان کے چہرے پر چھائی ندامت

انہیں مسرور کر گئی۔ ان کی معصوم بہن پھر با اعتبار ہو گئی تھی۔

”غلطیاں تو انسان سے ہی ہوتی ہیں فروان! ہم دونوں مل کر پھر اُسے منالیں گے۔ وہ بہت خوش ہوگی۔“

”ہاں آپنی! مجھے یقین ہے وہ مجھے معاف کر دے گی۔ وہ زیادہ دیر مجھ سے خفا ہی نہیں رہ سکتی۔ میں اُسے جانتا ہوں۔“ فروان بھاری لہجے میں بولا اور پھر تیزی سے کمرے کا پردہ اٹھا کر نکل گیا۔

...☆☆☆...

ناشتے کے دوران بابا خان حسب معمول اخبار پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ چائے کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے وہ بدستور نگاہیں اخبار پر جمائے ہوئے تھے۔ اچانک وہ چونکے۔

”توبہ ہے۔۔۔ آپ تو چائے کے ساتھ اخبار بھی گھول کر پی لیا کیجئے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کاغذوں کے بغیر آپ نے ناشتہ کیا ہوا۔“ شاہ خانم جھنجلا گئیں۔ ان کے آگے پراٹھے رکھے تھے جنہیں مہروز خان نے ابھی تک ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

”کیا کوئی بہت اہم خبر ہے بابا؟“ اشارے پوچھا۔

”آں۔۔۔۔۔ارے یہ اشمیل بھی پاگل ہوا ہے۔ کیا ضرورت ہے اُسے ان بکھیڑوں میں الجھنے کی۔“ انہوں نے جیسے اشارے شاہ خانم کی آواز ہی نہیں سنی تھی۔

”ایں۔۔۔۔۔اشمل۔۔۔۔۔خدا خیر کرے، یہ اشمیل کا کیا ذکر آیا ہے؟“ شاہ خانم، اشمیل کے نام پر چونکیں۔ اشارے بھی متوجہ ہو گئی۔ بابا خان نے اخبار شاہ خانم کی طرف بڑھایا۔

”موصوف یونین کے صدر بنے ہیں۔ مخالف گروپ نے کسی پروفیسر کو اغوا کر لیا تھا۔ اشمیل خان کی مدد سے پولیس نے انہیں بازیاب کرالیا۔ لڑکے گرفتار ہو گئے ہیں۔ کسی بڑے صنعت کار کا بیٹا بھی ملوث ہے۔“ انہوں نے شاہ خانم کے آگے اخبار رکھتے ہوئے پوری تفصیل بتائی۔ ”اب بتاؤ کیوں یہ دشمنیاں مول لے رہا ہے؟ یہ اسٹوڈنٹ یونین کے جھگڑے تو بہت خطرناک صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ اور وہ ویسے بھی جذباتی ہے۔“ مہروز خان کو فکر پڑ گئی۔ شاہ خانم بھی خوفزدہ ہو گئیں۔

”کون سمجھائے اسے۔۔۔ میری تو سنتا ہی نہیں ہے۔“ شاہ خانم نے اخبار رول کر کے نارا ضنگی کے انداز میں دور



پھینک دیا۔

”اشتراک بیٹا! ذرا اس کے ہو سٹل کا فون نمبر تو دینا۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔“ وہ از حد پریشان ہو گئے۔ اولاد کے معاملے میں وہ بزدل بن گئے۔ حالانکہ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ یونیورسٹی میں اس دور سے نہ گزرے تھے۔ وہ خود بھی اپنے طالب علمی کے زمانے میں ایکٹیو گروپس کے ساتھ پیش پیش ہوتے تھے۔ مگر اب اولاد \_\_\_\_\_ وہ بھی آنکھوں سے دُور ہو تو نڈر اور جری مرد کا دل بھی چڑیا جتنا ہو جاتا ہے۔

انہوں نے اٹھ کر جلدی سے ہاسٹل کا نمبر رنگ کیا۔ شاہ خانم نے انہیں دیکھا۔

”فضول ہے آپ کا فون کرنا۔ وہ کب مانے گا۔“

”مگر اُسے تاکید تو کر سکتا ہوں ان جھگڑوں سے دور رہنے کی۔“ انہوں نے نمبر ملاتے ہوئے کہا اور پھر نمبر ملتے ہی بولے۔

”ہیلو \_\_\_\_\_ مجھے اشمیل سے بات کرنی ہے۔ اشمیل خان خل زئی۔“

تھوڑی دیر بعد اشمیل خان کی آواز ابھری۔

”ہیلو \_\_\_\_\_ کون صاحب بول رہے ہیں؟“

”میں، مہروز۔“

”اوہ \_\_\_\_\_ بابا خان! آپ کیسے ہیں؟ اور یہ صبح صبح فون کرنا \_\_\_\_\_ خیریت تو ہے؟ میں ابھی یونیورسٹی جانے کے لئے نکل ہی رہا تھا۔“ اس نے حیرانگی سے پوچھا۔

”ہاں \_\_\_\_\_ اخبار پڑھا ہے آج؟ یہ کیا کرتے پھر رہے ہو تم؟“

”جی \_\_\_\_\_ خیریت \_\_\_\_\_ مجھ سے کیا قصور سرزد ہو گیا بابا خان! کہ اخبار تک میں خبر آگئی۔“ وہ واقعی قدرے متحیر تھا۔

”اشمیل! یہ لڑکے جو شر پسند لڑکے ہوتے ہیں نا، ان سے دور ہی رہنا چاہئے۔ اور پھر یہ بڑے باپ کے بیٹے جب الیکشن میں ہارتے ہیں تو یہ تند و تیز طوفان ہوتے ہیں، ان سے۔“

”اوہ \_\_\_\_\_ آئی سی \_\_\_\_\_ تو یہ بات ہے۔“ وہ سمجھ گیا۔ آج صبح ہی صبح اخبار میں پروفیسر حیدر کیانی کے اغوا اور ان کی بازیابی کی خبر شائع ہوئی تھی۔ احسن نے بھی اُسے پڑھ کر سنائی تھی۔

”ان بکھیڑوں میں الجھنے کی کیا ضرورت ہے تمہیں؟ سیدھے سادھے پڑھائی کرو اور واپس وادی میں آجاؤ۔“ ان کے لہجے میں بلا کی تشویش تھی۔ ”میں ذولین کو بھیجوں گا تمہارے پاس۔ تمہیں تو اتنا نہیں ہے۔ کم از کم مجھے ہی وہاں کے حالات سے باخبر کرے۔ یونین کا صدر بننا خدشوں سے خالی نہیں ہوتا۔ آج کی اس خبر نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ یہ خون خرابے والے عہدے۔۔۔۔۔۔“

”ارے، ارے \_\_\_\_\_ بابا خان! آپ تو بس سیریس ہو گئے۔ بائی گاڈ، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میرے آس پاس لوگ بہت اچھے ہیں۔ سارے امن کے خواہاں ہیں۔“ اس نے بابا خان کو اتنا پریشان محسوس کر کے انہیں تسلی دینی چاہی مگر بابا خان کو تسلی کب ہوئی تھی۔ نگاہوں سے اتنی دور وہ انہیں بہلا رہا تھا۔

”دیکھو اشمیل! شاہے بھی بہت پریشان ہے۔ اگر تمہیں کچھ ہو نا تو میری خیر نہیں ہے۔“ انہوں نے قریب آکھڑی ہوئیں شاہ خانم کو دیکھا تو وہ لاپراہی سے ہنس دیا۔

”ارے کچھ نہیں ہوتا بابا خان! کسی نہ کسی کو تو یونین کا صدر بننا ہی تھا۔ مجھ سے پہلے بھی کتنے لوگ یہ عہدہ سنبھال چکے ہیں۔ مگر بابا خان! میں نے بہت نیک ارادوں کے ساتھ یہ عہدہ سنبھالا ہے۔ آپ اور شاہ خانم میرے لئے دست

دعا دراز رکھیں۔“

”جانتا ہوں تمہارے ارادے۔ مگر بیٹا! یہ سب سوچنا آسان ہے، ارادے باندھنا آسان ہے۔ عملاً یہ ناممکن سا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔“

”نہیں بابا! اسے ناممکن ہم لوگوں نے ہی بنا رکھا ہے۔ ان حالات کو انسانوں نے ہی بگاڑا ہے تو پھر سنوارنے والے بھی انسان ہی ہوں گے نہ۔“ اس نے بابا خان کی بات کاٹ کر پُر عزم لہجے میں کہا۔ ”آپ دیکھئے گا، تعلیمی اداروں میں کیسے امن پھیلتا ہے۔ برائی کا نکتہ تیزی سے پھیلتا ہے مگر نیکی اور اچھائی کے نکتے کو پھیلانے کے لئے کچھ وقت اور محنت درکار ہوتی ہے۔ اور مجھے بھی کچھ وقت درکار ہے اپنی محنت کو بروئے کار لانے کے لئے۔ اور پھر میں تنہا نہیں ہوں۔ اس سفر میں میرے ہمراہ کئی اور بھی ہیں۔“

”ہاں۔۔۔ دیوانے ہیں۔“ بابا خان پہلی بار ہنسے تو وہ بھی ہنس دیا۔

”جو بھی کہہ لیں۔ ویسے یہ مت بھولیں بابا خان! کہ چچا فیروز بھی اپنے وقت میں یونین کے صدر رہ چکے ہیں۔ آپ ہی نے بتایا تھا مجھے اور آپ خود بھی ان کے گروپ میں شامل تھے۔“

”خوب۔۔۔ تو مجھے ٹریپ کر رہے ہو۔“

”ارے تو بے کیجئے، میں کیونکر ایسی گستاخی کر سکتا ہوں۔ بس آپ کو مطمئن کر رہا ہوں۔“ وہ زور سے ہنس دیا۔

”بس بیٹا! ہر کام یہ سوچ کر کرنا کہ تمہاری زندگی ہم سب کے لئے بے حد اہم ہے۔ تمہارے جسم کا ایک زخم بھی یہاں بہت سے دلوں کو تڑپا دے گا۔“

”اگر زخم فتح کے ہوں تو وہ زخم نہیں تحفہ ہوتے ہیں۔ ان میں تکلیف نہیں ایک عجیب طرح کی راحت ہوتی ہے۔“

”مجھے تم پر فخر ہے بیٹا! مگر بات اس دل کی ہے جو اولاد کے معاملے میں کچھ بے قرار واقع ہوا ہے۔ میں تمہاری راہ میں اپنے کسی حکم کی رکاوٹ نہیں ڈالنا چاہتا۔“ بابا خان نے محبت سے کہا۔

”تھینک یو بابا خان!“ وہ کھل اٹھا۔ ”گھر میں سب کیسے ہیں؟۔۔۔ سب کو میرا سلام کہئے گا بابا۔“

”ہاں، ہاں۔۔۔ ٹھیک ہیں۔“

”اچھا مجھے اجازت دیجئے۔۔۔ خاصا لیٹ ہو گیا ہوں۔ پیریڈ مس ہو گیا تو مجھے بے حد افسوس رہے گا۔“ اس نے رسٹ وائچ کو دیکھا۔

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ضرور۔۔۔ اچھا خدا حافظ بیٹا!“ بابا خان نے جلدی سے ریسور رکھ دیا۔

”کیا ہوا؟“ اشارہ ان کے ریسور رکھتے ہی ان کی طرف بڑھی۔ ”انہوں نے یقیناً آپ کو تسلی دی ہو گی۔“ وہ مسکرائی۔

بھلا وہ اپنے بھائی کو کیسے نہ جانتی۔ اس کا مزاج، اس کے بلند حوصلے اور اپنی بات پر ڈٹ جانے والا بابا خان کے حکم پر اپنے سارے ارادوں کو کیسے چھوڑ کر پیچھے پلٹ آتا۔ چٹانی عزم لے کر آگے بڑھنے والے کبھی پیچھے نہیں ہٹا کرتے۔ اس نے اپنی وادی کے نوجوانوں کو ایسا ہی جری دیکھا تھا جن میں اس کا بھائی سر فہرست تھا۔

”ہوں۔۔۔ خدا اُسے اپنی امان میں رکھے۔“ بابا خان اٹھ کر دوبارہ ناشتے کی میز پر آئے مگر ناشتہ کرنے کی بجائے شاہ خانم کی طرف دیکھ کر بولے۔

”اب میں زمینوں کی طرف جائوں گا۔۔۔ پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔ اس لڑکے نے تو مجھے الجھا کر رکھ دیا ہے۔۔۔ اُلٹا مجھے قائل کر دیا۔“ ان کے لہجے میں پدرانہ شفقت بھری تھی۔

”اور ناشتہ؟“ شاہ خانم نے انہیں دیکھا۔

”نہیں۔۔۔ بس دودھ پی لیتا ہوں۔“ انہوں نے انکار کر دیا اور گلاس میں رکھا دودھ پی کر قابل نواز کے ہمراہ باہر نکل گئے۔

”لو بھلا اب ایسی بھی کیا جلدی تھی۔“ شاہ خانم برہمی سے بڑبڑائیں۔ انڈہ اور پراٹھا یو نہی پلیٹ میں دیکھ کر انہیں غصہ آگیا اور بڑبڑاتی ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئیں۔ اشارہ کو ہنسی آگئی۔ غصہ اور جھنجھلاہٹ تو شاہ خانم کی سنتواں ناک پر جمار ہوتا تھا۔

”کیا بات ہے خان زادی۔۔۔ صبح ہی صبح بہت چہک رہی ہو۔“ زبیل اندر آئی تو اسے اکیلے میں مسکراتا دیکھ کر بولی۔

”صبح صبح کس کی صورت دیکھ لی؟“

”آئینہ ہی دیکھا تھا صبح منہ دھوتے وقت۔“ وہ شگفتہ لہجے میں بولی تو زبیل زور سے ہنس دی۔

”ارے ہاں زیبے!“ اشارہ ایک بیک سنجیدہ ہوتے ہوئے زبیل کے قریب آئی۔ ”میں نے رات کو خواب میں زری کو دیکھا تھا۔“

”کیا اپنی زر سانگہ کو؟“ زبیل آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگی۔

”ہاں زیبے! اس نے بہت جگمگ کرتے کپڑے پہن رکھے تھے۔ میں اس کے پاس بیٹھی تھی مگر وہ مجھ سے کوئی بات نہیں کر رہی تھی۔ بس ہنس رہی تھی۔ اس کے خوبصورت لب بے تحاشا مسکراہٹ بکھیر رہے تھے۔“

”اشارہ ابی بی! یہ۔۔۔ یہ تو بہت پیارا خواب ہے۔ زر سانگہ بہت خوش ہے۔ دنیا کے جھنجھٹ سے آزاد ہو گئی ہے وہ۔“ زبیل کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اشارہ کے دل پر بھی بھاری پن آگیا۔ ”کبھی کبھی وہ مجھے بہت یاد آتی ہے زیبے! کیا

وہ ہمیں یاد کرتی ہوگی؟“ اس نے پوچھا تو زبیل بولی۔

”اب کہاں اشارہ ابی بی! وہ تو جنت کے گلشن میں کھیل رہی ہوگی۔۔۔ ہمیں کیونکر یاد کرے گی۔۔۔ یاد تو اسے نیچے زمین والے کر رہے ہیں۔“ زبیل گہری سنجیدگی کے ساتھ بولی۔

”ہاں۔۔۔ ٹھیک کہتی ہو تم۔“ اشارہ نے بھی سر ہلایا۔ اسی لمحے فون کی گھنٹی بج اٹھی تو وہ چونکی۔

”ارے یہ صبح صبح کس کا فون آگیا؟“ وہ جلدی سے فون کی طرف لپکی۔

”ہیلو!“

”ہیلو۔۔۔ کون، اشارہ ابی بی! میں تمہاری ممانی بول رہی ہوں۔“

”ارے ممانی جان! آپ۔۔۔ کیسی ہیں؟ یہ صبح صبح فون۔۔۔ خیریت۔۔۔؟“ وہ کھل اٹھی۔

”ہاں خیریت ہی ہے۔ بس اطلاع دینی تھی کہ ہم انشاء اللہ کل حویلی آ رہے ہیں سب لوگ۔“

”کیا۔۔۔ سچ؟“ وہ خوشی سے چیخ اٹھی۔

”ہاں۔۔۔ شاہ خانم کو ذرا فون دینا۔ جاگ رہی ہیں اس وقت؟“

”ہاں، ہاں۔۔۔ وہ ناشتہ کر کے اپنے کمرے میں گئی ہیں۔ میں ابھی انہیں بلا دیتی ہوں۔ ویسے خوش کر دیا ممانی جان! آپ نے یہ خبر سنا کر۔ دیکھئے سب کو لے کر آئیے گا۔ ماہی، سحر، شاردہ بھابی، سب کو۔۔۔“ وہ جلدی سے بولی اور پھر ریسپورر کھ کر شاہ خانم کو خود ہی بلانے ان کے کمرے کی طرف بھاگی۔

...☆☆☆...



دلِ وحشت زدہ کے ہاتھوں پر یہ عجیب گلاب رقم ہوئے ہیں

جس کی خوشبو حریمِ جاں کو اپنے گھیرے میں لے رہی ہے

یہ کیسا منظرِ نظر میں پھیلا

جو نا آشنا ہے

جو اجنبی ہے مگر لہو کے اندر مچل رہا ہے

جو اپنا رنگ بکھیر رہا ہے

کڑکتی دھوپ ہے یلکخت میں جیسے سائے میں آگئی ہوں

یہ گہری رنگیں دُھند جو میری بصارتوں میں

سمٹ رہی ہے

یہ نامانوس رنگ سارے، جو میری جانب بڑھ رہے ہیں

میں اس کے گھیرے میں آ کے جیسے

سکون کی منزل پار ہی ہوں

خدا یا! میں جسے یاد کر رہی ہوں

سنہری آنکھوں کے دُھند لکوں میں ہو لے ہو لے اُتر رہی ہوں

میں جیسے خود سے بچھڑ رہی ہوں

شہرِ دل کی ساری وحشت قطرہ قطرہ پگھل رہی ہے

میں اس اجنبی خوشبو میں خود کو ڈوبتے ہوئے دیکھ رہی ہوں

میں سوچ رہی ہوں

یہی ہے شاید میری آخری شکست

کہ جس کے بعد نہ کوئی جنگ کی صورت

یہی ہے ساحل کہ اب اس سے آگے

نہ میری راہیں نہ میری منزل

وہ ایک ہی زاویے سے جامعہ کے بغلی لان کے سبز فرش پر بیٹھی تھی۔ بظاہر اس کی نگاہیں گلاب کی کیاری کی طرف اٹھی ہوئی تھیں مگر دھیان کی ہوائیں اور ہی سمت اڑ رہی تھیں۔ ایک عجیب سا احساس اس کے ذہن، دل میں ہلکورے لے رہا تھا۔

شوریدہ سر جذبے رگوں میں طوفان اٹھائے ہوئے تھے۔ اور وہ اس طوفان میں بہہ رہی تھی۔ اس نے اپنی ہستی دل کو بچانے کی کوئی ترکیب بھی نہ سوچی۔ شاید بچاؤ کے سارے ہتھیار بے کار ہو چکے تھے۔

وہ ان شوریدہ سر جذبوں کے رنگ پہچان رہی تھی۔

اور تصور میں بنتی تصویر کو دیکھ رہی تھی۔

معاً تصویر مکمل ہو گئی اور اُسے لگا جیسے اس کے اطراف ہر پھول میں \_\_\_ ہر ٹہنی میں ایک ہی صورت سمٹ گئی ہو۔  
ہر شے پر ایک ہی رنگ بکھر گیا ہو۔

”آف خدا یا \_\_\_ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟“ اچانک ہی جیسے وہ عالم مدہوشی سے عالم خود شناسی میں آگئی۔

اس نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر چہرے پر لانا چاہا تو رک گئی۔ کئی تینکے اس کی مٹھی میں پھسل پڑے۔

پسینے کے قطرے لہروں کی صورت میں اس کی ہتھیلیوں سے بہہ رہے تھے۔

”بہت ڈسٹرب کر دینے والی شخصیت ہے تمہاری اشمٰل خان!“ اس نے لبوں کو دانتوں میں دبا کر ایک گہری سانس کھینچی اور سر کو جھکا کر گھٹنوں پر رکھ دیا جیسے ایک ہاری ہوئی فوج کا سربراہ، فاتح لیڈر کے قدموں میں اپنے سارے ہتھیار رکھ دے۔ اور پھر سر جھکا کر ہر طرح کی سزا کے لئے تیار ہو جائے۔

”ارے ہشمنہ! کیا ہوا \_\_\_ گھر نہیں جانا کیا؟“ نگہت بیگ یہاں سے گزری تو اُسے سر گھٹنوں میں دیئے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ ”کیا بات ہے \_\_\_ تم نے لاسٹ پیریڈ بھی اٹینڈ نہیں کیا۔“

”آں \_\_\_ کیا \_\_\_؟“ وہ چونکی اور جلدی سے چادر کے کناروں سے چہرہ گڑنے لگی جو ننھے ننھے قطروں سے چمک اٹھا تھا۔ سفید رنگت گہری گلابی ہو گئی تھی اور آنکھوں میں عجیب طرح کی وحشت پھیل گئی تھی۔

”اب تو خیر سے آخری پیریڈ ختم ہوئے بھی بیس منٹ ہو گئے ہیں۔ میں تو گھر جا رہی ہوں۔ تمہیں نہیں جانا کیا؟“

”ہاں \_\_\_ بس میں ابھی اٹھنے ہی والی تھی۔ موسم اچھا ہو رہا تھا سو بیٹھ گئی اور وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔“ وہ مسکرائی اور کپڑے جھاڑ کر کھڑی ہو گئی۔ نگہت جواباً مسکرا کر جامعہ کی سڑک کی طرف بڑھ گئی۔

اس کے جاتے ہی ہشمنہ نے خود کو سنبھالا اور چادر کو سر پر ڈال کر بیگ اٹھا لیا اور پھر ایک لمحہ رک کر خود سے بولی۔

”ٹھیک ہے اشمٰل خان! کہ میں تم سے ہار گئی ہوں۔ مگر میں تمہارے سامنے اپنی شکست کا اعتراف نہیں کر سکوں گی، نہ کرنا چاہوں گی۔ اس لئے کہ میں جانتی ہوں کہ یہ یکطرفہ سفر میری خواری ہی ہو گا \_\_\_ میرے لئے اذیت کا باعث۔ اور میں اذیت میں اضافہ نہیں چاہتی۔ شکست کا یہ کرب بھی بہت ہے اشمٰل خان! جو تمہارے وجود، تمہاری آنکھوں اور تمہاری مکمل ذات نے مجھے بخش دیا ہے۔“

وہ کرب سے لب دانتوں میں دبائے دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف بڑھی۔

جامعہ کی سڑک کی رونقیں ماند ہو گئی تھیں۔ موٹر سائیکلوں سے بھری سڑک خالی خالی تھی۔ چند گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ اپنی گاڑی کی طرف آئی۔ اور اچانک ہی سفید ہنڈاسوک کے بریک پوری قوت سے اس کے قریب چرچرائے \_\_\_ اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی، مضبوط ہاتھوں نے اُسے گاڑی کے اندر کھینچ لیا \_\_\_ اور دوسرے ہی لمحے کار فرائے بھرنے لگی \_\_\_!

وہ اس اچانک حملے کے لئے قطعاً تیار نہ تھی۔ آندھی و طوفان کی طرح آنے والی اس گاڑی کے بریک نے ہی اُسے بوکھلا دیا تھا کہ وہ فوراً اپنے بچاؤ کے لئے کسی طرح کی کوشش نہ کر سکی۔ البتہ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے چیخا چاہا مگر مضبوط ہاتھ اس کے منہ پر جما ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ پیر مار کر اس آہنی پنچے کو پیچھے ہٹانے کی سعی کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔

اس نے اس جدوجہد کے دوران آنکھیں اٹھا کر گاڑی میں بیٹھے ہوئوں کو دیکھا تو جیسے دل دھڑکنا بھول گیا۔ اس کے بے حد قریب تو ریحان پراچہ بیٹھا تھا۔ اس کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں اس کا نازک وجود بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی اجنبی چہرہ تھا۔ وہ پوری رفتار سے گاڑی بھگ رہا تھا۔ نامعلوم، ناآشنا راستوں کی جانب \_\_\_ سرمئی دیواروں اور سفید گیٹ والی عمارت کے سامنے پہنچ کر اس نے زور زور سے ہارن دیا۔ اسی لمحے





تمہیں۔“ وہ قدرے اس کی جانب جھکا تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔

”ت۔۔۔۔۔ تم نے اشمیل کی دشمنی میں مجھے۔۔۔۔۔“

”نہ۔۔۔۔۔ نہ۔۔۔۔۔ نہیں ہشیمینہ صاحبہ!“ اس نے فوراً اس کا جملہ کاٹ دیا۔ ”تم نے مجھے دھوکا دیا۔ میری پارٹی سے نکل کر اشمیل خان کو میرے منصوبے سے آگاہ کرنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہوٹلوں میں بیٹھ کر میرے خلاف بولنے لگیں۔ تمہیں شاید میری طاقت کا اندازہ نہیں ہے سویٹ ہارٹ! میں وہ نہیں ہوں جو نظر آتا ہوں۔“ اس نے جھٹکے سے اس کی کلائی پکڑ کر اسے اپنے قریب کھینچا۔

”تم۔۔۔۔۔ ذلیل انسان! تم نے صرف اور صرف اپنی ہوس کے لئے مجھ سے پارٹی ریلیشن استوار کئے ہوئے تھے۔“ ہشیمینہ نے ایک جھٹکے سے خود کو اس کی گرفت سے چھڑا لیا۔ ”میرے قریب مت آنا ریحان ورنہ۔۔۔۔۔“

اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئی تھیں۔

ریحان کے بڑھتے قدم اس کا خون خشک کئے دے رہے تھے۔

بے بسی اور غصے سے اس کا بدن کانپنے لگا تھا۔

”میں نے تمہیں چاہا ہے ہشیمینہ ابرار! اور جسے چاہا جاتا ہے اسے پانا بہت ضروری ہوتا ہے۔ تم نے میرے جذبوں کی اہانت کی تھی۔ یاد ہو گا تمہیں۔ اب میرے پاس یہی طریقہ رہ جاتا ہے۔ سارے حساب اسی طرح بے باق ہو سکتے ہیں۔“

”تم ایسی گھناؤنی حرکت نہ کرنا۔“ وہ بلک اٹھی۔

”ہا، ہا، ہا۔۔۔۔۔ کہاں گئی وہ تنی ہوئی گردن۔۔۔۔۔ وہ فخر و غرور؟ یہ سب خاک میں ملا دوں گا۔ ابھی چند منٹوں

میں ریزہ ریزہ کر دوں گا وہ غرور۔۔۔۔۔ اس کے بعد تم کبھی یہ خوبصورت گردن تان کر نہیں چل سکو گی۔ پھر کسی ریحان پر اچہ کو نہ جھڑک سکو گی۔ یہ پارسائی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔“

”قہر نازل ہو گا تم پر کمینے انسان!“ وہ اپنی ہمتیں مجتمع کرتے ہوئے دھاڑی۔ ”اگر تم نے مجھے چھوا بھی۔“

”تو۔۔۔۔۔ تو کیا کر لو گی۔۔۔۔۔ ہا، ہا، ہا۔۔۔۔۔ بس یہی غرور تو توڑنا ہے مجھے۔ یہی تننا جو کبھی مجھے اچھا لگتا تھا، مگر اب نفرت ہے مجھے۔“

ہشیمینہ کو اپنی سانسیں گھٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ بے بسی کا غلبہ شدت سے اس پر طاری ہو گیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس وقت جہاں ہے وہاں دور دور تک اس کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ اس کی عصمت و عزت کی حفاظت صرف اور صرف خدا کے اختیار میں ہے۔

”خدا یا! تُو رحم کر۔۔۔۔۔“ اُس کا دل بلک اٹھا۔ اُس نے عجیب بے بسی اور بے اختیاری سے کمرے کے دروازے کی جانب دیکھا اور اسی لمحے دروازہ دھڑ سے کھل کر دیوار سے جا لگا۔

”ریحان! پیچھے ہٹ جاؤ۔“ اشمیل خان کی آواز میں غراہٹ تھی۔ اس کا چہرہ خطرناک حد تک سرخ ہو رہا تھا۔ پہلی بار اس کے ہاتھوں میں ریوالور چمک رہا تھا جس کی نال ریحان پر اچہ کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔

”تم یہاں کیسے آ گئے؟“ ریحان کے اوسان خطا ہو گئے۔ اشمیل خان کو اپنے سامنے ریوالور لئے کھڑے دیکھ کر وہ نہ صرف حیران ہوا تھا بلکہ خوفزدہ ہو گیا تھا۔

”تمہیں اندر کس نے آنے دیا؟“

”او نہہ۔۔۔۔۔ مجھے کون روک سکتا تھا۔ جب تم ہشیمینہ کو یہاں تک لانے کی جسارت کر سکتے ہو تو پھر مجھے یہاں

آنے پر کون روکنے کی ہمت کر سکتا ہے؟ ذلیل شخص! آج تم نے اپنی اوقات دکھا دی۔ تم نے اپنا مکروہ روپ بالآخر دکھا دیا۔“ وہ اسی نفرت اور غصہ سے اس کے قریب آگیا۔

ہشمنہ بے حس و حرکت دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ اس کی سانسیں تیز رفتاری سے چل رہی تھیں۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے اس کا وجود اسی زمین پر ڈھیر ہو جائے گا۔ غم و غصہ اور بے بسی کی کیفیت طاری ہوتے ہوتے یہ اتنی بڑی خوشی اُس سے سنبھل نہ پا رہی تھی۔ اس کی عصمت کی حفاظت کرنے اشمٰل خان آچکا تھا۔ اُس کے لئے رحمت کا فرشتہ بن کر۔

”اشمٰل! شاید تمہیں احساس نہیں ہے کہ تم اس وقت میری کوٹھی کی انیکسی میں ہو۔“ ریحان پراچہ نے تھوک نکلے ہوئے اُسے خوف دلانے کی کوشش کی۔ ”میں تمہیں وارننگ دیتا ہوں کہ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ ورنہ۔۔۔۔۔۔“

”ورنہ کیا تم میری جان لے لو گے؟“ نہیں ریحان پراچہ! جان تو آج میں تمہاری لوں گا کہ تمہارے ناپاک ہاتھ ایک شریف لڑکی کی جانب بڑھے تھے۔“

اس نے ریوالور جیب میں ڈال لیا اور ریحان پراچہ کو گریبان سے پکڑ کر کئی جھٹکے دیئے۔

”تم جیسا ناپاک وجود اس زمین کے لئے وبال ہے۔ اس زمین پر بوجھ ہے۔ اسے ختم ہو جانا چاہئے۔ ابھی اور اسی وقت۔“ وہ جنونی سا ہورہا تھا۔ اس کے ہاتھ ریحان پراچہ کی گردن کے گرد جم گئے اور وہ پوری قوت سے اس پر دباؤ ڈالنے لگا۔

”اشمٰل۔۔۔۔۔۔ اشمٰل پلیز! مجھے چھوڑ دو۔“ ریحان پراچہ کی دبی دبی چیخیں حلق سے نکلنے لگیں۔

”کیسے چھوڑ دوں تمہیں ذلیل انسان! کیسے چھوڑ دوں۔ تم جیسے غلیظ اور بے غیرت شخص کو زندہ نہیں رہنا

چاہئے۔“

اشمٰل خان غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ ریحان اس کی مضبوط گرفت سے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا اور بے بسی سے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

”اشمٰل۔۔۔۔۔۔ مل! یہ۔۔۔۔۔۔ یہ کیا کر رہے ہو؟“ اچانک ہشمنہ آگے بڑھی اور اپنے کانپتے ہاتھوں سے اس کا بازو تھام لیا۔ ”یہ مرجائے گا۔۔۔۔۔۔ اسے چھوڑ دو اشمٰل!“

”اسے مرنا ہی چاہئے۔۔۔۔۔۔ ہٹ جاؤ تم۔“ وہ دھاڑا۔

”خدا کے لئے اشمٰل!“ ہشمنہ پریشان ہو گئی۔ ریحان پراچہ کی اُبلتی آنکھیں اس کے اندر دہشت بھر رہی تھیں۔

اگر ریحان پراچہ اشمٰل خان کے ہاتھ سے قتل ہو گیا تو وہ پھر سزا سے کیسے بچ سکے گا؟ وہ قاتل ہو جائے، محض اس کے لئے۔ یہ ہشمنہ کیسے گوارا کر لیتی۔ اُسے اس اقدام سے ہر حال میں اُسے باز رکھنا تھا۔

”میری جان کی قسم اشمٰل خان! اسے چھوڑ دیں۔۔۔۔۔۔ چھوڑ دیں۔“ وہ اس کا بازو تھام کر بے اختیار رو دی۔ ”یہ قتل ہو جائے گا۔۔۔۔۔۔ اور میں نہیں چاہتی کہ اس کا ناپاک خون آپ کی گردن پر ہو۔ اسے ابھی جیل میں سڑنا ہے۔۔۔۔۔۔ اسے اتنی جلدی مت ماریں۔“ وہ ہلکے بلکے کر رونے لگی۔

اشمٰل خان کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور ریحان پراچہ ایک طرف لڑھک گیا۔ اس کے سانسوں کی رفتار بے حد دھیمی ہو گئی تھی۔ اشمٰل خان نے جھک کر اس کی نبض دیکھی پھر قدرے مطمئن ہو کر اٹھ کر ہشمنہ کی طرف مڑا جو دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے بلک رہی تھی۔

وہ چند ثانیے لب بھینچے اُسے دیکھتا رہا پھر اس کا بازو پکڑ کر اسے کھینچتا انیکسی سے باہر نکال لایا۔

سامنے افتخار اور نعیم جان کھڑے تھے۔ وہ دونوں انیکسی کی طرف ہی بڑھ رہے تھے۔ ہشمنہ اور اشمل خان کو دیکھ کر چونکے۔

”اشمل! وہ ریحان \_\_\_“ نعیم جان تیزی سے آگے بڑھا مگر پھر رک گیا۔ اشمل خان اسے نظر انداز کرتے ہوئے ہشمنہ کو لئے اپنی گاڑی میں آبیٹھا۔ وہ ہنوز اسی رفتار سے رو رہی تھی۔ اس صدمے نے اس کی جان تک نکال دی تھی۔ موت نے اسے کبھی خوفزدہ نہیں کیا تھا مگر اپنی رسوائی کے خوف نے اسے نیم جان کر دیا تھا۔

اشمل خان کے سامنے وہ کتنی بے وقعت اور بے حیثیت ہو گئی تھی۔ اگر وہ فرشتہ بن کر نہ آتا تو وہ ریحان پر اچہ کے ہاتھوں رسوا ہو گئی ہوتی۔

اُف \_\_\_ وہ مرکبوں نہ گئی؟

”ہشمنہ!“ اشمل خان نے آہستگی سے اس کے شانے کو چھوا تو وہ بے قرار ہو کر اس کے ہاتھ پر چہرہ ٹکا کر رونے لگی۔

”مجھے کہیں سے زہر لادیں اشمل! میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ میرا مان ٹوٹ گیا \_\_\_ میری ساری انا مجروح ہو گئی۔ اب جی کر کیا کرنا ہے۔“

”بے وقوف لڑکی! تم اب بھی ان چھوٹی کلی ہو۔ پھر رونا کس بات کا؟ عزت، مان سب کچھ تو سلامت ہے۔“ اس کے یوں تڑپ تڑپ کر رونے پر اشمل خان کے دل پر گھونسا لگا تھا۔ اتنی مضبوط، اتنی پیاری لڑکی کو بکھرتے ہوئے وہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”آپ کو مجھ سے نفرت تو نہیں ہو گئی؟“ اس نے آنسوؤں سے بھری پلکیں اٹھا کر پوچھا۔

”ہشت \_\_\_ پگل \_\_\_ نفرت کے قابل تم نہیں، ریحان پر اچہ ہے۔ بھلا تم سے کیونکر نفرت ہوگی۔ کم آن ہشمنہ!“ اس نے اس کا کانپتا ہاتھ تھپتھپایا۔ ”اس واقعہ کا خوف اپنے اوپر طاری مت ہونے دو۔ جو ہو گیا اسے کوئی بھیانک خواب سمجھ کر بھلانے کی کوشش کرو۔“ اس نے شفقت اور محبت سے اس کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں جھانکا۔

”میں تمہیں وہی مغرور و مضبوط اور نڈر ہشمنہ دیکھنا چاہتا ہوں جس نے مجھے اسیر کر لیا ہے۔“

اس کے لفظ ہشمنہ ابرار کے دل کو تسلی دے رہے تھے۔ اس کے آخری جملے پر وہ چونکی۔ اُسے لگا جیسے اشمل خان نے اس کی سماعتوں پر خوشبو بکھیر دی ہو۔ وہ یقین اور بے یقینی کی سی کیفیت میں بیٹھی رہ گئی۔ اور چونکی اس وقت جب گاڑی ایک پارک کے سامنے رک گئی۔

”تم خود کو نارمل کر لو \_\_\_ اس طرح تمہیں گھر ڈراپ کرنا سب کو مشکوک کر سکتا ہے۔“ وہ اس کے متوحش چہرے اور ریشمی رخسار پر ایک نگاہ ڈال کر دھیرے سے بولا تو وہ جیسے پوری طرح سے عالم خود شناسی میں آگئی اور جلدی سے شانوں سے ڈھلکتی چادر کو سر پر ڈال لیا اور بے قراری سے لب کاٹے ہوئے دھیرے سے سر اٹھایا تو ساری ہستی ڈول گئی۔

وہ سحر انگیز آنکھیں سچی اور پُر خلوص محبت کا ایک جہاں آباد کئے اسے دیکھ رہی تھیں۔

لبوں پر دل آویز مسکراہٹ تھی۔ اس نے پلکیں جھکادیں اور عارضوں پر ڈھلکے آنسوؤں کو چادر کے کناروں سے پونچھنے لگی۔

”ضروری نہیں کہ ہم جس طرح سوچتے ہیں، جو سوچتے ہیں وہ سب کچھ اسی انداز سے ہو اور بالکل ہماری منشاء کے مطابق ہمارے ارادوں کی تکمیل اور خوابوں کی تعبیر ہو۔“



”مگر اشمٰل خان! اپنے ارادوں کا اتنا بھیانک انجام، خواب کی اتنی دہشت ناک تعبیر۔“ اس کی آواز ندھ گئی۔ ابھی تک یہ دکھ اس کی روح میں شعلے کی طرح جل رہا تھا۔ اس کی ہمدردی پر اور بھی حوصلہ ہار رہی تھی۔

جب سہارے کے لئے دیوار نظر آجائے تو انسان اس لمحے سارے حوصلے ہار کر دیوار کا سہارا لینا چاہتا ہے۔ وہ بھی ایک ساتھ سارے دکھ، ساری تھکاوٹ اتار دینا چاہتی تھی۔ سارے آنسو بہا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لینا چاہتی تھی۔ اشمٰل خان اس وقت اس کے لئے ایک مضبوط دیوار ہی تو ثابت ہوا تھا۔

”میں نے کہا ہشمنہ! کہ سب کچھ ہماری سوچوں اور ہمارے خیالوں کے مطابق نہیں ہوتا۔ اور پھر تمہیں تو تقدیر نے مات دی ہے۔ کبھی کبھی تو ہمیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ ہم دل جیسی شے سے بھی مات کھا گئے ہیں۔ دراصل یہ ہمارے اندر دھڑکتے ہوئے دل کی شکست ہے۔ کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ خود کو بھی بہت مضبوط اور ناتسخر سمجھنے والے تسخیر ہو جاتے ہیں۔“ اس نے ہشمنہ کی بڑی بڑی نم آنکھوں میں بس ایک لمحے جھانک کر کہا تھا اور وہ اس لمحے کے سحر میں جکڑتی چلی گئی۔ ان بھوری بھوری آنکھوں کو حیرت سے دیکھتی رہی جو کبھی آئینے کی طرح تھیں اور جن میں اس کا اپنا عکس بہت واضح تھا۔

”اشمٰل خان!“ اس کے لب کپکپا گئے اور چہرہ متمتا اٹھا۔

”ہاں ہشمنہ! اپنی ہار کا کھلا اعتراف کرنا بھی بہادری ہے۔“ اس کا لہجہ شگفتہ تھا اور آنکھیں اور لب دونوں ہی متبسم تھے۔ ”تم نے تو یہاں بھی بزدلی کا ثبوت دیا ہے۔“ وہ اس کے سرخ چہرے کو پُر شوق نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا تو وہ بوکھلا گئی۔

”اُف۔۔۔ یہ شخص کیا دل میں جھانک لینے کے فن سے آگاہ ہے یا میری آنکھوں نے اُسے یہ راز سونپ دیا ہے؟“

اس کی پلکوں پر منوں بوجھ آ پڑا۔

”میں نے تمہیں بہت ہرٹ کیا ہے نہ۔“ وہ پوچھ رہا تھا۔ ”دراصل تم مجھے غصہ میں اچھی لگتی تھیں۔ بلند حوصلہ رکھنے والی۔۔۔ پُر جوش۔۔۔ میرے لئے کبھی کبھی چیلنج بن جاتی تھیں۔“

”اور اسی چیلنج کو آپ نے قبول کر لیا۔“ وہ شرمگین لہجے میں بولی تو اشمٰل خان اپنی بے ساختہ ہنسی کو نہ روک سکا۔ وہ دونوں نیچے اتر آئے۔

نرم نرم سبزے پر چلتے ہوئے اشمٰل خان نے اس کا نرم ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں تھام لیا

”میں خود کو بہت پریکٹیکل سمجھتا رہا تھا۔ مگر یہاں وہی بے وقوف سا، دیوانہ سا مجنوں بن گیا۔ بہت اچانک۔“

اُس نے بڑے سے درخت کے تنے پر ٹیک لگا کر اسے دیکھا اور کتنے ہی لمحے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

ہشمنہ کو لگ رہا تھا جیسے کائنات کی حرکت رک گئی ہو۔

دل پر لپکتے شعلوں پر نرم نرم بوندیں گر رہی ہوں۔

یا ہر شے مسکرانے لگی ہو۔

یا وقت چلتے چلتے اچانک خوبصورت موڑ پر ٹھہر گیا ہو۔ سارے بھیانک اندیشے معدوم ہو گئے ہوں۔

اشمٰل خان اپنا نرم و مہربان سایہ لے کر اس کے قریب آ گیا تھا۔

اشمٰل خان نے اُسے یکطرفہ سفر کی افیت سے یکدم ہی باہر نکال دیا تھا۔

اس کی سماعتوں پر خوشبو بکھیر دی تھی۔

اسے چاہے جانے کا فخر بخش دیا تھا۔

اور یہ احساس کتنا روح پرور ہوتا ہے کہ کوئی ہمیں چاہتا ہے۔

اس کے وجود نے اس کے وجود کو تسخیر کر لیا ہے۔

مسرت و انبساط کے احساسات کسی منظر کی طرح اس کے سامنے پھیلے ہوئے تھے اور وہ آگے بڑھ کر اس کی ساری رعنائیاں سمیٹ لینا چاہتی تھی کہ

یہی ہے شاید میری آخری شکست

کہ جس کے بعد نہ کوئی جنگ کی صورت

یہی ہے ساحل کہ اب اس سے آگے

نہ میری راہیں

نہ میری منزل

☆☆☆...

اُس کی حالت ابھی سنبھلی نہیں تھی۔ اُس نے خود کو کمرے میں ہی مقید کر لیا تھا۔ شاردابھابی بھی اس کے رویے پر پریشان ہو گئیں۔

”کیا ہو گیا ہے سحر! تجھے؟ کیوں اتنی دُلی ہو گئی ہو؟“ شاردابھابی نے پیار سے اس کے بال سہلائے تو وہ سٹپٹا کر اٹھ بیٹھی۔

”ک۔۔۔۔۔ کچھ نہیں۔ بس سر میں درد سار ہوتا ہے۔“ اس نے بدقت خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ اُسے ماہِ گل اپنی کی تاکید یاد آگئی۔ انہوں نے کتنی مرتبہ اس سے کہا تھا کہ وہ خود کو سنبھال لے۔ گھر میں ان دونوں کے علاوہ بھی کئی

افراد ہیں جو مشکوک بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر وہ کیا کرتی اس دل کا جو سب چیزوں سے یک دم ہی اُچاٹ ہو گیا تھا۔

اس واقعہ نے اُسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔

”ارے ہاں۔۔۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔ امی کہہ رہی تھیں تم وادی جاؤ گی نا ان کے ساتھ؟“ شاردابھابی نے پوچھا تو اس نے سر جھکا لیا۔

”نہیں۔۔۔ میرا موڈ نہیں۔“

”ایں۔۔۔ کیوں؟ اشترا تو تم سب کی آمد کا سن کر بہت خوش ہوئی ہے۔ تم سے تو اس کی بڑی دوستی ہے۔ تم نہیں جاؤ گی تو وہ برا مانے گی۔“

”کون کون جا رہا ہے؟“ اس نے دھیرے سے پوچھا۔ وہ بالکل غائب دماغ ہو رہی تھی۔ حالانکہ چند دن پہلے اس کے سامنے ہی پروگرام بناتا تھا۔ اور اب اُسے کچھ یاد نہیں تھا۔ ذہن کی ساری سُونیاں تو بس اس واقعہ کے گرد گھوم رہی تھیں۔

”سحر! تمہارا فون ہے۔“ زمان بھائی دروازے میں کھڑے اس سے کہہ رہے تھے۔ وہ پوری جان سے کانپ گئی۔

”میرا فون؟“ اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ اپنے نام سے منسوب ہر آہٹ پر وہ خوف میں گھر جاتی۔

’خدا یا اب کوئی نیا دکھ نہ ہو۔‘

”ہاں۔۔۔ کوئی فضا نامی لڑکی ہے۔“ زمان بھائی یہ کہہ کر اٹھے قدموں واپس مڑ گئے۔ شاردابھابی بھی باہر نکل گئی تھیں۔

”فضہ۔۔۔“ یہ نام اس کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح لگا تھا۔

اُسے بدنامی میں دھکیلنے والی۔

اُسے زندہ درگور اسی لڑکی نے تو کیا تھا۔

فروان کے سامنے رسوا اسی کی وجہ سے تو ہو گئی تھی وہ۔

اب کیا رہ گیا تھا۔ وہ سلگتی سوچوں کے ہمراہ لائونج میں آئی اور پردہ کھینچ کر جلدی سے لپک کر ریسپور اٹھالیا۔

”ہیلو۔۔۔“

”ہیلو سحر!“ فضہ کی آواز اُبھری اور اس کے ساتھ ہی سحر گل کی رگوں میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس کا پور پور جلنے لگا۔

”کیوں کیا ہے فون۔۔۔ اب کیا رہ جاتا ہے ذلیل لڑکی! تم نے میری زندگی میں کانٹے بھر دیئے فریبی لڑکی! اب

کون سا ڈرامہ رچانا چاہتی ہو؟“ وہ پھٹ پڑی۔ دل میں چھپا ہوا لاوا بہہ نکلا۔

”نہیں، نہیں سحر! تم غلط سمجھی ہو۔ میں تو۔۔۔۔۔“

”مجھے اب تمہیں سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔“ اس نے نفرت سے اس کی بات کاٹ دی۔ ”دوستی کی آڑ میں تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ اپنے کزن کے لمحوں کو رنگین بنانے کے لئے میری ذات کو گھسیٹا۔“

”خدا کے لئے سحر! اتنے الزام مت دو۔ بائی گاڈ، میں یہ سب کچھ نہیں چاہتی تھی۔ ہاں قصور ہے تو اتنا کہ تمہیں بلوایا۔ مگر میری مجبوری بھی تو سمجھو۔ یہی کچھ تو بتانے کے لئے تمہیں فون کیا ہے۔ پلیز ٹھنڈے دل سے میری بات سنو، پھر چاہو تو مجھے کوئی بھی سزا دینا۔“ فضہ بے اختیار سسکنے لگی۔ ”اُس دن سے میں بھی لمحہ لمحہ مر رہی ہوں۔ اپنے ضمیر کی عدالت میں کھڑی خود کو بہت بڑا مجرم سمجھ رہی ہوں۔“

”تم نے پھر یہ سب کچھ کیوں کیا فضہ! کیوں کیا؟“ سحر گل اس کے رونے پر پگھل سی گئی۔

”سحر! مجھ سے بہت پہلے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ ایک ایسی غلطی جس کا خمیازہ اب اکثر و بیشتر مجھے بھگتنا پڑتا ہے۔

جانتی ہو وہ غلطی کون سی تھی؟“ وہ قدرے رکی مگر سحر خاموش رہی۔

”وہ غلطی ہے منصور سے محبت۔“

”کیا۔۔۔؟“ سحر کو جیسے کرنٹ لگ گیا تھا۔ ”تت۔۔۔۔۔ تم منصور سے۔۔۔۔۔“

”ہاں سحر! میں اس وقت عمر کے اس دور میں تھی جہاں آگ بھی بسا اوقات دکتا ستارا محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے کہ حُسن اور رنگ میری آنکھوں میں اُتر آئے تھے۔ اس وقت منصور بھی دکتا ستارا محسوس ہوا سحر! وہ اس وقت بہت آتا تھا ہمارے گھر۔ میں نے بتایا تھا نا تمہیں کہ تب ہم ان کے پڑوس میں ہی رہتے تھے۔“

”ہوں۔۔۔ ہاں، بتایا تھا۔ پھر؟“ سحر بے قراری سے بولی۔ اس کی سانس فضہ کی آواز کے ساتھ کبھی تیز کبھی دھیمی ہو رہی تھی۔

”میں اُس کی خوبصورت باتوں کی اسیر ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں جھلکتے مکروہ جذبے مجھے ایسے دلکش خواب دکھا گئے کہ میں انہی میں گم ہو گئی۔ اور پھر کچھ پانے سے پہلے ہی سب کچھ کھو بیٹھی۔“ اس کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔ ماضی کی غلطیوں کا دکھ اس کے لہجے میں گھلنے لگا۔

سحر کو لگا جیسے اس کا دل یکنخت کسی نے مٹھی میں دبایا ہو اور اسے بھینچ لیا ہو۔ فضہ کے دل کے اندر اتنی وحشت ناک کہانی چھپی تھی۔ جانے اس کا بوجھ وہ کب سے اٹھائے پھر رہی تھی۔ اس کا دل فضہ کے دُکھ پر پگھلنے لگا۔

”سحر! مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے کسی نے آسمان سے اٹھا کر زمین پر بیچ دیا ہو اور میں عمیق تاریکیوں میں گم ہوئی جا



رہی ہوں۔ میری ساری زندگی بکھر گئی جس طرح نازک کانچ اور سبک چوڑیاں ہاتھوں سے گر کر کرچی کرچی ہوتی ہے نا، اسی طرح میں بھی کرچی کرچی ہو گئی ہوں سحر!“

”فضہ! تم نے اس شخص کا گریبان نہیں پکڑا؟ اس بے غیرت کینے انسان سے بدلہ نہیں لیا؟ کوئی احتجاج نہیں کیا؟“

سحر گل کو ایسا لگا جیسے یہ دُکھ فضہ کا نہیں، اس کا اپنا ہو۔ ”ہاں“ مگر تم کہتیں بھی کس سے؟“ اس نے لب دانتوں میں دبائے۔ ”یہی تو ہمارا المیہ ہے کہ لٹ کر بھی ماتم نہیں کر سکتے۔ رسوا ہو جانے کے بعد بھی رسوائیاں ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔“

”ہاں سحر! ٹھیک کہتی ہو تم۔ میں برباد ہو کر بھی اس سے انتقام نہ لے سکی۔ الٹا اس کی محکوم بن گئی۔ مبادا یہ راز افشانہ کر دے۔ مردوں کے اس معاشرے میں اس پر کون انگلی اٹھاتا“ سارا کچڑ تو میرے ہی حصے میں آتا۔ سر تو بیٹیوں کے والدین کے ہی جھکتے ہیں۔“

”مگر فضہ! تم“

”سحر! تم نہیں جانتیں اس نے مجھے کس کس طرح بلیک میل کیا ہے۔ کئی لڑکیوں کو تباہ و برباد کرنے میں اس کے ساتھ میرا بھی ہاتھ شامل ہے۔ اور اب تمہیں بلانے پر بھی اس نے مجھے مجبور کیا تھا۔ اسی حربے سے۔“

”تم نے اس سے شادی کے لئے کہا تھا؟“ سحر گل دھیرے دھیرے رندھے ہوئے لہجے میں بولی تو فضہ کی ایک تلخ سی ہنسی آزاد ہو گئی۔

”شادی“ ارے بے وقوف لڑکی! عورت جب تک مردوں کی ہوس زدہ نگاہوں سے دور ہو، ہیرا ہوتی ہے۔ اسے ہیرے ہی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر جب عورت اس کے ہاتھوں کھلو نا بن جائے تو پتھر ہوتی ہے اور پتھروں سے گھر نہیں سجائے جاتے۔ خیر اب تو اتنے برس بیت گئے۔ اس داغ کی کسک کبھی کبھی تیز ہو جاتی ہے تو

چھپ کر رو لیتی ہوں۔ پلیز تم مجھے معاف کر دو۔ خدا کے لئے میرا جرم معاف کر دو۔“

”نہیں، نہیں فضہ!“ اس نے جلدی سے کہا اور پھر شدت دھک سے ہلکا اٹھی۔ ”اوہ فضہ! یہ سب کیا ہو گیا؟“ اس نے کرب سے لب دانتوں میں دبائے۔

”سحر! تم ماہ گل آپ کی سب کچھ بتا دینا۔ اس سے پہلے کہ منصور کچھ گڑبڑ کرنے کی کوشش کرے تم سب کو اپنے اعتماد میں لے لینا۔“

”فضہ! مجھ پر قیامتیں ٹوٹی ہیں۔ میں بے قصور ہو کر بھی قصور وار ٹھہرائی گئی ہوں۔ فروان کی نظروں سے ایسی گری ہوں کہ دل چاہتا ہے پھند اڑال کر مر جائوں۔ روح کی موت جسم کو تا عمرافیت دیتی ہے۔“ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنا غم جاوداں ہو گیا۔ وہ نیم جان سی ہو گئی۔

فضہ کا دکھ۔

منصور کا ناقابل معافی گناہ۔

اور خود اپنا کرب۔

اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے جالے دبیز ہو گئے۔

اس نے فون رکھا تو ڈھیروں تھکن اس کے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ پلٹی۔ سن سی رہ گئی۔ فروان لاؤنچ کا پردہ تھامے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بے اختیار جھک گئیں اور قدم من من بھر کے ہو گئے۔ وہ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی جس کی نظروں سے چھپتی اور کتراتے پھر رہی تھی اب وہ اس کے بالکل سامنے تھا۔

”سحر!“ وہ اس کے قریب آگیا۔ عجیب سا حزن اس کے چہرے پر ہلکورے لے رہا تھا۔ ”مجھے معاف کر دو“

میرے ناروا رویوں نے تمہیں بہت دکھی کر دیا ہے نہ۔ میں اپنے کہے لفظوں اور خیالوں پر نادم ہوں۔“ اس نے خفت زدہ لہجے میں کہا تو سحر گل گرتے گرتے بچی۔ اس نے سر اٹھا کر بے یقینی سے اسے دیکھا۔ یہ۔۔۔۔۔ یہ فرداں اس سے معافی مانگ رہا ہے۔

”سحر! میں نے بغیر سوچے سمجھے، تمہارا عذر سنے بغیر تمہیں نجانے کیا کچھ کہہ دیا ہے۔ سوچتا ہوں تو خود ہی زمین میں گڑنے لگتا ہوں۔ پلیز سحر! میں سخت نادم ہوں۔“ اس نے بے قراری سے کفِ افسوس ملتے ہوئے اسے دیکھا جو عالمِ تحریر میں گم تھی۔

اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے فرداں اس کی سماعتوں میں امرت اُنڈیل رہا ہو۔

اس کے دکھی دل کو تھپک رہا ہو۔

”فر۔۔۔۔۔ فرداں۔۔۔۔۔ میرے بھائی!“ اس کا دل بھر آیا۔

”فر۔۔۔۔۔ وان۔۔۔۔۔“ اس نے تڑپ کر دیکھا اور پھر بے اختیار ہو کر اس کے شانے سے سر ٹکا کر بلک اٹھی۔

”پاگل لڑکی! تم نے سب کچھ ماہی آپنی سے چھپا دیا۔ مجھے اتنا بے اختیار سمجھا اور خود تنہا آگ کو بجھانے کے لئے آگ میں ہی کود پڑیں۔“ اس نے نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”تم مجھے بتانا اس شخص کے بارے میں۔ میں اس ذلیل شخص کو اس کے انجام تک پہنچاؤں گا۔“

”نہ۔۔۔۔۔ نہ۔۔۔۔۔ نہیں فرداں!“ وہ سہم گئی۔ ”وہ شخص آوارہ، بد معاش ہے۔ اس نے بہت سے گھروں کو تباہ کیا ہے۔ ایسے شخص کو چھیڑنا نہیں چاہئے۔ نجانے وہ تمہیں کیا نقصان پہنچا دے۔“

”نہیں سحر!“ فرداں کا چہرہ تن گیا۔ اس ان دیکھے شخص کے لئے اس کی آنکھوں میں نفرت کا ایک سمندر موجزن

تھا۔

”گھروں کو اجاڑنے والوں کو کھلا نہیں چھوڑ دینا چاہئے۔ وہ اور بھی شیر ہو جاتے ہیں۔ ان سے خوفزدہ ہو کر انہیں بہادر بنادیتے ہیں لوگ۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے ناپاک قدم کسی اور دامن کی جانب بڑھائے، میں اسے۔۔۔۔۔“

”فرو۔۔۔۔۔ تم نے مجھ پر اعتماد کر لیا ہے نا؟“ اس نے اپنی سسکاری دباتے ہوئے اُسے دیکھا۔ بے تحاشہ آنسوؤں نے اس کا چہرہ بھگو دیا تھا

”ہم دونوں تو دوست ہیں۔ میرا اعتماد ٹوٹا تو نہ تھا۔ وہ بس میری ہی عقل پر پردہ پڑ گیا تھا جو ماہی آپنی نے اتار دیا۔ تم تو بالکل خاموش تھیں۔ کچھ تو کہتیں۔ شاید میرا رویہ بدل جاتا۔“ اس نے شفقت سے اس کے کانپتے وجود کو تھام کر صوفے پر بٹھا دیا۔

”سنو۔۔۔۔۔ اب تم اس واقعہ کے متعلق کچھ مت سوچنا اور نہ روئو گی اب۔ سب ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا تو سحر گل پہلی بار کھل کر ہنس دی۔

ایک بھاری بوجھ شانوں سے اترتا تھا

دل پر جمی گرم ریت پر جیسے شبنم کے قطرے گرے تو ٹھنڈک سارے وجود میں پھیل گئی۔

”مجھے معاف تو کر دینا سحر! تم نے؟“ فرداں اپنے اطمینان کے لئے پوچھ رہا تھا

سحر گل نے اسے محبت سے دیکھا۔

اس کا دوست، اس کا بھائی۔ بھلا وہ اس سے کیسے ناراض رہتی۔ جب اس نے اس کو معتبر کر دیا تھا۔ اس کے شانوں پر دھرے بوجھ کو اتار کر پھینک دیا تھا پھر بھلا اسے کیا شکوہ رہتا۔

”نہیں فرو! مجھے اب کسی سے شکوہ نہیں رہا بلکہ میرے دل پر اب کوئی بھی بوجھ نہیں رہا۔ تم نے مجھے معتبر کر دیا۔ مجھے اپنی اور خود میری نظروں میں اونچا کر دیا۔“ وہ کھلے دل کے ساتھ بولی تو فروان کے لبوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ بکھر گئی۔

...☆☆☆...

وہ بھابی کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی جو اس کے فیصلے پر شدید حیران تھیں۔

”کیوں چھوڑ دی آخر تم نے یونیورسٹی؟ کم از کم ایم اے کا پریویس تو مکمل کر لیتی۔“ ان کی یہی گردان تھی مگر اس کے پاس ایسا کوئی جواب نہیں تھا جس سے بھابی مطمئن ہو سکتیں۔ اور اصل جواز وہ بتانا نہیں چاہتی تھی۔

ریحان پر اچہ کی حرکت نے اسے یونیورسٹی سے ایسا بدل کیا تھا کہ وہ سہم کر رہ گئی تھی۔ اور پھر شامل خان کو اس نے جب اپنا یہ فیصلہ سنایا تو اس نے قطعاً کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ اس کی آنکھوں میں طمانیت سی اتر آئی تھی اور اس نے اپنی اس طمانیت کا اظہار بھی بلا جھجک کیا تھا۔

”میں جامعہ چھوڑ رہی ہوں شامل خان!“ اس نے کیفے کے پُر سکون گوشے میں بیٹھے ہوئے اُسے بتایا۔

”ہوں۔۔۔ کچھ اڑتی اڑتی خبر مجھ تک پہنچی تو ہے شاید تمہاری فرینڈز کی طرف سے۔“ اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”وجہ نہیں پوچھیں گے؟“ وہ اس کے سکون پر حیران ہوئی تھی۔

”وجہ مجھے معلوم ہے۔ اور یقیناً تم نے بہتر سوچ کر ہی فیصلہ کیا ہو گا۔“ اس نے اسے بغور دیکھا۔ ”ویسے تمہارا فیصلہ مجھے اچھا لگا۔ ایک بات کہو ہشمنہ! میں خود چاہتا تھا کہ تم یونیورسٹی چھوڑ دو۔ اس تمام جھنجٹ سے نکل جاؤ۔ تم

یہاں رہتیں تو یقیناً پ سیٹ رہتیں۔ گزرے واقعات تمہارے لئے پریشانی کا سبب رہتے۔ اور پھر مجھے تم اتنی تعلیم یافتہ ہی کافی ہو۔ اس سے زیادہ میں تمہاری ڈگریوں اور ذہانت کا متحمل نہیں ہو سکوں گا۔ کیوں۔۔۔ کیا خیال ہے؟“ اس کا آخری جملہ پُر مزاح تھا اور نگاہوں میں ایسی گرم جوشی تھی کہ ہشمنہ کے رخسار تپ اٹھے۔ اس نے ان سب سبب نگاہوں کی محویت سے گھبرا کر اپنا سر جھکا لیا۔

”اشٹارا کو بھی شہر میں آکر پڑھنے کا بہت شوق تھا۔“ اس نے کہا تو ہشمنہ نے چونک کر سر اٹھایا۔

”اشٹارا۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ میری بہن ہے۔ بہت معصوم اور پیاری سی۔“ اس کے لہجے میں ڈھیر ساری چاشنی گھل گئی تھی۔ اشٹارا کا تصور ذہن میں آتے ہی وہ اسے شدت سے یاد آگئی۔

”پھر اسے شہر کیوں نہیں لائے آپ؟“ اس نے بے حد دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

اشمل خان کی بہن یقیناً اس جیسی ہی دلکش اور دل موہ لینے والی ہو گی۔ وادی کی معصوم بھالی لڑکیاں تو اسے ہمیشہ سے ہی اچھی لگتی تھیں۔ خود اسے اپنی کزن شاندا نہ دل و جان سے عزیز تھی۔

”اُسے اجازت نہیں ملی اور میں بھی نہیں چاہتا تھا۔ تم یہ مت سمجھنا کہ میں عورتوں کی تعلیم کے خلاف ہوں۔ یا بیک ورڈ ہوں۔“ وہ مسکرایا۔ ”بس یہ سمجھ لو کہ کچھ ہمارے یہاں کی روایتیں اور کچھ اصول ہیں۔ اور پھر ہم مردوں کی

پرورش اس انداز سے کی جاتی ہے کہ ہم اپنی ماں، بہن اور بیٹی کو اپنی بہت قیمتی شے سمجھتے ہیں۔ اپنے سر کی پکڑی، عزت سمجھتے ہیں۔ اور جس طرح عزت اور کسی قیمتی شے کی حفاظت کی جاتی ہے نا، بس اسی طرح ہم اپنی عورتوں کی

حفاظت کرتے ہیں۔ اسے سنبھال کر، دنیا کی نگاہوں سے چھپا کر، بچا کر۔ ہاں، مگر اتنے روشن خیال ضرور ہیں کہ انہیں ان کے حق سے محروم نہیں کرتے۔ انہیں بنیادی تعلیم ضرور حاصل کرنے دیتے ہیں۔ اشٹارا نے بھی میٹرک



کیا ہے۔ ہاں، اگر ہماری وادی یا قرب وجوار میں کوئی کالج ہوتا تو اسے ضرور اس کا شوق پورا کرنے دیا جاتا۔“ اس نے پہلی بار اشتار کے بارے میں اسے تفصیل سے بتایا۔ اپنے مزاج اور روایتوں کے بارے میں۔

”ہاں۔۔۔۔۔ نے بھی مجھے خاندان والوں کی نادر اضگی مول لے کر یونیورسٹی میں ایڈمیشن دلوا یا تھا۔ ایم۔ اے کرنا میرا خواب تھا۔“ ہشمنہ نے کہا۔

”تھا۔۔۔؟“ اُس نے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ ہنس دی۔

”جی۔۔۔۔۔ تھا۔ کچھ خواب ایسے ہوتے ہیں کہ گزرے واقعات اور بدلتے حالات ان کے حصول کی شدت کو ختم کر دیتے ہیں اور پھر ان کے ٹوٹنے یا بکھرنے پر غم نہیں ہوتا۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے پلکیں جھپکادیں۔

”کیا ہر خواب کے ساتھ یہ ہو سکتا ہے؟“ اشمل خان کا جملہ معنی خیز تھا۔

”ہو بھی سکتا ہے۔ مگر کچھ ہمارے اختیار میں بھی ہوتا ہے کہ ہم ایسے حالات ہونے ہی نہ دیں۔“

”مگر ہشمنہ ابرار! میں خواب نہیں دیکھتا۔ میں عزم رکھتا ہوں اور تمہیں بھی پانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ جانتی ہو جو بہت شدت کے ساتھ کسی کو چاہتے ہیں وہ اسے پانے کے صرف خواب

نہیں دیکھتے، پالینے کا عزم بھی رکھتے ہیں۔ اور مجھے تو اپنی چیز حاصل کرنا ہی نہیں، چھین لینا بھی آتا ہے۔“

’اوہ۔۔۔۔۔ اشمل خان! یہاں تو تم وہی مغرور شخص بن گئے۔‘ وہ اُسے دیکھتی رہ گئی۔

اس کی آنکھوں میں محبت کا نشہ ٹوٹ کر بکھرا تھا۔

ہشمنہ ابرار کو پالینے کا عزم چمک رہا تھا۔

اس کی رگ رگ میں طمانیت انگیز ٹھنڈک سرایت کر گئی۔

”تم تو اندر سے وہی پہاڑی نوجوان ہو! اشمل خان! جس کے عزائم بھی پہاڑ جیسے ہوتے ہیں۔“ اُس نے سوچا پھر دھیرے سے بولی۔

”خدا حافظ۔“

”میں تم سے یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھ سے ملنے جامعہ میں آتی رہنا۔ اس لئے کہ مجھے بھی تمہاری عزت بے حد عزیز ہے۔۔۔۔۔ بہر کیف آواز کا رشتہ تو قائم رکھ سکتی ہوں۔“ اس کا اشارہ فون کی طرف تھا۔ وہ ہنس دی۔ مگر ایک عجیب سی اداسی اس کے دل پر محیط ہونے لگی۔

اور پھر یہ اداسی یونیورسٹی چھوڑنے کے کئی دن بعد تک اس پر طاری رہی۔ کتنی شدتوں سے اشمل خان یاد آتا تھا مگر وہ اس سے ملنے جا کر رسوائیوں کے دراپنے لئے کیسے کھول لیتی۔

اُسے جامعہ چھوڑنے کا پچھتاوا ہر گز نہ تھا بلکہ وہ مطمئن تھی۔ اشمل خان نے اس کے فیصلے کو سراہا تھا۔ اپنی محبت کا کتنا مضبوط اظہار کیا تھا اس نے۔

کوئی خدشہ، کوئی واہمہ بھی تو پاس نہ تھا۔

وہ کتنی مطمئن، سرشار تھی۔ اس کی آنکھوں کے بدلتے، مہکتے رنگ بہت انوکھے اور سچیلے تھے۔ تو پھر بھابی کیونکر نہ چونکتیں۔ وہ زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکیں۔ اور بالآخر ہشمنہ نے انہیں اپنا ازداد بنا لیا۔

دل کی سرزمین پر چلنے والی نئی ہوائوں کا انہیں شریک بنالیا۔

یہ سب بتاتے ہوئے اس کی بھونر اسی آنکھوں میں اشمل خان کے نام کے جذبے مہکنے لگے تھے۔ لبوں کی مسکراہٹ میں شرمیلا پن سمٹ آیا تھا۔

بھابی کتنے ہی لمحے ششدر رہیں۔۔۔ یہ انکشاف ان کے لئے کسی دھماکے سے کم تو نہ تھا۔

کہاں وہ اشمل خان کے نام سے الرجک تھی، اس کی حمایت میں بولنے والے کو مارنے پر تل جاتی اور اب یہ عالم کہ اشمل خان کے نام سے چہرے پر بہاریں آکر ٹھہر جاتیں۔

”ہائے ہشمنہ! میں اس بات پر ایمان لے آئی کہ محبت کا حملہ اچانک اور بالکل غیر متوقع ہوتا ہے۔ نہ پہلی نظر نہ دوسری۔۔۔ یہ تو بس اچانک دل کی زمین سے پھوٹ نکلتا ہے۔“ بھابی نے گہرے گہرے سانس لے کر صوفے کی پشت پر سر رکھ دیا پھر مسکرا کر نیم وا آنکھوں سے اس کے گل رنگ چہرے کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

”تو یونیورسٹی پھر تم نے بڑے غلط وقت پر چھوڑی۔“

”کیا مطلب؟“ وہ قطعی نہ سمجھتے ہوئے بھابی کو دیکھنے لگی۔ پھر جیسے ان کی بات کا مفہوم سمجھ گئی تو جھینپ کر ان پر جھپٹی۔

”آپ ایسی لڑکی سمجھتی ہیں مجھے؟“

”ارے۔۔۔۔۔ بھئی میں کہہ رہی تھی کہ اب بھلا تم دونوں ایک دوسرے سے کہاں مل سکو گے؟“ بھابی اس کے خطرناک ارادے بھانپ کر جلدی سے صوفے سے اٹھ کر دور بھاگیں۔

”یعنی آپ سمجھتی ہیں کہ میں ہر وقت اس کے ساتھ محبت بھری ملاقاتیں کرتی رہی تھی۔ یاب جانوں تو کروں۔“ وہ یک بیک سنجیدہ ہو گئی۔ ”نہیں بھابی! محبت تو بہت پاکیزہ جذبہ ہے، اسے رسوا نہیں کیا جاتا۔ یہ دل میں جتنی زیادہ رہے اتنی ہی مقدس رہتی ہے۔ اور پھر محبت کو پروان چڑھانے کے لئے خلوص کی ضرورت ہوتی ہے، ملاقاتوں کی نہیں۔“ وہ ناراض سی ہو گئی۔ بھابی گھبرا کر بولیں۔

”ارے۔۔۔ تم تو مائنڈ کر گئی۔“

”ظاہر ہے۔ آپ نے بات ہی ایسی کہی۔ محبت اپنی جگہ مگر درس گاہوں کی عزت اور وقار بہت اہم اور میری نظر میں مقدم ہے۔“

”اچھا بابا! معاف کر دو۔“ بھابی نے دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تو وہ بے ساختہ ہنسی کو نہ روک سکی۔

”بہت بری ہیں آپ۔“ اس نے بھابی کو زور سے صوفے پر گرا لیا۔ اسی لمحے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

”دیکھ لو۔۔۔ شاید اشمل خان کا ہی فون ہو۔“ بھابی زور سے ہنسیں تو اس نے بھابی کو مصنوعی خفگی سے گھورتے ہوئے فون اٹھایا۔

دوسری طرف ندرت تھی۔

”ہیلو ہشمنہ!“

”ہاں ندرت! کیا حال ہے؟“ وہ ندرت کی آواز پہچان کر بولی۔ ”یاد آگئی میں؟“

”ہشمنہ! غضب ہو گیا۔“ ندرت اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔ اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔ ہشمنہ کا دل لرز اٹھا۔

”ک۔۔۔۔۔ کیا ہو گیا؟“

”آج صبح ہی ریحان پراچہ اور اس کے ساتھیوں نے اشمل خان کے آفس میں پچھلی کھڑکی سے زبردست فائرنگ کی ہے۔ وہ سب کے سب اندر ہی تھے۔“

”کیا \_\_\_؟“ ہشمنہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں دبا دیا ہو۔

”اشمل خان کو گولی لگی ہے اور ایک دوسرا لڑکا موقع پر ہی ہلاک ہو گیا ہے۔ اشمل خان کو احسن وغیرہ ہسپتال لے گئے ہیں۔“ ندرت اسے تفصیل بتا رہی تھی مگر اس کی سماعت اب کچھ سننے کے قابل ہی نہ رہی تھی۔

اشمل خان کو گولی لگی تھی \_\_\_ اُس کا دماغ اس خبر کو سہار ہی نہ سکا۔ وہ چکر اگئی اور لڑکھرائی۔ بھابی نے جلدی سے اسے تھام لیا اور دوسرے ہاتھ سے لٹکتا ہوا ریسیور اٹھا لیا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ ہیلو ندرت! کیا ہوا؟“

”وہ بھابی! اشمل خان کو گولی لگی ہے اور ان کا ایک ساتھی ہلاک ہو گیا ہے۔ کیا ہشمنہ بے ہوش ہو گئی ہے؟“ ندرت گھبرا گئی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ اوہ گاڈ! یہ سب کس طرح ہوا؟۔۔۔۔۔ اچھا میں فون رکھ رہی ہوں۔“ بھابی نے جلدی سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ ایک طرف ہشمنہ ان کے بازوؤں میں نیم بے ہوش تھی اور دوسری طرف ندرت نے انہیں ایک خوفناک خبر سنائی تھی کہ ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔

...☆☆☆...

فیصل ماموں کی فیملی کے آجانے سے حویلی میں رونق سی ہو گئی تھی۔ شاہ خانم بھی خاصی خوش نظر آنے لگی تھیں اور اشتار کی تو خوشی کا ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ ماہ گل آپنی نے اسے خوب گلے سے لگا کر پیار کیا تھا اور سحر گل اور وہ دونوں ایک دوسرے سے کتنی ہی دیر تک چپٹی رہی تھیں۔ یہ تو فروان کے شوخ جملے نے انہیں سب کی موجودگی کا احساس دلایا۔

”میرا کیا قصور تھا؟“ اس نے اشتار کو دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا۔

”کیا مطلب؟“ وہ پٹی۔

”بھئی سب کا اتنا پُر تپاک خیر مقدم کیا ہے اور میں بے چارہ \_\_\_“

”توبہ \_\_\_“ فروان کے جملے نے اُسے سرخ کر ڈالا۔ ”بڑے بد تمیز ہو۔ تمہیں تو سب سے پہلے سلام کیا تھا چونکہ تم ہی سب سے پہلے اندر تشریف لائے تھے۔“

”اوہ \_\_\_ اچھا \_\_\_ میں تو بھول ہی گیا کہ سب سے پہلے مجھے ہی سلامیاں دی گئی ہیں۔ بس سات توپوں کی سلامی رہ گئی تھی۔“ وہ ہنستا ہوا شاہ خانم کے پاس جا بیٹھا۔

”کتنا اچھا لگتا ہے جب تم سب آتی ہو۔ اشتار اتودن گنتی رہتی تھی کہ نہ جانے ممانی کب آئیں گی۔“ شاہ خانم بولیں۔

”ہاں \_\_\_ اسے تو بس آنا ہی نہیں ہے۔ اور ادھر یہ اشمل بھی تو دیکھو کتنا اجنبی بنا بیٹھا ہے۔ ایک شہر میں رہتے ہوئے مجال ہے جو ادھر آ نکلا ہو۔ بس فون ہی کھڑکا دیتا ہے کبھی کبھی۔“ ممانی جان ہمیشہ کی طرح اشمل کا شکوہ بھی زبان پر لے آئیں تو سب مسکرا دیئے۔

”اب تو یونین کے صدر ہو گئے ہیں۔ اب تو اتنا اور بھی ناممکن ہو گیا ہے۔“ ماہ گل نے ہنس کر کہا۔

”ارے رہنے دو \_\_\_ ایک بار ملاقات تو ہو جائے۔ میں تو خوب کان کھینچوں گی اس کے۔ کیوں شاہے!“ ممانی جان کی بات پر شاہ خانم نے سر ہلادیا۔

”ویسے اشمل لالہ کے خلاف ڈھیر سارے شکوے جمع ہو گئے ہیں سب کے پاس۔ شاہ خانم تو پہلے ہی ان کے حویلی کم آنے پر خفا رہتی ہیں۔ ادھر آپ کے شکوے۔ اور اب تو بابا خان بھی ان کے یونین کے صدر بننے پر کچھ پریشان سے ہیں۔“ اشتار نے مسکرا کر کہا تو فروان نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔



”تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔۔۔ تم سے بھی خوب گلے ہیں ہم شہر والوں کو۔ تمہیں تو اتنا ہی نہیں ہے۔ ویسے سوچا ہے اب کے ایک بار ہی پکڑ کر لے جائیں گے۔“ اس کا جملہ ذو معنی اور دھیمّا تھا جسے دور بیٹھی شاہ خانم اور ممانی جان نہ سن سکیں۔ البتہ ماہ گل اور سحر گل ہنس پڑیں جب کہ اشارانے اس کا مفہوم نہ سمجھتے ہوئے مسکرانے پر اکتفا کیا۔

”چلو گی نا؟“ اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارے رنگ اتر آئے اور اس سے پہلے کہ وہ اشارا کے چہرے کو حصار میں رکھتے ہوئے کوئی اور ذو معنی جملہ کہتا، ماہ گل نے اسے گھورا۔

شام تک اشارانے سحر گل کے ہمراہ حویلی کے لان میں گھومتے ہوئے ڈھیر ساری باتیں کر لی تھیں۔ ماہ گل آپنی بھی اپنے گڈو کے ساتھ ان دونوں کو ٹہلتے ہوئے اور ہنستے ہوئے دیکھتی رہیں۔

یہ سب کچھ اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ دل میں چھائی اُداسی کسی حد تک کم ہو گئی تھی۔ وہ یہاں خود کو ماضی سے نکال کر حال کی رنگینیوں میں اونچے اور لا پر واہ قہقہوں میں زندہ کرنے آئی تھی۔ اشارا کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں بہت سا پیار اتر آیا۔

سنہری سنہری آنکھوں والی یہ معصوم اور دلکش لڑکی اسے بے حد عزیز تھی۔ یقیناً اس کے اونچے لائے بھائی فروان کے ہمراہ بہت چچے گی۔ فروان سے ایک سال بڑی ہونے کے باوجود وہ نازک سی لڑکی فروان کے مقابلے میں کتنی چھوٹی سی لگتی تھی۔ فروان ہر گز اس سے چھوٹا نہیں لگتا تھا۔ اور پھر فروان کی آنکھوں میں چمکتی محبت جو خالص اشارا کے لئے تھی ان سے چھپی تو نہ تھی۔

آہ یہ محبت بہت خوبصورت حقیقت ہے۔

چاہے میاں بیوی کے درمیان ہو۔ بہن بھائی یا اولاد سے ہو۔ محبت کے دم سے ہی تو رشتوں میں خوبصورتی اور دلکشی

پیدا ہوتی ہے۔

”کیا سوچ رہی ہیں آپنی؟“ اشارا اس کے قریب آکر بیٹھی تو وہ چونکی اور پھر اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

”سوچ رہی ہوں کہ حُسن، معصومیت اور پیار بھر ادا اگر ایک شخصیت میں سما جائے تو وہ شخصیت واقعی چاہے جانے کے قابل ہوگی۔

”آپنی! بھلا ایسی شخصیت کس کی ہے؟“ اس نے گڈو کو ان کی گود سے لے کر دلچسپی سے پوچھا۔

”تمہاری۔“

”کیا۔۔۔؟“ وہ ان کی اس تعریف پر بری طرح جھینپ گئی اور ہنس کر بولی۔

”آپ تو بے وقوف بنانا خوب جانتی ہیں آپنی۔“ اس نے گڈو کے سر پر چہرہ ٹکاتے ہوئے جھینپے لہجے میں کہا تو ماہ گل زور سے ہنس دی۔

”قطعاً نہیں۔۔۔ میں سچ بولتی ہوں۔ اور اشارا اسی عادت کی وجہ سے۔۔۔۔۔“ وہ یک بیک سنجیدہ ہو گئی۔

”آپنی! آپ اور اشارا ابھائی بلا تقصیر سزا پا رہی ہیں۔ کیا اس کا حل نہیں۔۔۔ کتنی کمزور ہو گئی ہیں آپ؟“ اشارانے اسے غور سے دیکھا۔ اس کا دل کٹ سا گیا۔ اس کی پیاری، من موہنی سی آپنی کس قدر مرجھا گئی تھیں۔

”ارے۔۔۔ یہ سحر کہاں چلی گئی؟ ابھی تو تمہارے ساتھ ٹہل رہی تھی۔“ اس نے جیسے اس کا جملہ نظر انداز کر دیا۔

”اُسے نیند آرہی تھی، زبردست۔ دوپہر کو تو اسے میں نے سونے نہیں دیا۔ خوب جگا کر باتیں کیں۔ اب معاف کر دیا ہے۔“ وہ یہ کہہ کر ہنس دی۔ ”باتیں تو کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ میں نے کہا ابھی سولو، رات کو خوب باتیں ہوں گی۔

آپ سے بھی خوب باتیں کرنی ہیں مجھے۔“

”ہاں ضرور۔۔۔ مگر اشترا! مسعود شاہ کے متعلق کچھ مت پوچھنا مجھ سے۔ وہ سب کچھ بھول جانے کے لئے ہی یہاں آئی ہوں۔“ اس نے نرم مگر سنجیدہ لہجے میں کہا پھر ان کی نگاہ اس کی گود میں بیٹھے گڈو پر پڑی تو وہ چونکی۔

”ارے دیکھو تو ذرا۔۔۔ کس قدر مزے سے تمہاری گود میں چڑھ کر بیٹھا ہے۔ ماما کو اتنی جلدی بھول گیا۔ مانوس جو ہو گیا ہے تم سے شاید۔ تمہاری صورت پسند آگئی ہے اسے۔“ ماہ گل نے اسے چھیڑا۔ اسی لمحے ان کی نظر اچانک انیکسی کے دروازے سے نکلتے ہوئے ذولین خان پر پڑی تو وہ چونکی۔

”یہ شخص۔۔۔؟“ ماہ گل نے اشترا کی سمت دیکھا تو اس کے خوبصورت لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”یہ ذولین خان ہیں۔ فیروز چچا کے بیٹے۔ آئیے میں آپ کو ان سے ملوانوں۔“ وہ کھڑی ہو گئی اور جلدی سے گڈو کو اٹھا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ ماہ گل بھی بادل ناخواستہ اٹھی، اس کے ساتھ چلی آئی۔

”ذولین خان!“ اشترا نے اسے پکارا تو وہ رک گیا اور پلٹا۔ ماہ گل اسے دیکھ کر ایک لمحے کو مسحور ہوئے بنانہ رہ سکی۔ سبز زمر دیں آنکھیں قریب سے اور بھی حسین لگیں۔ وہ انہیں اشمیل خان کی عمر کے لگ بھگ محسوس ہوا۔

”یہ ماہ گل آپ ہیں۔ میری ماموں زاد۔“ اشترا نے تعارف کروایا تو اس نے سرسری انداز میں ماہ گل کو دیکھا اور سلام کیا۔ ماہ گل مسکرا دی۔

”کبھی دیکھا نہیں ہے آپ کو۔“

”ارے تو آپ کون سی یہاں روز آتی ہیں۔“ اشترا جلدی سے بولی اور پھر ذولین کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”یہ ان کا بیٹا ہے۔ کتنا پیارا ہے نا۔۔۔ مجھ سے آتے ہی مانوس ہو گیا ہے۔“ اس کی معصومیت پر ذولین خان کے لبوں پر

مسکراہٹ بکھر گئی اور آنکھوں میں ایک پیاری سی چمک لہرا گئی۔

”پھر تو اسے دور ہی رکھنا خود سے۔“ اس کا جملہ بے ساختہ تھا اور نگاہیں اشترا پر مرکوز، محبت کا ایک خزانہ لٹائے دے رہی تھیں۔ ماہ گل بری طرح چونکی۔

”میرا خیال ہے مجھے اب جانا چاہئے۔ سوری! مجھے کچھ جلدی ہے ورنہ۔۔۔“ ذولین خان نے کار کی چابی انگلی میں گھماتے ہوئے معذرتی لہجے میں کہا اور ایک بھر پور نظر اشترا پر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ اشترا کا چہرہ ابھی تک سرخ ہو رہا تھا۔ وہ ذولین خان کو جانا دیکھتی رہی، پھر بولی۔

”کیسا لگا آپ! ذولین خان؟“ اس نے ماہ گل سے پوچھا جو ابھی تک عجیب سے احساس میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ذولین خان کی آنکھوں میں پنہاں رنگ ان سے مخفی نہ رہے تھے اور اشترا کی شرمیلیں مسکراہٹ تو اتنی واضح تھی کہ وہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکیں۔ وہ کم فہم یانا سمجھ تو ہر گز نہیں تھیں۔ ایسے جذبے تو کبھی ان کے دل میں بھی مچلے تھے۔ یہ نرم و نازک احساسات تو آنکھوں سے چمکتے ہیں۔ مسکراہٹ میں گھلے ہوتے ہیں۔

”آپ مائنڈ مت کیجئے۔۔۔ وہ کچھ سنجیدہ سا ہے اور پھر زیادہ باتیں کرنے کا عادی نہیں ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ آں۔۔۔۔۔ نہیں، نہیں بھئی۔“ اشترا کی آواز پر جیسے وہ عالم خود شناسی میں آگئیں۔ ”بھلا اس کا اور میرا کیا رشتہ ہے کہ وہ مجھ سے بے تکلفانہ باتیں کرتا۔ ویسے شاندار پر سنیلٹی ہے۔ تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔“ انہوں نے یہ کہتے ہوئے اشترا کو بغور دیکھا جیسے اس کے اندر جھانک لینا چاہتی ہوں کہ جو انہوں نے محسوس کیا تھا وہ ان کا وہم تو نہیں۔ مگر ذولین خان کی تعریف پر اشترا کے چہرے کی بدلتی رنگت نے ان پر سب کچھ واضح کر دیا۔ انہوں نے ایک گہری سانس سینے کی تہہ سے کھینچ کر آزاد کی۔

اب وہ اچھی طرح جان چکی تھیں کہ اشترا اور ذولین خان کا آپس میں عم زاد کے علاوہ بھی ایک بہت خوبصورت اور

رنگین رشتہ قائم ہے۔

دھیمی دھیمی لودیتی محبت جو دونوں پر پوری طرح قابض تھی۔

☆☆☆...

یہ حملہ بالکل غیر متوقع اور شدید تھا۔ ان میں سے کسی کے گمان میں نہ تھا۔ وہ یوتھ فیڈریشن کے آفس میں دھرنا مارے بیٹھے تھے۔ اشمل خان نے سارے ممبرز کو بارہ بجے کا ٹائم دیا تھا۔ تمام درپیش مسائل کا وہ مل کر حل ڈھونڈنا چاہ رہے تھے۔ ان میں سر فہرست مسئلہ فلاسفی کی کلاس کا تھا۔ اسٹوڈنٹس سر عثمانی کے خلاف بائیکاٹ کئے ہوئے تھے اور ادھر سر عثمانی بھی اپنی ناک کا مسئلہ بنائے ہوئے بیٹھے تھے۔

احسن تو گیارہ بجے سے ہی آفس میں آ بیٹھا تھا اور نعیم جان اور شہزاد اس بات پر ہنس رہے تھے۔

”ایمان سے یاد! تم نہایت فضول انسان ہو۔ شرم کرو۔“

”ارے شرم ہی تو نہیں آتی۔“ افتخار نے اس کے دونوں شانوں کو پکڑ کر دباؤ ڈالا۔

”دیکھ لو۔۔۔ پھر بھی اشمل خان کا منظورِ نظر ہوں۔“ احسن نے اس کے دونوں ہاتھ جھٹک کر گویا نیا انکشاف کیا۔

”خوب۔۔۔ زبردستی مسلط ہو۔“ نعیم جان نے زبردست قہقہے کے ساتھ کہا اور اس سے پہلے کہ احسن جوابی کارروائی کرتا، اشمل چند لڑکوں کے ہمراہ اندر داخل ہوا اور بالکل اسی لمحے آفس کی پچھلی کھڑکی سے زبردست فائرنگ ہوئی۔

وہ سب بوکھلا اٹھے۔

اشمل خان نے جھک کر خود کو بچانا چاہا مگر ریحان پر اچہ کا نشانہ خطانہ ہوسکا اور سنسناتی گولیاں اس کے دائیں بازو اور پیر

کو روند گئیں۔

اس اچانک فائرنگ نے جامعہ میں ہلچل مچادی۔ ایم اے پریویس کا اسٹوڈنٹ شہباز خان، ریحان پر اچہ کی گولی سے موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ وہ ابھی نیا نیا ہی یوتھ فیڈریشن میں شامل ہوا تھا اور اب اس کا جسم آفس کے فرش پر خون سے لت پت پڑا تھا۔

پانچ منٹ تک فائرنگ ہوئی اور وہ سب پچھلی طرف سے نکل گئے تھے۔

ریحان پر اچہ سب کی نگاہوں کی زد میں آ گیا تھا مگر اس وقت کسی کو بھی اس کے پیچھے جانے کا ہوش نہ تھا۔ اشمل خان اور شہباز کی حالت نے سب کو ہراساں کر دیا تھا۔

نعیم جان اور احسن جلدی جلدی ان دونوں کو گاڑی میں ڈال کر ہسپتال کی جانب روانہ ہو گئے۔

یہ روح فرسا خبر ہشمنہ کوندرت نے دے دی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر بھابی کے بازوؤں میں لیٹی روتی رہی۔ پھر بہ مشکل خود کو سنبھال کر کھڑا کیا اور ندرت کا فون نمبر ملا کر اس سے ہسپتال کا نام پوچھا۔ بھابی نے اُسے روکا مگر وہ نہ مانی۔

”بھابی! پلیز مجھے مت روکنے۔ نہ جانے اشمل خان کس حال میں ہو گا۔ میں ریحان پر اچہ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ وہ آنسو پیتی الماری سے اپنی چادر نکال کر اوڑھنے لگی۔

”دعا کیجئے گا بھابی۔۔۔“ اُس نے ریک سے چابی اٹھاتے ہوئے رندھے لہجے میں کہا اور گھر سے باہر بھاگی۔

دل سینے کی دیواریں توڑ کر باہر نکلنے کو بے قرار ہو رہا تھا۔ دماغ کی رگیں چٹختی جا رہی تھیں۔

گاڑی کا نپتے ہاتھوں سے بار بار پھسلتی بالآخر ہسپتال گیراج میں جا کر کی۔ اسے زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑی تھی۔ ایمر جنسی کو آئے چونکہ آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا۔ اس کی جامعہ کے کئی اسٹوڈنٹس بھی راہداری میں نظر آ رہے تھے۔



”اش-ش-مل-یہ سب کیسے ہو گیا؟“ وہ اس کے قریب آئی تو ضبط کا یار نہ رہا۔ آنکھیں آنسوؤں کا  
 بوجھ نہ سہہ سکیں۔ وہ بلک اٹھی۔

انتابڑ اسانحہ گزر گیا۔ سینے کی چار دیواری اس بوجھ کو برداشت نہ کر پا رہی تھی۔

وہ تو خوشگوار یادوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ کب گمان گزرا تھا کہ چند گھنٹوں کے اندر ہی اشمٰل خان کو ایسی حالت میں دیکھے گی۔

اُف خدایا

”ارے، ارے، ہشمنہ۔۔۔۔۔“ اشمل خان بے پناہ تکلیف کو پرے دھکیل کر مسکرایا۔ ”یہ کیا بھئی  
\_\_\_\_\_ تم تو بہادر لڑکی ہو۔ یہ کس طرح کا مظاہرہ کر رہی ہو \_\_\_\_\_ بس۔“ اُس نے اُسے سرزنش کی۔ ہشمنہ نے بھیگی  
پلکیں اٹھا کر اس کے ہنستے ہوئے چہرے کو دیکھا جہاں سرخی کی جگہ زردی پھیل گئی تھی۔ آنکھیں اور چہرہ اس تکلیف کا  
واضح ترجمان تھا جسے وہ چھپانے کی سعی کر کے جبراً مسکرا رہا تھا۔

“بلیطو”

”اشتمل \_\_\_\_\_ کیا یہ سب ریحان پر اچہ \_\_\_\_\_“

”ہاں۔۔۔ مگر ہشمنہ! دکھ تو شہباز خان کا ہے۔ وہ لڑتا ہوا موقع پر ہی ہلاک ہو گیا ہے۔ ریحان پر اچہ نے میری دشمنی میں اُسے ضائع کر دیا۔ میں بہت دکھی ہوں اس کی موت پر۔“ شہباز خان کی موت پر اشمیل خان سخت ملول ہو رہا تھا۔ اسے جب احسن نے بتایا کہ وہ بچ نہ سکا تو اس لمحے اسے اپنے سارے زخم بے حد معمولی لگے۔ ان کی ساری تکلیف زائل ہو کر صرف شہباز کا غم جسم و جان پر ہلکورے لینے لگا تھا۔

شہباز خان موقع پر ہی دم توڑ چکا تھا۔ اس کی ڈیڈ بوڈی کو اسٹریچر پر رکھ کر کمرے سے باہر نکالا جا رہا تھا۔ سارے اسٹوڈنٹس اس کے پیچھے لپکے اور وہ دم سادھے راہداری کے کنارے کھڑی رہ گئی۔

ایک گہری خاموشی اور مہیب اُداسی پوری راہداری میں چھائی ہوئی تھی۔ صرف قدموں کی آوازیں تھیں جو اس کے قریب سے ہوتی ہوئی دور جا رہی تھیں۔ اچانک اُسے احسن نظر آیا جو ایک کمرے سے نکل کر اسی طرف آ رہا تھا۔ وہ تیزی سے اس کے قریب آئی۔

”احسن“

”ارے آپ \_\_\_\_“ احسن اسے دیکھ کر رک گیا۔ پھر اس کی آنسوؤں سے بھری آنکھوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”ایم اے پریویس کا شہباز خان ہے۔ ڈیپتھ ہو گئی ہے اس کی۔ اشمل خان اس کمرے میں ہے۔“ اس نے اپنے دائیں طرف کے کنارے والے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ”شکر ہے وہ بچ گیا۔ اسے گولی پیر اور بازو پر لگی ہے۔“

”اُف خدا یا! یہ سب کیسے؟“

”شش\_\_\_\_ یہ وقت باتوں کا نہیں۔ آپ جائیں۔ وہ ہوش میں آگیا ہے۔ میں ذرا شہباز کے گھر تک جا رہا ہوں۔ ایک گھنٹہ تو لگ ہی جائے گا مجھے واپسی میں۔“ احسن یہ کہہ کر سرعت سے راہداری عبور کر گیا۔

وہ سینے میں سسکیاں دبائے احسن کے بتائے ہوئے کمرے میں آئی تو ضبط کا بندھن ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

وہ بستر پر دراز تھا۔ دایاں پیر اور بایاں بازو سفید پٹیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ دائیں بازو سے خون چڑھ رہا تھا۔ وہ آنکھیں موندے ہوئے تھا۔ سرخ و سفید چہرہ اس وقت خطرناک حد تک پیلا ہو رہا تھا۔



”اُسے ابھی زندہ رہنا تھا، بہت زیادہ۔ اُس کے خیالات، اُس کے ارادے بہت اعلیٰ اور بلند تھے۔ مجھے تا عمر اس سرمائے کے ضائع جانے کا دکھ رہے گا۔ میں ریحان کو اب معاف نہیں کروں گا۔ اسے سزا سے بچنے نہیں دوں گا، ہشمنہ! میں اس کے خلاف گواہی دوں گا۔ شہباز کے قاتل کو اب بچنا نہیں چاہئے۔ اگر وہ قانون سے بچ بھی گیا تو میرے ہاتھوں اُسے موت ملے گی۔“ اس کا لہجہ آگ ہو گیا تھا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں ریحان پر اچھ کے خلاف نفرت ہی نفرت تھی۔

درد کی تپش ہشمنہ کو جھلسائے دے رہی تھی۔ مگر اس وقت اشمل خان کو ہر درد سے، ہر اذیت ناک سوچ سے دور رکھنے کی ضرورت تھی۔ اُسے ذہنی سکون کی ضرورت تھی۔ بے تحاشا خون بہنے کی وجہ سے وہ جسمانی طور پر کمزوری اور تھکن محسوس کر رہا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ وہ لبوں سے اس کا اظہار نہیں کر رہا تھا مگر چہرہ اس کی تکلیف کا غماز تھا۔

”اشمل پلیز\_\_\_ خود کو ریلیکس رکھئے۔“ اس نے اپنے بے آواز بہتے آنسوؤں کو بمشکل روکتے ہوئے کہا تو اشمل خان نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ از حد نڈھال اور پریشان تھی۔ چہرہ اندرونی جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے اپنے قریب رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ بتاؤ تمہیں اس کی اطلاع کس نے دی\_\_\_ تم یونیورسٹی گئی تھیں؟“

”نہیں، ندرت نے مجھے فون پر بتایا۔“ وہ کرسی پر بیٹھ کر دل گرفتہ لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھوں میں وہ منظر گھوم گیا جب وہ خوبصورت جذبوں سے سچی آنکھوں کو جھکا کر بھابی کے سامنے وہ از طشت از بام کر رہی تھی اور بھابی کس درجہ شرارت سے اسے دیکھ کر چھیڑ رہی تھیں۔

پھر اچانک وہ اشمل کے ہاتھوں پر چہرہ جھکا کر بلک اٹھی۔ آنسوؤں کا ایک سمندر تھا جو آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔

”ارے بھئی ہشمنہ!“ اشمل خان اس کے رویے پر ایک دم گھبرا گیا۔

”اشمل خان! کاش\_\_\_ یہ سارے زخم آپ کے جسم پر پڑنے کی بجائے میرے جسم پر لگتے۔ میں جانتی ہوں ریحان پر اچھ نے اس دن کا بدلہ لیا ہے آپ سے۔ وہ مجھے اغواء کر کے بھی

اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اور یہ آپ کی وجہ سے ہوا تھا۔ میری وجہ سے وہ آپ کا جانی دشمن بن گیا ہے۔ صرف اور صرف میری ذات نے یہ ڈھیر سارا دکھ اور تکلیف دی ہے۔ یہ ساری اذیت تو مجھے ملنی چاہئے، آپ کو تو نہیں۔“ ہشمنہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

”بالکل پاگل ہو تم۔ یہ خود ساختہ سوچیں ہی تمہاری۔ سنو! حق! وہ صرف اور صرف مجرم ہے اور ایک دہشت گرد۔ اس کے لئے کسی جواز کی ضرورت نہیں۔ اور پھر وہ اپنی شکست کی آگ بگاہے نکالتا رہا ہے اور اثرورسوخ ہونے کی وجہ سے شیر ہو گیا ہے۔ اس میں تمہارا یا میرا، کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ پھر یہ تو معمولی زخم ہیں۔ اس میں تو تکلیف بھی نہیں ہے دیکھو۔“ اس نے آہستگی سے سراونچا کیا تو ہشمنہ نے کرب سے ہونٹ بھیج لئے۔

”ہاں\_\_\_ میں جانتی ہوں، تم چٹان ہو۔ بے حد مضبوط اور بڑی سے بڑی تکلیف پر بھی اُف نہ کرنے والے۔ مگر بہر حال ایک انسان ہو گوشت پوست کے۔ ورنہ جسم اور دھڑکتا دل پتھر نہیں ہوتا۔ زخم لگنے پر تکلیف ضرور ہوتی ہے۔ ہاں مگر تم میں کمال کا حوصلہ ہے۔“

”ارے یوں کیا منہ بنائے بیٹھی ہو\_\_\_ سچ کہہ رہا ہوں کوئی تکلیف نہیں ہو رہی۔ ہاں کچھ دیر پہلے ہو رہی تھی۔ مگر تم آگئی ہو تو ایسا لگتا ہے جیسے سارے زخموں پر مرہم لگ گیا ہو۔ ساری تکلیف زائل ہو گئی ہے۔“ وہ ہنسا تو ہشمنہ کھڑی ہو گئی۔

”پلیز اشمل!“ اس نے آنسو بہاتے ہوئے رخ موڑ لیا۔ پھر اچانک پلٹی اور بولی۔

”میں آپ کے لئے سوپ وغیرہ لے کر آتی ہوں۔“

”نہیں، نہیں۔۔۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ یہاں ہاسپٹل میں۔۔۔۔۔“

”یہ آپ کی ضرورت نہ سہی مگر میری مجبوری سمجھ لیں۔ دل کی مجبوری۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے چہرہ جھکا لیا۔ اشمل خان کے گداز لبوں پر خوبصورت مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس لمحے اُسے واقعی اپنی ساری تکلیف کا احساس زائل ہوتا محسوس ہوا۔

”خود کو زیادہ متفکر مت کرو ہشمنہ!“

”جی۔۔۔“ اُس نے جھکا ہوا سر ہلادیا۔ اسی لمحے کوریڈور میں قدموں کی آواز اُبھری تو وہ قدرے سنبھل گئی۔

نعیم جان اور افتخار اندر داخل ہوئے تو ہشمنہ کو دیکھ کر دونوں بہ یک وقت ٹھٹکے۔

”اُلو۔۔۔۔۔ اُلو نعیم جان!“ اشمل ان دونوں کو رکتے دیکھ کر پکارا تو وہ دونوں قریب آگئے۔

”شہباز کے باپ نے ایف آئی آر درج کرائی ہے ریحان پر اچہ کے خلاف۔“

”ہاں یاد! اس کی ماں تو رو کر پاگل ہو رہی ہے۔ ایک ہی بیٹا تھا اس کا۔“ افتخار اس کے قریب رکھی کر سی پر بیٹھ گیا۔

”ہوں۔۔۔ بہت اچھا کیا۔ میں گواہی دوں گا ریحان کے خلاف۔ میں اُسے عدالت میں گھسیٹوں گا۔“ اشمل خان نے غراتے ہوئے کہا۔ نعیم جان اور افتخار نے اُسے دیکھا۔

”وہ اس بار بھی بچ سکتا ہے۔“

”نہیں۔۔۔ اب میں اُسے نہیں بچنے دوں گا۔ وہ قاتل ہے اور پھر وہ اثر و رسوخ کا مالک ہے تو میں بھی ایک اسٹوڈنٹ سے ہٹ کر رئیس زادہ بن کر اس کے مقابل آؤں گا۔ تم نے ابھی صرف امن پھیلانے اور درگزر کرنے والے اشمل خان کو ہی دیکھا ہے۔“

اس نے چہرہ درتچے کی طرف کر لیا اور غصہ ضبط کرتے ہوئے لب بھینچ کر آنکھیں موند لیں۔ نفرت سے اس کی گردن کی رگیں پھول گئی تھیں اور آنکھوں میں خون اُترتا محسوس ہو رہا تھا۔

ہشمنہ چند ثانیے یہ سب دیکھتی اور سنتی رہی اور پھر آہستگی سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

...☆☆☆...

یہ گہری اور مہیب تنہائی انہیں مارے دے رہی تھی۔ ان سب کے جانے سے گھر میں جیسے وحشت سی برسنے لگی تھی۔

فروان اور سحر گل کی شرارتیں۔۔۔ ماہ گل کی دھیمی مسکراہٹ اور گڈو کی موجودگی۔۔۔ سب ایک ساتھ ان کی نظروں سے محو ہوئے تھے۔ وہ متوحش سی ہو گئی تھیں۔

ابو صبح کے جاتے رات ہی کو آتے تھے اور زمان خان کا ہونا نہ ہونا ہمیشہ سے ان کے لئے برابر رہا تھا۔

زمان کا تصور بنتے ہی جیسے دل وزہن پر وزنی بوجھ آن گرا۔ برداشت کی بھاری سل سرکنے لگی اور آنسو نہ جانے کہاں سے آنکھوں میں لہرانے لگے۔ زیست کے اس گزرتے عرصے میں وہ ٹھہر کر سوچتیں تو روح جیسے غم و اندوہ کے بوجھ تلے سسک کر رہ جاتی۔

پیچھے دیکھتیں تو ماتمی نوے دل کو گرفت میں لینے لگتے اور آگے ڈھیر ساری ویرانی خوفناک منظر کی طرح ان کی آنکھوں کے سامنے بکھرتی جاتی تھی۔

وہ خالی ہاتھ تھی

’زمان خان! عورت تو بس محبت اور توجہ کی خواہاں ہوتی ہے۔ تم نے دونوں ہی سے مجھے محروم کر رکھا ہے۔‘

سات سال \_\_\_ یہ سات سال جیسے تپتے صحرا پر ننگے پیر چلتی رہی تھیں۔

’زمان \_\_\_ تم نے مجھے تخت سے پتھریلی زمین پر لا پھینکا ہے۔ جہاں خاردار جھاڑیوں کے سوا کچھ نہیں۔ کوئی خوشگوار جھونکا نہیں \_\_\_ ہر سمت ریت کا دریا دکھائی دیتا ہے \_\_\_ مجھے کوئی بتائے کہ یہ ہولناک منظر اپنا رخ بدلے گا بھی کہ نہیں؟ \_\_\_ کیا دکھوں کے سمندر کا کوئی کنارہ بھی ہے کہ نہیں؟ \_\_\_ کیا میری زندگی صرف موج کی صورت ہے یا اس میں کسی ساحل کا آسرا بھی ہے؟

اب تو امید کی لویں بھی تھر تھرانے لگی ہیں۔‘

انہوں نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔ پھر کھولیں تو ٹھٹک گئیں۔ سامنے وہ دشمن جاں نہ جانے کب سے کھڑا تھا \_\_\_ نگاہیں ملنے پر اس نے جلدی سے سٹیٹا کر رخ موڑ لیا تھا۔

یہ گہری خاموشی اور تنہائی دونوں ہی کو عجیب سے نامانوس احساسات سے دوچار کر رہی تھی۔

’ایک کپ چائے بنا دینا۔‘ وہ یہ کہہ کر قدم اٹھاتا ہوا اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ ایسا اجنبی انداز تھا، ایسی بے اعتنائی کہ اس کی آنکھیں سلگ اٹھیں۔

دونوں ہی مجبور ہو گئے تھے ایک دوسرے کو مخاطب کرنے پر۔

گھر میں ان کے علاوہ اور کوئی تیسرا فرد نہ تھا اور ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ ورنہ تو زمان خان چائے اور کپڑے استری کرنے اور دوسری چھوٹی موٹی چیزوں کے لئے سحر گل یا امی کو ہی پکارتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ شاردہ ہی اس کے سارے کام انجام دیتی تھی۔ مگر مخاطب وہ نہ ہوتی تھیں۔ ہمیشہ پس منظر رہتیں۔ وہ زمان خان کے ناروا سلوک کے باعث خوفزدہ رہتیں۔ مگر اب چند دنوں سے وہ دونوں ہی الجھ گئے تھے۔ زمان خان کو ہر بار اُسے ہی مخاطب کرنا پڑتا تھا۔

وہ چائے بناتے ہوئے اسی کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ خود سے الجھ رہی تھیں اور تقدیر سے شکوہ کناں تھیں۔ اب تو درد شدید ہو گیا تھا۔ گڈو، ماہ گل اور سب کی موجودگی میں ذہن بٹا رہتا تھا۔ کوئی پردہ دلہراٹھتی بھی تو کسی کے جملوں، کسی کی مسکراہٹوں میں دب کر رہ جاتی۔ مگر اب تنہائی نے شدت پیدا کی ہوئی تھی اور زمان خان کے سامنے آنے اور اس کے اجنبی رویے پر زخم ہر بار تازہ ہو جاتا۔

وہ خاصی دیر بعد چائے بنا کر قدم اٹھاتی کمرے میں آئی تو وہ باتھ روم سے نہا کر نکلا تھا۔ شانے پر تولیہ رکھے آستین کو کہنی تک فولڈ کرتے ہوئے اُسے دیکھا۔ سیاہ اور گلابی پرنٹڈ سوٹ میں وہ اُداس اُداس چہرے اور گہری گہری سنجیدگی کے ساتھ اندر آئی تھی اور کپ ایک تپائی پر رکھ دیا تھا۔

’کب تک آنے کا کہہ گئی ہیں امی؟‘ اس نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور تولیہ شانے سے اتار کر بیڈ پر بے ترتیبی سے پھینک دیا۔

’دن مقرر تو نہیں ہیں۔‘ اس نے بھی مبہم انداز میں جواب دیا اور بے ترتیب رکھا تولیہ اٹھا لیا اور باتھ روم کا کھلا دروازہ بند کیا اور پھر اس پر ایک اچھتی نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔

’آپ لچ نہیں کریں گے؟‘

’ہوں۔۔۔۔۔ آں۔۔۔۔۔ نہیں، ہوٹل سے کھا کر آیا ہوں۔‘ وہ نہ جانے کن سوچوں میں گم ہو گیا تھا، اس کی بات پر چونکتے ہوئے بولا اور ایک بار نگاہ پھر اس کے چہرے کی جانب اٹھ گئی جہاں شگفتگی کا دھواں پھیل گیا۔

’آج ہی پر کیا موقوف، کبھی بھی تو اس نے اس کے ہمراہ کھانا نہیں کھایا تھا اور وہی نادان، بے وقوف اس کی منتظر رہتی تھی۔ اس کا انتظار کرتی رہتی۔ حالانکہ ہمیشہ ہی اس طرح کے جواب ملتے تھے۔ انتظار کا صلہ کبھی اس سے مختلف تو نہ ملا تھا۔



”اخبار آج کا نہیں آیا تھا کیا \_\_\_؟“ اس کے بڑھتے قدم رک گئے۔ وہ پلٹی مگر اسی خاموشی کے ساتھ اور آگے بڑھ کر ریک کی دراز سے رول کیا اخبار نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

”صبح آپ کے جانے کے بعد دے گیا تھا۔“

اس حد تک وہ اس کا خیال رکھتی تھی۔ وہ ایک لمحے کے لئے چونکا جیسے دل کو پکڑ کر کسی نے جھنجھوڑا تھا مگر دوسرے لمحے بے حسی کی چادر تن گئی۔ اس نے رول کیا اخبار اس کے ہاتھ سے لے لیا اور پلنگ پر نیم دراز ہو گیا۔ گویا اب اخبار کا مطالعہ شروع ہو گیا تھا۔

وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس فضا میں اس کا دم گٹھنے لگا تھا۔ وہ خود کو ان افیت بھری سوچوں سے چھٹکارا دلانے کی غرض سے کچن میں آگئی اور بکھری چیزیں اٹھا اٹھا کر طریقے سے رکھنے لگی۔

”شاردا!“ وہ کچن کے دروازے تک آیا۔ وہ پلٹی۔ زمان خان قدرے پریشان سادروازے میں ایستادہ تھا۔ اخبار کا پہلا صفحہ اس کے ہاتھ میں تھا۔

”میں ذرا اسپتال جا رہا ہوں۔“

”جی۔۔۔“ وہ حیران رہ گئی۔ ”ہاسپیٹل؟“

”ہوں۔۔۔ مجھے تو خبر ہی نہ تھی۔ ابھی اخبار میں اس خبر پر نظر پڑی۔ یونیورسٹی فائرنگ میں ایک لڑکا ہلاک ہو گیا ہے اور اشمیل شدید زخمی ہے۔ مائی گاڈ۔۔۔ یہ لڑکا یہاں اسی شہر کے ہاسپٹل میں ہے اور میں اتنا بے خبر ہوں۔“ وہ یہ کہہ کر سرعت سے پلٹا۔ ”چائے اٹھا لینا وہاں سے۔“ وہ اخبار کچن کی سلپ پر رکھ کر تیزی سے باہر کی جانب نکل گیا۔

وہ اخبار کو گھورتی رہی پھر تلخی سے ہنسی۔ ’تو زمان! تم اتنے ہمدرد بھی ہو۔‘

اُس نے آگے بڑھ کر ہوا سے پھڑپھڑاتا اخبار اٹھالیا۔

”تو تم صرف اور صرف میرے لئے بے حس اور ظالم ہو۔۔۔ اشمٰل خان کی چوٹوں نے تمہیں پریشان کر دیا مگر کبھی میرے زخموں کا احساس نہیں ہوا تمہیں۔۔۔ میں، جو اندر سے بالکل مر چکی ہوں۔ میری روح کے زخم ناسور بن رہے ہیں۔ مگر تمہیں احساس نہیں رہا۔۔۔ تم بے حس ہو تو صرف میرے لئے۔ ظالم ہو، جابر ہو صرف میرے لئے۔“

اُس نے زور زور سے چیخنا چاہا مگر ساری آوازیں اندر ہی دم توڑ گئیں۔ اس پر اچانک جنون سا چڑھ گیا۔ اس نے اخبار کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے فضا میں اچھال دیئے۔

”تم۔۔۔ ہمدرد۔۔۔ نہیں، تم کسی کے لئے بھی ہمدرد نہیں ہو۔ تم فرعون ہو۔“ اس نے اپنے بال نوچ دیئے۔ ”مجھے ایک بار ہی موت دے دو زمان خان! اب یہ افیت ناقابل برداشت ہے میرے لئے۔“

وہ اچانک لڑکھڑائی۔ آنکھوں کے سامنے سیاہ دائرے بننے لگے۔ پھر اس کے ہاتھ سہارے کے لئے دروازے کی طرف اٹھے مگر چند قدم پر موجود دروازہ اس کی آنکھوں میں مسلسل تاریکی میں گم ہو گیا۔ وہ لہرا کر فرش پر ڈھیر ہو گئی۔

اُسے نہ جانے کتنی دیر ہو چکی تھی ٹھنڈے فرش پر بے حس و حرکت پڑے۔ خود اُس کا وجود بھی تنہا تھا۔

زمان خان نے جب گھر کے اندر قدم رکھا تو اس کی پہلی نگاہ شاد اکے بے ہوش وجود پر پڑی تھی اور وہ تیر کی طرح

آگے بڑھا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے اعصاب میں تناؤ سا پیدا ہوا۔

”اف خدایا۔۔۔“

اُس کے جانے کے بعد وہ کب سے اس حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ ایک گہرے تاسف نے اُسے اپنے حصار میں لے لیا۔ اس نے وقت ضائع کئے بغیر اُسے بیڈ پر لٹا کر ڈاکٹر ظفر ملک کا فون ملا دیا۔

ڈاکٹر ظفر ملک اس کا قریبی دوست تھا۔ ایک ساتھ وہ کالج میں پڑھتے رہے تھے اور اب بھی اکثر اس کے کلینک جانا ہوتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے کلینک کی بجائے گھر میں تھا۔

ظفر ملک نے ہی فون ریسو کیا تھا۔ شارد کی اچانک بے ہوشی کا اس نے جلدی سے بتایا۔ وہ فون اٹھا کر شارد کی طرف بڑھا۔ اس کی بے ہوشی نے اُسے ذہنی طور پر گہرا شاک پہنچایا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ لابی چوٹی سے بال کھل کر زرد چہرے پر بکھر گئے تھے۔ دراز پلکیں بالکل ساکن تھیں اور آنکھوں کے نیچے ابھی تک نمناکی تھی۔

یہ زرد زرد چہرہ جو چند سال قبل تک گلابی اور شگفتہ تھا، سیاہ آنکھوں کی روشنیاں کبھی کبھی اس کے بے حس دل کو جھنجھوڑنے لگتی مگر ہر بار وہ اپنے جذبوں پر مضبوط بند باندھ لیتا تھا اور احساسات کی لو نیچے کر لی تھی۔

اس لڑکی سے اُسے ذاتی دشمنی تو نہ تھی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اس کی انا کو مجروح کرنے کا سبب تھی۔ شہلا اس کی زندگی میں آئی تھی مگر امی نے مسعود شاہ کی بہن کو اس کی زندگی میں جبراً داخل کر دیا۔ یہ فیصلہ صرف امی کا تھا جس پر وہ قطعی راضی نہ تھا بلکہ سراپا احتجاج تھا۔ مگر جیت شارد احیات کی ہوئی اور وہ ڈھیروں ارمان، ڈھیروں خوبصورت خواب لے کر اس کے آنگن میں اتر آئی۔ اس کی ذاتیات میں شامل ہونے لگی تو وہ جیسے بھڑک اٹھا۔ شہلا سے کئے ہوئے پیمان کے ٹوٹنے پر، اپنی انا کے مجروح ہونے پر وہ مشتعل ہو گیا۔

اس کے دل میں شارد احیات کے خلاف اسی روز سے شدید نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے اس سے ہم کلام ہوئے بغیر اس کے وجود کو، اس کی ذات کو سمجھے بغیر اسے ناپسندیدگی کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔ امی اور ابو کو ان کے جبراً کئے گئے فیصلے کی گویا سزا دے رہا تھا۔ مگر سزا تو شارد کو بھی مل رہی تھی یا پھر ماہ گل کو۔

اتنے برس بیت گئے۔ وہ خود بھی تو اس آگ میں مسلسل جلتا رہا تھا۔ شہلا ایوب تو اس کے دل سے، اس کے ذہن سے نہ جانے کب کی نکل چکی تھی۔ سارے جذبے ہی سرد پڑ گئے تھے۔ سارے زخم بھی مند مل ہو گئے تھے۔ لیکن اس میں بے حسی کی دبیز چادر تن گئی تھی جس سے نکل کر اس نے کبھی دیکھا اور سوچا ہی نہیں۔

شارد کی سسکیاں۔

اس کی موہنی صورت۔

اس کی آنکھوں میں بکھرتے سپنوں کا عکس۔

اور نہ ماہ گل کی اداسیاں!

اس نے جھک کر شارد کو بہت قریب سے دیکھا جیسے یہ اس کے لئے کوئی نامانوس چہرہ ہو اور پہلی بار نظر آیا ہو۔

تکیے کی سفیدی میں سیاہ بالوں میں گھرا ہوا چہرہ زرد ہونے کے باوجود ایک عجیب سی جاذبیت لئے ہوئے تھا۔ اس کے دل کی دیواریں طوفان سے لرزنے لگیں۔ دل و دماغ الگ آپس میں الجھ رہے تھے۔ کوئی سرا بھی تو ہاتھ نہ آ رہا تھا۔ ایک ہجوم تھا سوچوں کا۔ گزرے دنوں کے خیالات کا۔ اچانک وہ چونکا۔ کال بیل زور زور سے بج رہی تھی۔ اُس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ظفر ملک کھڑا تھا۔

”یہ بھابی کو اچانک کیا ہو گیا؟“

”پتہ نہیں \_\_\_ میں باہر سے آیا تو وہ کچن کے دروازے کے قریب فرش پر بے ہوش تھی۔ شاید گرمی کا اثر ہو۔“

اس نے اپنے سارے مظالم مخفی رکھتے ہوئے خفیف سے انداز میں کہا۔

”مگر موسم تو خاصا ٹھنڈا ہے۔“

وہ چلتے ہوئے اس کمرے میں آگئے جہاں بیڈ پر شاردابے ہوش پڑی تھی۔ ظفر ملک کی نظر شاردابے کے چہرے کی طرف

اٹھی تو وہ بری طرح چونکا اور تیزی سے آگے بڑھا۔ اس کے زرد چہرے نے اُسے بری طرح چونکا دیا تھا۔

”زمان! “ وہ پلٹا۔ ”یہ کب سے بیمار ہیں؟“

زمان خان سٹیٹا کر رہ گیا۔

”یہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ بس آدھے گھنٹے قبل ہی اچانک بے ہوش ہو گئی۔“

”مگر ان کا چہرہ تو۔۔۔۔۔ خیر۔۔۔۔۔“ اُس نے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا اور شاردابا کا معائنہ کرنے لگا۔

”ہاسپٹل لے جانے کی ضرورت پڑے گی کیا؟“ زمان خان کچھ متفکر سا ہونے لگا۔ ظفر ملک کے چہرے کے

تاثرات نے اُسے ایک دم خوف زدہ کر دیا۔

اگر شاردابا کو کچھ بھی ہوا تو اس کا ذمہ دار سراسر وہ خود ہو گا۔

”نہیں، نہیں \_\_\_ میرے خیال سے ہوش آجائے گا تو گھر میں ہی مکمل آرام کرنا ہو گا۔ زمان! میرے خیال میں تم

بھابی کی طرف سے بالکل لاپرواہ ہو۔“ وہ زمان کی طرف پلٹا۔ ”یہ بے حد ویک ہیں اور چہرے سے بظاہر عرصے کی

بیمار محسوس ہو رہی ہیں۔ یہ مینٹلی اپ سیٹ ہیں۔ اور ظاہر ہے یہ تمہاری جانب سے ہی ہے۔“

”ہاں \_\_\_ ہمارا مکیش (جھگڑا) چل رہا ہے۔“ زمان نے قدرے جھجکتے ہوئے بتایا۔

”کیا \_\_\_؟“ ظفر ملک ششدر رہ گیا۔ ”زمان \_\_\_ تم \_\_\_“

”ظفر! یہ میرا پرسنل افیئر ہے۔ اور میں کسی کو مداخلت کی اجازت نہیں دیتا۔ پلیز، تم علاج بتاؤ۔“ اس نے سرد مہری

سے ظفر ملک کی بات کاٹ دی۔ ظفر ملک حیران سا اس اونچے لمبے، پڑھے لکھے اور اچھے گھرانے کے زمان کو دیکھتا رہ

گیا۔ اس کا اتنا قریبی دوست گھریلو تنازعہ میں الجھا ہوا تھا اور وہ بے خبر تھا۔

”نہیں زمان \_\_\_ یہ عظیم گناہ ہے۔ تم ایک لڑکی کو اپنے گھرا کر \_\_\_ کہیں تم اُس شہلانا می لڑکی \_\_\_“

”میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا اور نہ میں کسی شہلانا میلا کے عشق میں گرفتار ہوں۔ میرا مسئلہ کچھ اور

ہے۔“

”اوکے۔۔۔۔۔ ایز یو وش۔۔۔۔۔ مگر زمان! بھابی کی حالت مزید خطرناک ہو سکتی ہے اگر انہیں مینٹلی ریلیکس

نہ ملا۔“ ظفر ملک اس رویے پر خاصا دل برداشتہ ہو کر بولا اور چند میڈیسن لکھ کر پرچہ اس کی جانب بڑھا دیا۔

”میں صرف ڈاکٹر ہی نہیں، تمہارا دوست بھی ہوں۔ تمہارا رویہ میرے لئے بے حد اذیت کا باعث بنا۔ خدا حافظ۔“

وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔

”ظفر! میں اس وقت سخت اپ سیٹ ہوں۔“ وہ اس کے لئے دروازہ کھولتے ہوئے ندامت سے بولا۔ ”میں اپنے

آپ سے جنگ کی حالت میں ہوں \_\_\_ کیا ایک الجھے شخص کو مزید ڈپریشن کرنا تم پسند کرو گے؟ ظفر! میں ماضی کے

سارے باب بند کر کے کچھ سوچنا چاہتا ہوں۔ میں گزرے لمحوں کو زبان پر لانا نہیں چاہتا۔ ڈیوانڈرا اسٹینڈ؟“

”ہوں \_\_\_“ ظفر ملک نے اس کے پرانگندہ چہرے پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے بولا۔

”شارد ابھابی کی حالت نے اتنا تو مجھے سمجھا دیا ہے کہ قصور وار سراسر تم ہی ہو۔ مگر مجھے امید ہے اب تم آنے والے

لمحوں کو ماضی کی اس گرد سے محفوظ رکھو گے۔ دس ازمائی ریکوریسٹ ٹیوٹ۔ تم شارد ابھابی کو ان کا حق دو گے \_\_\_ ان کا



خیال رکھنا زمان! زندگی کو محض ایک تلخ لمحے کی بھینٹ مت چڑھاؤ۔ اچھا خدا حافظ۔“ وہ تیزی سے باہر نکل گیا مگر زمان خان کی سوچ کو ایک نیا انداز دے کر۔ اُس کی پریشان اور اُلجھی سوچوں کو سلجھا ہوا راستہ دے کر۔

اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کی زندگی کسی زبردست انقلاب سے دوچار ہو رہی ہے۔ اس کے ذہن کی ساری تنی ہوئی طنابیں ڈھیلی ہو رہی ہیں۔ وہ ایک دم جیسے ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

وہ پلٹا تو شارد اہوش میں اچکی تھی۔

...☆☆☆...

”وادی کا اتنا زبردست حُسن تو اچھے اچھوں کی عقلیں سلب کر لیتا ہے ماہی آپلی!“

فروان مسلسل اشتراک کے چہرے کو نگاہوں کی گرفت میں لئے ہوئے بول رہا تھا۔ اشتراک، زیبیل کے ہمراہ شام کی چائے اور لوازمات میز پر سجا رہی تھی۔ سحر بھی اس کے ہمراہ تھی۔

”اسی لئے تو میں تمہیں وادی نہیں لارہی تھی۔ اتنی سی تو عقل ہے۔ وہ بھی گئی کام سے۔“ ماہی آپلی سن رہی تھیں۔ اشتراک اور سحر گل اس طرف متوجہ تھیں۔

”اب کیا ہو گیا فروان بھائی؟“ بغیر عقل کے ہی شہر واپس جانا ہے؟“ سحر گل نے اُسے چھیڑا۔

”ارے تم لوگ مذاق سمجھ رہی ہو۔ میں سنجیدہ ہوں۔“ فروان نے مصنوعی سنجیدگی سے سحر گل کو گھورا۔

”تو میں کب مذاق کر رہی ہوں۔“ سحر جلدی سے بولی۔

”ویسے پوچھ سکتی ہوں کس طرح کے حُسن نے تمہیں متاثر کیا ہے؟ یہاں تو صرف قدرتی حُسن ہے سیدھا سادا۔“

اشتراک پہلی بار گویا ہوئی اور فروان بھرپور انداز میں مسکرایا۔

”جناب! قدرتی حُسن ہی تو متاثر کرتا ہے۔ مصنوعی روشنیاں ہمیں تو متاثر نہیں کرتیں۔“

”پتہ نہیں۔ میں نے تو سنا ہے شہروں کی زندگی بہت خوبصورت ہوتی ہے۔“

”ارے۔۔۔ ارے، یہ کس نے کہہ دیا۔“ فروان اٹھ کر میز کی طرف آگیا۔ ”شہر کی زندگی تو بالکل پھیکی اور بے مزہ ہوتی ہے۔ ایسی شگفتگی، ایسی خوبصورتی اور سادگی کہاں۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ اس وادی میں آجاؤں ہمیشہ کے لئے۔“

”گھر داماد بن کر۔“ سحر گل سرگوشی کے انداز میں برجستہ بولی تو فروان نے پلٹ کر اسے مصنوعی خفگی سے دیکھا۔

فروان کی جذبے لٹائی آنکھیں سحر گل سے مخفی تو نہ تھیں۔ ایک نئے اور اچھوتے رنگ لئے مسلسل اشتراک پر مرکوز تھیں اور اس پر ذومعنی جملے۔

اشتراک، ممائی جان اور شاہ خانم کو چائے کے لئے بلالائی اور دونوں نہ جانے کس موضوع پر باتیں کر رہی تھیں۔ سٹنگ روم میں آتے ہوئے بھی سلسلہ ٹوٹا نہیں تھا۔

”امی! کیا خیال ہے پھر۔۔۔ ہمیشہ کے لئے اس وادی میں نہ رہ جائیں؟“ فروان نے میز پر رکھی پلیٹ سے چپس کھاتے ہوئے ممائی جان کو مخاطب کیا تو وہ چونکی۔

”آں۔۔۔ کیا، کیا؟“

”کیوں نہ ہم وادی میں رہ جائیں۔“ اس نے اپنا جملہ دہرایا۔

”ہاں، ہاں۔۔۔ کیوں نہیں؟ بس یہیں رہ جاؤ۔ اتنی بڑی حویلی تو ہے۔“ ممائی سے پہلے شاہ خانم جلدی سے بولیں۔

اُس نے نرم مسکراہٹ کے ساتھ اپنے شوخ اور باتونی مکرزن کو دیکھا۔

”نہیں۔۔۔ وادی میں تم جیسے بھی رہتے ہیں اور زیادہ باتیں نا پسند کرنے والے بھی۔“

”اچھا، تو زیادہ باتیں اور شرارتیں ناپسند کرنے والوں سے مجھے ملو! تو سہی۔ میں بھی دیکھوں کہ وہ کیسے ہوتے ہیں۔“

فروان کا موڈ از حد شگفتہ تھا۔

”اشارا! ذولین خان سے ملو اور اسے۔“ ماہ گل نے ہنس کر کہا تو فروان چونکا۔

”ذو لین خان؟“

”ہوں۔۔۔ اشتار کے کزن ہیں۔۔۔ چچا زاد۔ انیکسی میں رہتے ہیں۔ تنہائی پسند ہیں۔“ سحر گل نے تفصیل بتائی۔

”ضرور ملو اُنوں گی کسی دن۔“

”آں۔۔۔۔۔ کسی دن کیوں۔۔۔۔۔ آج ہی، بلکہ ابھی دیدار ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔“ فروان ایک دم بے قرار ہو گیا اور اسی وقت کر سی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”سنجھ کر جاننا۔“ سحر گل ہنستے ہوئے بولی۔ ”وہاں بھوت بھی ہو سکتے ہیں۔“

”نہ۔۔۔ بھوت سے ڈرنے والا نہیں۔ مرد ہوں پورا۔ اور چڑیلیں ہوتیں تو کوئی بات بھی تھی ڈرنے کی۔“ اس نے کہا اور بڑے بڑے قدم اٹھاتا ہوا سنگ روم سے باہر نکل گیا اور وہ تینوں اس کی بے قراری اور جلد بازی دیکھ کر ہنسنے لگیں۔

فروان نے انیکسی میں قدم رکھا تو چند لمحے مبہوت سا رہ گیا۔ ذولین خان کا شاندار سراپا اس کے عین سامنے تھا۔

وہ بھی اپنی سبز سبز آنکھوں میں حیرانگی لئے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی رائیڈنگ سے واپس آیا تھا۔ سفید بیگی جرسی، سیاہ پینٹ اور لانگ شوز میں وہ دو گھنٹے کی مسلسل رائیڈنگ کے باوجود تروتازہ تھا۔

”مجھے فروان کہتے ہیں۔“ وہ ذولین خان کے خوبصورت سراپے سے قدرے مرعوب ہوتے ہوئے بولا اور آگے بڑھ کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

”اشتمل کے کزن \_\_\_“ ذولین کو پہچاننے میں دقت نہیں ہوئی۔ اشترا نے ہی اسے بتایا تھا کہ اس کے ماموں کی فیملی آج کل حویلی میں آئی ہوئی ہے۔ اس نے بھی مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

”مشمول کی غیر موجودگی میں تو آپ یقیناً بوریت محسوس کر رہے ہوں گے۔“

”اس لئے تو آپ کے پاس آگیا۔“ فروان شگفتہ لہجے میں بولا۔

”کیا مطلب ہے؟“

”کیا آپ مجھے کمپنی نہیں دے سکتے؟ ویسے اتنی شاندار کمپنی کا مجھے گمان نہیں تھا۔ اور آپ کا غائبانہ تعارف ہو چکا ہے کہ آپ بے حد کم گو ہیں اور زیادہ باتیں کرنے والوں کو ناپسند کرتے ہیں۔“ مگر مجھے تو آپ کو چند دنوں تک برداشت کرنا پڑے گا۔ جبراً ہی سہی۔“

اس کی بات پر ذولین خان کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے سوچا یقیناً اس کا تعارف اشارانے ہی کروایا ہوگا۔ وہ شاید اس کی کم گوئی سے خائف رہتی تھی۔ یہ سچ تھا، وہ تنہائی کا عادی تھا اور خاموش طبع تھا۔ مگر ابھی تک اسے ایسا ہمارا، ایسی کوئی شخصیت نہیں ملی تھی جس سے وہ بہت سی باتیں کرتا۔ وہ اشارا سے ڈھیروں باتیں کرنا چاہتا تھا مگر وہ شاہ خانم کے خوف کو سر پر سوار کر کے اس سے ملتی اور ایسے میں کبھی کبھی اس کی بے قراری کو اور بھی شدید کر دیتی۔

”کیا میں کچھ توقع رکھ سکتا ہوں آپ سے؟“ فروان نے کہا۔

”پتہ نہیں، میں تمہاری توقعات پر پورا اتروں گا یا نہیں۔ بہر کیف اپنی سی کوشش کروں گا۔ کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”میں آپ کا مشکور رہوں گا۔“ فروان نے اپنی ازلی شوخی سے سرخم کرتے ہوئے کہا تو ذولین خان ہنس دیا۔

”آپ شاید رائیڈنگ کر کے آئے ہیں۔“ وہ اب بے تکلفی کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گیا۔

”ہاں۔۔۔ چچا جان نے مجھے تاکید کی ہے کہ سورج ڈھلنے سے پہلے ہی میں واپس آجائوں۔ انہیں بہت خوف رہتا ہے ان گہری کھائیوں سے۔“ اس نے خود کو کرسی پر گرا لیا اور لانگ شوز اتارنے لگا۔ ”تم گھڑ سواری جانتے ہو؟“

”میں۔۔۔۔۔ہا۔۔۔۔۔ہا۔۔۔۔۔“ اُس کی بات پر فروان زور سے ہنسا۔ ”ارے شہر میں رہنے والے صرف گاڑی میں بیٹھنا جانتے ہیں، گھوڑے کی پشت پر نہیں۔ ویسے یہ میرا شوق ضرور ہے۔ کیا آپ کا گھوڑا مجھے اپنی پشت پر برداشت کر لے گا؟“

”کیوں نہیں۔۔۔ بس ذرا احتیاط برتنی ہوگی۔ ایک بار شامل نے اس کی مرضی کے خلاف کسی سمت لے جانے کی سعی کی تھی لیکن پھر شامل کو اسے قابو کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ تم ایسی غلطی نہیں کرو گے تو محفوظ رہو گے۔“



ذولین خان اپنے مشکلی گھوڑے کا کھڑپن بے حد شان سے بتا رہا تھا اور فروان کا دل اُچھل کر رہ گیا۔

”اشمل بھائی کو قابو کرنا مشکل ہو گیا تو بابا! میری توجان ہی دُھل جائے گی۔ اور ویسے بھی مجھے ان کھائیوں سے بہت خوف آتا ہے۔“

”ارے \_\_\_ تم ڈر گئے۔“ ذولین خان نے اسے مسکرا کر دیکھا اور پھر بیسن پر ٹھنڈے پانی سے منہ دھوتے ہوئے بولا۔ ”تم چائے پیو گے؟“

”نہ \_\_\_ نہیں، میں چائے پی کر ہی آیا ہوں۔ اب میں چلوں گا۔ وہاں سب میرے منتظر ہوں گے۔ میں کل پھر اُنوں گا آپ کو ڈسٹر ب کرنے۔“ فروان کرسی سے کھڑا ہو گیا اور اسے خدا حافظ کہتا ہوا انیکسی سے باہر نکل گیا۔

ذولین خان تو لیے سے منہ رگڑتے ہوئے فروان کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ یہ خوب رو اور باتونی لڑکا اُسے براہر گز نہیں لگا تھا۔ اس کے جملوں میں اُسے زندگی ہمکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اُسے اچانک اپنی تنہائی کا شدت سے احساس ہوا۔ کچھ لوگ شاید ہمیشہ تنہا ہی رہے ہیں۔

اُس نے تولیہ پیگ کرتے ہوئے گولڈن فریم والے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا اور بالوں پر ہاتھ پھیر کر پلٹا تو اشترا کھڑی تھی۔

”وہ فروان آیا تھا نا یہاں؟“

”ہاں \_\_\_ چلا گیا۔“

”چلا گیا؟ \_\_\_ شاید دوسری طرف نکل گیا ہو گا۔“

”اشترا!“ ذولین نے اُسے دیکھا اور پھر لب بھیج کر اس کے قریب آیا۔ ”اتنی شام انیکسی میں مت آیا کرو۔“ اس

نے ڈھلتی شام کی گہری ہوتی رنگت کو محسوس کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا تو اشترا مسکرا دی۔

”ذولین خان! مجھے آپ پر خود سے بھی زیادہ اعتبار ہے۔ پھر \_\_\_۔“

”بات اعتبار کی نہیں ہے۔“ اس نے تیزی سے اس کا جملہ کاٹ دیا۔ ”احتیاط کی ہے۔ اور پھر میں نہیں چاہتا کہ چچا

خان کے دل میں میری طرف سے کسی طرح کا کوئی ایسا خوفزدہ کر دینے والا خیال آئے یا کوئی ایسی سوچ ابھرے۔“

”نہیں ذولین! بابا خان کو آپ پر بے حد اعتماد ہے۔ بھلا وہ ایسا \_\_\_۔“

”اشترا! پلیز، سمجھنے کی کوشش کرو۔“ اس نے رخ پلٹ کر دیوار پر لگے لائٹ کے سوچ آن کر دیئے۔ کمرہ ایک دم ہی روشنیوں میں نہا گیا۔ ”تم جائو۔“

اشترا کے دل پر جیسے گھونسا سا پڑا۔ اس کی سنہری آنکھوں میں نمی اُتر آئی۔ ذولین خان کا یہ رویہ اس کا دل دکھا گیا۔ وہ پلٹی اور تقریباً بھاگ کر انیکسی سے باہر نکل گئی۔

”اشترا \_\_\_“ ذولین اس کے اس طرح بھاگنے پر پریشان ہو گیا۔ اس نے درتچے سے جھانکا تو وہ دور جا چکی تھی۔

’پاگل لڑکی! اس میں ہم دونوں کی ہی بھلائی ہے۔ ساری عمر میں نے اپنی انا، عزت کی حفاظت کرتے ہوئے گزاری ہے۔ اب خوفزدہ ہوں کہ کوئی ہاتھ میری جانب نہ اٹھے کہ جس میں صرف میری ہی نہیں، تمہاری بھی ذات کے لئے اذیت کا باعث ہو۔‘

اس کی ناراضگی نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ مگر وہ خود ہی سوچ کر مسکرا دیا کہ وہ اسے موقع ملنے پر منالے گا۔ وہ جانتا تھا کہ اشترا امہر وزبے حد معصوم لڑکی ہے۔ وہ اس سے زیادہ خفا نہ رہ سکے گی۔ بھلا جو لوگ دل سے بے حد قریب ہوتے ہوں وہ ناراض کب رہ سکتے ہیں۔ اس نے درتچے کا پردہ کھینچ لیا۔

”آخر آپ اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔ کچھ نہیں ہوتا مجھے۔ میں بس اس کو ٹھٹی میں رہوں گا۔ مجھے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا گاڑ لے گا قانون میرا۔ یہ کھلونا ہے کھلونا۔“ ریحان پر اچہ کا لہجہ تکبرانہ تھا۔ ”کیا ہمارا اثر و رسوخ ختم ہو چکا ہے جو آپ اتنے فکر مند ہو رہے ہیں؟“

”بے وقوف ہو تم۔ بات معمولی نہیں ہے، قتل کا کیس ہے۔ ریحان! جانتے ہو تم قتل کسے کہتے ہیں؟“

شاہنواز پر اچہ کی جان پر بن رہی تھی اور بیٹا تھا کہ قتل کرنے کے بعد بھی اسی سکون سے تھا۔ غلطی انہی کی تھی کہ ہمیشہ اس کی پشت تھپتھپائی تھی۔ اسے خوفزدہ دیکھ کر تسلیاں دی تھیں۔ مگر آج خود انہیں کسی طرح بھی تسلی نہ ہو پارہی تھی۔ بیگم شاہنواز بھی ہراساں تھیں۔

”بس اس دن سے ڈرتی تھی میں۔ یہ آگ کا کھیل ہے۔ یہ اسلحہ تباہ کر دیتا ہے اسے جو بھی اسے پکڑتا ہے۔ خدایا اب کیا ہوگا؟“ وہ تو باقاعدہ رورہی تھیں۔

”اوہو ماما! آپ لوگ کیوں اتنے خوفزدہ ہیں؟“

”بس میں نے کہہ دیا نا کہ ریحان! تم ابھی اور اسی وقت فلیٹ میں منتقل ہو جاؤ۔ پولیس یہاں دوبارہ بھی آسکتی ہے۔ شاہباز کے باپ اور بھائیوں نے ایف آئی آر درج کرادی ہے تمہارے خلاف۔ تم سمجھتے کیوں نہیں ہو؟ قتل کا کیس آسان بات نہیں ہے۔“ شاہنواز پر اچہ کے لہجے میں الجھن کے ساتھ سختی بھی تھی۔

انہیں اپنا اکلوتا بیٹا بے حد عزیز تھا۔ اور ہر حال میں وہ اس کی حفاظت اور سلامتی چاہتے تھے۔

”جاؤ ذرا فلیٹ کی چابیاں لے کر آؤ۔ میں نے بیڈ کی دراز میں ہی رکھی ہیں۔“ شاہنواز پر اچہ نے اپنی بیوی کو مخاطب

کیا جوا بھی تک بے آواز رورہی تھیں۔

”او کم آنا ماما!۔۔۔ اس سے پہلے بھی تو ایسا ہوا ہے۔ پولیس نے چھاپے مارے بلکہ مجھے گرفتار بھی کر چکی ہے۔ پھر کیا میں واپس نہیں آؤں گا؟ یہ پایا کا وسیع ریلیشن اور پیسہ کس کام کا ہے؟“ وہ لا پر واہ انداز میں ہنسا۔

”اس ریلیشن شپ اور پیسے نے تو تمہیں اس حال تک پہنچایا ہے۔“ وہ دکھ سے بولیں اور کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔

”تمہیں اتنا مطمئن رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ ضروری نہیں ہے کہ ہم ہر بار اتنی آسانی سے بازی جیت جائیں۔“ شاہنواز پر اچہ کے لہجے میں ناگواری سمٹ آئی۔ بیٹے کا بے فکر انداز انہیں ایک آنکھ نہ بھایا۔

”وہ لڑکا شامل خان کوئی معمولی لڑکا نہیں ہے۔ اس کی بیک بے حد مضبوط ہے۔ اور وہ ڈپٹی منظور احمد بھی بہت خزانہ آدمی ہے۔۔۔ اس بار بہت مشکل پیدا کر دے گا وہ شامل کے ساتھ مل کر۔ اور پھر تم نے اسے بھی گولی مار کر زخمی کر دیا ہے۔“

”پاپا! آپ شاہباز کے گھر والوں پر پریشر تو ڈالئے۔۔۔ انہیں منہ مانگی قیمت دیں۔ انہیں ایف آئی آر درج کرانے کیوں دی؟“ قدرے توقف کے بعد ریحان پر اچہ نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ باپ کی پریشانی اب اس پر بھی لاحق ہونے لگی۔ اسے سنگینی کا احساس ہونے لگا۔

”اونہ۔۔۔ وہ غریب لوگ بہت غیرت مند اور عزت دار بنتے ہیں۔ وہ لوگ خون کا بدلہ خون مانگتے ہیں۔۔۔۔۔ بے وقوف لوگ۔۔۔۔۔“

”آپ ان کے پاس گئے تھے؟“

”ہاں، گیا تھا۔ تم کیا سمجھتے ہو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں۔ ایک لاکھ روپیہ یوں ٹھکرا دیا جیسے دو روپے ہوں۔

پچھتائیں گے خود ہی۔ میٹا تو گیا سو گیا۔ شاید بہت پُر اعتماد ہیں تمہاری گرفتاری اور سزا کے سلسلے میں۔“

ریحان پراچہ کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔ وہ منہ بنانا صوفے سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

بیگم شاہنواز چابیاں لے کر آئیں اور روٹھے ہوئے انداز میں اس کے ہاتھ میں تھما دیں۔

”کاش اشل ہی مرجاتا اس کی بجائے۔“ وہ چابیوں کو ہتھیلی پر مارتے ہوئے نفرت سے بولا۔

”بکومت زیادہ \_\_\_ چلو اب، پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔“ شاہنواز پراچہ نے اُسے ڈپٹ کر سرعت سے قدم باہر کی

جانب بڑھائے۔

”میرا بچہ \_\_\_ خدا تجھے حفظ و امان میں رکھے۔ میں تو پہلے ہی ڈرتی تھی۔ کہتی رہتی تھی تمہارے پاپا کو کہ اولاد کو زیادہ

ڈھیل دینا نقصان دہ ہو گا مگر \_\_\_“

”اوہو شازیہ! یہ کیا بے وقوف عورتوں کی طرح رونادھونا شروع کر رکھا ہے۔ ابھی ہمارے اختیار سے کچھ نہیں

گیا۔“ شاہنواز پراچہ پلٹ کر تندہی سے بولے۔ ”چلو ریحان! جلدی کرو۔“

”اوکے می \_\_\_ آپ فکر مت کریں۔ میرا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ اشل خان ہو یا کوئی اس سے بھی بڑھ کر

\_\_\_ اونہہ، ابھی تو آپ نے پاپا کی طاقت دیکھی ہی نہیں ماما!“

”پاپا کی یا پیسے کی؟“ انہوں نے قدرے منہ بنا کر کہا تو ریحان زور سے ہنس دیا۔

”اوکے \_\_\_ گڈ بائی ماما! میں آپ سے فون پر رابطہ رکھوں گا۔“ اس نے بیگم شاہنواز کے ہاتھ تھام کر تھپتھپائے۔

”آؤ \_\_\_ میں تمہیں گاڑی تک ہی چھوڑاؤں۔“ انہوں نے کہا تو وہ ہنس پڑا۔ وہ اسے گاڑی تک چھوڑنے آئیں تو

سخت دل گرفتہ ہو رہی تھیں۔

”بائے \_\_\_“ خدا حافظ کہہ کر جیسے بکھر ہی گئیں۔ ”ایسا ہی اس کی ماں کا کلیجہ ہو گا۔ وہ بھی تو بیٹا تھا جو میرے بیٹے

کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ نہ جانے اس کی ماں نے کیسے سنبھالا ہو گا خود کو۔“

گاڑی دور ہوتی گئی اور بیگم شاہنواز کی آنکھوں سے آنسو تیزی سے بہنے لگے۔ ان کی آنکھوں سے غفلت کا پردہ ایک دم

اتر گیا تھا۔ وہ اب شوہر سے بھی خائف تھیں۔ وہ بیٹے کی حرکتوں کو معمولی کھیل سمجھتے ہیں۔ اور وہ خود بھی پارٹیوں اور

فنکشن سے فارغ ہی نہیں ہوتیں۔

”یہ آزادی خود میرے لئے وبال بن گئی۔“ وہ بلک اٹھیں۔

☆☆☆☆...

نعیم جان اور افتخارا بھی ابھی اس کے پاس سے اٹھ کر گئے تھے۔ وہ بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو تکیے کا سہارا لے کر نیم دراز ہو

کر آنکھیں موند لیں۔

ہاسپٹل کی آکٹا دینے والی خاموشی اور تنہائی اس پر کوفت طاری کر رہی تھی۔ اتنی بے رونق اور بے کل زندگی کا تو تصور

بھی نہیں رہا تھا اس کے پاس۔ اتنا بے بس اس نے کبھی خود کو محسوس نہیں کیا تھا۔ بیٹیوں میں جکڑا وہ خود کو اس بے

بس پرندے کی طرح محسوس کر رہا تھا جس سے اُس کی اڑان چھین لی گئی ہو اور اس کے سامنے سے آسمان ہٹا کر ایک

چھت تان دی گئی ہو۔

ایک ایک کر کے اُسے سب یاد آ رہے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی زمان خان بھی اس سے مل کر گیا تھا۔ اس کی لا پرواہی

پر خفگی بھی ظاہر کر گیا تھا اور اسے اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کیا تھا۔ مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ

پوری فیملی وادی گئی ہے۔ چند لمحوں کے لئے تو اسے اپنی وادی اور حویلی کتنی شدت سے یاد آئی تھی۔ وہ آنکھیں



موندے گہری سوچوں میں غرق تھا کہ اچانک ہی اسے اپنے قریب کسی ذی روح کا احساس ہوا۔ ایک مانوس سی خوشبو کا جھونکا اس کے نتھنوں سے ٹکرایا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

سامنے ہی وہ آشنا خوشبو میں بسا گلاب چہرہ تھا۔ آنکھوں میں اس کے لئے بے پناہ چاہت تھی۔ درد اور حزن کی آمیزش لئے۔ وہ اس کے چہرے کو اپنی آنکھوں کے حصار میں لئے ہوئے تھی۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“ اس نے مسکرا کر پوچھا تو وہ چونکی۔ پھر اس کے زرد چہرے پر سے نگاہیں ہٹا کر بولی۔

”اشمل خان! میرا دل چاہتا ہے کہ میں ریحان پر اچہ کو اپنے ہاتھوں سے شوٹ کر دوں۔ اُسے کوئی بہت ہی افیت ناک سزا دوں۔ مگر۔۔۔۔۔۔“ اُس کا گلارندھ گیا۔

”وہ شخص قانون کے ہاتھوں سے ہر گز نہ بچے گا۔ یہ بتاؤ، کب آئیں تم؟“ وہ قدرے اونچا ہو کر بیٹھ گیا۔

”پتہ نہیں، یہ قانون ان لوگوں کے لئے ہے یا نہیں۔“ اُس نے رخ موڑ لیا۔ وہ سخت زور درنج ہو گئی تھی۔

اشمل خان کا زرد چہرہ اور پیٹوں میں جکڑا وجود کس قدر بے بسی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ایک منٹ نہ بیٹھنے والا، اپنے سینے میں درد رکھنے والا یہ لڑکا کتنی بے بسی سے بستر پر پڑا ہوا ہے۔ اس کی تکلیف و افیت کی ترجمانی اس کی بھوری آنکھیں بخوبی کر رہی تھیں۔ یہ اور بات تھی کہ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتا تھا۔

”بہت چاہتی ہو مجھے ہشمنہ؟“ اُس نے اُسے بغور دیکھتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا تو اس کے رخساروں پر دھنک رنگ بکھر گئے۔ وہ ٹفن سائیڈ میز پر رکھ کر دوبارہ اس کی جانب رخ نہ کر سکی اور پیالے میں سوپ بھرنے لگی۔

”جانتی ہوا ظہار، محبت کو آسمان کی بلندیوں پر لے جاتا ہے اور دل کے لئے تقویت کا باعث ہوتا ہے۔ ایک دوبارہ ہی سہی۔“ وہ پُر زور انداز میں ہنسا تھا۔ اس کا جھینپا جھینپا انداز اُسے محفوظ کر گیا تھا۔

”اشمل خان! جب آنکھیں اور چہرہ دل کا ترجمان ہو تو پھر لفظوں کی کیا وقعت رہ جاتی ہے۔“ اس نے سوپ کا پیالہ اس کی طرف بڑھایا۔

وہ نچلا ہونٹ ہموار دانتوں تلے دبائے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کی بات پر اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”اگر آنکھیں اور چہرہ پڑھنے کی اجازت ہی نہ ہو تو پھر سماعت لفظوں کی منتظر رہتی ہے۔“

”آپ نے اپنے گھر اطلاع نہیں دی اس حادثے کی؟“ وہ دور ہو کر کرسی پر بیٹھ کر دھیرے سے بولی۔ وہ اس نازک موضوع کو بڑھنے دینا نہیں چاہتی تھی۔

”نہیں۔۔۔ وہ سب پریشان ہو جائیں گے۔ بابا خان نے پہلے ہی وارننگ دے رکھی ہے۔“

”اخبار میں تو یہ خبر آئی ہے۔“ اس نے کہا تو اشمل خان کے چہرے پر تفکر کے رنگ پھیل گئے۔

”اوہ۔۔۔ یہ تو بہت برا ہوا۔ زمان لالہ بھی آئے تھے۔ بہت پریشان ہو رہے تھے۔ حالانکہ اب تو کافی ریکور کر رہا ہوں۔“

”یہی تو رشتوں کی اہمیت اور محبت ہے۔ خوشی اور غم میں شریک ہونا ہی تو اپنوں کی محبت کی نشانی ہے۔ خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جن کے غم میں لوگ پریشان ہوتے ہیں۔ کیا آپ ایسی شخصیت نہیں؟“ آپ کے لئے اسٹوڈنٹس بھی دُعا گو ہیں۔“

”حالانکہ میں تو بہت عام سا بندہ ہوں ہشمنہ! جس نے ابھی تک کسی کے لئے کچھ نہیں کیا ہے اور اگر کچھ کیا بھی ہے تو اتنے سارے لوگوں کا تعاون رہا ہے ساتھ۔“ وہ بے حد صاف گوئی سے بولا۔

”مجھے بس فکر ہے کہ یہ خبر بابا خان تک نہ پہنچے۔“ اس نے سوپ کا پیالہ سائیڈ میز پر رکھ دیا اور (اخبار میں چھپی تھی

یہ خبر (یہ بات اسے متفکر کر گئی تھی۔

”شاہ خانم، اشارہ خان سب اس کے لئے کتنے پریشان ہو جائیں گے۔ ہو سکتا ہے ان کی نظروں سے یہ خبر نہ گزری ہو ورنہ ابھی تک تو وہ یہاں آجاتے۔“ ہشمنہ نے اسے پریشان دیکھ کر دلاسا دینا چاہا۔

”اُحسن سے تو بات ہوئی ہوگی ناپ کی۔ کوئی کال نہیں آئی ہاسٹل میں۔“ احسن نے تو کچھ نہیں بتایا؟“ ہشمنہ کی بات اس کے دل کو لگی۔ تبھی دروازے پر آہٹ ہوئی۔ وہ دونوں چونکے۔

کمرے میں داخل ہونے والا ذولین خان تھا۔ بالکل غیر متوقع ذولین کو دیکھ کر شامل خان حیران رہ گیا۔

”ذولین۔۔۔ تم۔۔۔“ اُس کا چہرہ چمک اٹھا۔ وہ بھی پریشان سا اس کی طرف بڑھا اور جھک کر اس سے بغل گیر ہو گیا۔

”تم نے تو اطلاع دینے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔ وہ تو اخبار والے مہربانی کر گئے۔“ ذولین نے اس کے وجود پر تشویش بھری نظر ڈالی اور قدرے خفگی سے کہا۔ ”یہ سب کیسے ہوا؟“

”تم بیٹھو تو۔۔۔ آتے ہی غصہ نکالنے لگے یار!“ شامل اس کی خفگی پر مسکرایا۔

ہشمنہ حیران کن نظروں سے ذولین کو تکتی رہی جو اس سے پہلے بالکل اجنبی تھا۔ نام تک سے واقفیت نہ تھی۔ وہ شامل سے اس کی اتنی بے تکلفی پر حیران ہوئی جا رہی تھی۔

”بابا خان وغیرہ کو بھی خبر ہے؟“ وہ اپنا خدشہ زبان پر لے آیا۔

”نہیں۔۔۔ میں یہ خبر والا صفحہ گول کر گیا تھا۔ سوچا پہلے خود دیکھ آؤں کہ معاملہ کتنا سیریس ہے۔“

”تو دیکھ لو۔۔۔ زیادہ سیریس نہیں ہے۔“ شامل خان نقاہت محسوس کرنے کے باوجود لہجے میں بشاشت طاری

کرتے ہوئے بولا۔

”بکومت۔۔۔ زیادہ سیریس کسے کہتے ہیں؟“ ذولین خان کی سبز آنکھوں میں غصہ ہلکورے لینے لگا۔ ”میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ چھٹیوں میں تم غائب رہتے ہو۔ وادی کا چکر نہیں لگاتے۔ پولیس کے چکروں میں ہو سٹل میں ہی پڑے رہتے ہو۔“

”اوکے۔۔۔ اوکے۔۔۔ یار! تم ذرا ٹھنڈے تو ہو لو۔“ شامل خان نے کچھ اس طرح کہا کہ باہم جڑے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”ارے ہشمنہ! اس سے ملو، یہ ذولین ہے۔ عم زاد ہے میرا۔ اور میرا بہترین دوست۔“ اس نے ہشمنہ کی سمت دیکھا تو وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

ذولین نے بھی اس کی طرف دیکھا اور پھر قدرے چونکا۔ سیاہ چادر کے ہالے میں جگمگاتے چہرے اور سیاہ فسوں خیز آنکھوں والی اس لڑکی کے لئے شامل خان کی آنکھوں میں انوکھے رنگ تھے۔

”میری کولیگ تو نہیں مگر۔۔۔“ شامل کچھ جھجک سا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ذولین سے ہشمنہ کا تعارف کس طرح اور کس رشتے سے کرائے۔

”مگر کیا؟“ ذولین نے اُسے کھوجتی نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکا سا تبسم لہرا رہا تھا جس نے شامل خان کو کچھ اور بھی خفیف کر دیا۔

”میرے خیال سے اب میں چلوں گی۔“ ہشمنہ، ذولین خان کی نگاہوں سے جھینپ کر جلدی سے بولی اور سرعت سے کمرے سے باہر چلی گئی۔

”تم نے وضاحت نہیں کی اشمٰل!“ ذولین اس کے کمرے سے جاتے ہی اشمٰل خان کی طرف پوری طور پر متوجہ ہو گیا۔ اُسے تجسس ہونے لگا۔ گو کہ کسی حد تک اس نے اندازہ تو لگا لیا تھا مگر

وہ سب کچھ اشمٰل خان سے صاف لفظوں میں سننا چاہتا تھا۔

”گل بی بی کی نند کی بیٹی ہے۔ ابراہان گل کی بیٹی۔“ وہ اُس کی سبز آنکھوں کی محویت سے جھینپ کر بولا۔

”یہ وضاحت تو نہیں تمہارے تعلق کی۔“ ذولین کا تہقہہ بے ساختہ تھا۔

”بہت چالاک ہو یاد! تم سے بچنا بہت مشکل ہے۔ یہ بتاؤ وادی میں سب کیسے ہیں؟ کسی کو اس حادثے کی اطلاع تو نہیں ہے؟“ اس نے بھی کمال خوبصورتی سے بات بدل دی جس پر ذولین مسکرا کر رہ گیا۔

”نہیں۔۔۔ ابھی تک تو کسی کو خبر نہیں ہے۔ مگر میں جا کر ضرور سب کو باخبر کر دوں گا۔ آخر کیا دھند اپال رکھا ہے تم نے۔ دیکھو اشمٰل خان! تم چچا خان کو بہت عزیز ہو۔ خود کو ان بکھیڑوں میں مت الجھاؤ۔“

”یہ بکھیڑا نہیں ہے ذولین! نہ ہی میرا شوق ہے۔ یہ ضرورت ہے۔ اچھے اور سازگار حالات کی ضرورت ہے تمام طلباء کو۔ ذولین! میں سب کچھ بدل دینا چاہتا ہوں۔ دھونس، نفرت اور دہشت گردی سے اس زمین، اس درس گاہ کو پاک کرنا چاہتا ہوں۔ یہ جہاد ہے اور اس میں میرے ساتھ بہت سے لوگ شریک ہیں۔ میں تو بس ایک راستہ بنانا چاہتا ہوں۔ منزل گو کہ ابھی میرے اختیار سے بہت دور ہے۔ مگر میرے پیچھے آنے والے ان راستوں پر چل کر کبھی تو منزل پالیں گے۔ آئی ایم ویری ہوپ فل ذولین!“

اس کا لہجہ شدت جذبات سے بھاری ہو گیا۔ ذولین اپنے اس عم زاد اور دوست کو چند ساعت دیکھتا رہا جس کے چہرے پر عزم روشنی کی طرح چمک رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ اگر صحیح راستے کا تعین ہر شخص کر لے تو پھر منزل دور نہیں۔ مگر اشمٰل! تم نے اس حادثے کی رپورٹ کروائی ہے ان لوگوں کے خلاف جنہوں نے یہ فائرنگ کی ہے؟“

”ہاں۔۔۔ ایک لڑکا ہلاک ہو گیا ہے شہباز نام کا۔ اس کے والدین نے ایف آئی آر درج تو کروائی ہے۔ بس ذولین! میرے زخموں کو ذرا بہتر ہو لینے دو۔ میں خود اس کے خلاف گواہی دوں گا۔ ریحان اب سلاخوں کے پیچھے مجھے نظر نہیں آیا تو میرا نام بھی اشمٰل خان نہ ہو گا۔“

”اشمٰل۔۔۔!“ ذولین نے اس کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔ ”فی الحال تمہیں میرے ساتھ وادی چلنا ہے۔ ان عدالتوں کے چکر میں پڑو گے تو لمبا عرصہ گزر جائے گا۔ اور پھر چچا خان سے کچھ بھی مخفی نہ رہ سکے گا۔ جانتے ہو انہوں نے مجھے چند دن پہلے ہی کہا تھا کہ میں اشمٰل کے پاس ایک چکر لگاؤں۔ اور اگر میں یہاں نہیں آتا تو وہ ضرور آجاتے۔ اور اب تم میرے ساتھ نہ چلے تو کچھ بعید نہیں کہ چچا خان خود شہر آہی جائیں۔“

ذولین کی بات پر اس کے چہرے پر تردد کے رنگ پھیل گئے۔

”مگر ذولین! ڈی ایس پی منظور احمد سے میری بات ہو چکی ہے۔ وہ خود اس کیس میں مصروف ہے اور عنقریب شہباز کا مقدمہ بھی پیش ہو جائے گا۔ اور ایسے میں میری ضرورت ہے۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ میں تمہیں گواہی دینے سے نہیں روک رہا۔ مجھے خوشی ہوئی ہے تمہاری باتیں سن کر۔ تمہاری ہمت و جرأت کی داد دیتا ہوں۔ مگر اشمٰل! صرف ایک ہفتے کی بات ہے۔ تم وادی چلو اور پھر واپس آکر مقدمے کی سماعت کرو۔“

”اچھا، تم کب تک ہو یہاں؟“ اشمٰل خان نے جیسے ہتھیار ڈال دیئے۔

”میں یہاں دو دن مزید ہوں تمہارے پاس۔ اس عرصے میں کچھ زخم تو مند مل ہو جائیں گے۔ علان تو اچھا ہو رہا ہے



۱۰۰

”ہاں۔“

”بس تو پھر کیا ہے۔۔۔ وہاں کہہ دیں گے کہ تمہاری کار کا حادثہ ہو گیا تھا۔ معمولی زخم آئے ہیں۔ جو یقیناً شاہ خاں اور اشتار کی خدمت سے بہتر ہو جائیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے ذولین خان زور سے ہنسا تو شامل خان بھی ہنس دیا۔

”پورا پلان بنا کر آئے ہو مجھے لے جانے کے لئے۔“

”ہوں \_\_\_ یہی سمجھ لو۔ اور پھر شاندا نہ کی شادی بھی تو ہے۔“

”اچھا \_\_\_\_\_ کب؟“

”بس انہی پندرہ بیس دنوں میں۔ تیاریاں تو زور و شور سے جاری ہیں۔ تم اٹینڈ کرتے ہی واپس آجانا۔“ ذولین یہ کہتا ہوا اٹھ کر اس کے پیر کا زخم دیکھنے لگا۔

”ہاں ظاہر ہے، گل بی بی اس طرح جانے بھی کب دیں گی جب تک شاندا نہ رخصت نہیں ہو جاتی۔“ وہ مسکرایا اور پھر سر تکیہ پر ڈال کر آنکھ موند کر بولا۔

”ذولین! ہشتمینہ کیسی لگی تمہیں؟“

ذولین خان نے چونک کر اسے دیکھا پھر اس کے قریب آیا۔

”اچھی ہے۔۔۔ میں تمہاری پسند کی داد دیتا ہوں۔“ اس کے تصور میں سیاہ چادر کے ہالے میں جگمگاتا چہرہ اور فسوں خیز آنکھیں ابھرائیں۔

”ذولین! وہ لمحہ میرے اختیار سے باہر تھا جب میرا دل ہشتمینہ ابرا کو چاہنے لگا۔ ایک دم ہی وہ مجھے اپنے دل سے بہت

قریب محسوس ہونے لگی۔ شاید وہ میری شکست کا لمحہ تھا۔ اور پتہ ہے ذولین! مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ میری شکست ایک اچھے فاتح کے ہاتھوں ہوئی۔“ وہ آنکھیں کھول کر عجیب مخمور نگاہوں سے چھت کو دیکھنے لگا۔ ذہن کے پردوں میں نرم چہرے والی ہشمنہ ابرار جھانک رہی تھی۔ سیاہ فیسوں خیز آنکھوں والی لڑکی کی محبت ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کے دل میں شدید ہو رہی تھی۔

”کیا اس شکست کی خبر چچا خان کو پہنچا دوں کہ آپ کا توانا، لائق و فائق بیٹا ایک کمزور لڑکی کے ہاتھوں۔۔۔۔۔“

”ارے، نن۔۔۔۔ نہیں۔ یہ ستم مت کرنا۔“ اشمل خان گھبرا کر اٹھ بیٹھا مگر دوسرے لمحے ذولین کی آنکھوں میں مہکتی شریر مسکراہٹ سے جھینپ گیا۔

”دل بڑے بڑے مضبوط اور فاتح کی دسترس سے بھی باہر ہوتا ہے ذولین!“ اس نے کہا اور سائیڈ ٹیبل سے پانی سے بھرا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

اس کی بات پر ذولین خان کو لہجہ شکست یاد آگئی جو اشتار نے اسے ایسے ہی کسی کمزور لمحے میں دی تھی۔

”دیکھو، تم اسے اپنے تک ہی محدود رکھنا۔“ اس نے تاکید کی نظروں سے ذولین کو دیکھا۔

”گل بی بی کو تو بتانا ہی پڑے گا۔ آخر تم نے ان کی نند کی بیٹی۔۔۔۔۔۔“

”آخا، اشمٰل خان! آج بڑے تازہ تازہ لگ رہے ہو۔“ احسن کی بلند آواز پر ذولین خان نے اپنا بقیہ جملہ منہ میں ہی روک لیا۔

وہ اشمَل کے مسکراتے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ ذولین پر نگاہ اٹھی تو جو رنگ۔

”خوب\_\_\_ تعریف اس خدا کی جس نے یہ شاہکار بنایا۔ مگر پھر بھی آپ کی تعریف؟“ اس نے توصیفی نظروں

سے ذولین خان کے دلکش سراپے کو دیکھا۔

”یہ ذولین ہے۔“

”اچھا، اچھا۔۔۔ غائبانہ تعارف تو ہوا ہے مگر دیکھنے کا اتفاق پہلی بار ہوا ہے۔ کیا یہ لینز تو نہیں؟“ اس نے اچانک اس کی سبز کانچ سی آنکھوں کی سمت اشارہ کیا تو ذولین نے لب بھینچ کر اشمیل کی سمت دیکھا۔ اُسے احسن کی دماغی حالت پر شک گزرا۔

”احسن! کیا فضول بک رہے ہو؟ ذولین! اس شخص کے پاس عقل کی کمی ہے۔“ اشمیل مسکراہٹ کو دبا کر بولا۔  
 ”واللہ۔۔۔ اگر آپ لڑکی ہوتے تو کچھ بعید نہ تھا کہ میری بچی کبھی عقل بھی سلامت نہ رہتی۔“ وہ یہ کہہ کر زور سے ہنسا۔ ذولین اپنی اس تعریف پر جھینپ گیا۔

”ویسے اشمیل کی برداشت کی داد دیتا ہوں جو نہایت اطمینان اور صبر سے آپ کی یہ باتیں ہضم کر جاتا ہے۔“ ذولین خان نے پہلی بار لب کشائی کی تو احسن سر کھجاتے ہوئے قدرے جلدی سے بولا۔

”خیر، اطمینان سے تو ہضم نہیں کرتا۔ خاصی کڑواہٹ، بے چینی اور ہمت کے ساتھ نوش فرماتا ہے۔“

”میرے خیال سے مجھے چلنا چاہئے۔ ہاں تو مسٹر۔۔۔“

”احسن۔“

”جی، مسٹر احسن! میں برداشت کے معاملے میں بالکل صفر ہوں۔ اس لئے خدا حافظ۔“ ذولین یہ کہہ کر سرعت سے نکل گیا۔ احسن کتنی ہی دیر بغلیں جھانکتا رہا۔

”ہر وقت تم بے تکی ہی ہانکتا۔“ اشمیل اس کی کھسیاہٹ پر خاصا ملاحظہ ہوا۔

”ویسے زبردست پرسنیلٹی ہے۔ میں ہی کیا کوئی اور بھی ہوتا تو دیوانہ ہو جاتا۔ مگر ایک افسوس رہ گیا۔“

”کس بات کا؟“

”کہ یہ لڑکی کیوں نہیں۔۔۔ یا پھر میں صنفِ کرخت کیوں۔“

”توبہ، توبہ۔۔۔“ اشمیل کا اپنا سر پیٹ لینے کو دل چاہا۔

”اشمیل خان! آپ سے کوئی شاہنواز پر اچہ صاحب ملنا چاہتے ہیں۔“ نرس کی آواز پر دونوں چونکے۔

”کیا۔۔۔ شاہنواز پر اچہ؟“ احسن پلٹا۔

”جی۔۔۔ نام تو انہوں نے یہی بتایا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ انہیں اندر بھیج دو۔“ اشمیل اپنی حیرت کو بہ دقت قابو کرتے ہوئے بولا تھا۔

شاہنواز پر اچہ نے مختلف فروٹز کے لفافے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیئے اور اشمیل خان کی طرف آئے۔

”بہت دکھ ہوا ہے مجھے تمہاری یہ حالت دیکھ کر۔“ وہ اس کے قریب آگئے۔

”مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔“ اشمیل خان نے ان لفافوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”جانتا ہوں۔۔۔ بس، یہ تو میرے دل کی خواہش تھی۔ تم میرے بیٹے کی طرح ہو۔“ انہوں نے لبوں پر دوستانہ

مسکراہٹ سجاتے ہوئے اسے دیکھا اور پھر ان کی نگاہ احسن پر اٹھی تو وہ کچھ سوچ کر دھیرے سے بولے۔

”میں تنہائی میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم۔۔۔۔۔“

”میں جانتا ہوں کہ آپ کیا کہنے تشریف لائے ہیں۔ اور یہ بھی اس سے اچھی طرح واقف ہے۔“ اشمیل خان نے ان

کا جملہ کاٹ دیا۔

”بالکل۔“ احسن مسکرایا۔ اُس کا ڈھیروں خون بڑھ گیا تھا۔

”پھر بھی اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو۔۔۔۔۔“ وہ مصر تھے احسن کے چلے جانے پر۔

”ناگوار تو گزرے گا چچا! مگر ٹھیک ہے۔“ احسن نے شانے اچکائے اور کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چچا کہنے پر شاہنواز پر اچہ کا منہ بن گیا تھا۔

”مگر یاد رکھئے گا۔۔۔ شامل خان کئے والا نہیں ہے۔“ اس نے جھک کر قدرے جلانے والے انداز میں کہا اور پلٹ کر سرعت سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

”دیکھو شامل بیٹا! یہ یونین وغیرہ میں کھڑے ہونے والے لڑکے جذباتی ہوتے ہیں۔ اور پھر عمر بھی ایسی ہو تو غلطیاں سرزد ہو ہی جاتی ہیں۔“ احسن کے جانے کے بعد شاہنواز پر اچہ نے کہنا شروع کیا۔ ”میں مانتا ہوں کہ ریحان سے غلطی سرزد ہو گئی ہے۔“

”غلطی نہیں، جرم۔ اور جرم معاف نہیں کیا جاتا۔ اس کی سزا ہوتی ہے۔“ شامل کا چہرہ تن گیا۔ ”آپ میرے پاس کیوں آئے ہیں؟“ اصولاً تو شہباز کے گھر جانا چاہئے۔“

”ہاں، ان لوگوں نے مقدمہ دائر کیا ہے۔ مگر انہیں گواہی ملنا ناممکن ہے۔“ شاہنواز پر اچہ نے نرم لہجے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے خصوصی متکبرانہ لہجے میں کہا تو شامل نے اسے دیکھا۔

”ریحان کی یہ حرکت لوگوں سے چھپی نہیں ہے۔ اور پھر میں گواہی دے رہا ہوں۔“ اس کا لہجہ تند تھا۔

شاہنواز پر اچہ نے اس کے سخت چہرے کو دیکھا۔

”ہاں۔۔۔ جانتا ہوں۔ مگر ینگ مین! تم نہیں جانتے کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھتے ہو۔“ انہوں نے شامل خان کو سنگینی کا احساس دلایا اور حقیقت جتنی چاہی۔ ”تم میری پوزیشن سے اچھی طرح واقف ہو۔ میں تمہیں اس غلطی سے رکنے کی تنبیہ کر سکتا ہوں۔ مجھے تمہاری جان عزیز ہے۔“

”شاہنواز پر اچہ!۔۔۔ اگر آپ انہی باتوں کے لئے آئے ہیں تو آپ اپنی سی کوشش کر ڈالئے۔ باقی اللہ نگہبان۔“ وہ یہ کہہ کر بستر پر دراز ہو گیا۔ گویا مزید اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ ابھی تم بچے ہو۔ سمجھنے میں دیر لگے گی۔ وقت تمہیں خود ہی سکھا دے گا سب کچھ۔“ وہ کھڑے ہو گئے۔

”اپنی یہ چیزیں لے جائیے گا۔“

”ہاں۔۔۔ ان کی اب ریحان کو ضرورت ہو گی۔“ احسن اندر آ گیا۔

شاہنواز پر اچہ نے کھا جانے والی نظروں سے احسن کو دیکھا اور لائے ہوئے لفافے اٹھا کر باہر نکل گئے۔

”کیوں آئے تھے یہ چچا؟“

”پلیز احسن! میں اب تنہائی چاہتا ہوں۔“ شامل نے بگڑے لہجے میں کہا اور آنکھیں موند لیں۔ غصے سے اس کا رواں رواں سلگ رہا تھا۔ شاہنواز پر اچہ کی باتوں نے اس کا موڈ سخت خراب کر دیا تھا۔

احسن نے اس کے تنے چہرے اور بھنچے لبوں کو دیکھا اور خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔

...☆☆☆...

کتنی ہی دیر تک وہ خالی خالی نظروں سے زمان خان کو تکتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ جیسے گزرے لمحے ذہن میں آنے لگے۔



آنکھوں کے سامنے ہر پل لہرانے لگا۔

”اُف\_\_\_“ ایک ٹیس سی اُٹھی اور سارے بدن میں پھیل گئی۔ اُس نے دُکھ سے بو جھل آنکھیں موند لیں۔

وہ شخص اس کے اتنا قریب تھا۔

”اب کیسی طبیعت ہے شارد؟“ مانوس سی آواز مگر لہجہ نیا تھا۔ اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

”ٹھیک ہوں۔“

”میں تو پریشان ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر ابھی واپس گیا ہے۔“ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

”شکر یہ اس نوازش کا۔“ وہ آنکھیں کھول کر اس کی سمت دیکھے بغیر اٹھنے لگی۔

”ہاں، ہاں\_\_\_ ابھی لیٹی رہو۔“ وہ اُٹھ کر اس کے قریب آگیا۔

شارداحیات کی ساری ہستی جیسے ڈول گئی۔ وہ سراٹھا کر آنکھوں میں حیرت کا جہاں لئے اس بے حس کو دیکھنے لگی جسے جیتنے کے لئے اس نے اپنے آپ کو توڑ دیا تھا۔

”نہیں\_\_\_ اب میں بہتر ہوں۔“ وہ مزید اس کی آنکھوں میں نہ دیکھ سکی۔ عجیب سے احساسات میں گھر گئی تھی۔

زمان خان کا یہ بدلا ہوا لہجہ اور اتنی نرمی۔

بے حسی کی چادر سے جو چہرہ نکلا تھا وہ اس کے لئے یکسر اجنبی تھا۔ وہ اُلجھ سی گئی۔

”شاردا\_\_\_“ اُس نے اس کی نازک کلائی تھام لی۔ ”تم کتنی بہتر ہو، یہ مجھ سے زیادہ کون جانتا ہوگا؟“ اس کا لہجہ ذو معنی تھا۔ وہ تڑپ گئی۔

”پلیز\_\_\_ زمان\_\_\_“ وہ اس کے لمس سے خوفزدہ ہو رہی تھی۔

”تمہاری اس بیہوشی کی وجہ میں جانتا ہوں اور اس لئے نام ہو رہا ہوں۔“ وہ کھڑا ہو گیا اور بے چینی سے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچنے لگا۔ ڈھیر ساری باتیں تھیں جو وہ اس سے کرنا چاہتا تھا۔ ہر ہر لمحے کی معافی مانگنا چاہتا تھا مگر \_\_\_ ندامت سارے لفظوں کو جیسے نگل رہی تھی۔ وہ کس طرح اس معصوم لڑکی کے سامنے اپنے ڈھیر سارے گناہوں کی معافی طلب کرے۔ کیا وہ واقعی قابل معافی تھا؟

اُس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ اسی زاویہ سے بیڈ کے کنارے بیٹھی تھی اور اُلجھی اُلجھی نگاہیں اس کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ کتنا سادہ، بے ریا چہرہ تھا۔

”آپ کہنا کیا چاہتے تھے؟“ نظریں ملنے پر اس نے دھیرے سے پوچھا۔

”کیا کہوں\_\_\_ کوئی لفظ گرفت میں نہیں آ رہا ہے۔ اپنے جرم اور گناہوں کا اتنا بھاری بوجھ ہے میرے اوپر کہ دبا جا رہا ہوں۔ یہ کس طرح اترے گا\_\_\_ کون سا جملہ، کون سا لفظ اس بوجھ کو ہلکا کرے گا۔ کیا میں معافی مانگنے کے قابل ہوں؟“ وہ اُس کے قریب آیا۔ ”نہیں ہوں نا؟\_\_\_ تمہارے اتنے خوبصورت سالوں کا میں نے گلا گھونٹ دیا۔ تمہارے خوابوں کا بھاری قرض ہے مجھ پر۔“ وہ کفِ افسوس ملنے لگا اور شارداحیات کی آنکھیں حیرانیوں کے سمندر میں ڈوب گئیں۔ جسم کا سارا خون چہرے پر سمٹ آیا۔

ہونٹ یکبارگی کانپ کر کھلے کے کھلے رہ گئے۔

وہ بے یقینی کے عالم میں زمان کو دیکھتی رہ گئی۔ اُسے اپنی سماعت پر اعتبار نہ آ رہا تھا۔ اُسے اپنی بصارت پر یقین نہ آ رہا تھا۔ وہ کیا دیکھتی\_\_\_ کیا سنتی۔ یہ جملے جو خوشبو میں بسے تھے اس کے دل کی دنیا میں طوفان اٹھا رہے تھے۔

”شاردا! میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ میری بے حسی اور کج روی نے تمہیں یقیناً بکھیر دیا ہے۔ کیا میں سمیٹنے کی

کوشش کر سکتا ہوں۔۔۔؟“ وہ یہ کہہ کر اُسے دل آویز نظروں سے دیکھنے لگا۔

اور وہ تو پہلے ہی طوفان میں گھری ہوئی تھی۔ دل جیسے سینے کی دیواروں میں مچل رہا تھا۔ آنسوؤں نے آنکھوں کا راستہ دیکھ لیا تھا۔

”میں تمہارے ان گزرے سالوں کو واپس تو نہیں لاسکتا۔ مگر آنے والے لمحوں کے عذاب سے تمہیں بچانے کا عہد کر رہا ہوں۔ میں تم سے معافی مانگتا ہوں شادا! میرے عظیم جرم کو معاف کر دو۔“ اس نے اس کے شانوں پر اپنے دونوں مضبوط ہاتھ رکھ دیئے۔ ”سارے تلخ واقعات بھلا کر ماضی کی ساری گرد جھاڑ کر اب ہم اپنی نئی زندگی شروع کریں گے۔ میری تقصیر کی جو چاہو سزا دے دو، مجھے منظور ہے۔ مگر مجھے دل سے معاف کر دو۔ میرے ضمیر کا بوجھ ہلکا کر دو۔“

"ز۔۔۔۔۔۔۔ن۔۔۔۔۔۔۔ اس کے لب کانپ گئے۔ وہ بے اختیار ہو کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ یہ اتنی  
بڑی خوشی اس سے سنبھل نہیں رہی تھی۔

اس کی زندگی انقلاب سے دوچار ہو گئی تھی۔ اسے گمان نہیں تھا کہ وہ دورِ نظر آتا صحرا ایک دم گلستان میں بدل جائے گا۔ یہ کب سوچا تھا۔ کیا یہ کہیں اس کی سماعت کا دھوکا تو نہیں تھا؟

اس نے پلکیں جھکا کر ایک بار پھر آنسوؤں سے بھاری ہوتی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔

”زمانہ۔۔۔۔۔خان۔۔۔۔۔میرادل اتنے بڑے مذاق کا مستحمل نہیں ہو سکے گا۔“ اس کی آواز میں لرزش تھی۔

زمان خان تڑپ گیا۔

وہ کتابے اعتبار ہو چکا تھا اس کی نظروں میں۔ گہرے ملال نے اسے آگھیرا۔ بنجر زمین پر چلتے چلتے پائوں اب اتنے

کھر درے ہو چکے تھے کہ ٹھنڈے نرم فرش کا گداز محسوس نہیں کر سکتے تھے۔

”شماردا! \_\_\_ میری زندگی! \_\_\_ یہ مذاق نہیں۔ سچ ہے۔ میں اپنے جرم پر نادم ہوں اور تم سے معافی کا خواستگار۔ میں مانتا ہوں کہ اب تمہاری نظروں میں میرا اعتبار اٹھ چکا ہے۔ تمہارے دل میں شاید میرے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ میرے نام سے وابستہ ہونے کے بعد تم نے دکھ ہی دکھ اٹھائے ہیں۔ مگر اب میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے سارے زخموں پر مرہم رکھ دوں گا۔“ اس کا لہجہ مالتجی تھا۔

”تم تو میری روح کی پنہائیوں میں اب بھی جلوہ گر ہو زمانہ \_\_\_ تمہیں دل سے نکال سکتی تو پھر تمہاری کج روی پر دُکھی کیوں ہوتی؟ چاہنے والے کی بے اعتنائی ہی تو آگ لگاتی ہے من میں۔ جس کے التفات کی منتظر ہو اسی کی بے اعتنائی ہی تو دکھ بھرتی ہے۔“ وہ سوچے جا رہی تھی۔

”کچھ کہو شماردا! \_\_\_\_\_ بیتے سالوں کا دکھ، میری نا انصافیوں اور کی گئی زیادتیوں کا حساب مانگو \_\_\_\_\_ اتنی خاموش کیوں ہو؟“ وہ اس کے جھکے سر کو بے قرار نظروں سے دیکھنے لگا۔

”زمان! میں تو صرف ایک قطرے کی خواہاں تھی۔ تم نے تو ایک دم التفات اور محبت کے ڈھیر سارے دروازے کھول دیئے مجھ پر۔ یہ انعام نہیں تو اور کیا ہے رب العزت کا۔“ وہ لڑکھڑاتی بیڈ سے کھڑی ہو گئی۔

خوشی اس کے انگ انگ میں بھر گئی تھی۔ جیسے اچانک مسیحائی کے کواڑ کھلے تھے اور دستِ کرم آگے بڑھا تھا۔ وہ جو کہہ نہ سکی۔ اشک بن کر صفِ مرزاں پر رقم ہوتا چلا گیا۔

زمان خان نے اس کے کانپتے ہاتھ تھام لئے۔

”تم عورتیں بھی کیسے دل لے کر آتی ہو۔۔۔ مرد کی برسوں کی زیادتیوں کو اس کی ایک مسکراہٹ، ایک نرم جملے پر بھلا دیتی ہو۔ میں اس عظیم دل کے آگے ہار گیا۔ شاد احویات! مجھے اپنا وجود بالکل ہیچ محسوس ہو رہا ہے تمہارے وجود

کے سامنے۔“

شاردا کی ذہنی تھکن پر روشن تازگی سبج گئی۔

زمان خان کا ایک ایک جملہ اُسے اپنے بنجر سالوں کا ثمر محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے مچلتے وجود میں کیسی ٹھنڈک سی پڑی تھی۔

”اب ان آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں آئیں گے شاردا! یہ بس صرف مسکراہٹوں سے سجیں گے۔“ اس نے آگے بڑھ کر اسے محبت سے اپنے ساتھ لگایا اور اسے لئے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

گھٹن زدہ فضا سے باہر اس کے قدم ہرے بھرے لان کی جانب تھے۔

صبانے جانے کیا کہا

کہ معجزہ سا ہو گیا

بکھر گئیں جو نکلتیں

کرن کرن سحر ہوئی

کلی کلی کے رنگ سے

حیات معتبر ہوئی

جو کم سخن نگاہ تھی

وہ داستاں طراز ہے

جو ترجمانِ آن تھی

وہ سلسبیلِ ناز ہے

دعا کے جو چراغ تھے

وہ سارے آفتاب ہیں

کہ دستِ شاخسار میں

گلاب ہی گلاب ہیں

☆☆☆☆...

سفید سوٹ اور سفید بڑی سی چادر میں شاندا نہ ایک جگہ سمٹ کر بیٹھ گئی تھی بلکہ اسے بٹھا دیا گیا تھا اور آتی جاتی عورتوں کی نصیحتیں سن سن کر وہ کبھی کبھی بیزار ہو جاتی۔

وادے کی ایک رسم یہ بھی تھی کہ شادی سے پہلے لڑکی کو بس ایک کمرے میں محدود کر دیا جاتا کہ کسی غیر مرد کی نظر بھی نہ پڑتی۔ بس عورتیں اور لڑکیاں اس کے پاس آتی جاتیں۔ اور شاندا نہ بھی مارے ڈر کے ایک کمرے میں سمٹ تو گئی تھی مگر اس سے نچلا بیٹھانہ جانا۔ ذولین آتا تو لپک کر اس کے پاس جاتی اور باتیں کرنے لگتی۔ تب گل بی بی کا دھموکا سیدھا پیٹھ پر لگتا۔

”ہزار دفعہ کہا ہے، نہ ملا کر تو مردوں سے۔“

”تو ذولین لالہ کون سے غیر ہیں۔ بھائی ہیں میرے۔“ وہ بسور نے لگتی اور اشتار خوب ہنستی اور شاندا نہ کو بھی ایسے میں اشتار کا دم غنیمت لگتا جو ہر روز اس کے پاس آ جاتی اور اس کے ساتھ ہی علاقے کی ڈھیر ساری لڑکیاں جو دیکھتے ہی

دیکھتے خاموش گھر میں ایک ہنگامہ برپا کر دیتیں۔

وادی کے اطراف کا سارا علاقہ گل بی بی کی خوشی میں شریک تھا۔ کھلتے چہرے اور کھنکتی سریلی تانوں پر خوبصورت گیت اور ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ اشتار کی آواز سب سے بلند ہوتی۔

آج بھی وہ سب کو جمع کئے گیت گارہی تھی۔ اس کا چہرہ خوشی سے متمار ہا تھا۔ سحر گل بہت خوبصورتی سے ڈھول بجا رہی تھی۔

”ارے لڑکیو! ابھی تو شادی میں کئی دن ہیں۔“ گل بی بی نے انہیں چھیڑا تو اشتار جلدی سے بولی۔

”کہاں گل بی بی! شان کو جدا ہونے میں مجھے تو بہت تھوڑے دن لگتے ہیں۔“

”ہاں ٹھیک کہہ رہی ہے تو۔“ اس کی بات پر گل بی بی آزرہ سی ہو گئیں۔ ان کی نگاہیں شاندانہ پراٹھیں، پھر جھک گئیں۔

”ارے، میرا مطلب آپ کو دکھی کرنا نہیں تھا۔“ اشتار اذور سے ہنسی۔ ”ابھی تو بہت دن ہیں گل بی بی! اور پھر میں جو آپ کی بیٹی ہوں، شان سے تو اچھی ہی ہوں۔“

”ہاں، ہاں۔“ کیوں نہیں۔“ گل بی بی نے اسے پیار سے خود سے لپٹایا۔ پھر کچھ سوچ کر ماہ گل کی طرف پلٹیں۔

”تم لوگ شادی تک یہیں رہنا۔ شان کی شادی میں شریک ہو کر ہی واپس شہر جانا۔“

”ارے کہاں گل بی بی۔ ہم تو پرسوں ہی لوٹ کر جا رہے ہیں۔ یہاں آئے ہوئے پہلے ہی کئی دن ہو گئے ہیں۔“

ماہ گل نے متانت سے کہا تو سحر گل کا چہرہ اتر گیا۔

”ہاں، شادی کو تو ابھی ہفتہ پڑا ہے۔ اتنے دن تو ہم نہیں رہ سکتے۔“

اُسے شاندانہ کی شادی میں شرکت نہ کرنے کا بے حد دکھ تھا۔ وہ روز اشتار کے ساتھ گل بی بی کے گھر آتی۔ شاندانہ سے اس کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ اُسے گل بی بی کے گھر کی یہ رونقیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ اب شہر جانے کو اس کا بالکل جی نہ چاہ رہا تھا۔

”ارے۔۔۔ تم کیوں منہ لٹکائے بیٹھی ہو؟ ایک دن ہم تمہیں وادی میں لے آئیں گے پھر سے۔“ اشتار نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

اُسے یاد تھا شاہ خانم، سحر گل کو شامل خان کی دُہن بنانا چاہتی تھیں۔

”چھوڑو یاد۔۔۔ شہر جا کر واپس کب وادی آسکوں گی۔ اور تم تو شہر آتی ہی نہیں ہو۔“

”اب آؤں گی شان سے۔“ وہ ابھی تک شریر نظروں سے اسے دیکھ کر ذومعنی لہجے میں بول رہی تھی۔

”اوں، ہوں۔۔۔ سحر!“ ماہ گل نے اس کا منہ دیکھ کر اسے تنبیہی نظروں سے دیکھا۔

”اوہو آپی! آپ ایک ہفتہ اور رہ لیں تو حرج تو نہیں ہے۔“ اشتار کچھ سوچ کر ماہ گل سے ملتی ہو کر بولی۔

”نہیں اشتار!“ ماہ گل نے انکار کر دیا۔ ”تم تو جانتی ہو نا، گھر پر زمان بھائی اور بھابی شاد ہیں۔ اور ان کا مسئلہ۔“

انہوں نے قدرے آہستگی سے کہا تو اشتار اچپ ہو گئی۔

”ارے، میں تو بھول ہی گئی۔ ڈرائیور کب کا آیا ہوا بیٹھا ہے۔ توبہ، باتوں میں کچھ بھی یاد نہیں رہا۔“ ماہ گل آپی کو جیسے

ایک دم یاد آگیا۔ وہ جلدی سے کھڑی ہو گئیں۔ سحر گل بھی ان کے ساتھ اٹھ گئی۔

”اتنی جلدی کیا ہے۔۔۔ کچھ دیر اور بیٹھ جاتی بیٹی!“ گل بی بی اندر سے کمرے کا چکر لگا کر باہر نکلیں تو انہیں جانے

کے لئے تیار دیکھ کر بولیں۔



”پہلے ہی اتنی دیر ہو گئی ہے۔ بیچارہ ڈرائیور سوکھ کے رہ گیا ہو گا۔“

”معمور جان تو خاصا تنگڑا ہے آپ! اتنی جلدی سوکھے گا نہیں۔“ سحر گل بولی تو سب ہنسنے لگے۔

ماہ گل نے جاتے جاتے شاندا نہ کو بہت پیار کیا۔

”تم سب لوگ ہمیں بہت یاد آؤ گے۔ خاص کر یہ خوبصورت وادی۔“

”جانے سے پہلے ایک بار پھر آنا ماہ گل!“ گل بی بی نے کہا تو وہ ہنس دی۔ اس کی ہنسی میں نہ انکار تھا نہ اقرار۔

شاندا نہ نے اشتاراکو روک لیا تو وہ اس کے اصرار پر زیادہ انکار نہ کر سکی۔ پاس پڑوس کی لڑکیاں بھی گل بی بی اور شاندا نہ سے اجازت لے کر جا رہی تھیں۔

”مہک! کل ضرور آنا۔“ شاندا نہ نے جاتی ہوئی سہیلی سے کہا تو وہ پلٹی۔ پُرکشش سی، پیاری لڑکی تھی اور بے حد شریر۔“

”کیوں؟“

”شان چاہتی ہے کہ روز ہم اس کی شادی کے گیت گائیں۔“ اشتاراکو نے اسے چھیڑا تو شاندا نہ جھینپ گئی۔

”ہشت۔۔۔۔۔ بد تمیز۔۔۔۔۔ اس لئے تھوڑی ہی کہہ رہی ہوں؟“

”اور پھر کس لئے کہہ رہی ہو؟“ مہک نے ٹھنک کر پوچھا۔

”میں تم سب کو بہت بار دیکھ لینا چاہتی ہوں۔ اپنے اندر اتار لینا چاہتی ہوں۔ ڈھیر ساری باتیں اور مسکراہٹوں کو یاد کے روپ میں اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے شاندا نہ کی آنکھوں کے فرش گیلے ہو گئے۔

”چند دنوں کے بعد تو یہ سب میرے لئے اجنبی ہو کر رہ جائے گا۔“

”آں، آں۔۔۔۔۔ شان! یہ کیا پاگل پن ہے؟“ اشتاراکو نے جلدی سے اسے سنبھالا۔ ”بالکل پاگل ہو۔ شہباز بھائی تمہیں دوسرے گائوں ہی تو لے جائیں گے۔ کسی دوسرے ملک

تو نہیں نا۔ ارے روز آؤ گی، نت نئے کپڑے پہن کر۔ اور پھر جنابہ! ایک سال بعد ایک عدد چنو منو کو لے کر آؤ گی۔“

”ہائے بد تمیز۔۔۔۔۔“ شاندا نہ کا چہرہ تک سرخ ہو گیا۔ اس نے زور سے دھموکا اشتاراکو کی پیٹھ پر دے مارا۔ ”کتنی بد تمیز ہو گئی ہے تو۔“

مہک کھلکھلاتی باہر نکل گئی۔

”چل دفع ہو یہاں سے۔“ شاندا نہ سرخ سرخ چہرے کے ساتھ اُسے پرے دھکیلنے لگی تو وہ زور سے ہنستی ہوئی اٹھ کر آگے بڑھی مگر اس کا اگلا قدم زمین نے جکڑ لیا۔

ذولین خان درمیانی دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔ اس کی نگاہیں بھی اشتاراکو پر اٹھیں اور کتنی ہی ساعت وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پورے چار دن بعد وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ذولین خان کی آنکھوں میں تشنگی بکھری ہوئی تھی جبکہ اشتاراکو کی نگاہیں شکونوں سے بھر گئیں۔

”ارے حور مینا۔۔۔۔۔ دیکھو تو شان! یہ حور مینا کدھر مر گئی۔ توبہ، سارا گھر الٹ پلٹ پڑا ہے۔ کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔“ گل بی بی برہم برہم سی اپنے کمرے سے نکلیں تو وہ دونوں جیسے عالم خود شناسی میں آ گئے۔

”ارے ذولین! تم کب آئے شہر سے؟“ گل بی بی کی نگاہیں ذولین پر اٹھیں۔ اشتاراکو نے جلدی سے پلٹی اور شاندا نہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”کیا حال ہے آپ سب کا؟ اور بھئی، ابھی سے اپنی شادی کا ہنگامہ مچائے رکھا ہے تم نے۔“ ذولین شاندانہ کو دیکھ کر بولا تو وہ شرمائی۔

”نہیں تو \_\_\_ میں نے تو نہیں مچایا۔“ اس نے بے حد معصومیت سے برجستہ کہا تو وہ ہنس دیا۔

”اشمل بھی آیا ہے \_\_\_ ابھی میں نے اسے حویلی پر ڈراپ کیا ہے۔“ اس نے کرسی پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے اطلاع فراہم کی۔

”اس \_\_\_ اشمل آیا ہے؟“ گل بی بی نے چونک کر پوچھا۔

”ہوں \_\_\_ یوں سمجھے زبردستی کھینچ کر لایا ہوں \_\_\_ اُسے شان کی شادی کا علم ہی نہیں تھا۔“

”چلو، اب تو رہے گانا نہیں پر۔“

”ہاں، ارادہ تو ہے۔“ اس نے کہا پھر گل بی بی کو باورچی خانے کی طرف جاتے دیکھ کر شاندانہ کو مخاطب کیا۔

”اشتراکب آئی؟“

”آئی تو صبح سے ہے مگر اب ایک گھنٹے بعد معمور خان آئے گا لینے اسے۔ ویسے خیریت ہے؟“

”اس سے کہو کہ میں واپس حویلی ہی جا رہا ہوں۔ چلنا ہے تو چلے میرے ساتھ۔“ اس نے سرسری انداز میں کہا مگر نگاہیں اسی کمرے کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں جس کے اندر اشتراکب آگئی تھی۔

”آپ ہی پوچھ لیں اس سے۔“ شاندانہ مسکراہٹ دبا کر لاپرواہی سے بولی۔

”ابھی کہاں جا رہے ہو ذولین! کھانا کھا کر ہی جانا۔“ گل بی بی اس کے سامنے قہوہ رکھتے ہوئے بولیں۔ پھر شاندانہ کی طرف رخ موڑ کر بولیں۔ ”جاؤ نشان! اشتراک کو تو بلا لاؤ۔ وہ کیوں اندر بند ہو کر بیٹھ گئی ہے۔“

”میں اب چلوں گا گل بی بی!“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”کیوں \_\_\_ قہوہ تو پی لو۔“ انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”ہاں \_\_\_ قہوہ تو پی لیتا ہوں۔ مگر کھانا نہیں کھائوں گا۔ تھکن بہت ہو رہی ہے۔ بس آپ کو سلام کرنے آگیا تھا۔“ اس نے قہوے کی پیالی لبوں سے لگائی۔

”کیا ڈرائیو آیا ہے شان؟“ وہ شاندانہ کی آواز پر باہر نکلی۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی جو اس کی ندرت کی ندرت کا واضح اظہار تھا۔

ذولین خان کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

”ہاں \_\_\_ ڈرائیو ہی آ رہا ہے سمجھ لو۔“ شاندانہ ہنسی۔

”کیا مطلب؟“

”ذولین لالہ کہہ رہے ہیں وہ حویلی جا رہے ہیں۔ تمہیں اگر جانے کی جلدی ہے تو ان کے ساتھ ہی حویلی چلی جاؤ۔“ شاندانہ نے یہ کہتے ہوئے بھرپور نظروں سے دونوں کے چہرے کا جائزہ لیا۔

”نہیں \_\_\_ مجھے ابھی نہیں جانا۔“ اس نے قدرے خفگی سے کہہ کر رخ موڑ لیا اور اس کمرے میں جانے کو پلٹی تو گل بی بی نے اُسے پکارا۔

”ہاں \_\_\_ مت جاؤ۔ مگر اندر کمرے میں بند ہو کر کیوں رہ گئی ہو؟ بیٹھو یہاں ہمارے پاس۔ عجیب ہی لڑکی ہے۔

کہاں شام تک شرارتیں کئے جا رہی تھی اور اب دیکھو چہرہ بگاڑ لیا ہے۔ بیٹھو یہاں۔“ گل بی بی نے اُسے تھام کر بٹھا دیا۔

”شاید میرا چہرہ پسند نہیں آیا اسے گل بی بی۔“ ذولین نے کہا تو اس نے تڑپ کر پلکیں اوپر اٹھائیں

بے حد مسکراتیں اور والہانہ نگاہیں تھیں۔ اس نے جلدی سے پلکوں کی گھنی باڑھ دوبارہ گرالی۔

”اچھا گل بی بی! میں چلا۔“ اس نے قہوے کی پیالی میز پر رکھ دی۔ ”خدا حافظ۔“ اس نے اس پر ایک اچھٹی نگاہ ڈالی

اور پلٹ گیا۔ اشارہ اکاد دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر دیا تھا۔

ذرا بھی تواصر نہیں کیا تھا اس کو اپنے ساتھ لے جانے پر۔ نہ اس کی خیریت پوچھی۔

کتنا اجنبی انداز تھا۔

اس کے دل میں دھواں سا بھر گیا۔ خفا تو وہ اس سے پہلے ہی تھی، اب اس کا یہ رویہ دل اور بھی دکھا گیا۔

...☆☆☆...

وہ گنگناتے ہوئے اپنا سفری بیگ بھر رہی تھی۔ جگمگ کرتے سوٹ، سادے سوٹ اور ان کی میچنگ جیولری، سب

بھرتی جا رہی تھی۔ بھابی کی نگاہیں مسلسل اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”بڑی خوش ہو رہی ہو وادی جانے پر۔“ وہ پہلی بار گویا ہوئیں۔

”خوشی کی بات ہی تو ہے۔“ کتنے لمبے عرصے کے بعد جا رہی ہوں۔“ اس نے چہک کر کہا۔

”دیکھو، اب وہیں کی ہو کر نہ رہ جانا۔“ وہ اس کے قریب آگئیں اور پھر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے قدرے

جھک کر بولیں۔ ”اشمل خان بھی ہو گا وہاں؟“ اس استفسار پر ہشیمہ کا دل زور سے دھڑکا۔ جسم کا سارا خون چہرے پر

سمٹ آیا۔ ”ہو گا نا؟“

بھابی اس کے چہرے کی بدلتی رنگت سے محفوظ ہوتے ہوئے ہنسنے لگیں۔

”ظاہر ہے۔۔۔ اس کی کزن کی شادی ہے۔“ اس نے پلکیں جھکائے جھکائے کہا اور آگے بڑھ کر الماری سے بقیہ

کیڑے نکالنے لگی۔

”اسی لئے کہہ رہی ہوں، وہیں کی مت ہو جانا۔“ بھابی کے ذومعنی جملے پر اس نے پلٹ کر انہیں گھورا۔

”آپ کو تو بتانا بڑا مہنگا پڑا مجھے۔“ اس نے چڑ کر کہا۔

”جنابہ! محبت مہنگی ہی ہوتی ہے اور اتنی آسان نہیں جتنا تم سمجھتی ہو۔ سنا نہیں، محبت کرنے والے ہزاروں نگاہوں کو

برداشت کرتے ہیں۔ ظالم سماج سے ٹکراتے ہیں۔ ڈھیر ساری کڑوی کیسی باتیں ہضم کرنی پڑتی ہیں تب کہیں جا کر

محبت کرنے والے ایک دوسرے کو پاتے ہیں۔“ بھابی مسلسل شرارت کے موڈ میں تھیں۔

”بس، بس۔۔۔ اب سب کچھ آپ ہی بنیں گی۔ میرے لئے ظالم سماج بھی بنیں گی۔“ اسے زور سے ہنسی آگئی

تھی۔

”نہ بابا! میں کیوں ظالم سماج بننے لگی۔ اس کے لئے سماج ہی کافی ہے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ تو کی لاڈلی، وادی کی سیر کو جا رہی ہے۔“ شناس بھائی اندر آگئے تو بھابی کا جملہ ادھور رہ گیا۔

”وادی کی سیر کو نہیں، شاندانہ کی شادی میں شرکت کرنے جا رہی ہوں۔“ اس نے برجستہ کہا تو شناس بھائی مسکرا

دیئے۔

”چلو، شادی کے بعد وادی کی سیر بھی کر لینا۔ کون سی پابندی ہو گی۔“ ان کی بات پر وہ اور بھابی مسکرانے لگیں۔

”ماموں جان انتظار کرتے کرتے اب بے زار ہو گئے ہیں۔ میں تمہیں یہی بات بتانے آیا ہوں۔ چلو فٹ۔“ شناس

بھائی نے کہا تو اس نے جلدی جلدی بیگ کی زپ بند کی۔

”چلیں \_\_\_ میں بھی تیار ہوں۔“ اس نے پلنگ پر رکھا ہوا شولڈر بیگ اٹھایا اور ساتھ ہی چادر بھی اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ شناس بھائی اس کا دستی بیگ اٹھا کر اس کے پیچھے باہر آگئے۔

صبغت خان واقعی اب خاصے بیزار بیزار سے ہو گئے تھے۔ مگر ہشمنہ کو مکمل تیار دیکھ کر ان کی کیفیت بدل گئی۔

”تیار ہو؟“

”جی \_\_\_ بالکل۔“ اس نے سر خم کر دیا تو وہ مسکرا کر کرسی سے کھڑے ہو گئے۔

”اچھا، اور امی!“ وہ سے مل کر امی کے قریب آئی تو امی نے محبت سے اسے گلے لگا لیا۔

”آپ لوگ اب کب آئیں گے؟“ صبغت خان نے پوچھا۔

”انشاء اللہ اسی ہفتے میں۔“ امی نے کہا۔

”اچھا ابرا بھائی! دعا کیجئے گا، سب خیریت سے نمٹ جائے۔ پہلی بیٹی کو بیاہ رہا ہوں۔ وہ بھی غیروں میں۔“

”ارے نہیں صبغت خان! سب بہتر ہی ہو گا۔ آپ دل پر بوجھ نہ رکھیں۔“ نے انہیں متفکر دیکھ کر تسلی دی۔

”بیٹیاں تو ہوتی ہی پر یاد دہن ہیں۔“ امی کی نگاہیں ہشمنہ پر اٹھیں۔ ”شہباز تو تمہارے دوست کا بیٹا ہے۔ جانا پہچانا۔

پھر بھلا کیا گھبرانا۔ اور سچ بات تو یہ ہے بھائی! کہ بیٹیاں اپنے اپنے

نصیب اپنے ساتھ لے کر آتی ہیں۔ دُکھ سگھ تو نصیب کا مقدر ہے۔ انشاء اللہ شاندا نہ بہت راج کرے گی۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ امی کی بات پر صبغت خان نے کہا اور پھر سب کو خدا حافظ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھ

گئے۔

ہشمنہ سب سے مل کر بھابی کے پاس آئی۔

”اچھا خدا حافظ \_\_\_ اب آپ لوگ جلدی آجائیے گا۔“

”آجائیں گے بابا! اور سچ پوچھو تو مجھے تو آنے کی بہت جلدی ہے۔ جانتی ہو کیوں؟“ بھابی کی شریر آنکھیں مسکرائیں۔

”جانتی ہوں۔“ وہ گلنار چہرے کو جھکا کر تیزی سے پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ وادی جانے کی اسے بے انتہا خوشی تھی۔ ایک تو شاندا نہ کی شادی اور پھر دوسرے اس سے ملنے کی۔ کتنا عرصہ بیت گیا تھا اسے شاندا نہ سے ملے ہوئے۔

وادی کا خوبصورت تصور ذہن و دل میں ہلچل مچا رہا تھا۔

”ماموں جان! شان کی شادی کی تو خوب رونق ہو گی وہاں پر۔“ اس نے پوچھا۔

”ارے بیٹی کی جدائی پر رونق کہاں۔“ صبغت خان کا دل بجھا بجھا سا تھا۔ پھر وہ جیسے چونک کر بولے۔ ”ہاں، ہاں \_\_\_ خاصی رونق ہے۔ اور اب تمہارے آنے سے اس میں اضافہ ہو جائے گا۔ شاندا نہ تو روز ہی کہتی تھی مجھے کہ آپ جا کر ہشمنہ کو لے آئیے۔ آج تمہیں اچانک دیکھ کر بہت خوش ہو گی۔“

”اچھا \_\_\_ آپ نے اسے نہیں بتایا؟“ اس کا چہرہ چمک اٹھا۔

”نہیں \_\_\_ بالکل اچانک میرا آج شہر آنا ہوا تھا۔ چلو اچھا ہے، خوش ہو جائے گی وہ۔“

ہشمنہ کی نگاہوں کے سامنے شاندا نہ کا چہرہ لہرا گیا۔ اسے دیکھ کر وہ کتنی حیران ہو گی۔ پھر وہ بے تحاشا خوش اور پھر اس سے لپٹ جائے گی اور روئے گی اور پھر اس کے چھیڑنے پر سرخ ہو جائے گی اور ہنس دے گی۔



پیچھے کی طرف بھاگتے درختوں کی قطار پر نگاہیں جمائے وہ سوچتی جا رہی تھی۔ جیپ تیزی سے شہری حدود چھوڑ رہی تھی۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں اُسے وادی کی خوشبو سے بھری ہوئی لگ رہی تھیں۔ اونچے نیچے راستوں سے گزر کر جیپ وادی میں داخل ہو چکی تھی۔ شفتالو اور خوبانیوں کی خوشبو پوری فضا کو معطر کر رہی تھی۔

وہ وادی کی خوبصورتیوں میں جانے کب تک گم رہتی کہ اچانک جیپ ایک جھٹکا کھا کر رک گئی۔

”کیا ہم پہنچ گئے ماموں؟“ وہ خوشی سے چلائی۔

”بالکل\_\_\_ یہ رہا سامنے گھر۔ کیا خوشی میں یاد ہی نہیں رہا گھر کا دروازہ؟“ صبغت خان ہنسے۔

وہ جیپ سے چھلانگ لگا کر اتری اور بھاگ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کا چہرہ اندر کی خوشی سے سرخ ہو رہا تھا۔

ہائے، شان تو مجھے دیکھ کر کتنی پاگل ہو جائے گی۔

اُس نے بھڑاہو اور دروازہ کھول دیا۔ صبغت خان اُس کی معصوم دیوانگی پر مسکرا رہے تھے۔

”ہائے اللہ\_\_\_ ہشیمینہ باجی! آپ؟“ حور مینا برآمدے میں ہی کھڑی تھی، اُسے دیکھ کر اپنی جگہ حیران رہ گئی۔ مگر وہ آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گئی۔

”ہاں میں\_\_\_ یہ بتاؤ شان کہاں ہے؟“

”آپنی اندر ہیں\_\_\_ مگر آپ\_\_\_“ وہ ابھی تک اس کی اچانک آمد پر حیران تھی۔ اندر داخل ہوتے ہوئے صبغت خان کو دیکھ کر جیسے سمجھ گئی۔

”اچھا تو آپ ابو کے ساتھ آئی ہیں۔“ اس کی ایک پریشانی رفع ہوئی تھی۔

ہشیمینہ مسکراتی اندر آئی۔ تب زنان خانے کے دروازے پر ہی اُسے شاندا نہ کھڑی نظر آئی جو کچھ ناراض ناراض سی لگی اور زنان خانے میں اس کی پڑوسنیں اور جاننے والی عورتیں تھیں جن سے وہ باتوں میں مصروف تھی۔ معاً اس کی نگاہیں ہشیمینہ پر اٹھیں تو اُسے جھٹکا سالگا۔ پھر اچانک وہ چھلانگ لگا کر اس کی طرف بڑھی۔

”ارے ہش\_\_\_ مینا\_\_\_ تو\_\_\_ تو\_\_\_ تو اس طرح\_\_\_ ہائے، نہیں۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی؟“ وہ اس سے کچھ فاصلے پر رک کر حیرت آمیز نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”نہیں جنابہ! یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ میں ماموں کے ساتھ آئی ہوں۔“ ہشیمینہ ہنستی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ دوسرے ہی لمحے دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔

”توبہ\_\_\_ کتنا انتظار کرایا تو نے۔ یقین نہیں آ رہا\_\_\_“ شاندا نہ بے یقین سی ہو رہی تھی

”سرپر اُزدیا نا تجھے؟“

”ہشیمینہ! تم\_\_\_“ وہ اچانک رونے لگی۔ زور زور سے۔ اُس کی آواز سن کر گل بی بی باہر نکلیں اور ہشیمینہ کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

”ہائے میری چاند! تو کب آئی؟“

”میں لایا ہوں\_\_\_ میرا اچانک شہر جانا ہوا تو سوچا ہشیمینہ بیٹی کو بھی ساتھ لیتا جاؤں۔“ صبغت خان کی آواز پر شاندا نہ اس سے الگ ہوئی اور ڈھلکا ہوا آنچل سر پر ڈال لیا۔

”پاگل ہی ہے\_\_\_ یہ تو سب سے لپٹ کر رونے لگتی ہے۔“ گل بی بی، شاندا نہ کے چہرے پر نظر ڈال کر بولیں۔

”اتنی خوشی تو مجھ سے بھی نہیں سنبھل رہی، سچی مامی! یہاں آکر مارے خوشی کے میرا بھی رونے کو دل چاہ رہا ہے۔“

اس نے پھر شاندا نہ کو خود سے قریب کر لیا۔

”بہت بد تمیز ہے۔۔۔ آئی بھی تب ہے جب میرے جانے کے دن قریب ہیں۔“ وہ چادر کے کنارے سے آنکھیں رگڑتے ہوئے اُسے پیار سے دیکھنے لگی۔

”ارے واہ۔۔۔ تو کون سا تم دوسری دنیا میں جا رہی ہو۔“ ہشمنہ زور سے ہنسی۔ ”شہباز بھائی جن تو ہر گز نہیں ہیں کہ تجھے قید کر کے رکھ لیں گے۔“

اس کی بات پر شاندا نہ کا چہرہ کانپ اٹھا۔

ہشمنہ سب کے پاس خاصی دیر بیٹھی رہی۔ پھر اٹھ کر شاندا نہ کے ساتھ اس کے کمرے میں آگئی۔

”یہ تم میرے آنے سے پہلے منہ لٹکائے زنان خانے کے دروازے پر کیوں کھڑی تھیں؟“ اس نے تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے اس سے پوچھا تو شاندا نہ کا منہ بن گیا۔

”ساری عورتیں امی سمیت میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہیں کہ ٹک کر میں نہیں بیٹھتی، یوں گھر میں دندناتی پھرتی ہوں، شادی میں چند دن رہ گئے ہیں۔ اب تم خود ہی بتاؤ ہشمنہ! جدا ہونے سے پہلے انسان سب سے جی بھر کے ملتا ہے نہ۔ ڈھیروں ڈھیروں باتیں کرتا ہے نا؟“

”تو پھر نور کہاں سے آئے گا آپ کے چہرے پر؟“ حور مینار دروازے پر کھڑی تھی، ہنس کر بولی تو اس نے اسے گھورا۔

”اونہ۔۔۔ کوئی مجھے نور وور کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تو یادوں کی ضرورت ہے۔ خوشگوار یادوں کی جو میں اپنے ہمراہ سمیٹ کر لے جاؤں گی۔“

”ٹھیک ہی تو کہتی ہیں۔ سب سے او جھل نہیں بیٹھو گی تو خاک و لہن لگو گی؟ اب میں آگئی ہوں نا، اچھی طرح خبر لوں

گی تیری۔“

”کیا آتے ہی تم بھی۔۔۔“ شاندا نہ نے اُسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو ہشمنہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

”بالکل۔“ اس نے شانے اچکائے اور شاندا نہ سر پکڑ کر بیڈ پر ڈھے سی گئی۔

...☆☆☆...

شاہ خانم جہاں اشمل کے آنے پر خوش تھیں، وہاں اس کے زخموں پر متفکر بھی۔

”سچ سچ بتاؤ، یہ زخم تمہیں یونیورسٹی میں کسی جھگڑے میں آئے ہیں؟ مجھے تو نہیں لگتا کہ تمہاری کار کا ایکسڈنٹ ہوا ہے۔“

شاہ خانم بے حد تاڑنے والی نگاہیں رکھتی تھیں۔ مگر اشمل خان نے بھی کمال سے جھوٹ بول دیا تھا۔

”ارے نہیں شاہ خانم! بس یہاں آنے سے ایک دن پہلے ہی ہوا۔ میری کار سلپ ہو گئی تھی۔ اور یہ تو معمولی خراشیں ہیں۔ یوں منٹوں میں ٹھیک ہو جائیں گی۔ جس دن سے میں آیا ہوں، آپ کو تو بس میری فکر ہے۔“

”آپ ہی کی تو بس فکر ہے انہیں۔“ اشارے دودھ سے بھرا ہوا گلاس تپائی پر رکھتے ہوئے عجیب دل گرفتہ لہجے میں کہا تو شاہ خانم نے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے اسے تقریباً خفگی سے گھورا۔

”کیا بات ہے اشارے! تم اتنی بچھی بچھی سی کیوں ہو؟ کیا شاندا نہ کی شادی کو انجوائے نہیں کر رہی؟“ شاہ خانم کے کمرے سے نکل جانے کے بعد اشمل نے اسے مخاطب کیا۔ سفید شال میں وہ خاموش خاموش سی اُسے کچھ مضطرب سی نظر آئی۔

”ہاں، ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔ بہت رونق ہے شان کے پاس۔“

”ادھر آؤ اشتارا! میرے پاس۔“ اس نے اس کا جملہ نظر انداز کرتے ہوئے اُسے بغور دیکھتے ہوئے پکارا تو وہ چلتی ہوئی اس کے قریب آگئی۔

”کیا بات ہے۔۔۔ شاہ خانم نے کس بات پر ڈانٹا ہے تمہیں؟“ اُس نے اُسے اپنے قریب صوفے پر بٹھالیا۔ اُسے اشترا دل و جان سے عزیز تھی۔

”نہیں۔۔۔ انہوں نے مجھے کبھی اس طرح ڈانٹا ہی نہیں لالہ! یہی تو غم ہے۔ جو ڈانٹتے ہیں نا، وہ پھر کسی دن گلے سے لگا کر بہت پیار بھی کر لیتے ہیں۔ مگر شاہ خانم نے تو مجھے کبھی۔۔۔۔۔“ اُس کا گلارندھ گیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا ریلا بہہ نکلا۔

اس کا دل بے حد پڑمردہ ہو گیا تھا۔

ایک طرف ذولین خان کا خراب رویہ اور پھر آج صبح سے وہ جانے کتنی بار شاہ خانم کی تنبیہی نظریں سہ چکی تھی۔ کتنی بار وہ اسے جھڑک چکی تھیں۔ گل بی بی کے گھر جانے کے نام سے۔

آج اشمل کی محبت اور استفسار پر اس کا دل پگھل گیا۔ صبح سے آنسو دبائے بیٹھی تھی، یکلخت اُٹ آئے۔

اشمل نے اُسے پیار سے سینے سے لگا لیا۔

”پاگل لڑکی ہو بالکل۔ معمولی باتوں کو دل پر لے بیٹھتی ہو۔“ وہ پیار سے اس کا سر سہلانے لگا۔ ”جانتی ہو، وہ دل کی بری نہیں ہیں۔ بس غصے کی ذرا تیز ہیں۔ اور پھر تم شاندا نہ کی جدائی پر اتنی رنجیدہ ہو رہی ہونا۔“ اس نے جھک کر اس کا بھگیا بھگیا چہرہ اٹھایا۔ مگر وہ چپ رہی۔

”ممائی جان کی فیملی کے جانے کے بعد دراصل تم تنہا ہو گئی ہو اس لئے پریشان رہتی ہو۔ چلو شاباش، آنسو پونچھ لو۔“

”آپ گل بی بی کی طرف نہیں گئے؟“ اس نے شال کے کنارے سے آنکھیں رگڑیں۔

”ہاں۔۔۔ آج جائوں گا۔ طبیعت اب بہتر ہے نا۔ چلنا تم بھی میرے ساتھ۔ ویسے گل بی بی بہت خفا ہو رہی ہوں گی مجھ پر۔ ہے نا؟“ وہ مسکرایا اور اس کے سنہری بال بکھیر کر کھڑا ہو گیا۔

”تم مجھے بہت عزیز ہو اشتارا! جو بھی دل میں بوجھ ہو، میرے پاس بیٹھ کر ہلکا کر لیا کرو اور دل کو اتنا حساس مت رکھو۔ یہ دنیا ہے گڑیا! یہاں پریشانیاں، دکھ، رنج سب کو ملتا ہے۔ کسی کو پہلے غم اور پھر خوشی۔ اور یہ معمولی معمولی ناراضگیاں اور خفیاں تو چلتی رہتی ہیں۔ دراصل یہ سب زندگی میں جمود کو توڑنے کے لئے ہوتی ہیں۔ تم نے تو اتنا چڑیا جتنا دل رکھا ہے۔“ اشمل نے شفقت بھرے انداز میں اس کا سر ہلایا۔

اسی لمحے ذولین اندر داخل ہوا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ اشترا بے آواز بہتے آنسو پونچھ رہی تھی اور سرخ چہرہ چادر سے رگڑ رگڑ کر اور بھی سرخ کر رہی تھی۔

”کیا کوئی پر اہلم؟“ وہ اندر آ گیا۔

اُس نے ذولین کی آواز سن کر سر اٹھایا تو ذولین کے دل پر گھونسا سا پڑا۔ یقیناً وہ اس کے رویے پر اس حد تک دل برداشتہ ہو رہی تھی۔

”نہیں، کوئی پر اہلم نہیں۔ بس یوں ہی، پاگل سی لڑکی ہے۔“ اشمل مسکرایا۔

”آؤ بیٹھو۔۔۔ کہیں جا رہے ہو کیا؟“ اشمل نے اسے تیار دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں، ذرا زمینوں تک جا رہا ہوں۔ چچا خان نے بلایا تھا، اس لئے آیا تھا مگر وہ تو ہیں نہیں اس وقت۔“ اس نے جیب کی چابی سے کھیلتے ہوئے کہا۔

”میں بھی ذرا گل بی بی کی طرف جا رہا ہوں۔ تین دن ہو گئے ہیں، اب جا کر خوب گرم گرم ڈانٹ سنوں گا۔“

اشٹار خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

”اشٹار! کو کیا ہوا تھا شمل؟“ اس نے آہستگی سے پوچھا۔ اس کا ذہن وہیں پرائٹ کر رہ گیا تھا۔

کوئی موقع بھی تو نہیں ملا تھا اُسے منانے کا۔ اور وہ تھی کہ اتنی دُکھی ہوئی جا رہی تھی۔

اشمل نے اُسے چونک کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے بولا۔

”ارے نہیں، بس شان کی جدائی نے اسے ڈسٹرب کر دیا ہے۔ دل بھر آیا تھا تو میرے پاس بیٹھ کر رو دی۔ اب تو سوچا ہے کہ اس بار وادی آؤں گا تو اس موصوفہ کو بھی رخصت کرنے کا بندوبست کروں گا۔“ اس نے واسکٹ پہنتے ہوئے کہا اور ریک سے گاڑی کی چابی نکالی۔

”اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”میرا خیال تو تم کرو گے ناب۔“ اس نے پلٹ کر برجستہ کہا تو ذولین مسکرا کر رہ گیا۔

”اوکے\_\_\_ میں اب چلوں گا۔ تم جانو گل بی بی کی گرما گرم ڈش کھانے۔“ وہ ہنستا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

راہداری میں اشٹار اسے نظر آئی۔ وہ بھی اسے دیکھ چکی تھی۔ پلٹ کر جانے لگی کہ وہ اس کی طرف بڑھا۔

”تم تو میرے اندازے سے کہیں زیادہ احمق لڑکی ہو۔“ اس کے لہجے میں مسکراہٹ گھلی ہوئی تھی۔ مگر وہ پلٹی

نہیں۔ وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ جیسے اس کی ناراضگی سے محظوظ ہوا تھا۔

”ہاں ذولین! انتہائی درجے کی احمق ہی تو ہوں جو تمہاری بے اعتنائی اور کج روی پر جلتی کڑھتی ہوں۔“ اس نے تیزی

سے قدم اشمل کے کمرے کی طرف بڑھا دیئے۔

اشمل، شاہ خانم سے اجازت لے کر اشٹار! کو ساتھ لئے گل بی بی کے گھر کی طرف چلا آیا۔

”ذولین کیسا ہے اشٹار؟“ اُس نے بالکل اچانک پوچھا تھا۔ شیشے کے باہر جھانکتی اشٹار! کا دل دھک سے رہ گیا۔

”تم سے کچھ پوچھا ہے میں نے۔“ اس کی خاموشی پر اشمل خان نے اپنا سوال دہرایا تو وہ پہلو بدل کر دھیرے سے بولی۔

”آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں انہیں۔“

”ہاں\_\_\_ مجھے تو بہت عزیز ہے وہ۔“ اس نے کن آنکھوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ اس کے قریب بیٹھی تھی دونوں ہاتھ گود میں رکھے۔

”آپ کی توان سے دوستی ہے نابچپن سے بہت۔“ اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ وہ قطعی نہ جان پڑ ہی تھی کہ اشمل یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہا تھا۔ یہ تو اس کے اندر کا چور ہی اسے ہولائے دے رہا تھا۔

”ہاں\_\_\_ ہم نے مل کر بہت اچھے دن گزارے ہیں۔“ اس نے گاڑی کی اسپید قدرے کم کر دی اور اس کی سمت

رخ کیا۔ ”اشٹار! بسا اوقات پابندیوں کے درجتنے مضبوط ہوتے جاتے ہیں بغاوت کے عالم بھی اسی تیزی سے بلند

ہونے لگتے ہیں۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ جس شے کے قریب جانے پر پابندی عائد ہو، انسان اسی شے میں دلچسپی لیتا

ہے۔ شاہ خانم نے ہمیشہ تمہیں ذولین سے دور رہنے کی تاکید کی اپنی ذاتی نفرت کی وجہ سے۔“ وہ رک گیا اور اس کے

تپتے ہوئے لال سرخ چہرے کو دیکھا۔

”پتہ نہیں، میں جو محسوس کر رہا ہوں وہ کس حد تک درست ہے۔ اشٹار! کیا تم\_\_\_“



”اشمل لالہ!“ اشارا کے سینے کی چاردیواری جیسے پھٹنے کو تھی۔ اس کا سارا وجود کانپنے لگا۔ ”پلیز مجھ سے کوئی ایسا

سوال مت پوچھئے گا جو میرا سر آپ کے سامنے ندامت سے جھکا دے۔“

اشمل نے اُسے دیکھا۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے سرخ ہو رہی تھی۔ بے بسی سے لب دانتوں سے کچل رہی تھی۔

وہ جو پوچھنا چاہتا تھا سب کچھ واضح ہو گیا تھا۔

”میں ڈرتا ہوں اشارا! کہ تمہیں کوئی بڑا دکھ نہ مل جائے۔“ اس نے چہرہ و نڈا سکرین کی طرف کر دیا اور گاڑی کی

رفتار بڑھادی۔

”یہ بہت پُر تیج راستے ہیں۔ اور یکطرفہ سفر ہو تو اور بھی اذیت ناک ہوتا ہے۔ اور پھر ہمارے حالات۔“ اس کا لہجہ

شفیق اور نرم تھا۔

اشارا دونوں ہاتھ گود میں رکھے سر جھکائے بیٹھی تھی۔

اس کے تو گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کا بھائی اس راز سے واقف ہو چکا ہے جسے وہ چھپائے پھرتی تھی۔ مارے

ندامت کے اس کا سراٹھ نہ رہا تھا۔ پلکیں بھاری بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں۔ اس کی حالت دیکھ کر اشمل نے کچھ سوچ

کر موضوع بدل دیا۔

”یہ بتاؤ، گل بی بی کا کیا حال ہے؟ ان کے گھر خوب چہل پہل ہوگی۔“

”جی\_\_\_ چہل پہل تو ہے مگر شان بہت روتی ہے۔ اور خود گل بی بی بھی۔“ اس کے دل کو ڈھارس سی ملی۔

وہ اس موضوع سے بچنا چاہتی تھی۔ اس نے خود ہی موضوع بدل دیا تھا۔

اس کے دل میں اشمل کے لئے ڈھیر ساری محبت سرایت کر گئی۔

گاڑی گل بی بی کے گھر کے سامنے رکی تو وہ نیچے اتر آئی۔

”ہائے اشارا! تُو اب آئی ہے۔ شاندا نہ تو کب سے تیرا انتظار کر رہی ہے۔“ مہک باہر ہی اُسے مل گئی۔

اشمل خان کو دیکھ کر اس نے چہرے پر نقاب ڈال لیا تھا۔

”تم کیوں واپس جا رہی ہو؟“ وہ اس کے قریب آگئی۔

”ڈانٹ کھانے جا رہی ہوں۔“ مہک یہ کہہ کر ہنسی۔

”کیا مطلب؟“

”مجھے آئے آدھا گھنٹہ ہو گیا ہے۔ بی بی نے پیچھے سے شیر جان کو بھیجا، میں چولہے پر ہنڈیا چڑھا کر آئی تھی صرف

شاندا نہ کو یہ کہنے کہ شام کو دوبارہ آؤں گی۔ پر بیٹھی رہ گئی۔ ہائے، ہنڈیا جل کر راکھ ہو گئی اور بی بی بھی سمجھو، ہنڈیا جیسی

ہی ہو گئیں۔“

اس کی بات پر اشارا کو بھی بے اختیار ہنسی آگئی۔

”تیرے تو کام ہی نرالے ہیں۔“

”بی بی کہتی ہیں کہ آٹھ جماعتیں پڑھ کر تُو اور بھی نکلی ہو گئی ہے۔ ہا، ہا\_\_\_ میں نے کہا دس پڑھ لیتی تو شاید کچھ سدھر

جاتی۔“

اشمل، گل بی بی کے گھر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ دروازہ کھلا ہی ملا۔ وہ برآمدہ عبور کر کے اندر آیا تو جیسے اس کی آنکھیں پلک

جھپکنا بھول گئیں۔

وہ سرخ، نرم شال سر پر اوڑھے لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی گارہی تھی۔

اس کی آواز سب سے اونچی تھی۔ مارے جوش کے گلابی چہرہ ٹمٹما رہا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں خوشیوں اور طمانیت کے رنگ بھرے ہوئے تھے جو اُسے اور بھی دلکش بنا رہے تھے۔ کانوں میں بڑی بڑی سنہری بالیاں سرخ چادر کی اوٹ سے نکل کر لہراتیں اور اس کے رخساروں پر سنہرے رنگ بکھیر جاتیں۔

اشمل خان کی نگاہیں جیسے خیرہ ہو رہی تھیں۔ وہ کتنے مختلف اور انوکھے روپ میں اس کے سامنے آئی تھی۔ وہ دم بخود سا اُسے دیکھتا رہا۔ معاً کسی لڑکی کی نگاہ اس پر اٹھی تھی۔ اس نے سب کو متوجہ کر لیا اور سب غیر مرد کو دیکھ کر گھبرا کر اپنی اپنی چادریں سنبھالتی اٹھ کر بھاگیں۔ اس یکبارگی افراتفری نے اسے بھی چونکا دیا۔

ہشمنہ کی نگاہیں اشمل پر اٹھی تھیں تو اس کا سارا وجود مجسمہ کی طرح ساکت و جامد ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ پلکیں جھپکے بنا اسے دیکھنے لگی۔ پھر جیسے اچانک اشمل خان کی سحر انگیز نگاہوں اور والہانہ مسکراہٹ نے اُسے شرمادیا۔ اس نے جلدی سے شانوں پر پھسلتی چادر کو سر پر ڈال لیا۔ اسے بے طرح شرم نے آگھیرا۔ اپنے اس انداز میں اشمل خان کے آنے پر وہ کچھ محبوب سی ہو گئی۔ جلدی سے ڈھولکی دھکیل کر کھڑی ہو گئی۔

اشمل کے لبوں پر بڑی پیاری مسکراہٹ تھی۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا مگر اشارہ کو دیکھ کر رک گیا۔

اشارہ نے اشمل اور ہشمنہ کو ایک دوسرے کے سامنے بے خود سا ہوتے دیکھا۔

اشمل خان کا اس اجنبی لڑکی کو دیکھ کر رک جانا اور اس کا شرمنا سے حیران کر گیا۔ مگر اس نے اپنی کسی حیرانگی کو ظاہر نہ ہونے دیا اور اندر آگئی۔

”دیکھو ذرا اشارہ! گل بی بی اندر ہیں کیا؟“ اشمل نے خود کو سنبھالتے ہوئے اشارہ کو مخاطب کیا۔

ہشمنہ جھپاک سے اندر کسی کمرے میں گم ہو چکی تھی۔

اپنے دل کی دھک دھک سے اسے اپنے کانوں کے پردے لرزتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اُسے یقین تھا کہ اشمل خان ضرور آئے گا۔ مگر یوں اچانک اسے دیکھ کر اس کی کیفیت عجیب سی ہونے لگی۔ مارے شرم اور خجالت کے وہ کتنی ہی دیر خالی کمرے میں تنہا بیٹھی رہی۔

باہر گل بی بی کی آواز اسے سنائی دے رہی تھی۔

دوسری ساری لڑکیاں شاندا نہ کے کمرے میں تھیں۔

یہ محبت بھی کیا چیز ہے۔ شرم اور خوف ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ کہاں وہ اشمل خان کو دیکھنے کو ترس گئی تھی اور اب یہ حالت کہ باہر نکلنے کا سوچ کر ہی بے طرح شرم محسوس کر رہی تھی۔ پانوں جیسے من من بھر کے ہوتے جا رہے تھے۔

اچانک دروازہ کھلا اور شاندا نہ اندر آئی۔ اس کے ساتھ اشارہ بھی تھی۔

”یہ تم یہاں اکیلی بند ہو کر کیوں بیٹھ گئی ہو؟“ وہ اس کے قریب آگئی۔ ”اشارہ کو تم سے ملوانے لائی ہوں۔ اشارہ! یہ ہشمنہ ہے جس کا میں ذکر کرتی تھی نا تم سے۔“

ہشمنہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔

معصوم اور نازک سی، بے تحاشا خوبصورت لڑکی کو اپنے روبرو دیکھ کر وہ چند ثانیے مبہوت سی رہی۔

سنہری آنکھوں اور سنہرے بالوں والی اس لڑکی کو دیکھ کر اسے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ یہ اشمل خان کی بہن ہے جس کا ذکر وہ اس سے کئی بار کر چکا تھا۔ بے حد محبت اور شفقت کے ساتھ۔ اس کے ذہن میں جو خاکہ بنا تھا، اس سے کہیں زیادہ دلکش تھی۔

”ہشمنہ! یہ اشارہ ہے، شاہ خانم کی بیٹی۔“ شاندانہ نے تعارفی مرحلہ طے کیا تو اشارانے مسکرا کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا جسے ہشمنہ نے تھام لیا۔

”جیسا سنا تھا اس سے بڑھ کر پایا۔“ اشارا اس کی سیاہ بھوری سی دلکش آنکھوں کو دیکھ کر پوری سچائی سے بولی۔

”میرے بارے میں تو تم یہ نہیں کہہ سکتیں۔“ ہشمنہ جھینپ کر ہنس دی۔ رخساروں کی رنگت ابھی تک تپ رہی تھی۔ سرخ شال کے ہالے میں اس کا چہرہ بے حد تاباں لگ رہا تھا۔

اشمل کا ٹھٹک جانا کچھ غلط تو نہ تھا۔ وہ لگ ہی پیاری رہی تھی۔ اشارانے سوچا۔

”اب تم دونوں میرے ساتھ میرے کمرے میں آجاؤ۔ بقیہ باتیں وہیں ہوں گی۔ اگر مجھے کسی نے یہاں دیکھ لیا تو خیر نہیں ہے۔“ شاندانہ نے گہرا کر کہا۔

”ہونے والی دُہن کو دیکھو، یہاں وہاں اُچھلتی کودتی پھرتی ہے۔“ اشارانے اسے چھیڑا تو وہ دونوں ہنس دیں۔

”ایمان سے او جھل ہونا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ بھلا مرد او جھل بیٹھ کر دکھادیں۔ یہ کرو، وہ نہ کرو، یہ کھاؤ، وہ نہ کھاؤ۔ میرے تو کان پک گئے ہیں ایسی باتیں سن سن کر۔ ذولین لالہ سے مجھے کتنی صلواتیں سننی پڑی تھیں۔“ وہ دل کی بھڑاس نکالتی کمرے سے نکل کر اپنے کمرے کی جانب بھاگی۔ وہ دونوں بھی ہنستی اس کے ساتھ ہی کمرے سے نکل گئیں۔

...☆☆☆...

ریحان پراچہ نے فون رکھا تو خوف اس کی نس نس میں اتر چکا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے سیاہ دائرے بنتے اور بگڑتے ہوئے محسوس ہوئے۔

”ریحان! سراج کیا کہہ رہا تھا؟“ یاور نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اس کا دل ریحان پراچہ کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو دیکھ کر دھڑک اٹھا تھا۔

”کسی نے خبر دی ہے پولیس کو کہ میں یہیں، اسی فلیٹ میں ہوں۔ سراج کہہ رہا تھا، ہو سکے تو وقت ضائع کئے بغیر یہ فلیٹ چھوڑ دوں۔“ وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا صوفے پر ڈھے گیا۔

”اوہ۔۔۔۔۔“ یاور کے حلق میں جیسے سانس اٹک گئی۔ ”اب کیا ہوگا؟“

”مجھے خود کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ پتہ نہیں پایا اپنا اثر و رسوخ استعمال کیوں نہیں کر رہے۔“ اس نے صوفے کے ہتھے پر زور سے مکھارا۔ ”ایسا تو کبھی نہیں ہوا یا اور!“

”ایسا کبھی کبھی ہی ہوتا ہے پیارے۔ ہم اس کبھی کبھی میں پھنس گئے۔ خیر چھوڑو، وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے ہمیں۔ اُٹھو، چلو۔“ یاور یہ کہہ کر جلدی سے اندر کمرے میں غائب ہو گیا۔

ریحان کی نگاہیں دیوار کو گھورنے لگیں۔ اُسے پھانسی کا پھندا بے حد قریب محسوس ہونے لگا۔ اس بار وہ بچ نہیں پائے گا۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر دبا دیا ہو۔

وہ تڑپ کر صوفے سے کھڑا ہو گیا۔

اس کے خلاف کارروائیاں تیز ہو رہی تھیں۔ پولیس جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی۔ سراج اُسے لمحہ لمحہ کی خبریں پہنچاتا رہا تھا اور وہ خود یہاں بند پڑا تھا۔

اس قید سے اُسے وحشت ہو رہی تھی۔ مگر موت کا خوف پھر بھی غالب تھا۔ یہ قید خانہ اسے غنیمت لگتا۔

وہ بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ پھر اچانک ٹیلی فون کی سمت لپکا۔

”کیا کر رہے ہو ریحان؟ تم وقت ضائع کر رہے ہو۔“

”میں پاپا کو فون پر مطلع کر دوں۔“ وہ پلٹا۔ یاور کاندھے پر سیاہ چمڑے کا بیگ لٹکائے ہوئے تھا۔

”تمہارے پاپا اس وقت گھر پر نہیں ہوتے۔ یہ جگہ تمہارے لئے خطرناک ہے۔ ہم محفوظ جگہ پر پہنچ کر بھی انہیں مطلع کر سکتے ہیں۔“ وہ یہ کہہ کر سرعت سے دروازے کی طرف بڑھا۔

”مگر اب ہم جائیں گے کہاں؟“ وہ بولا یا بولا یا اس کے پیچھے لپکا۔

”ظفری کے گھر میں۔“

”ظفری \_\_\_ ریحان نے اُسے دیکھا۔

”اوہو یاد \_\_\_ دوست ہے میرا۔ بہت اچھے تعلقات ہیں اس سے میرے پہلے بھی وہ ایسے موقعوں پر میرا ساتھ دے چکا ہے۔ اب سوچنے کا وقت نہیں ہے۔“ اس نے ریحان کا ہاتھ پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔

ریحان نے جیسے خود کو سنبھال لیا تھا اور جیب سے گاڑی کی چابی نکال کر یاور کی طرف بڑھادی اور خود فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

یاور نے بھی اسی تیزی سے سیاہ بیگ سے سیٹ پر اچھالا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

تھوڑی ہی دیر میں تارکول کی سیاہ سڑک پر گاڑی فراٹے بھرنے لگی۔

”ارے \_\_\_ میرا ریوالور لیا یا نہیں؟“ ریحان کو اچانک یاد آیا۔

”لے لیا ہے یاد۔۔۔۔۔ سب کچھ لے لیا ہے۔“ یاور ہنسا۔ ”تم تو بالکل بزدل ہو رہے ہو۔ حالانکہ اس میدان میں

مجھ سے زیادہ ماہر ہو۔“

یہ سن کر ریحان کے لبوں پر پہلی بار مسکراہٹ پھیلی۔

”میں تو بس یہ سوچ رہا ہوں کہ پاپا نے کیا کیا؟ \_\_\_ یہ ساری مصیبت ڈی ایس پی منظور احمد کی پھیلائی ہوئی ہے \_\_\_ خیر، میرا نام بھی ریحان ہے۔ اسے بھی سیدھا نہ کر دیا تو میرا نام بدل دینا۔“

گاڑی تیزی سے ناآشنا راستوں پر رواں دواں تھی

”یہ ظفری کرتا کیا ہے؟“ ریحان نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

”ارے کرتا کیا ہے، بس ہم جیسوں کو پناہ دیتا ہے \_\_\_ اسی سے اس کا گھر بار چل رہا ہے۔“

”ہوں \_\_\_ اس کا مطلب ہے باعتبار شخص ہے۔“ اُسے اطمینان ہوا۔

اچانک مخصوص سائرن کی آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔

”پولیس۔۔۔۔۔“ یاور کے ہاتھوں سے گاڑی پھسلی۔

پولیس سائرن کی گونج تیزی سے قریب آرہی تھی \_\_\_ جس نے ریحان پر اچہ کے اندر دہشت بھردی۔

”یاور! گاڑی دائیں طرف موڑلو \_\_\_“ وہ کچے راستوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زور سے چلا دیا۔

گاڑی کچے راستوں پر جھٹکے کھاتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی \_\_\_ خوف اور دہشت ان دونوں کی رگوں میں بھرتا جا رہا تھا۔

”ریحان! آگے راستہ بہت خراب ہے \_\_\_ گاڑی چلانا مشکل بلکہ ناممکن ہو گا۔“ یاور نے ریحان پر اچہ کی سمت دیکھا۔ ”میرے خیال میں ہمیں یہیں رک جانا چاہئے۔“



”نہیں، نہیں۔۔۔“ ریحان چلائی۔

”آگے گاڑی جانا مشکل ہے ریحان! اور پھر میرے خیال سے پولیس کسی اور راستے پر نکل گئی ہے۔“ اس نے فضا میں خاموشی محسوس کرتے ہوئے دھیرے سے کہا اور گاڑی روک دی۔

ریحان پراچہ کے حلق سے جیسے کوئی انکی ہوئی وزنی شے اُتری تھی۔ اُس نے سینے سے ایک گہری سانس خارج کی۔  
”واپس جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔“ اُس نے دُور تک فضا میں نگاہیں دوڑائیں۔

”تو واپس کون پاگل جانے کو کہہ رہا ہے۔“

”تو\_\_\_ کیا مطلب ہے تمہارا؟ آگے ہم جا نہیں سکتے، پیچھے پلٹ نہیں سکتے۔ تو کیا اس تپتی ریت پر مٹر گشت کریں گے؟“ اس نے یاور کو عجیب نظروں سے دیکھا۔

”لگتا ہے خوف نے عقل سلب کر لی ہے تمہاری۔“ یاور زور سے ہنس دیا۔ ”پولیس کو تو جُل دے ہی دیا ہے ہم نے۔ مگر پھر بھی کوئی بھروسہ نہیں، کب وہ یہاں تک آجائے۔ میرا خیال ہے ہم گاڑی کو جھاڑیوں کے پیچھے چھپا کر پیدل آگے بڑھتے ہیں۔ آگے کچی آبادی ہے۔“

”ہوں\_\_\_ شام بھی اُتر رہی ہے۔“ ریحان پراچہ اس کی بات پر متفق ہو گیا۔

ظفری کے پاس تو آج ہم پہنچ نہیں سکیں گے۔ کیونکہ رات بھی یہیں کہیں بسر کرنا ہوگی۔“ یاور گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کر کے اسے گھنی جھاڑیوں کے پیچھے لے آیا۔

”کیا پوری رات ہمیں اس کچی آبادی میں بسر کرنا ہوگی؟“ ریحان پراچہ کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ ”مائی فُٹ\_\_\_ یہ دن بھی دیکھنا تھا مجھے۔“ اس نے گاڑی سے اتر کر دروازہ غصے سے بند کیا۔

”دن نہیں، رات ڈیر!“ یاور ہنسا۔ ”تم تو عادی نہیں ہونا۔ باپ کی تھکیوں نے بچائے رکھا تھا ابھی تک۔ مجھ سے پوچھو، ایسی بلکہ اس سے بھی خوفناک راتیں کاٹ چکا ہوں۔ البتہ تمہارے لئے یہ نیا تجربہ ہے۔ بھٹی میں پک کر ہی کندن بنو گے پیارے۔“ اس نے گاڑی لاک کر کے چابی اس کی طرف اچھالی اور سیاہ چرمی بیگ کاندھے پر ڈال کر آگے بڑھا۔

”ایسے دھندوں میں یہ سب تو ہوتا ہے۔ اور سچ پوچھو تو وہ شہباز مرا تمہاری گولی سے تھا۔ میں تو صرف ہوائی فائرنگ میں پھنس گیا۔“

”تو اب پچھتا رہے ہو“ ریحان پراچہ نے اُسے دیکھا۔

”نہ۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ میں خوار ہو رہا ہوں۔“ اس نے مسکرا کر اسے دیکھا اور پھر رخ موڑ کر بڑے بڑے قدم اٹھانے لگا۔

اونچے نیچے کئی ٹیلے عبور کر کے وہ دونوں کچی بستی کی جانب بڑھنے لگے۔

”ویسے یہ اشمیل خان بڑا پاور فل لڑکا ہے۔ عدالت میں تمہیں نچا سکتا ہے۔“

”ہاں\_\_\_ افسوس رہ گیا کہ شہباز کی بجائے وہ کیوں نہ مارا گیا۔“ اشمیل خان کے نام پر اس کے چہرے پر سختی آگئی اور تن بدن میں آگ بھڑک گئی۔ اُسے اپنی وہ درگت یاد آگئی جو ہشیمینہ ابرار کے اغواء کے سلسلے میں اشمیل نے بنائی تھی۔

اس خیال کے ساتھ ذہن کے پردوں پر ہشیمینہ کا دلکش سراپا لہرایا اور دل میں آگ سی بھڑک اٹھی۔ ”ہمیشہ وہ میری راہ میں حائل رہا ہے۔“ اس نے نفرت سے سر جھٹکا۔

”ریحان!“ یاور اچانک چلا لیا۔ مخصوص سائرن کی گونج دار آواز نے اُسے دہلا دیا۔

ریحان پراچہ کی چلتی سانسیں بھی حلق میں اٹک کر رہ گئیں۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہ بہت غلط ہو گیا ریحان!“ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ”اُٹو جلدی، بھاگو۔“

ان دونوں کے قدم بے اختیار حرکت میں آ گئے تھے۔ ریت کو اپنے مضبوط جوتوں سے روندتے ہوئے بھاگنے لگے۔

”اس طرف۔۔۔۔۔ اس طرف۔“ یاد کرنے اُسے اشارہ کیا تو وہ دونوں دائیں طرف آبادی والے حصے کی جانب بڑھے۔

تیز سائرن ساری فضا کو مرتعش کر رہا تھا۔ گزرتے مرد عورتیں اور بچے حیرت زدہ نظروں سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

”ہم بری طرح پھنس گئے ہیں ریحان!“ یاد ایک پتلی سی گلی میں داخل ہوتے ہوئے پھولی ہوئی سانس کے درمیان بولا۔

”ہماری گاڑی۔۔۔۔۔“

”ہاں، اسی گاڑی نے ہمیں مروادیا۔ وہ اسے پاچکے ہیں اور انہیں یقین ہو چکا ہے کہ ہم اسی طرف آئے ہیں۔“ یاد نے اطراف میں نگاہیں دوڑائیں۔ پھر اچانک اس نے بیگ سے ریوالت نکال لیا اور پھر ایک چھوٹے سے کچے پکے گھر میں داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے ریحان تھا۔ اس نے بھی اپنا ریوالت لود کر لیا تھا۔

...☆☆☆...

دولہا والوں کے استقبال کی تیاریاں زور و شور سے ہو رہی تھیں۔ آج دولہا والوں کی طرف سے لڑکیاں اور عورتیں شاندارانہ کو مہندی لگانے آرہی تھیں۔ یہ رسم سب سے پیاری تھی۔ لڑکیاں اس میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی

تھیں۔ اور یہ دن دلہن کے لئے سب سے بھاری تھا۔۔۔۔۔ الوداعی گیت سن سن کر اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا جھرنابہہ رہا تھا۔

شاندارانہ گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھی تھی اور لڑکیوں کو تیار ہوتا دیکھ رہی تھی۔ سبز جھلملاتا گھیردار پشتوا اور لمبے چوڑے جھلملاتے دوپٹے میں اشتار اقیامت ڈھارہی تھی۔ چھنکتی ماتھا پٹی اور بھاری زیور میں اُس نے اپنا سراپا قد آدم آئینے میں دیکھا۔ پھر اچانک اُس کے رخسار تپ گئے۔ آئینے میں ہشمنہ کا مسکراتا چہرہ جھلک آیا۔ وہ پلٹی۔

”اتنا سارا حُسن اب تک کسی کے نام نہیں ہوا کیا؟“ وہ ہنسی تو اشتار کے رخساروں پر لہو رنگ چھلک آیا۔

”ہے۔۔۔۔۔ ذولین لالہ کے نام۔“ شاندارانہ نے برجستہ کہا تو ہشمنہ ایریوں کے بل پلٹی۔

”کیا۔۔۔۔۔ کون ہے وہ خوش نصیب؟“

”بکتی ہے یہ تو۔“ اشتار نے شاندارانہ کو اپنی قیامت خیز آنکھوں سے گھورا جس میں تنبیہ تھی۔ مگر وہ اس کی نگاہوں کو نظر انداز کر گئی۔

”ادھر آؤ، تمہیں بتاؤں۔“ اُس نے شرارت آمیز نظریں اشتار پر ڈالیں اور ہشمنہ کو اشارے سے اپنے قریب بلایا۔

”بے شرم۔۔۔۔۔“ اشتار امارے حیا کے کچھ نہ بول پائی اور جھپاک سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

ہشمنہ اپنا زیور کا بکس اٹھائے پُر تجسس سی اس کے قریب پلنگ پر ٹک گئی، جیسے شاندارانہ اُسے کوئی بہت ہی مزے دار کہانی سنانے والی تھی۔

”میں بھی سوچتی رہی کہ اتنی پیاری لڑکی ابھی تک آزاد کیسے ہے۔“ وہ ہنسی اور بکس کھول کر اس میں سے اپنے زیورات نکال کر پہننے لگی۔

”آں، ہاں۔۔۔ ابھی منگنی نہیں ہوئی۔“ شاندانہ جلدی سے بولی۔ پھر اُسے ساری بات دھیرے دھیرے بتانے لگی۔

”یعنی جوڑی چاند، سورج کی کہہ سکتے ہیں۔“

”ہاں، بالکل۔۔۔ ذولین لالہ سورج کی طرح گرم گرم۔“ شاندانہ ہنسی۔

”شان!“ اچانک اشمل کی گاڑی کی آواز اُبھری تو شاندانہ چونک گئی اور پھر جلدی سے بولی۔

”اشمل لالہ! یہاں۔۔۔۔۔ یہاں مت آئیے۔“ وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر پلنگ سے نیچے اُتری۔ ”میرا آپ سے پردہ ہے۔۔۔ اور پھر یہاں میری سہیلی بھی ہے۔“ وہ زور سے چلائی کہ کہیں وہ اندر ہی نہ آجائے۔ مگر اشمل خان دروازہ عبور کر چکا تھا۔

ہشمنہ کادل تیزی سے دھڑکا۔۔۔ اس مانوس آواز نے اُس کی دھڑکنوں کو منتشر کر ڈالا تھا۔ اُس نے جلدی سے اپنے سیاہ کادار سوٹ کا بڑا سا کام والا دوپٹہ کھینچ کر سر پر ڈال لیا۔

”یہاں تو میرے لئے کوئی اجنبی نہیں ہے۔۔۔ ویسے میں تمہیں یہ گفت دینے آ رہا تھا جس کے بغیر یقیناً تم رخصت نہ ہوتیں۔ یا پھر مجھے بے حد برا کہتیں۔“ اُس نے محملی ڈبہ شاندانہ کی طرف بڑھادیا۔ لمحہ بھر کے لئے نگاہیں جھلملاتے دوپٹے سے جھانکتے تاباں چہرے کی جانب اُٹھیں تو اُس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”شان! تمہاری یہ سہیلی تو وادی آکر مجھے بالکل بھول گئی۔۔۔ شاید پہچانتی بھی نہیں اب تو۔“

”جج۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔“ شاندانہ ہکا بکارہ گئی۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ کر اشمل کو دیکھا۔

ہشمنہ کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ اشمل اس اطمینان بھرے انداز میں شاندانہ کے سامنے یہ راز طشت از بام کر دے گا۔ وہ

بالکل غیر اختیاری طور پر پلٹی تھی اور اشمل خان مبہوت سا رہ گیا تھا جیسے بجلی کا جھماکا سا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں۔

دوپٹے میں سبجے دکتے ستاروں کا عکس اُس کے چہرے کو پھر جگمگا گیا تھا۔ ہلکے ہلکے میک اپ اور بڑے بڑے جھولتے آویزوں نے اُس کے چہرے پر عجیب طرح کا نکھار بھر دیا تھا۔ وہ بھرپور دلکشی کے ساتھ اُس کے سامنے تھی۔ انوکھے اور روپہلے روپ میں۔

”ہائے اشمل لالہ!۔۔۔ آپ یہ کک۔۔۔۔۔ کیا کہہ رہے ہیں؟“ شاندانہ گرتے گرتے بچی تھی۔ اس انکشاف نے اُسے کتنے ہی لمحے گنگ کئے رکھا۔

اشمل خان کادل چاہا وہ اُس کے قریب آجائے اور اُسے دیکھتا رہے۔ اس حُسن کی ساری رعنائیاں اپنے دل پر نقش کر لے۔ اُس کی والہانہ نگاہوں نے ہشمنہ کو سرخ کر ڈالا۔ وہ دفعۃً ہوش میں آگئی اور جیسے ہی اپنی پوزیشن کا احساس ہوا خود کو سنبھالا اور آؤدیکھانہ تاؤ، جھپاک سے کھلے ہاتھ روم میں غائب ہو گئی۔

”اشمل لالہ۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ یہ کیا؟“ شاندانہ کے حواس پر تو بجلی سی گری اور اشمل کا یہ جملہ اور والہانہ نگاہوں سے ہشمنہ کو تکتے رہنا، یہ کسی انکشاف سے کم نہ تھا۔

وہ کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ اُس کی حیرانگی کو رفع کئے بغیر تیزی سے اُس کے پیچھے لپکی۔

”آ۔۔۔۔۔ آپ اور ہشمنہ کیا ایک دوسرے کو جان۔۔۔۔۔“ ابھی وہ اپنی حیرت پر مکمل قابو نہ پاسکی تھی۔

”ہوں۔۔۔۔۔“ وہ بھرپور انداز میں مسکرایا۔ ”یہ بات تم اپنی سہیلی سے بھی پوچھ سکتی ہو۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ مجھے آپ بتائیے۔۔۔۔۔ بتائیے نہ۔“ اس نے اس کا بازو تھام لیا، مبادا وہ بھاگ نہ جائے۔

”ارے، ارے\_\_\_ خود کو سنبھالو لڑکی! دولہا والے آئیں گے تو کیا سوچیں گے ایسی ہونق دُلہن کو دیکھ کر۔“ بات کو مذاق میں اڑا کر وہ سرعت سے کمرے سے نکل گیا۔

”ہائے ہشمنہ! تم تو چھپی رستم نکلیں۔“ شاندانہ ہاتھ روم کی طرف بڑھی جہاں ہشمنہ خود کو شاندانہ کی نگاہوں کا سامنا کرنے کے لئے تیار کر رہی تھی۔

...☆☆☆...

اشٹار اکو بے حد شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

اُسے اب ہشمنہ سے شرم سی محسوس ہونے لگی اور شاندانہ پر غصہ\_\_\_ کیا ضرورت تھی اُسے کہ اُس کی محبت کی تشہیر کرتی پھرے۔

وہ تو اب بھی ہو اپر محل بنا رہی تھی۔ کیا خبر، کون سا جھونکا اس محل کو دھڑام سے گرا دے\_\_\_ شاہ خانم کا کون سا جملہ اُس کی محبت کے چراغ کو گل کر دے یا ذولین خان کی انا اُس کی آنکھوں سے سارے خواب چھین لے۔

اُس کا ذہن پھر منفی انداز میں سوچنے لگا۔ ذولین سے ناراضگی نے اُسے اندر سے بکھیر دیا تھا۔

وہ پھر رنجیدہ ہونے لگی تھی۔

دولہا والے مہندی کے بڑے بڑے تھال اٹھائے اندر آگئے تھے۔ عورتوں اور بچوں کا ایک بڑا سا ریلہا سارے ماحول پر یکخت چھا گیا تھا۔

لڑکے والوں کے چہروں پر مسرت کے رنگ ہلکورے لے رہے تھے۔ لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔

وہ فاتح ہی تو تھے\_\_\_ لڑکی لینے آئے تھے۔ اپنے گھر کی رونق بڑھانے۔

اور لڑکی والوں کے چہروں پر اُدا سی ڈیرے ڈال رہی تھی۔ وہ اپنے گھر کی رونق کسی اور کی جھولی میں ڈال رہے تھے۔

گل بی بی کی تو آنکھیں رو رو کر سون گئی تھیں۔ ساری عورتیں اُنہیں دلا سہ دے رہی تھیں۔

شاہ خانم بھی اس وقت عجیب سی کیفیت سے دوچار بیٹھی تھیں۔ ایک تو وہ گل بی بی کے گھراتے برس کے بعد آئی تھیں۔ اُن کی خود ساختہ ناراضگی نے اُنہیں ہمیشہ گل بی بی سے دُور رکھا۔ مگر آج بیٹی کی خوشیوں میں وہ شریک نہ ہو تیں تو زمانہ انہی پر تھو تھو کرتا۔ اُن کی ناراضگی، اُن کے دل کی جلن، وہ دُکھن دنیا والوں پر آشکارا تو نہ تھی۔ وہ اُن کے گھر آئیں تو گل بی بی بچھ بچھ گئیں۔ کوئی شکوہ، کوئی گلہ\_\_\_ غرض آنکھوں میں کسی رنجش کا رنگ بھی نہ لہرایا تھا۔ وہ تو بھر بھر کر محبت دینے والی ہستی تھیں۔ بدلے میں اُنہیں کیا ملا، انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ اور پھر شاہ خانم تو انہیں ہمیشہ سے عزیز تھیں۔ اُن کی سہیلی اور بھائی کی بیوی، اشٹار اور اشمل کی ماں۔ اتنے بہت سارے رشتوں نے انہیں اور بھی گداز دل بنا دیا تھا۔

شاہ خانم اُن کی اس قدر اپنائیت اور محبت پر عجیب سے خلفشار کا شکار بیٹھی تھیں۔ مگر ان میں اس وقت اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اٹھ کر روئی روئی گل بی بی کے شانے پر ہاتھ رکھ دیتیں۔ اُن کی انا نے یہاں بھی ان کے قدم جکڑ لئے۔

مہک اور سلطانہ، اشٹار کو شاندانہ کے کمرے سے باہر پکڑ لائیں۔

”دیکھو تو\_\_\_ دولہا والے زبردست تیاریاں کر کے آئے ہیں۔“

”ہم تو لڑکی والے ہیں\_\_\_ یوں بھی ہارے ہی ہارے ہیں۔“ اشٹار اکا دل شاندانہ کے آنسوؤں میں ابھی تک بہہ رہا

تھا۔ مگر پھر بھی اُس نے تمام لڑکیوں کے ساتھ ڈھولک سنبھال لی۔



”ارے لڑکی تو ہم ہار ہی چکے، کم از کم یہ مقابلہ نہیں ہاریں گے۔“ ہشمنہ ہنسی۔

”بالکل \_\_\_“ مہک نے اُس کی تائید کی۔

شبہ و نگر ژو جنکے

تمبل وہی نا خلق و اخوانا

پہ و دعر اغلی دینا

ماہہ اُس ڈولی وڑی

(مہندی کی رات ہے اور لڑکیاں تمبل بجا رہی ہیں۔ لوگ اُس طرف سے شادی میں آئے ہیں۔ مجھے ڈولی میں لے

جائیں گے)

وہ مقابلے پر اتر آئی تھی۔ سارا جوش و خروش اُٹ آیا تھا۔ ہشمنہ بھی اُس کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔

اُس نے اچانک ڈھول ہشمنہ کی طرف بڑھا دیا اور خود تالیاں بجانے لگی۔

پہ و دعر اغلی دینا

ماہہ اُس ڈولی وڑی

جذبات کی شدت سے اس کا چہرہ متمم ہا تھا اور دوسرے کمرے میں بیٹھے ذولین خان کا پسلیوں میں دبادل جیسے مچل

مچل کر باہر نکلنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ وہ اڑتے پردے کے پیچھے سے اُس کے تاباں چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی پردہ لہرا

کر تیز جھونکے سے اوپر اٹھتا اُس کی آنکھیں اشتار کی چمک سے خیرہ ہو جاتیں۔

اُس نے کچھ دیر قبل اُسے شاندا نہ کے کمرے کے پاس ملول سادیکھا تھا۔ تب اُس کی کندن رنگ آنکھوں میں اُس کا عطا کردہ دکھ تھا۔ مگر اس وقت وہ صرف اور صرف دلہن والوں کا پلہ بھاری کرنے کے لئے اپنی ساری اُداسی کو پس پشت ڈال کر پُر جوش انداز میں گیت گارہی تھی۔ سب سے اونچی آواز اُس کی تھی اور یہ مترنم آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی

اچانک دولہا والوں میں سے کسی لڑکی نے اُس کی خوبصورت چوٹی ہلکے سے چھوتے ہوئے کہا۔

”بے کار تم لوگ اتنی محنت کر رہی ہو۔ دلہن کو تو ہم جیت ہی چکے ہیں۔“ اُس کی آنکھوں میں فتح کا نشہ تھا۔ ہشمنہ جلدی سے بولی۔

”تو پھر یہ مقابلہ بھی جیت کر دکھا دو۔“

”نہ بابا \_\_\_ یہ تو اپنے بس کا نہیں رہا۔“ اُس نے اشتار کو پُر شوق نظروں سے دیکھتے ہوئے برجستہ کہا تو وہ سب ہنسنے لگیں۔

گانے کا مقابلہ تھم گیا تھا۔ دلہن والی عورتیں شاندا نہ کی نرم ہتھیلی پر رکھے پتے پر مہندی لگانے لگیں۔ اس رسم کے شروع ہوتے ہی ساری لڑکیاں بھی ارد گرد جمع ہو گئیں۔

رنگ و بُوکا ایک سیلاب تھا جو گل بی بی کے اس بڑے کمرے میں اُٹ آیا تھا۔ لڑکیاں آپس میں ہنسی مذاق بھی کر رہی تھیں۔ لڑکیوں کے اس ٹولے سے عورتیں دُور ہی بیٹھی تھیں اور دُور سے اُن کی نوک جھونک اور رسم کی ادائیگی پر لطف اُٹھا رہی تھیں۔

ہشتمینہ نے حنارنگ مہندی کا ایک گولہ سبنا کر مہک اور سلطانیہ کی طرف اچھال دیا جو دونوں پر گرا تھا۔

”ہشتمینہ کی بچی \_\_\_\_\_“ مہک اس کی طرف جھپٹی اور رنگ دار مہندی اٹھالی تو ہشتمینہ چلائی۔

”اے، اے \_\_\_\_\_ دیکھو، یہ مت اڑنا۔“

”تم نے اپنی مرضی سے پھینکی تھی۔ اب میری مرضی۔“ مہک اترائی۔

”اے ہے \_\_\_\_\_ لڑکیو! سنبھل کر۔ یہ رنگ دار مہندی تو مت اڑاؤ۔ داغ چھوڑ جائے گی۔“ گل بی بی اس شرارتی ٹولے کو سمجھاتی ہوئی اشارہ کی طرف آئیں۔

”اشٹار ایٹی! ذرا دیکھنا، زہرہ سے معلوم کرو کہ کھانا لگیا ہے یا نہیں؟ پتہ نہیں، نواز احمد کہاں رہ گیا ہے۔“

”جی اچھا \_\_\_\_\_ میں ابھی معلوم کرتی ہوں۔“ وہ جلدی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ اُسے تو موقع چاہئے تھا اس کمرے سے فرار ہونے کا \_\_\_\_\_ اُسے ہشتمینہ اور مہک سے ڈر لگ رہا تھا۔ نہ جانے کب وہ اس پر رنگ دار مہندی پھینک دیں۔ خود کو اُس نے کب سے عورتوں کی آڑ میں چھپا رکھا تھا۔ اور اب جو نہی موقع ملا، جھپاک سے کمرے سے نکل گئی۔

زہرہ بی بی اُسے باورچی خانے کی طرف جاتی نظر آئی تو وہ اُس کی طرف بڑھی۔

”زہرہ بی بی! ابھی تک نواز احمد نہیں آیا ہے؟ \_\_\_\_\_ گل بی بی پوچھ رہی تھی کھانے کا۔“

”اے نہیں خان زادی! وہ تو کب کا آچکا ہے۔“ زہرہ جلدی سے بولی۔ ”دیگیں تیار رکھی ہیں۔ کیا بڑے کمرے میں کھانے کا انتظام کریں؟“

”ہاں، ہاں بالکل۔ اب دیر نہیں ہونی چاہئے۔“ اشارہ یہ کہہ کر اُلٹے قدموں واپس مڑ گئی۔ اور ابھی راہداری عبور نہ کر

سکی تھی کہ اُس کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لئے۔

اپنے اسی دلکش سراپے اور تمکنت کے ساتھ ذولین خان اس کے سامنے تھا۔ اسی سکون کے ساتھ جو اس کا سکون تباہ کر دیتا تھا۔

اُس کی پلکیں اٹھیں اور جھک گئیں۔

ذولین اُس کے فسوں خیز حُسن کے سامنے کتنے ہی ثانیے مسحور کھڑا رہا۔ ”اتنا ڈھیر سارا حُسن کہاں سے چرایا اشترا مہروز! تم نے؟“ اُس کے مضبوط سینے میں مقید دل میں جیسے طوفان سا پیا ہو گیا۔ وہ آگے بڑھا اور بے اختیار اس کے نازک شانوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔

اشٹار اپوری جان سے کانپ گئی۔ اُسے یوں لگا جیسے پور پور میں برقی لہریں سرایت کر گئی ہوں۔ وہ لمحہ بھر کے لئے اُس کی قربت سے بوکھلا گئی، پھر خود کو سنبھالتی تیزی سے پیچھے ہٹی۔

”احتیاط لازم ہے ذولین خان! کہیں بابا خان کے دل میں آپ کی طرف سے کوئی ایسا خوفزدہ خیال نہ آجائے۔ یا کوئی ایسی بات۔“ اس کا لہجہ طنز آمیز تھا۔

وہ اُس کے الفاظ اُسے لوٹا ہی تھی۔ ذولین کے لبوں کی تراش میں ایک دل فریب مسکراہٹ پھیل گئی۔

”کہہ لو جی بھر کر جو کہنا ہے \_\_\_\_\_ میں تمہیں منانے ہی آیا ہوں۔“ اُس نے پُر سکون لہجے میں کہا۔

”اونہہ \_\_\_\_\_ آپ کو منانا ہی کب آتا ہے۔ روٹھنے والے منا کب جانتے ہیں؟“ وہ از حد دُکھی ہو رہی تھی۔ سنہری آنکھوں میں ڈھیر سارے شکوے مچل رہے تھے۔

”نہیں \_\_\_\_\_ اب تو خاصی جانفشانی سے میدان میں اُترا ہوں۔“ وہ مخمور نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ روٹھی روٹھی

برہم سی اشتار اُسے اپنے دل سے بے حد قریب محسوس ہو رہی تھی۔

”اب دیکھو کتنا کامیاب ہوتا ہوں۔“ وہ ہنس دیا۔

اُس نے اپنی پلکوں کی باڑا اٹھائی، پھر جھکادی۔ ”اف۔۔۔ تم مجھے ہر بار شکست دینے آتے ہو ذولین خان!“ وہ اُس کے سبز نگینوں میں جیسے پھر ڈوبنے لگی تھی۔

”اشتار! مجھے شاید محبت کرنے کا سلیقہ نہیں آتا۔“ اُس کی آواز ابھری جس میں سنجیدگی مستور تھی۔ ”مجھے کبھی اتنی ڈھیر ساری چاہت ملی بھی تو نہیں ہے نا۔۔۔ جو محبت کے لمس سے سدا نا اشتار ہے ہوں، وہ شاید محبت کے تقاضے پورے کرنا نہیں جانتے۔ میں مانتا ہوں میرے رویوں نے تمہیں بے حد دکھ پہنچایا ہے اشتار! میں تمہیں کھل کر چاہتا ہوں۔ مگر میرے پاس اظہار کے کوئی طریقہ نہیں۔ یا شاید کوئی الفاظ نہیں۔ تم بھی سوچتی ہو گی کہ کس پتھر سے سر ٹکرایا ہے۔“ اُس کے لہجے میں بے چارگی سمٹ آئی۔ اُس نے آہستگی سے سر اٹھایا تو اُس کا دل گچھلتا چلا گیا۔

وہ جتنا اکھڑ لگتا تھا اس سے کہیں زیادہ مہذب تھا۔

جتنا ظالم لگتا تھا اس سے کہیں زیادہ چاہنے والا محسوس ہوا تھا۔

وہ اُس کے چہرے کی نرمی میں کھوئی رہی۔

”میں بہت پیاسا ہوں اشتار! بہت پیاسا۔ تمہاری بے کراں چاہت سے خود کو سیراب کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز مجھ سے خفا مت ہو۔ اگر ناراض ہو تو مجھ سے اُلجھو، مجھ سے لڑو۔ ایسی خاموشی اختیار مت کرو۔ مجھے خاموشی توڑنا بہت مشکل لگتا ہے۔“ اُس نے بے حد صاف گوئی سے اپنی کمزوریوں کا اعتراف کیا۔

وہ تو پہلے ہی گھائل تھی۔ آنکھیں بھیگتی چلی گئیں۔

”آں۔۔۔۔۔ آں۔۔۔۔۔ نہیں، نہیں۔“ اُس نے جلدی سے کہا۔ ”ان آنسوؤں سے مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔ یہ بڑا خطرناک ہتھیار ہوتا ہے تم عورتوں کا۔ یہ سخت سے سخت چٹان کو بھی بہا لے جاتے ہیں۔“ وہ مسکرایا تو وہ روتے ہوئے ہنس دی۔

”کیا سمجھوں ناراضگی ختم؟“ وہ اُس کی ہنسی کو دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

”آپ کو تو منانا بھی نہیں آتا ذولین!“ اُس کی اُداسی زائل ہوتی چلی گئی۔ ”جو دل میں رہتے ہوں بھلا ان سے ناراضگی کب تک قائم رہ سکتی ہے۔“ اُس نے آنکھیں پونچھتے ہوئے سر جھکا کر کہا۔

”اور جو دل میں رہتے ہیں انہیں منانے کی ضرورت کب پیش آتی ہے۔“ اس نے آہستگی سے اُس کا سراونچا کیا۔ ”تمہارا یہ پیارا چہرہ تو میری آنکھوں کی روشنی بنا ہوا ہے اشتار! یہ معصوم اور سادہ حُسن تو مجھے دنیا کی ہر شے سے عزیز ہو گیا ہے۔“ وہ بے حد سچائی کے ساتھ اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اُس کی تعریف اور اتنی محبت پر اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

یہ جملے مثل آبِ حیات تھے جو اُس کی پور پور میں زندگی کا نیا سر بھر گئے۔ ذہنی تھکن پر روشن تازگی سچ گئی۔

اُس کے نرم نرم ہاتھ ذولین کے مضبوط ہاتھوں کے حصار میں تھے۔ اُس نے لمحہ بھر آنکھیں موند کر محبتوں کی ہمیشگی کی دعائیں مانگ ڈالیں۔

”اشتار!“ ذولین کی آواز پر اُس نے آنکھیں کھول لیں۔

”شاندانہ کی شادی کے بعد میں چاچا خان سے تمہیں ہمیشہ کے لئے مانگ لوں گا۔“ اس کے لہجے میں محبت کا نشہ بکھرا ہوا تھا اور اُس کے چاہنے کی تڑپ تھی۔ اُس کا چہرہ لوٹوں تک گرم ہو گیا۔

”مم۔۔۔۔۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا، گل بی بی نے کام سے بھیجا تھا مجھے۔“ وہ اُس کی والہانہ نگاہوں سے گھبرا کر جلدی سے پیچھے ہٹی۔

”اس سے اہم کام اور کون سا ہو سکتا ہے؟“ وہ اُس کی گھبراہٹ سے محفوظ ہوتے ہوئے ہنس دیا تو وہ تیزی سے بڑے کمرے کی جانب بھاگ لی۔

...☆☆☆...

اُسے اپنی سماعتوں اور بصراتوں پر بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

شارد ابھابی کے مسکراتے لب اور مطمئن چہرہ۔

زمان بھائی کا نرم رویہ اور \_\_\_\_\_ اور \_\_\_\_\_ وہ سارے انداز جو اُس نے آج تک نہ دیکھے تھے نہ سوچے تھے۔

انتہائی انقلاب شارد اور زمان کی زندگی میں یوں ایک دم آجائے گا۔

اب تو وہ مایوس ہو چکی تھی۔ اُسے اُمید نہیں تھی۔ کسی معجزے کی منتظر بھی نہ رہی تھی۔ اور آج جیسے معجزہ ہی رونما ہو گیا تھا۔

”ماہی! سچ پوچھو تو میں اپنے خدا سے مایوس نہیں ہوئی تھی۔ دلوں کو بنانے والا دل کو پھیرنا بھی جانتا ہے۔“

وہ بے یقینی سی کیفیت میں بغیر سانس لئے شارد ابھابی کو دیکھتی رہی۔ اُن کے چہرے پر محبت پالینے کا خمار بکھرا ہوا تھا۔ اُن کے لہجے میں اُجلے موسموں کی خوشبو بسی تھی اور ہونٹوں پر ایسی صبیح مسکراہٹ جیسے پہلی بار لب مسکراہٹ سے آشنا ہوئے ہوں۔

وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اُٹھی اور فوراً مسرت سے شارد ابھابی کے سینے سے لگ کر بلک اُٹھی۔

”یہ خواب \_\_\_\_\_ میرا خواب آج تعبیر پا گیا کہ آپ اور زمان بھائی ایک ہو جائیں۔ ایک دوسرے کو پالیں۔ صلح کر لیں۔“ اُس کی آواز آنسوؤں کی یورش سے بھاری ہو گئی۔

امی الگ اپنے کمرے میں اس خوشی پر اپنے خدا کے حضور سر بسجود تھیں۔

شارد کے پُر سکون چہرے اور زمان کے دل کی اس تبدیلی نے انہیں سرشار کر دیا تھا۔

’اب ماہ گل بھی اپنے گھر کی ہو جائے گی۔‘ خوش آئند خیال ہی ان کے اندر توانائیاں بھر گیا۔

”ماہی!“ شارد ابھابی نے اُسے تھام کر صوفے پر بٹھادیا۔ ”تیرا میرا درد مشترک تھا۔ اب تم بھی میرے بھائی کے اُجڑے گھر کو آباد کر دو۔“ اُسے معاف کر دو۔“ وہ یکلخت سوالی بن گئیں۔

ماہ گل کا دل تیزی سے دھڑکا اور پلکیں تھرتھرا کر رخساروں پر جھک گئیں۔ اُس کے خیال کے پردوں پر وہ مانوس سا چہرہ جھانکنے لگا تو وہ سارے درد جاگ اُٹھے۔ وہ سارے بیتل آنکھوں کے سامنے جاوداں ہو گئے۔

”آہ \_\_\_\_\_ مسعود شاہ۔“ ایک تیز سسکاری اُس کے لبوں سے آزاد ہو گئی۔

”ماہی! مسعود بھائی بے قصور ہیں۔ بس حالات نے ہی انہیں تمہارے سامنے مجرم بنا ڈالا۔ انہوں نے بہن کی محبت میں یہ سب کچھ کر ڈالا۔ ہاں ماہی! میرے دُکھی وجود نے انہیں یہ سب کرنے پر مجبور کیا تھا۔ قصور وار تو میں ہوئی نہ۔ تم اپنے دُکھوں کا حساب مجھ سے مانگو۔“

”شارد! \_\_\_\_\_“ ماہ گل نے تڑپ کر اُسے سینے سے لگا لیا۔ ”کیسی اجنبیوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔“ اُس کا دل پگھل گیا۔ وہ اُٹھی اور سسکیاں بھرتی سرعت سے کمرے سے نکل گئی۔

”تم مسعود کو فون کر دینا شارد!“ اُس کے کمرے سے نکل جانے کے بعد امی شارد ابھابی کے پاس آئیں۔



”نہیں امی! وہ خود کریں گے۔ انہوں نے کہا ہے مجھ سے۔“ شاردابھائی انسوپو پختی کھڑی ہو گئیں۔

”شادو! مجھے بڑا ڈر لگتا ہے اس لڑکی کے پاگل پن سے۔“ امی کے چہرے پر اضطراب سا پھیل گیا۔ وہ متفکر سی نظر آنے لگیں۔ شادو ابھائی نے اُنہیں دیکھا۔

”تم اُسے سمجھانا\_\_\_\_\_ کہیں وہ جذبات میں آکر کوئی ایسا غلط قدم نہ اٹھالے جو تاعمر اس کے لئے پچھتاوا بن جائے۔“

”آپ فکر مت کریں امی! مسعود بھائی اُسے منالیں گے۔“ شاردانے انہیں تسلی دینی چاہی مگر نہ جانے کیوں انہیں تسلی نہ ہو پار ہی تھی۔

”جذبات میں کئے گئے فیصلے خود ہماری خوشیوں کے قاتل ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں نا، چیدہ چیدہ خوشیاں بھی ملیں تو انہیں سمیٹ لینا چاہئے۔ پھر ایسا نہ ہو کہ ہم انہیں ٹھکرا کر خوشیوں کے لئے ترستے رہ جائیں۔ یہ اس کی انا نہیں، بے وقوفی ہے۔“ امی اضطرابی انداز میں ہاتھ مسلنے لگیں۔ ”بس شارد! تم اُسے سمجھا دینا، اُسے قاتل کر لینا۔ یہی دنیا ہے اور ہم اور وہ کوئی انوکھے یا اس دنیا سے الگ تو نہیں ہیں۔ دُکھ، غم تو سب کے حصے میں آتے ہیں۔ بڑے بڑے جلیل القدر پیغمبر بھی بڑی بڑی آزمائشوں سے گزر رہے ہیں۔ ابھی ہم نے تو وہ دُکھ نہیں اٹھائے ہیں۔“

”آپ تسلی رکھئے امی! مجھے یقین ہے مسعود بھائی ماہِ گل کی کسی بھی حماقت کی پذیرائی نہیں کریں گے۔ وہ خود اُسے سمجھالیں گے۔“

”ہاں۔۔۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ امی ایک گہری سانس لے کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔

... ☆ ☆ ☆ ...

”سحر! تمہیں اشتراکیسی لگتی ہے؟“ فروان کے لبوں پر خوبصورت مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ سحر گل نے اُسے

دیکھا اور پھر ہاتھ میں پکڑی کتاب میز پر پٹختی۔

”اے ون، زبردست، بہت پیاری۔“ وہ اٹھ کر اُس کے قریب آئی اور پھر اُسے بغور دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا تمہیں بہت اچھی لگتی ہے؟“

”اوں، ہوں \_\_\_\_\_ میں تو ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔“ وہ گھبرا کر سیدھا ہو بیٹھا۔

”نہ۔۔۔۔۔ دال میں کچھ کالا ہے۔“ وہ ہنسی۔ ”ویسے امی نے شاہ خانم سے باتوں باتوں میں تمہارے رشتے کی بات کی ہے۔“

”کھکھ۔۔۔۔۔ کیا؟“ وہ اچھل پڑا۔ ”تمہیں کس نے بتایا؟“ اُس نے سحر گل کو بے یقینی سے دیکھا۔

”بس پتہ چل گیا۔“ وہ زور سے ہنسی۔ ”سیچ فرو! وہ بہت پیاری ہے۔ کسی کے خوابوں میں آنے والی لڑکی سے بھی زیادہ دلکش۔“ سحر گل شاعرانہ انداز میں بولی تو فروان کو ہنسی آگئی۔ مگر وہ دل سے اُس کی بات کی تائید کر رہا تھا۔ اشتراکِ خوبصورت چہرہ اُس کے خیال کے پردوں پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔

”پتہ ہے فروان! شاہ خانم کو بھی کوئی انکار نہیں۔ ہاں، انہوں نے ابھی فائنل جواب تو نہیں دیا ہے مگر اُن کے انداز میں انکار بھی نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے انکل مہروز سے بات کرنے کے بعد ہی وہ کوئی حتمی جواب دیں۔“

سحر گل کی یہ باتیں سن کر فروان کا سیر وں خون بڑھ گیا تھا۔

”تم تو بڑی کمال کی چیز ہو۔۔۔ اور کیا کیا باتیں ہوئی تھیں امی اور شاہ آئنی کے درمیان؟“ وہ پوچھنے لگا تو سحر گل چونکی اور پھر کھڑی ہو کر دوبارہ اپنی جگہ پر جا بیٹھی۔

”ارے واہ \_\_\_\_\_ تم تو پھلتے ہی جا رہے ہو۔ تم کیوں اتنی دلچسپی لے رہے ہو اشتار امہر وز میں۔ جبکہ تم کو۔۔۔۔۔“

”اچھا بکومت زیادہ \_\_\_ جلدی جلدی بتائو۔“ وہ دھونس جمانے لگا۔

”یعنی تم گئے کام سے۔“

”ہشت \_\_\_“ فروان نے جلدی سے اُسے آنکھیں دکھا کر خاموش کر دیا۔ کیونکہ ماہ گل اندر داخل ہوئی تھی۔

وہ سخت ذہنی دباؤ میں تھی۔ بدلتے حالات نے اُسے عجیب سی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ مسعود شاہ کے سابقہ رویوں اور اپنے دل کے فیصلے کے درمیان الجھی جا رہی تھی اور جب بہت تھک

گئی تو سحر گل اور فروان کے پاس آگئی۔

اُن کی ہلکی پھلکی باتوں اور مسکراہٹوں میں خود کو گم کرنے اور اس دباؤ سے نجات پانے کی سعی کی۔

”کیا باتیں ہو رہی ہیں بھئی؟“ وہ جبراً مسکرا کر اُن کے پاس آ بیٹھی۔

”اشتراکی باتیں ہو رہی تھیں۔“ سحر گل نے جلدی سے کہا تو ماہ گل کی بے اختیار نگاہیں فروان پر اٹھیں جو کہ سحر گل کو گھور رہا تھا۔

”اچھا \_\_\_ تو وادی کی باتیں ہو رہی تھیں۔“ وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

”اوں، ہوں \_\_\_ وادی کے حُسن کی۔“ سحر گل پھر بولی اور ہنسنے لگی۔

”سحر! جائو، ماہی آپنی کے لئے فٹ گرم گرم چائے بنالائو۔“ فروان نے اُسے گھورتے ہوئے حکم دیا تو وہ بادل نحوستہ کھڑی ہو گئی۔ ”ماہی آپنی کی طبیعت ویسے کچھ بہتر نہیں لگ رہی ہے۔ اور تمہاری اوٹ پٹانگ باتیں انہیں اور بھی تھکا دیں گی۔ جائو بھاگو۔“ وہ اُسے یہاں سے بھیج دینا چاہتا تھا۔ وہ کھل کھلاتی جھپاک سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

”فروان \_\_\_!“ ماہ گل نے کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر اُسے نیم و آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پکارا۔

”جی \_\_\_؟“

”کیا تم اشتراک کو بہت چاہتے ہو؟“ اُس کا جملہ بالکل غیر متوقع تھا۔ فروان کچھ خفیف سا ہو گیا۔

”پتہ نہیں \_\_\_ کبھی پیمائش نہیں کی۔“ وہ سر کھجانے لگا۔ ”بس اچھی لگتی ہے۔“ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اُسے ماہ گل سے نظریں ملانے سے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔

”فروان! تم بہت سمجھ دار ہو۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہاری زندگی بھی زمان بھائی کی طرح کسی ایسے یاد رکھ سے دوچار ہو جائے۔“ انہوں نے فروان کو بہت غور سے دیکھا۔ آج وہ سب کچھ کہہ دینے کی ہمت پیدا کرنے لگیں خود میں۔

وہ فروان کو اندھیرے میں رکھ کر اشتراک کو یا فروان کو کسی بھی دُکھ سے ہمکنار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے تو قدم قدم پر اشتراک کو جانچا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتے ان سپنوں کو بغور دیکھا تھا۔ وہ ذولین کو چاہتی تھی اور اُس کی محبت میں اس قدر آگے بڑھ چکی تھی کہ واپسی ناممکن تھی۔

”کیا بات ہے آپنی؟“ فروان اُس کے متغیر چہرے کو دیکھ کر چونکا۔

”فروان! امی ایک اور غلط فیصلہ کرنے چل نکلی ہیں۔ تم ہی انہیں روک سکتے ہو۔ فروان، میرے بھائی! تم نہیں جانتے شادی کے بعد کی زندگی بے حد مشکل اور پُر پیچ ہوتی ہے۔ خاص کر عورت کے لئے۔ میں نہیں چاہتی کہ تم یا اشتراک ساری عمر سمجھوتے کی زندگی گزارو۔“

”آپ کیا کہنا چاہتی ہیں \_\_\_ میں سمجھا نہیں۔ پلیز آپنی! کھل کر بتائیے نہ۔“ فروان اُلجھ سا گیا۔ ماہ گل نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے قریب بٹھالیا۔

”فروان! تم اشترا کو بھول جاؤ۔ بلکہ امی کو بھی اس اقدام سے باز رکھو۔ اشترا، ذولین خان کے نصیب کا ستارہ ہے اور اسے اسی کے نام رہنے دو۔ وگرنہ وہ بکھر جائے گی۔“

”آپی!“ فروان کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ ”کیا اشترا، ذولین سے ----؟“ اُس کے بقیہ لفظ ٹوٹ گئے۔

”ہاں۔۔۔“ اُس نے سر جھکا لیا۔ فروان کا متغیر چہرہ اُس کے لئے کرب کا باعث بنا۔ ”فرو! وہ بہت معصوم اور بے ضرر سی لڑکی ہے۔ شاہ خانم کے ہر فیصلے پر قربان ہو جائے گی۔ لیکن سوچو فرو! ایک ایسی لڑکی جس کا دل اور روح کسی اور کو چاہتی ہو، تم اُسے پا کر کیا کرو گے؟ ایک خالی مکان جہاں صرف تمہیں اپنی آواز کی بازگشت ہی سنائی دے گی۔ تم بہت سمجھ دار اور حقیقت کو قبول کرنے والے لڑکے ہو۔ مجھے یقین ہے تم خود کو یا اشترا کو آزمائش میں نہیں ڈالو گے۔“ اُس نے اُس کے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اُس کا دل اندر سے پھٹا جا رہا تھا۔ اُس کے بس میں ہوتا تو وہ ڈھیر ساری خوشیاں کہیں سے لا کر فروان کے قدموں میں ڈال دیتی۔

”آپ نے پھر امی کو اسی وقت روک کیوں نہیں دیا جب وہ شاہ خانم سے بات کر رہی تھیں؟“ وہ کھڑا ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی تھی اور آنکھوں میں یکلخت ہی اُدا سی بھر گئی تھی۔

”امی کو تو تم جانتے ہو۔۔۔ انہوں نے کب کہا مانا ہے میرا؟ انہوں نے تو زمان بھائی کی بھی بات نہیں مانی تھی۔ اور شاردابھائی نے سات سال تک کا طویل عرصہ بے پناہ اذیت میں گزارا ہے۔“

”اور آپ نے بھی تو۔“ فروان نے اسے دیکھا اور پھر اضطرابی انداز میں ہاتھ مسلنے لگا۔ پھر اچانک پلٹا اور پردہ اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

”میں جانتی ہوں فروان! تم ان راستوں پر اتنا آگے نہیں بڑھے ہو جتنا اشترا اور ذولین خان۔ مجھے یقین ہے تم خود کو سنبھال لو گے اور واپس پلٹ آؤ گے۔۔۔ چند دنوں کی کسک ہا عمر کے دکھ سے بہتر ہی تو ہوتی ہے۔“ اُس نے اپنے

گرم گرم آنسو اندر ہی اُتار لئے۔

اُسی لمحے فون کی گھنٹی چیخ اُٹھی تھی اور وہ کرسی سے اُٹھی اور ریسپور اُٹھالیا

”ہیلو۔۔۔!“

”ہیلو۔۔۔ میں مسعود بول رہا ہوں۔“ ماؤ تھ پیس سے مانوس سی آواز اُبھری اور ماہ گل کا سارا بدن کانپ گیا۔

...☆☆☆...

گل بی بی کا بڑا سا گھر مہمانوں سے کچا کھچ بھرا ہوا تھا۔۔۔ ایک شور تھا، ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ کانوں پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ آج شادی کا دن تھا اس لئے افراتفری سی مچی ہوئی تھی۔ لڑکیاں اپنی تیار یوں میں لگی ہوئی تھیں۔

ایک بڑے سے کھلے حصے میں شامیانے ڈال کر مہمانوں کے لئے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ پچھلے حصے میں بارات کے ساتھ آنے والے مردوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ عورتوں کے حصے میں ایک بڑا سا سیٹج بنا دیا گیا تھا۔ لہن کے لئے۔ یہ سارے کام ذولین اور اشمل اپنی پسند اور نگرانی میں کروا رہے تھے۔

”بارات تو میرے خیال میں عصر کے بعد تک پہنچ جائے گی۔“ ذولین کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”ہوں۔۔۔ دوسرے گائوں سے آرہی ہے۔ آنا تو جلدی ہی چاہئے۔“

”ایک تو میں اس عورت ذات سے عاجز آ گیا ہوں۔“ شناس بھائی منہ بناتے ہوئے بولے اور کرسی پر بیٹھ گئے تو ذولین اور اشمل نے انہیں دیکھا۔

”خیریت؟“

”سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی جگہ ہمارے لئے بھی ہے کہ نہیں۔۔۔ جس طرف جاتا ہوں کوئی چیتا ہے کہ اے بھائی!



یہ زنان خانہ ہے۔ کسی دوسرے کمرے کی طرف بڑھتا ہوں تو وہاں لڑکیاں بالیاں بیٹھی ہیں۔ پورا گھر لڑکیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ہم مردوں کے لئے لگتا ہے زمین تنگ ہو گئی ہے۔“

اُن کی بات پر وہ دونوں اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو نہ روک سکے۔

”تو پھر آپ کے لئے یہی بہتر ہے کہ یہیں بیٹھے رہئے۔ ہمارے ہمراہ کچھ کام کر لیجئے۔“ ذولین نے مشورہ دیا۔

”بھائی! مجھے بھی تیار ہونا ہے۔ ایک وہ تمہاری بھابی نظر ہی نہیں آرہی ہیں۔ وادی اگر تو نگاہیں ہی بدل لی ہیں اُس نے بھی۔“ وہ سخت متوحش سے ہو رہے تھے۔

”انہیں تو آپ اب بھول ہی جائیے۔ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملیں گی۔“ اشمل نے میز پر رکھے ٹھنڈے پانی کے جگ سے ایک گلاس بھر کر ان کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ پیچھے اور سکون سے یہاں بیٹھے رہئے۔ یہ شادی وغیرہ کے موقع پر تو سارے گھر پر عورتوں کی اجارہ داری ہوتی ہے۔ اسی لئے تو ہم بھی باہر باہر نظر آرہے ہیں آپ کو۔“

اشناس نے پانی کا گلاس اُس کے ہاتھ سے لے لیا۔

”تو گویا ان کی ایک دن کی بادشاہت قبول کرنا پڑے گی۔“

”بالکل۔۔۔ سودن مرد کے، ایک دن عورت کا۔“ اشمل مسکرایا تو اشناس بھائی نے منہ بنایا۔

”ویسے یہ ایک دن اُن کا سودن پر بھاری ہوتا ہے۔ اب دیکھو، رخصت ایک لڑکی کو ہونا ہے مگر لگتا ہے علاقے کی ساری عورتیں اس کے ہمراہ روانہ ہونے کے لئے تیار ہیں۔ لڑکیوں نے تو پورا آسمان سر پر اٹھا لیا ہے۔“ وہ شکوہ کنناں ہو گئے۔ اُن کی ناراضگی بھی بجا تھی۔ نہ انہیں اپنے کپڑے استری کئے ملے تھے اور نہ کوئی ہاتھ روم مل رہا تھا کہ نہا کر

تازہ دم ہو جائیں۔ ہر جگہ لڑکیاں ڈیرہ ڈالے بیٹھی تھیں۔ اپنی بیوی کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے تھے مگر صبح سے اب تک کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ اور وہ اندر ہی اندر تیج و تاب کھا کر رہ گئے تھے۔

”ذولین! میں ذرا اوپر کا ایک چکر لگاؤں۔ لائننگ وغیرہ دیکھ آؤں، کام پورا ہوا کہ نہیں۔ تم ذرا اشناس بھائی کو کمپنی دو۔ پھر بھابی کو ہی کہیں سے ڈھونڈ کر مجھے لانا پڑے گا۔“ وہ اشناس کے چہرے کی طرف دیکھ کر ہنس دیا اور پھر پلٹ کر سرعت سے اس حصہ سے باہر نکل گیا۔

...☆☆☆...

ہشمنہ اپنے کامدار دوپٹے کو سنبھال کر پن لگا رہی تھی۔ اپنے لمبے سیاہ بالوں کو اُس نے کلپ میں جکڑ کر پونی ٹیل کی صورت دے دی تھی۔ وہ شاندا نہ کے کمرے میں ہی تھی کہ گل بی بی اندر آئیں۔

”ہشمنہ بیٹی!“

”جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ ممائی جان!“ وہ جلدی سے پلٹی۔

”ایک کام کر دینا میری بچی! نہ جانے ساری لڑکیاں کہاں غائب ہو گئیں۔ اشتارا بھی حویلی گئی ہے کسی کام سے۔“ آپ مجھ سے کہئے۔“ وہ پن لگا کر اُن کے قریب آگئی۔

”ماشاء اللہ۔۔۔ خدا نظر بد سے بچائے۔“ گل بی بی کی نظریں اُس کے سر پر اُٹھیں تو وہ محبت سے اسے دیکھنے لگیں۔

ہشمنہ کے رخسار گلابی ہو گئے۔

”چھوٹی ممائی جان! کیوں بنا رہی ہیں مجھے؟“ وہ ہنس دی۔ ”آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔“



”اے ہاں \_\_\_ ذرا اوپر کے کمرے میں دیوار میں لگی الماری میں زیور کا بکس رکھا ہے، وہ لے کر آنا۔ میں چھوٹے کمرے میں ہوں۔ وہیں دے جانا مجھے۔“ انہیں اپنا کام یاد آگیا تو بولیں اور پھر کمرے کا پردہ اٹھا کر باہر نکل گئیں۔

ہشمنہ ڈریسنگ سے اپنے سنہرے آویزے اٹھا کر ہنستے ہوئے شاندا نہ کی طرف پلٹی۔

”سنو \_\_\_ میں ابھی آتی ہوں۔ بکس لے کر تم اندر سے دروازہ بند کر لو۔“

”جلدی آنا \_\_\_ پتہ نہیں، اشارہ ابھی ابھی تک کیوں نہیں آئی۔“ شاندا نہ بیڈ سے نیچے اتر آئی اور ہشمنہ کے باہر نکل جانے پر آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔

ہشمنہ تیزی سے سیڑھیوں کی جانب بھاگی تھی کہ اوپر سے نیچے آتے اشمیل خان سے بری طرح ٹکرائی \_\_\_ اور اُس کی کلائیوں میں چھکتی گلابی اور سبز کانچ کی چوڑیاں ایک چھنا کے سے ٹوٹ کر سیڑھیوں پر بکھر گئیں۔

”ہائے اللہ \_\_\_“ وہ اپنی پیشانی کی ضرب بھول کر چوڑیوں کی طرف لپکی۔

”اوہ، سوری \_\_\_ ویری سوری۔“ اشمیل اس اچانک تصادم پر بوکھلا گیا تھا۔ اُس کی نگاہیں بکھری چوڑیوں پر اٹھیں تو اُسے واقعی ندامت ہوئی۔ اُس نے نگاہیں اوپر اٹھائیں تو اس کے دلکش سراپے پر جم گئیں۔

”ہائے اللہ \_\_\_ اتنی پیاری چوڑیاں \_\_\_ ساری ہی ٹوٹ گئیں۔ اتنی محبت سے پہنائی تھیں۔“ اُس کا دم چوڑیوں میں اٹک گیا تھا۔ اُس نے ایک حسرت بھری نگاہ ٹوٹی چوڑیوں پر ڈالی جو اب صرف کانچ کے ریزے تھے۔ اور پھر پلکیں اوپر اٹھائیں۔ مگر پھر جلدی سے جھکادیں۔

وہ شوق کا ایک جہاں لئے ہوئے اُسے دیکھ رہا تھا۔

”کس نے پہنائی تھیں؟“

”اشترا نے \_\_\_ ابھی صبح ہی تو پہنائی تھیں۔“ اُس کی نگاہوں کے سحر سے وہ پگھلنے لگی۔

”تو اور پہن لینا \_\_\_ ویسے میں نے جان کر نہیں توڑیں۔“

”اونہہ \_\_\_ اور کہاں سے پہن لوں؟ اُس نے کوئی دکان تھوڑی کھول رکھی ہے۔“ وہ کلائی سہلانے لگی جس میں صرف تین چوڑیاں اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھیں۔ باقی سیڑھیوں پر بکھر کر دم توڑ چکی تھیں۔

”کیا چوڑیوں کے ساتھ دل بھی ٹوٹ گیا ہے؟“ وہ اس کے پلکیں اٹھانے پر سیدھا اُس کی خوشنما آنکھوں میں جھانکا۔

”خدا نہ کرے \_\_\_ دل کیوں ٹوٹنے لگا۔ بس ایسے ہی دکھ ہوا تھا۔“ وہ اُس کی مسکراتی آنکھوں سے شرما کر پیچھے ہو گئی۔ ”راستہ دیجئے \_\_\_ مجھے اوپر جانا ہے۔“

”تم وادی میں آکر تو بالکل بدل گئی ہو۔“ وہ اُس کا جملہ نظر انداز کرتے ہوئے گویا ہوا تو اُس نے حیرانگی سے آنکھیں جھپکیں۔

”کیا بدلی ہوں؟“

”پوری کی پوری۔“ اُس کی آنکھیں متبسم تھیں۔

”ہائے \_\_\_ نہیں تو۔“ وہ گھبرائی۔ ”میں تو وہی ہوں۔ ذرا بھی نہیں بدلی ہوں۔“

اُس کے اس انداز پر وہ خاصا محظوظ ہوا۔

”یہ بتاؤ تمہیں وادی کیسی لگی؟“ وہ ایک سیڑھی اتر کر اُس کے قریب آگیا۔

”ابھی آپ کی وادی کی سیر ہی کہاں کی ہے۔“ وہ ہولے سے مسکرائی۔

”جانتی ہو، میری شدید خواہش تھی کہ تمہیں اپنی وادی میں دیکھوں کہ تم کیسی لگتی ہو۔“

”تو پھر کیسی لگی؟“

”بہت پیاری \_\_\_ تصور سے زیادہ دلکش۔“ اُس کے لہجے میں محبتوں کے گھنگرولتے رنج رہے تھے اور آنکھیں التفات کا ایک خزانہ لٹا رہی تھیں۔ وہ بری طرح شرمائی۔

”آپ ایسے تو نہیں لگتے تھے اشمٰل!“ وہ اُس کی قربت سے گھبرا کر پیچھے ہٹ کر رینگ سے جا لگی۔ ”خاصے اکھڑ اور خشک مزاج لگتے تھے۔“

اُس کی بات پر وہ پُر زور انداز میں ہنسا تھا۔

”خوب۔۔۔ تمہارا کیا مطلب ہے ہر لڑکی سے اسی انداز میں بات کروں؟ پھر تمہیں ہی شکایت ہوتی ہے۔ ویسے اب اجازت دے دو تو میں تمام لڑکیوں سے اسی انداز میں بات کروں

گا جس طرح تم سے کرتا ہوں۔“

”ہر گز نہیں \_\_\_“ بے ساختہ جملہ اس کے لبوں سے پھسل گیا۔ پھر خود ہی جھینپ گئی۔

”اب آپ تشریف لے جائیں \_\_\_ کسی نے دیکھ لیا نا تو آپ کے ساتھ میری بھی عزت کا ستیاناس ہو جائے گا۔“

”تم واقعی بدل گئی ہو \_\_\_“ اُس نے منہ بنا کر اُسے دیکھا۔ ”نہیں ہٹتا \_\_\_ کیا کر لو گی تم؟“

”او فوہ \_\_\_ ممائی جان کا کام ہے نا، مجھے اوپر جانا ہے۔“

”تمہارے سارے راستے یہیں ختم ہوتے ہیں ہشمنہ ابرار صاحبہ!“ اُس نے اُسے چڑانے کے لئے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور مزید پھیل کر اُس کی راہیں مسدود کر دیں۔

...☆☆☆...

اشٹار احوالی میں ہی تھی اور اپنے کمرے میں تھی۔ تبھی زیبل اندر آئی۔

”ارے تم ابھی تک گئیں نہیں خان زادی؟“

”بھئی دوبارہ آئی ہوں۔ سنو ذرا، دیکھنا اس دراز میں سنہری بکس ہو گا۔ خدا جانے کہاں کھو گیا ہے۔ مل نہیں رہا ہے۔

اس میں میری جیولری ہے جو آج پہننی ہے۔“

”آج پہننا ضروری ہے کیا؟“ زیبل ہنسی۔

”بالکل۔“

”بغیر زیورات کے بھی غضب ڈھا رہی ہو خان زادی!“ زیبل اُس کے سراپا کو دیکھ کر بے حد سچائی سے بولی تو وہ شرما گئی۔

”باتیں بنانا تو کوئی تجھ سے سیکھے۔ اچھا سنو \_\_\_ بکس مل جائے تو تم معمور جان کے ساتھ بھیج دینا۔ میں چلتی ہوں۔“ وہ چادر اوڑھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور پھر کچھ سوچ کر شاہ خانم کے کمرے کی طرف بڑھی کہ ٹھٹک جانا پڑا۔ اندر بابا خان موجود تھے اور شاہ خانم ان سے باتوں میں مصروف تھیں۔

”بس میں کہہ دیتی ہوں، اشمٰل اب کے آیا ہے، میں اس سے ضرورت کر لوں گی۔ سحر گل بہت اچھی لڑکی ہے۔

بھلا وہ کیوں نکرانہ کرے گا؟“

”ہاں۔۔۔ اگر اُسے انکار نہ ہوگا تو پھر مجھے کیا حرج ہے۔“ بابا خان واسکٹ پہنتے ہوئے لاپرواہی سے بولے۔

”بس تو پھر میں کل اشمل سے بات کر لوں گی۔ میں جانتی ہوں اُسے، شاندانہ کی شادی کے دوسرے تیسرے دن ہی بھاگ لے گا شہر۔“

”بھئی میرا تو اب بھی یہی کہنا ہے کہ اسے پہلے پڑھ لینے دو۔ آخر تمہیں اتنی جلدی کیا ہے؟“

”تو کون سا پکڑ کر اس کی شادی کر رہی ہوں۔ صرف سحر گل کو اس کے نام کی انگوٹھی ہی تو پہنانی ہے مجھے۔“

”اچھا بابا! ابھی تو چلنے کی تیاری کرو گل کے گھر۔ بات بھی آنے والی ہوگی۔ دوسرے گائوں سے آرہی ہے۔ جلدی آئے گی۔“

اشٹارا گھبرا کر دروازے سے ہٹ گئی۔ مارے مسرت کے اس کا چہرہ متمنا لگا۔

”تو شان کی شادی کے بعد اشمل لالہ کی منگنی کی رونق ہوگی۔ ہائے، کتنا مزہ آئے گا۔ اشمل لالہ بھلا کیوں انکار کریں گے؟“

وہ خوشی سے مہکتے چہکتے دل کو سنبھالتی راہداری عبور کر گئی۔ تب زیبل اُسے نظر آئی۔ اُس کے ہاتھ میں سنہری بکس تھا۔

”لو۔۔۔ تم گئی نہیں۔ چلو اچھا ہے، تمہارا بکس مل گیا۔“ اس نے مسکرا کر اس کے ہاتھوں سے سنہری بکس لے لیا۔

”زیبے! اب ہمارے گھر میں ڈھیر ساری رونقیں اُتریں گی۔“ وہ دُور مسرت سے چہکتے دل کے ساتھ بولی اور بکس اٹھا کر پلٹ کر بھاگ لی۔ زیبل حیرانگی سے اُسے یوں بھاگتا دیکھتی رہی۔ اشٹارا کو تو جیسے یہ بوجھ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

وہ جلد از جلد اشمل خان کو ڈھونڈ کر اُسے بتا دینا چاہتی تھی۔

”اتنی دیر لگا دی تُو نے۔“ شاندانہ اُسے اندر آتے دیکھ کر بگڑی۔

”ہشیمینہ کہاں ہے؟“ اشٹارا نے اُسے کمرے میں تنہا دیکھ کر پوچھا۔

”وہ تو نہ جانے کہاں دفع ہو گئی ہے۔ اور تُو بھی حویلی میں چپک کر رہ گئی۔“ شاندانہ یہ کہہ کر رونے لگی۔ اشٹارا گھبرا گئی۔ وہ جانتی تھی اس کے رونے کی وجہ۔ اب اُسے بات بات پر رونا آ رہا تھا۔

”دیکھو شان! ہشیمینہ تمہیں بہت مارے گی اگر اب تم روئیں تو۔“ اشٹارا نے اُس کی طرف پانی کا گلاس بڑھایا۔ اسی وقت گل بی بی اندر آئیں۔

”اشٹارا! آگئیں تم؟“

”جی گل بی بی!“

”ارے دیکھنا بیٹی! یہ ہشیمینہ نہ جانے کدھر رہ گئی ہے۔ اُسے میں نے اوپر کمرے سے بکس لینے بھیجا تھا۔“

”میں دیکھتی ہوں گل بی بی! آپ پریشان نہ ہوں۔“ اشٹارا انہیں متفکر سی دیکھ کر جلدی سے بولی۔

اُن کے چہرے پر جیسے برسوں کی تھکن سمٹ آئی تھی۔ اُن کی نگاہیں شاندانہ پر اُٹھیں تو ڈبڈبائیں۔ وہ رُکی نہیں اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

اشٹارا اُس کے حکم کی بجا آوری کے لئے تیزی سے کمرے سے باہر نکل کر سیڑھیوں کی طرف بڑھی مگر اس کی آنکھیں اور قدم جیسے ساکن ہو گئے۔ وہ ستون کے پیچھے ہی رہ گئی۔

ہشیمینہ کا گلابی چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اشمل خان کی آنکھوں میں محبت کا ایک بیش بہا خزانہ تھا۔

”اشمل! بھابی آئی ہیں۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“ ہشتمینہ کہہ رہی تھی۔

”ہوں۔۔۔ غالباً میں اُن سے مل چکا ہوں۔“

”ہاں۔۔۔ مگر اس وقت جب آپ کا اور میرا جھگڑا چل رہا تھا۔“

”اور اب کیا چل رہا ہے؟“ اشمل کے جملے پر وہ لونوں تک سرخ ہو گئی۔

”آپ مجھے باتوں میں اُلجھا رہے ہیں۔ ہٹئے، اب مجھے اوپر جانے دیں۔“ وہ اُس کی باتوں سے سخت ڈسٹرب ہو رہی تھی۔ پھر اچانک وہ اُسے دھکیل کر اوپر سیڑھیاں پھلانگ گئی اور اشمیل مسکرا کر اسیڑھیاں اتر گیا۔

اشتراک جلدی سے پوری طرح ستون کی آڑ میں ہو گئی۔

اُس کی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔

اُس نے جو دیکھا اس پر اُس کی آنکھیں یقین کرنے کو تیار نہ تھیں۔ اور وہ کتنے ہی لمحے خالی الذہن اپنی جگہ پر ایستادہ رہی۔

وہ تو اشمٰل کو یہ خوش خبری سنا نے آرہی تھی کہ شاہ خانم سحر گل کو جلد از جلد بہو بنا کر حویلی میں لانا چاہ رہی تھیں۔ مگر اب یہ خوشخبری نہ رہی تھی۔ بس خبر دینا تھی جو یقیناً اشمٰل کے لئے پریشان کن خبر ہوتی۔

”آپ نے چپکے چپکے اپنے لئے لڑکی بھی پسند کر لی اشمئل لالہ!“ بے ساختہ اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُسے ہشمنینہ پہلی نظر میں ہی بہت پسند آئی تھی۔ اور وہ تھی بھی پسند کے قابل۔ اس نے سوچا کہ سحر گل نہ سہی، ہشمنینہ ہی سہی۔ گل بی بی کی نند کی بیٹی جو سحر گل سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی اور سب سے بڑی بات اشمئل لالہ کی پسند تھی اور اُسے تو بس اشمئل کی پسند اور خوشی عزیز تھی۔

... ☆ ☆ ☆ ...

اس مانوس آواز نے اُسے پھر اندر باہر سے بکھیر دیا تھا۔ اُس نے اپنا کان پتا لہجہ سنبھالا۔

”ہاں۔۔۔ میں ماہ گل بول رہی ہوں۔“

”میں نے کب نہیں پہچانا؟ \_\_\_\_\_ یہ آواز تو لا کھوں آوازوں میں پہچان سکتا ہوں۔“ مسعود شاہ کی مدھم آواز ابھری۔

”شمار دہتر ہی تھی کہ ——— تم وادی گئی تھیں۔ میں نے کئی بار تمہیں رِنگ کیا تھا۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ خود کو تمام تر اذیت ناک سوچوں سے چھٹکارا دلانے کے لئے۔“ اُس نے دھیرے سے کہا۔

”تو ملا چھڑکارا \_\_\_\_\_؟“ مسعود شاہ کے لہجے میں ہلکی کاٹ تھی۔ وہ تڑپ اٹھی۔

“مسعود،”

”ماہی! تمہارے اور میرے دُکھوں کا واحد مددگار یہی ہے کہ بس تم آجاؤ اس گھر میں جو تمہارا اور میرا ہے۔ جہاں کا آنگن تمہارے بن سونا ہے۔“

”سُونا تو پہلے بھی تھا مسعود۔ اب تمہیں یہ تنہائی۔۔۔۔۔“

”ماہ گل\_\_\_\_“ مسعود نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی۔ ”تم جانتی ہو اچھی طرح کہ میں نے صرف بھائی ہونے کا حق نبھایا ہے۔ اس میں تم کتنے نقصان میں رہیں، میں جانتا ہوں۔ مگر ماہی! میں خود غرض انسان نہیں بننا چاہتا تھا۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ اس میں سراسر ظلم تم پر ہی ہوا ہے؟\_\_\_\_ یہ سال کانٹوں پر صرف تم نے ہی بسر نہیں کئے ماہی! میں نے بھی۔۔۔۔۔ میں نے بھی بہت دُکھ سہے ہیں۔ سات سال ایک مرد کے لئے بہت ہوتے ہیں کہ وہ اپنی بیوی اور بیٹے سے جدا رہے۔ مگر مجھے ان سات سالوں کے دُکھ کا پچھتاوا نہیں ہے۔ میں سر خر و ہوں\_\_\_\_



میں اب اعتماد کے ساتھ اپنی بہن کا سامنا کر سکتا ہوں۔“ اُس کا لہجہ بے حد تیز تھا۔ وہ اپنے دل سے اٹھنے والی درد کی لہروں کو برداشت کرتے ہوئے بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔ ”اب صرف اور صرف تمہاری انا تمہیں مجھ سے بدظن کر رہی ہے۔ یہ یاد رکھو ماہ گل! کہ محبت اور انا میں ہمیشہ پرچم انا کا سر بلند رہا ہے۔ انا نے ہمیشہ محبتوں کے گھر منہدم کئے ہیں۔“

”مسعود شاہ! میں محبت کی ایسی مسخ شدہ صورت نہیں چاہتی۔ مجھے تو اُجلی اُجلی، نکھری نکھری محبت کی ضرورت تھی۔“ اُس کا لہجہ رندھ گیا۔ ایک بار پھر سرکش آنسو لڑیوں کی صورت ٹوٹ ٹوٹ کر بہہ رہے تھے۔

”ماہ گل! ہماری محبت مسخ نہیں ہو گئی۔ تم غور کرو، یہ اور بھی نکھر آئی ہے۔ تم نے دیکھا ہے برسات سے پہلے کتنی دُھند چھا جاتی ہے۔ کچھ بھی صاف نہیں دکھائی دیتا۔ اور پھر بارش ہوتی ہے

بہت تیز تو بہت کچھ اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔ جب بارش رکتی ہے تو مطلع کتنا صاف ہو جاتا ہے۔ ہر شے دُھل کر نکھر آتی ہے۔ اُجلی اُجلی اور نور نور روشنی ہو جاتی ہے۔ ہاں ماہی! اب ہماری محبت بھی دکھوں کی بارش میں دُھل کر اور بھی نکھر آئی ہے۔ تم دیکھو۔۔۔۔۔ سوچو۔۔۔۔۔ بہت اُجلا اُجلا ماحول ہو گیا ہے تمہارے اطراف۔ شاد کی مسکراہٹ، زمان کارویہ۔ کیا یہ خوبصورتی نہیں؟ کیا یہ خوش آئند بات نہیں؟“ اُس سے تو بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

لمحہ لمحہ اذیت میں گزرنے والے دنوں کے تصور سے چھٹکارے کی صورت کو وہ محسوس کر رہی تھی۔

”ماہی! اب میں کوئی لمحہ بھی گنونا نہیں چاہتا۔ اب میں سارے پل، سارے لمحے سمیٹ لینا چاہتا ہوں۔ ساری خوشیاں، ساری مسکراہٹیں بڑھ کر اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ ان پر ہمارا پورا حق ہے۔ ہاں ماہی! اب اس کائنات کی ایک ایک خوشی، ایک ایک مسرت پر ہمارا حق ہے۔ کچھ بولو ماہی!“ اُس نے بے حد

بھاری آواز میں اُسے پکارا۔

”کک۔۔۔۔۔ کیا بولوں۔۔۔۔۔ مسعود!۔۔۔۔۔“ وہ بمشکل اتنا کہہ پائی۔ حلق میں آنسوؤں کا گولا سا پھنس گیا۔

”تم ان سات برسوں میں بہت روئی ہو ماہی! میں نے تمہیں صرف آنسو ہی دیے ہیں۔ مگر اب ان آنکھوں میں صرف مسکراہٹیں بھر دوں گا ماہی! مجھے معاف کر دو۔“

”مسعود! نہیں۔۔۔۔۔ نہیں مسعود۔۔۔۔۔!“ وہ اور بھی زور سے رونے لگی۔ ”تم کیوں معافی مانگ رہے ہو؟“ اُس کے دل میں جیسے خنجر سا اتر گیا۔

اُس کا محبوب۔۔۔۔۔ اُس کا شوہر۔۔۔۔۔ اُسے اب بھی اسی طرح عزیز تھا۔ اُس کی ذات اُس کی سوچوں میں اب بھی اسی انداز میں تلاطم پیدا کر دیتی تھی۔

اس کا تصور اب بھی اس کی دھڑکنوں کو منتشر کر دیتا تھا۔ وہ اس کے خیال سے کٹ کر جی نہیں سکتی تھی۔ وہ خود جانتی تھی۔ ان سات برسوں میں جو فاصلے آگئے تھے، ہجر کا جو پتہ موسم آٹھرا تھا۔ اُس کے گزر جانے کے لئے اُس نے اپنے رب سے بہت سی دعائیں مانگی تھیں۔

اور اب اُس کی دعاؤں نے شرف قبولیت پالیا تھا تو وہ خوش تھی۔ بے انتہا خوش۔

ایک دکھ تھا۔۔۔۔۔ رنج تھا اور ایک انا جو اُسے بے چین کر رہی تھی۔ مگر آج مسعود شاہ کی وہی آواز جو اُس کے دل میں گھنگرے سے بجا جاتی، وہ آواز سن کر وہ بے قرار ہو گئی تھی۔

وہ انا کے تخت سے نیچے اتر آئی۔

وہ عورت تھی اور عورت ہی رہنا چاہتی تھی۔ اپنے محبوب، اپنے مجازی خدا کے خوبصورت لفظوں پر قربان ہونا چاہتی تھی اور وہ قربان ہو گئی۔

”ماہی! میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔“ مسعود شاہ نے فیصلہ سنا دیا۔ ”بس تم تیار ہو جاؤ۔ اور ہاں، مسکرا کر میرا استقبال کرنا۔“ ماضی کی کوئی گرد ہمارے حال میں نہ آنے پائے۔“

اُس نے کچھ بھی نہ کہا۔ اور جب ریسپورر رکھا تو جیسے دل کی ساری تھکن اُسوئوں میں بہہ گئی تھی۔

ہر رنج، ہر اندیشہ اس سیلاب میں بہہ گیا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت تھی جو اس کے پیروں کے سارے زخموں پر جیسے مرہم رکھ رہی تھی۔ بھگے بھگے چہرے پر چاندنی اتر آئی۔

وہ ایک گہری سانس لے کر پلیٹ تو سحر گل دروازے میں ایستادہ تھی۔

...☆☆☆...

شاندانہ کے آنسو تھم نہ پا رہے تھے۔ جیسے ایک سمندر اُتر آیا تھا اُس کی آنکھوں میں۔ ہشمنہ نے نفاست سے میک اپ کیا تھا، وہ سارا دھل گیا تھا ہشمنہ چیخ اٹھی۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہ کیا پاگل پن ہے شان!“ وہ اپنی محنت یوں ضائع جانے پر تڑپ گئی۔

”کیا اس حلیے میں جانو گی؟“ شہباز لالہ تو ڈر جائیں گے۔“ مہک نے شرارت سے کہا۔

”بس اسی طرح جانوں گی۔“ قبول کریں تو کریں۔“ اُس کی بچی بندھ گئی۔

”تین بار قبول کر چکے ہیں۔ اب مجال ہے جو کر پائیں۔ ادھر آؤ اب۔“ ہشمنہ نے اُسے کھینچ کر دوبارہ کرسی پر بٹخ دیا اور میک اپ کرنے لگی۔ وہ نہ نہ کرتی رہی مگر ہشمنہ کے سامنے ایک نہ چلی۔ اس نے اب کی بار ہلکا ہلکا میک اپ کیا تھا

سرخ کامدار پشتواز میں ہلکے میک اپ میں وہ روئی روئی، مضحک، بے پناہ دلکش لگ رہی تھی۔

اشٹار اپنے آنسو روکتی اُس کے قریب آئی اور اُس سے لپٹ کر بے آواز رودی۔ سب کے چہرے غمگیں تھے اور دل بو جھل ہو رہے تھے۔

گل بی بی کو تو ہشمنہ کی امی نے بمشکل سنبھالا تھا۔

بارات چونکہ دوسرے گائوں سے آئی تھی اس لئے شام ہی کو روانہ ہو جانا تھا۔ اس لئے شاندانہ کی رخصتی جلدی کر دی تھی۔ وہ چلی گئی۔ سب کو اُداس اور ملول کر کے۔

اتنے لوگوں کی موجودگی کے باوجود گھر جیسے بھائیں بھائیں کرنے لگا۔

گل بی بی کمرے میں بند ابھی تک اشک بہا رہی تھیں۔ اشٹار کو ہشمنہ نے زبردستی روک لیا تھا۔ شاندانہ کے جانے کے بعد وہ خود بھی بے کل سی ہو گئی تھی۔ اور خود اشٹار ابھی گل بی بی کی حالت دیکھ کر رُک گئی تھی۔

ذولین، اشمل کے ہمراہ حویلی کی طرف آگیا۔ شاندانہ کی رخصتی اور گل بی بی کی دل گرفتہ حالت نے دونوں پر اثر ڈالا تھا۔ دونوں کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

”یہ شان کو دیکھو، سب کو رُلا گئی۔“ آدھار استہ طے ہوا تو اشمل دھیرے سے بولا۔

”گل بی بی بہت اپ سیٹ ہو گئی ہیں۔“

”ہوں۔“ ذولین چونکا۔ ”تمہارے اب کیا ارادے ہیں۔“ کتنے دن ہو یہاں پر؟“ اُس نے رُخ اشمل کی طرف کر لیا۔

”پرسوں جا رہا ہوں۔ آج صبح ڈی ایس پی منظور احمد سے بات ہوئی تھی فون پر۔“

”اچھا۔ کیا بات ہوئی؟“

”ریحان پر اچہ روپوش ہو گیا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے اس بار شاہنواز پر اچہ کے ہاتھ پیر ڈھیلے ہیں۔“ ذولین نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔۔۔ اب کی بار ریحان کو میں سلاخوں کے پیچھے ڈال کر رہوں گا۔ وہ قاتل ہے اور اس کی سزا بہر کیف عمر قید یا پھانسی ہے۔ وہ بھاگ کر کہاں جائے گا۔۔۔ اس زمین اور اس آسمان کے نیچے ہی ہو گا۔“ اشمیل کا چہرہ تن گیا۔ ذولین نے اُسے دیکھا۔

”ڈی ایس پی اچھا آدمی ہے۔“

”ہاں۔۔۔ بے حد تعاون کر رہا ہے۔ خاصا محنتی بھی ہے۔ ریحان کو پولیس ڈھونڈ رہی ہے۔ وہ اپنے کسی فلیٹ میں منتقل ہو گیا تھا۔ مگر اب وہاں سے بھی فرار ہو گیا ہے۔“ اشمیل اُسے تفصیل بتا رہا تھا جو ڈی ایس پی منظور احمد نے اُسے دی تھی۔ وہ ایک ایک پل کی خبر رکھنا چاہتا تھا۔ اس بار وہ ریحان پر اچہ کو ہر حالت میں اس کے انجام تک پہنچانا چاہتا تھا۔

جیپ حویلی کے پورچ میں رک گئی۔ وہ دونوں نیچے اتر آئے۔

”اچھا پھر۔۔۔ خدا حافظ۔ اور ہاں، پرسوں مجھ سے ضرور مل کر جاننا۔“ ذولین نے اشمیل سے کہا اور پھر انکیسی کی طرف بڑھ گیا۔

اشمیل اپنی جگہ ایستادہ اُسے دیکھتا رہا۔

اُس کا اپنا خون، اُس کا عم زاد، اُس کا بھائی۔۔۔ مگر یہ درمیان کیسی دیواریں کھڑی تھیں؟ اُس کے قدم انکیسی کی جانب اٹھ رہے تھے۔ اشمیل کے دل میں دھواں سا بھر گیا۔

”تم بہت مضبوط ہو ذولین!۔۔۔ بہت مضبوط۔“

وہ اچانک پلٹا اور اشمیل کو اپنی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتا پا کر مسکرایا اور ہاتھ ہلا دیا۔ اشمیل بھی مسکرا دیا اور پھر رہائشی حصے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ اندر آیا تو شاہ خانم بڑے کمرے میں تھیں۔ وہ خود بھی ابھی گل بی بی کے گھر سے واپس آئی تھیں۔ بھاری کپڑوں اور قیمتی زیورات میں ملبوس تھیں۔ اشمیل کو دیکھ کر وہ اپنے کمرے سے باہر آ گئیں۔

”مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

”مجھ سے۔۔۔۔۔؟“ وہ رک گیا۔ ”اس وقت تو میں بہت تھک گیا ہوں شاہ خانم! کیا بہت ضروری ہیں؟“ اس کے چہرے پر تھکن کے واضح رنگ پھیلے ہوئے تھے۔

”میری باتیں تمہاری تھکن میں اضافہ ہر گز نہیں کریں گی۔“ شاہ خانم مسکرا نے لگیں۔

”اچھا۔۔۔ تو پھر ضرور کیجئے۔“

”ادھر آؤ، میرے کمرے میں۔“

”نہیں۔۔۔ میرا خیال ہے آپ میرے کمرے میں آجائیے۔“ اُس نے کہا تو شاہ خانم نے زیادہ تردد نہیں کیا اور اس کے ہمراہ اس کے کمرے میں آ گئیں۔

صوفے پر بیٹھ کر اشمیل نے پیروں سے اپنے وزنی پشاوری چپل اُتارے۔ اتنی دیر میں شاہ خانم اُس کے وسیع بیڈ کے

کنارے اُس کے بالکل سامنے بیٹھتے ہوئے کچھ سوچنے لگیں۔

”کیا کوئی پر اہلم ہے؟“ اُس نے جوتوں کو پیروں سے صوفے کے نیچے دھکیلتے ہوئے شاہ خانم کے چہرے کو بغور دیکھا۔

”آں \_\_\_ تم کب واپس جانے کا سوچ رہے ہو؟“ انہوں نے اُس کا جملہ سنا ہی نہیں یا پھر نظر انداز کر دیا۔

”پرسوں جا رہا ہوں \_\_\_ اگر آپ کہیں تو ایک دن اور رہ لوں؟“ اُس نے انہیں چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

”نہیں \_\_\_ اب اکٹھے ہی آنا۔“ وہ بغیر برمانے بولیں۔ پھر ایک گہری طویل سانس سینے کی تہہ سے آزاد کرتے ہوئے بولیں۔

”میں چاہتی ہوں کہ کم از کم تمہاری منگنی کر دوں۔“ انہوں نے اپنا اصل مدعا بیان کیا۔ ”بات ابھی طے ہو جائے۔ پھر جب تمہاری پڑھائی مکمل ہو جائے گی، شادی کر دوں گی۔ بس اب کوئی خوشی ہو گھر میں۔“ وہ بیڈ کے کنارے سے اٹھ کر سٹلنے لگیں۔

اشمل خان کا اٹھا ہوا سر اسی زاویے پر رہ گیا،

”تمہارا کیا خیال ہے اس بارے میں؟“

”آپ فی الحال میری فکر چھوڑیں اور اشتاراکے بارے میں سوچئے۔“ اُس نے بے حد خوبصورتی سے بات گھمانے کی سعی کی۔ شاہ خانم نے اُسے دیکھا۔

”اشتاراکا ذکر کہاں سے آگیا؟“

”اشتاراکا ذکر ہی ہونا چاہئے۔ پہلے بہن رخصت ہونی چاہئے۔ اس کی فکر کرنی چاہئے۔“ وہ صوفے سے کھڑا ہو گیا۔ وہ

ہر ممکن طریقے سے اپنی ذات کو اس موضوع سے بچانا چاہ رہا تھا۔

اُس کی پسند ہشمنہ ابرار تھی۔ اور وہ اس طرح کا کوئی ذکر کر کے اس معاملے کو سنگین نہیں بنانا چاہتا تھا۔

”اشتاراکا کیا ہے \_\_\_ وہ تو بیٹی ہے۔ کون سا اُس کی رضامندی لینی ہے۔“ شاہ خانم بولیں۔

”تو بھئی پھر اُسے فٹافٹ رخصت کرنے کی تیاریاں کیجئے۔“ اس نے ہلکی ہنسی کے ساتھ کہا۔

”تمہاری ممانی نے بات کی ہے مجھ سے اشتاراکے سلسلے میں۔“ شاہ خانم پھر بیڈ پر ٹک گئیں۔

اشمل کو جیسے کرنٹ سا لگا تھا۔

”ہاں، فروان کے سلسلے میں۔ گھر کا لڑکا ہے، دیکھا بھالا ہے۔ بس وہ لوگ تو میرے جواب کے منتظر ہیں۔“

”فروان اور اشتارا \_\_\_“ اشمل کو اپنی سماعت پر جیسے یقین نہ آ رہا تھا۔ ”آپ جانتی ہیں اشتار اور فروان کی عمروں میں کتنا فرق ہے اور \_\_\_“

”ہاں \_\_\_ ایک سال کا فرق ہے۔ وہ ایک سال چھوٹا ہے۔ بھلا کہیں سے لگتا ہے۔ کیسا اونچا لانا، گبھرو جوان ہے۔

اور پھر گھر کا لڑکا ہے۔“ شاہ خانم کے لہجے میں لاپرواہی تھی۔ ”تمہیں اشتاراکے سلسلے میں فکر کی ضرورت نہیں۔ یہ

بتاؤ مجھے کہ سحر گل کیسی لگتی ہے تمہیں؟ میں نے سوچا ہے اشتار اور فروان کے ساتھ تمہاری اور سحر گل کی بھی

منگنی کر دوں۔“ یہ کہتے ہوئے شاہ خانم کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”اب اس حویلی میں رونق ہونی

چاہئے \_\_\_ تم نے سحر کو دیکھا ہے نا؟“ انہوں نے پوچھا۔

اشمل کی سماعتوں پر بر چھبی سی لگی تھی۔

یہ شاہ خانم کیا کرنے چلی تھیں؟ \_\_\_ وہ مارے تحیر کے اپنی جگہ دم بخود سا رہ گیا۔



”تم نے بتایا نہیں، تمہیں سحر گل کیسی لگتی ہے؟“ بہت عرصہ ہو گیا ہے نا تم نے اُسے دیکھا نہیں ہے۔ اب دیکھو گے تو تمہیں یقینا پسند آئے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے وہ بہت اچھی لگتی ہے۔“

شاہ خانم کے لہجے میں سحر گل کے لئے مٹھاس کا دریا بہہ رہا تھا۔

اُس کی سمجھ میں فوری طور پر کچھ نہ آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ ذہن مأنوف ہو گیا تھا۔ کتنے ہی ثانیے وہ خالی خالی نظروں سے شاہ خانم کو تکتا رہا۔

یہ فیصلے صادر کرنے والی شاہ خانم اُس سے اجازت طلب کر رہی تھیں یا اپنے ارادوں سے باخبر کر رہی تھیں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ اُس کے خیالوں کے نرم پردوں پر ہشمنہ ابرار کا چہرہ چمکنے لگا۔ نہیں۔۔۔۔۔ وہ لاکھ شاہ خانم کی عزت کرتا ہے، اُن کا فرمانبردار ہے۔ مگر یہاں منافقت کا راستہ نہیں اپناتے گا۔

”میں جانتی ہوں، تمہیں بھلا کیا اعتراض ہو گا۔“ شاہ خانم کے لہجے میں یقین تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھیں تو وہ یک دم ہوش میں آگیا۔

”میں آپ کو اس سلسلے میں کسی طرح کا بھی جواب نہیں دے سکتا۔“ اُس کا لہجہ سپاٹ تھا جس میں نہ انکار تھا اور نہ اقرار۔

”کیا مطلب؟“ شاہ خانم نے حیرت زدہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ اُس نے خود کو بروقت سنبھال لیا تھا۔ اُس کے شہر جانے میں صرف ایک دن رہ گیا تھا اور وہ جاتے وقت کوئی بد مزگی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا نہ کسی طرح کا تنازعہ اٹھانا چاہتا تھا۔

یہ تو صرف شاہ خانم کی خواہش ہی تھی۔ کون سا وہ ابھی عملی قدم اٹھا رہی تھیں اُس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اُس نے بے حد تدبیر سے صورت حال کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

”آپ جانتی ہیں، کل میں واپس ہاسٹل جا رہا ہوں۔ اور میں ذہنی طور پر اس چیز کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں صرف اور صرف اپنی پڑھائی مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ شادی کے لئے تو ایک عمر پڑی ہے۔“ وہ ہنس دیا۔

”میں جانتی تھی تمہارا جواب اتنا ہی فضول ہو گا۔“ شاہ خانم کا چہرہ تن گیا۔ ”اور پھر میں کون سا ابھی تمہاری شادی کر رہی ہوں۔ صرف منگنی۔“

”شاہ خانم! کیا ضرورت ہے ابھی کسی لڑکی کو بے کار رشتے میں باندھ دینا۔ بھئی جب شادی ہی ابھی نہیں کرنی تو یہ منگنی، یہ زبان دے دینا سب بے کار، بے معنی باتیں ہیں۔ ہو سکتا ہے اس دوران سحر گل کے لئے کوئی مجھ سے بہتر رشتہ مل جائے۔“ اُس نے شگفتہ انداز اختیار کیا۔

شاہ خانم کی پیشانی پر ڈھیر سارے بل پھیل گئے۔

”کچھ غلط کہا میں نے؟“ وہ پلنگ پر ڈھیر ہو گیا۔

”نہیں۔۔۔ بہت ٹھیک کہا۔ تم باپ بیٹے تو ہر بات ہی درست کہتے ہو۔ غلط تو صرف میں سوچتی ہوں اور میں ہی بولتی ہوں۔“

”ارے، ارے۔۔۔ آپ تو خفا ہو گئیں۔“ وہ اٹھ کر ان کے قریب چلا آیا۔ پھر بیک سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ”میں شادی سے انکاری تو نہیں ہوں۔ بس کچھ مہلت مانگ رہا ہوں۔“

”تو پھر سحر گل اچھی تو ہے نا؟“

”یقیناً ہوگی۔۔۔ آپ اُسے بہتر جانتی ہوں گی۔“

شاہ خانم نے اُسے دیکھا۔ وہ اس وقت اس موضوع پر بالکل سنجیدہ ہونے کے موڈ میں نہیں تھا۔ تھکن اور آکتا ہٹ اُس

کی بھوری آنکھوں میں ہلکورے لے رہی تھی۔

”میرے خیال سے تم اس وقت آرام کر ہی لو۔“ انہوں نے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ پھر رُک گئیں اور پلٹ کر بولیں۔ ”مگر یہ بات تمہاری پڑھائی ختم ہونے تک کے لئے ملتوی نہیں ہوگی۔ ہاں، اب کی بار تم آؤ گے تو پھر بات ہوگی اور حتمی ہوگی۔“ وہ یہ کہہ کر سرعت سے پردہ اٹھا کر باہر نکل گئیں۔

وہ ایک گہری سانس لے کر دوبارہ اپنے وسیع بیڈ پر دراز ہو گیا۔ اُسے شاہ خانم کی اس سوچ نے پریشان کر دیا تھا۔

”سحر گل۔“

اُس نے اپنے ذہن پر زور دے کر سحر گل کا تصور جمایا۔ پُرکشش سی لڑکی تھی۔ ہنستی، شرارتی۔ وہ اُسے عزیز تھی خونی رشتے کے ناطے۔

”اُف، یہ شاہ خانم بھی کیا کرنے نکلی ہیں؟“ اُس نے سر جھٹک دیا اور آنکھیں موندیں تو ہشیمینہ کا دلکش سراپا اٹھہر اور دل جیسے ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی سے بھر گیا۔ سرخ شال میں گھبرائی گھبرائی وہ اُسے پہلی بار ڈھول بجاتی زور و شور سے شاندانہ کی شادی کے گیت گاتی کتنی مختلف لگی تھی۔ پھر وہ اُس سے ٹکرا گئی تھی اور ڈھیر ساری کانچ کی چوڑیاں ٹوٹ جانے پر کتنی خفا ہوئی تھی۔ مگر لمحہ بھر کے لئے۔

وہ آنکھیں موندے اُس کی رعنائیوں میں کھوتا جا رہا تھا۔

...☆☆☆...

شاندانہ کی شادی کے بعد گھر میں یکدم ہی جیسے سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ ایسے میں گل بی بی کا دل سخت بو جھل ہو رہا تھا۔ یہ تو ہشیمینہ کا دم غنیمت تھا اور اُس نے بھابی اور اشناس بھائی کو زبردستی روک لیا تھا۔ ساتھ ہی اُس نے اشتاراکو بھی روک لیا

تھا۔

”مجھے تمہاری ضرورت رہے گی نہ۔“

”کیوں؟“ اشتاراک نے اُسے شریر نظروں سے دیکھا۔

”بھئی اپنی وادی کی سیر نہیں کراؤ گی ہمیں؟“ اُس نے کہا تو اشتاراک نے سر ہلادیا اور پھر وہ اور بھابی، اشتاراک کے ہمراہ وادی کی سیر کو نکل آئیں۔

”لگتا ہے یہاں تو بارہ مہینے سردی ہی رہتی ہے۔“ شام کا وقت تھا۔ ہشیمینہ کو خنکی کا احساس ہوا۔ اُس نے شال اچھی طرح اپنے جسم پر پلپیٹ لی۔

”تم عادی نہیں ہونا، اس لئے تمہیں زیادہ سردی لگ رہی ہے۔ یہ موسم تو بہار کا ہے۔ اس موسم میں تو پوری فضا خوشبو سے بھر جاتی ہے اور ڈھیر سارے پھول کھلتے ہیں۔“

”دل کے؟“ بھابی نے شرارت سے پوچھا تو وہ ہنس دی۔

”دل کے پھول کھلنے کے لئے کسی موسم کی قید نہیں ہوتی۔ وہ تو جون جولائی کی گرمیوں میں بھی کھل اٹھتے ہیں۔“ ہشیمینہ اونچے اونچے پہاڑوں پر نگاہیں جمائے بولی۔

وہ تینوں ہلکی پھلکی گفتگو کرتی ہوئی، ماحول سے لطف اندوز ہوتیں ایک خوبصورت جگہ پر آ گئیں۔ یہ جگہ اونچے اونچے درختوں اور سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ سامنے پہاڑوں سے شور مچانا ہوا چشمہ بہہ کر مختلف پتھروں سے ٹکرا کر منقسم ہو جاتا اور ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار ارد گرد کے پھولوں کو نہلا دیتی۔

”یہاں کتنا حُسن ہے۔“ ہشیمینہ کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ بھابی بھی مسحور سی ہو گئیں۔

”آہ۔۔۔ ہم شہر والے اتنی بڑی نعمت سے محروم ہیں۔ تم تو بڑی خوش قسمت ہو اشترا!“ بھابی نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”آپ بھی یہیں رہ جائیں نا۔“ اشارے نے کہا تو ہشتمینہ بے ساختہ ہنس دی۔

”پھر شناس بھائی کا کیا ہوگا؟ اُن کا بیڑا غرق۔۔۔۔۔“

”ہشت\_\_\_ بد تمیز۔“ بھابی جھینپ گئیں اور آگے چلنے لگیں۔

”پھر ہشتمینہ! تم یہاں آ جاؤ ہمیشہ کے لئے۔“ اشارے نے پیار بھری مسکراہٹ کے ساتھ اُسے دیکھا تو وہ سٹیٹ گئی۔

”مم\_\_\_\_\_میں\_\_\_\_\_نہ، میں یہاں کیوں رہنے لگی؟“

”اب تو مجبوری ہے۔“ اُس کی ہنسی معنی خیز تھی۔ ہشمنہ نے پلکیں جھپک کر اُسے دیکھا۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ بھائی تو خاصی آگے نکل گئی تھیں۔

”اشمل لالہ کی خاطر تو رہنا پڑے گا نا۔ وہ تو وادی نہیں چھوڑ سکتے۔“ اُس نے اُس کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور ہشتمینہ بھونچکا سی رہ گئی۔

اشارہ کے اس واضح جملے نے اُسے کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔ ایک بیک اُس کے رخسار سرخ ہو گئے اور پلکوں پر منوں بوجھ آن گرا۔

”وہ میں تو“

”آں۔۔۔۔۔آں۔۔۔۔۔“ اشارانے ہاتھ اٹھا کر اُسے کچھ بولنے سے پہلے ہی روک دیا۔ ”جنابہ! مجھے ٹالنے کی کوشش مت کرنا۔ ویسے یہ اشمٰل لالہ بڑے چھپرے رستم نکلے۔ اور تم اس سے بھی زیادہ۔ میرے بارے میں تو سب

کچھ شائدانہ سے پوچھ لیا اور اپنا آپ اُس بیچاری سے بھی چھپا گئے۔“

ہشتمینہ کی پلکیں مارے خفت کے اُٹھ نہ رہی تھیں۔

اشتراکے سامنے سب کچھ کھل چکا تھا۔ وہ نہ جانے کب سے جانتی آئی تھی۔

”کیا اشمیل نے تمہیں۔۔۔۔۔ اُس نے بمشکل دل کو سنبھالتے ہوئے پوچھنا چاہا تو وہ زور سے ہنس دی۔

”میں نے کہانا، وہ تو بڑے چھپے رستم ہیں۔۔۔ بھنک تک نہیں لگنے دی مجھے۔ ویسے ہشمنہ! بالکل سچی سچی بتاؤ، تمہیں شامل لالہ کتنے اچھے لگے ہیں؟“ اُس نے پوچھا تو ہشمنہ کا چہرہ گرم ہو گیا۔ اُس کی پلکیں رخساروں پر کانپ کر رہ گئیں۔

کتنی شریر ہو رہی تھی اس وقت اشارا \_\_\_\_\_ راز جو جان گئی تھی

اشٹار اُس کی حالت سے خوب محفوظ ہو رہی تھی۔

”ارے تم دونوں وہیں اٹک گئیں۔“ بھابی نے پلٹ کر ان دونوں کو پکارا تو ہشمنہ پلٹ کر ان کی طرف بڑھ گئی۔ وہ اشتار کی شریر نگاہوں سے بے حد نروس ہو رہی تھی۔

”ہائے ہشمنہ! میں کیمرہ تو لانا ہی بھول گئی۔ تمہارے بیگ میں تو نہیں ہے کہیں؟“ بھابی اپنا بیگ سٹول کر بولیں۔

”نہیں۔۔۔ میرے پاس تو نہیں ہے۔ آپ نے نکال کے تو رکھا تھا۔“

”ہاں، شاید وہیں میز پر رکھا رہ گیا۔ ٹھہرو \_\_\_\_\_ میں ابھی جا کر لے آتی ہوں۔“

”ہائیں۔۔۔ واپس جائیں گی آپ؟“ ہشتمینہ نے انہیں دیکھا۔

”ہاں، تو کیا ہوا۔ زیادہ دُور تو نہیں ہے۔ کیوں اشتارا! سامنے ہی سے آئے ہیں نا؟“

”ہاں۔۔۔ سامنے اُس پہاڑی سے اتر کر دائیں طرف ہی تو گھر ہے۔“ اشتارا نے کہا تو وہ خوش ہو گئیں۔

”اتنی حسین جگہ کی تصویر میں نہ لوں گی تو تا عمر افسوس رہے گا۔“ وہ بھاگیں اور ہشیمینہ اُن کی دیوانگی پر مسکرا کر رہ گئی۔

بھابی کے جانے کے بعد دونوں نے زیادہ آگے جانا مناسب نہ سمجھا اور قریبی پتھر پر بیٹھ گئیں۔

”تم نے بتایا نہیں؟“ اشتارا نے اُسے دیکھا۔

”کیا؟“

”یہی کہ اشل لالہ تمہیں کتنے اچھے لگتے ہیں؟“ اُس کی شوخی پھر عود کر آئی تو ہشیمینہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے اُسے دیکھا۔

”بتاؤں؟“

”ہاں بتاؤ۔“

”اتنا جتنا تمہیں ذولین خان اچھا لگتا ہے۔“ اُس کا جملہ بالکل غیر متوقع تھا۔ اشتارا ساکت رہ گئی۔ سنہری آنکھوں پر سایہ فگن پلکیں جھک گئیں۔

”ہا، ہا، ہا۔۔۔ اب بتاؤ کہ تمہیں ذولین کتنا اچھا لگتا ہے؟“ ہشیمینہ اُس کی ساری شوخی کو شرم میں بدلتے دیکھ کر ہنسنے لگی۔

”بہت بری ہو تم۔“ وہ خفیف ہو گئی۔

”ارے واہ۔۔۔ میں بری ہو گئی۔ میں نے تو صرف یہی پوچھا ہے جو تم مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔“

اشتارا نے بس لمحہ بھر دیکھا اور پھر جھینپ کر پلکوں کی باڑھ دوبارہ گرائی۔

اسی دم دونوں کی نگاہیں چھوٹی سڑک کی جانب اٹھ گئیں جہاں سیاہ جیپ فرائے بھرتی اسی طرف آرہی تھی۔

”اشمل لالہ کی جیپ ہے یہ تو۔“ اشتارا ایک دم کھڑی ہو گئی۔ ”لگتا ہے انہیں علم ہو گیا ہے کہ ان کے بارے میں ہم باتیں کر رہے ہیں۔“ وہ ہنسی۔ پھر ہشیمینہ کو دیکھ کر بولی۔ ”وہ ادھر ہی آرہے ہیں، شاید تمہارا پیچھا کرتے ہوئے۔ گل بی بی کے گھر جو تم نہیں ملی ہو گی۔“ اُس کی بات پر ہشیمینہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

اشتارا کا اندازہ درست تھا۔ جیپ سامنے رک گئی تھی اور اس میں سے اشمل خان اتر رہا تھا۔

اُس کی کیفیت عجیب سی ہونے لگی۔ نہ جانے کیوں وادی میں ہر بار اُس کا سامنا کرنے پر اُس کی کیفیت ایسی ہی ہو جاتی۔ شاید رومان پرور ماحول کا اثر ہوتا تھا یا پھر اشمل خان کی بھوری آنکھوں میں ہلکورے لیتے رنگ میں ہی قیامت جھلکتی تھی۔ اُس کا دل پسلیوں میں بے قرار ہو کر مچل اٹھتا۔

لبوں کی معنی خیز مسکراہٹ اُس کی رگوں میں مچلتے خون میں طوفان مچا دیتی۔ اُسے اشمل سے بے طرح شرم آنے لگتی۔

وہ ان دونوں کے قریب آچکا تھا۔

سیاہ سوٹ اور سرخ شال میں وہ جھینپی جھینپی اپنے دل کی حالت کو سنبھالنے میں سرخ ہو رہی تھی۔ اُس کے لبوں پر وہی دل موہ لینے والی مسکراہٹ بکھر گئی۔ ہشیمینہ نے جلدی سے رخ موڑ لیا۔

”یہ تم کہاں کہاں گھومتی پھر رہی ہو؟“ وہ اُسے نظر انداز کرتا اشتارا سے مخاطب ہوا جو ہشیمینہ کی حالت سے خوب



محفوظ ہو کر دل ہی دل میں ہنس رہی تھی۔

”مہمانوں کو اپنے علاقے کی سیر کر رہی تھی۔ آپ نہیں جانتے انہیں، یہ گل بی بی کی خاص الخاص مہمان ہیں۔“ اُس نے یہ کہتے ہوئے ہشمنہ کی پشت کی طرف دیکھا۔ سرخ شال کے نیچے سے اُس کی لابی چوٹی نظر آرہی تھی۔

”اچھا۔۔۔ مگر گل بی بی کے تو سارے اہم اہم مہمان جاچکے ہیں۔ پھر یہ کیوں نہیں گئیں؟“ وہ لاپرواہی سے بولا تو اشارے کے لبوں پر مسکراہٹ چھلک آئی۔

”میں نے کہا نا، یہ خاص الخاص ہیں۔ ارے ہشمنہ! ملونا شامل لالہ سے۔“ اُس نے بالکل اچانک اُس کا ہاتھ پکڑ کر رخ شامل کی جانب موڑ دیا۔ یہ جملہ بالکل غیر متوقع اور اچانک تھا۔ ہشمنہ سٹپٹ گئی۔

”اچھا۔۔۔ تو یہ ہیں گل بی بی کی خاص مہمان۔“ اُس نے لبوں کا ایک گوشہ دانتوں میں دبا کر اُسے دیکھا۔

”جی۔۔۔ یہ یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں آپ کی۔“

”پڑھتی ہیں یا پڑھتی تھیں؟“ شامل کے منہ سے بے ساختہ جملہ پھسلا تھا۔

”تو آپ جانتے ہیں انہیں؟“ اشارے نے حیرانگی ظاہر کی تو شامل گر بڑا گیا۔

”مم۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ نہیں بھئی، میں انہیں کیسے جان سکتا ہوں؟“

”تو اب جان لیجئے نا۔ ویسے لالہ! وادی کے لوگ جھوٹ بولتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔“ وہ اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی۔

پھر اچانک بولی۔ ”میں بھابی کو دیکھتی ہوں۔ نہ جانے وہ کہاں رہ گئی ہیں۔“ وہ پلٹ کر بھاگی۔ شامل اُس کے یوں بھاگنے پر حیران رہ گیا۔ ہشمنہ سمجھ گئی اس نے جان بوجھ کر ان دونوں کو بات کرنے کا موقع دیا ہے۔

وہ دونوں چند ثانیے ایک دوسرے کے مقابل خاموش کھڑے رہے۔ پھر شامل خان دھیرے سے بولا۔

”یہ تم عورتیں کوئی راز، راز ہی نہیں رکھ سکتیں۔“

”کیا۔۔۔۔۔ آپ کا مطلب ہے اسے میں نے کچھ بتایا ہے؟“ ہشمنہ نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔

”میرا تو یہی خیال ہے۔“ اُس نے شانے اُچکائے تو ہشمنہ کا چہرہ تپ اٹھا۔

”آپ کا خیال غلط ہے۔ وہ آپ کی بہن ہے۔ اور ظاہر ہے آپ کی جانب سے ہی اُسے۔۔۔۔۔“ اُس نے بادل خواستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور لب بھینچ لئے۔

اشمل نے اُسے دیکھا وہ خفا سی ہو رہی تھی۔

”ویسے کہتے ہیں لوگ کہ عشق اور مشک چھپ نہیں سکتا۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔“ اُس نے اپنی سرمئی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اُسے بغور دیکھا۔ ”میں آج جا رہا ہوں واپس۔“

”اتنی جلدی؟“ وہ بے ساختہ بول اٹھی۔ پھر جھینپ گئی۔ ”مم۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔۔۔“

”تو کیا تمہارا واپس شہر جانے کا ارادہ نہیں ہے؟“ اُس نے اُس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے پوچھا تو وہ پلکیں اٹھا کر اُسے دیکھنے لگی اور ہولے سے مسکرا دی۔

”سچ کہوں شامل! اتنا حسن، اتنا خلوص اور اتنے پیارے لوگوں کے درمیان سے جانے کو دل نہیں چاہتا۔“ اُس نے سچائی کے ساتھ کہا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے گل بی بی، شاندا نہ، اشار اسب کے چہرے بنتے اور مٹتے گئے۔

”اس کا مطلب ہے اب جلد کچھ انتظام کرنا ہو گا۔“ وہ ہنسا۔

”اوہ، نہیں۔۔۔۔۔ میرا مطلب یہ تو نہیں تھا۔“ وہ گر بڑا گئی۔

”آج کل شاہ خانم میری شادی کے لئے بے تاب ہو رہی ہیں۔“ اُس نے قدرے توقف کے بعد لاپرواہی سے انداز میں

اُسے اطلاع دی۔

”تو پھر کر لیں \_\_\_ کس نے روکا ہے؟“ وہ پلٹ کر آگے چلنے لگی۔

”جانتی ہوا نہوں نے لڑکی بھی پسند کر لی ہے۔“ وہ اس کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ رک گئی۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑکا۔

”سحر گل اچھی لڑکی ہے۔ فیصل ماموں کی بیٹی۔ میں نے سوچا کہ کم از کم منگنی ہی کر لوں۔ مگر پھر۔۔۔۔۔“

”اش۔۔۔۔۔مل۔۔۔۔۔“ وہ یکدم پلٹی۔ اُس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور لب کپکپا گئے۔ شاہ خانم نے اُس کی زندگی

کافیصلہ کر لیا تھا تو یقیناً اب اشمیل اس سے سرتابی نہ کر پائے گا۔

”سحر گل“

یہ نام اُس کے سارے وجود کو ہلا گیا۔

”اشتمل! وہ بہت اچھی لڑکی ہے کیا؟“ اُس کی سیاہ خوبصورت آنکھوں کے فرش گیلے ہو گئے تھے۔

”ارے ہشمنہ!“ اشمٰل اُس کی بدلتی حالت سے گھبرا کر اُس کی طرف بڑھا۔

”ارے بے وقوف لڑکی! یہ صرف مذاق ہے۔ تم نے سچ سمجھ لیا۔“ وہ مسکرائے لگا۔

”اشمل! یہ شاہ خانم کا فیصلہ۔۔۔۔۔“

”کم آن ہشتمینہ! ابی ایزی\_\_\_ میں نے کہا نا، یہ صرف ایک مذاق ہے بس۔“

”کیا واقعی؟“ اُس نے اپنی بھیگی پلکیں جھپکیں۔

وہ مسکرا رہا تھا۔

اُس کے سارے اندیشے رفع ہونے لگے۔

اتنا خوفناک مذاق \_\_\_ اُس نے جھہر جھہری لے کر آنکھیں موند لیں۔ اشمٰل نے اُسے دیکھا۔ اُس کے رخساروں کی رنگت پھر لوٹ آئی تھی۔

”ہشتمینہ! اتنی شدت سے چاہتی ہو مجھے؟“ اُس نے اُس کے نرم ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں لے لیا۔

اُس کے مذاق میں کہے جملوں نے اُسے لرزایا دیا تھا۔ اُس کی حالت کو یکسر بدل دیا تھا۔ وہ کسی معصوم بچے کی طرح بلکنے کو تیار تھی۔

”مجھ سے ایسا جان لیوا مذاق نہ کیجئے گا! شمل خان! میرے لئے تو کوئی ایسا خیال ہی بہت برا ہے۔“ اُس نے خود کو سنبھالا۔

”پاگل لڑکی! تمہیں اس پہاڑی شخص نے چاہا ہے جس کی محبت بھی ان پہاڑوں کی طرح مضبوط، اٹل اور ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔ ہم اڑیل لوگ زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتے ہیں اور اپنی ساری زندگی اسی پر قربان کر دیتے ہیں۔“

اشمل کا لہجہ مضبوط تھا۔ ہشتمینہ کی رگوں میں طمانیت انگیز ٹھنڈک سرایت کر گئی۔

... ☆ ☆ ☆ ...

ماہ گل نے دیکھا، سحر گل کی آنکھیں رونے سے سرخ ہو رہی تھیں مگر لبوں پر مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ ایسی جیسے کوئی وزنی بوجھ اُتارنے کے بعد مزدور کے لبوں پر چھا جاتی ہے۔ ایک اطمینان ان سرخ، روئی روئی آنکھوں میں

ہلکورے لے رہا تھا۔ دُکھ اور خوشی کے مشترکہ احساس سے اُس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور بے اختیار ماہ گل سے لپٹ گئی۔

”آپی! سمجھ میں نہیں آرہا کہ مجھے خوش ہونا چاہئے یا دکھی۔“ وہ رُندھی آواز میں بولی۔ ماہ گل اُسے تھام کر صوفے پر لے آئی۔ اُسے خیال گزرا کہ وہ شاید اُس کے اور مسعود کے تعلقات استوار ہو جانے پر خوش ہے اور اُس کے اب یہاں سے چلے جانے پر اُداس۔

وہ ہولے سے مسکرائی۔ کیوں سحر! کیا بات ہے؟“ اُس نے اس کا سراونچا کیا۔

اُس کے آنسو اب خشک ہو گئے تھے اور چہرے پر گہری سنجیدگی آویزاں تھی۔

”آپی! فضلہ آئی تھی۔“ اُس نے ٹھہر کر بتایا۔

”فضلہ۔۔۔۔۔ کیوں؟“

”آپی! منصور کا بہت بری طرح ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔۔۔۔۔“ اُس نے بادل خواستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ منصور کے ذکر پر اُسے جھجک نے اکھیرا۔

”ہاں، ہاں۔ یاد ہے۔“ ماہ گل نے سر ہلایا۔ ”کس طرح ہو گیا اُس کا ایکسیڈنٹ؟“ وہ پوری طرح متوجہ ہو گئی۔

”فضلہ بتا رہی تھی کہ وہ کسی کالج گرل کے پیچھے آج کل چکر لگا رہا تھا اور اس دن اس کے پیچھے اسکو ٹر بھگا رہا تھا کہ سامنے سے آتے ٹرک نے اُسے کچل دیا۔ اس حادثے میں اُس کی ایک ٹانگ بھی ضائع ہو گئی ہے۔“

”اف، توبہ۔۔۔“ ماہ گل کے دل کو دھچکا سا لگا۔ وہ صوفے سے اُٹھ گئی۔

”بہت بڑا حادثہ تھا۔۔۔ دوسرے بھی کئی گہرے زخم آئے تھے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔۔۔ دوسروں کے گھروں میں آگ لگانے والے خدا کے عتاب سے دنیا میں بھی نہیں بچ سکتے۔ بہنوں، بیٹیوں کے سر سے ردا کھینچنے والے کبھی نہ کبھی

”کئی دن ہو گئے ہیں، بات نہیں ہوئی اُن سے۔“ وہ صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”جی نہیں۔۔۔ کچھ اور بات ہے۔“ سحر گل مسکراتی ہوئی فون کی طرف بڑھی۔

”کہیں اشتراک کے سلسلے میں تو۔۔۔؟“ اُس نے بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا۔ امی بے ساختہ ہنس دیں۔

”آپ نے اُن سے بات تو کی تھی جب ہم حویلی گئے تھے۔ انہوں نے کیا جواب دیا تھا؟“

”ہاں۔۔۔ اسی سلسلے میں تو پوچھنا ہے۔ اس وقت تو انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اُن کے انداز میں انکار ہر گز نہیں تھا۔ بس انہیں تو مہروز بھائی سے پوچھنا تھا۔“ امی اُٹھ کر اُس کے قریب آگئیں۔ ”تم جلدی سے نمبر تو ملاؤ۔“

”نہیں امی! آپ شاہ خانم کو فون نہیں کریں گی۔“ فروان کی آواز دروازے سے ابھری تو امی اور سحر گل ایک ساتھ پلٹیں۔

فروان کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

”میرے اور اشتراک کے رشتے کے سلسلے میں آپ شاہ خانم سے کوئی بات نہیں کریں گی۔“ وہ اندر آگیا۔ اُس کا لہجہ اٹل تھا۔ سحر گل کو جھٹکا لگا۔

”کیا کہہ رہے ہو فرو!۔۔۔ تم ہوش میں تو ہو؟“ امی استعجاب سے اُس کی طرف بڑھیں۔

”آپ کو میرے لئے اتنی دُور سے لڑکی لانے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا کوئی قریب قریب نظر نہیں آئی؟“ وہ یہ

کہتے ہوئے اطمینان سے پھیل کر بیٹھ گیا۔

”ہائے فروان! \_\_\_ یہ کیا کہہ رہے ہو؟“ سحر گل نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا۔ اُسے اُس کی دماغی حالت پر شک سا گزرا۔ کہاں وہ اشتراکے قصیدے پڑھتے نہ تھکتا تھا، اُس کی آنکھوں کی چمک اور لبوں کی مسکراہٹ سحر گل سے چھپی تو نہ تھی۔ اور پھر وہ ذومعنی جملے۔ یہ سب مذاق تو ہر گز نہیں تھا۔ لاکھ وہ شوخ اور شرارتی تھا مگر اس قدر بھونڈے مذاق کی توقع فروان سے وہ نہیں کر سکتی تھی۔

”ہاں امی! میں اشتراک سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔“ اُس نے بے حد واضح الفاظ میں کہا تو امی کامنہ بن گیا۔

”یہ تمہارے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں۔

”کیا \_\_\_؟“ وہ اچھل پڑا۔ ”شادی میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ اور اس میں آپ کی پسند، ہر گز نہیں۔ زندگی مجھے گزارنی ہے امی! اور ظاہر ہے میں اپنی پسند کو اولیت دوں گا۔ یہ کوئی کھیل تو نہیں ہے۔“ وہ خطرناک حد تک سنجیدہ ہو گیا۔

”ہاں \_\_\_ میں بھی یہی کہتی ہوں کہ یہ کوئی کھیل نہیں ہے۔ میں شاہ خانم سے بات کر چکی ہوں۔ اور انہیں یقیناً کوئی انکار نہیں ہو گا۔ تم چاہتے ہو میں بات چھیڑ کر اب خود پہلو تہی کروں۔ ہر گز نہیں۔“

”تو آپ نے مجھ سے اس وقت کیوں نہیں پوچھا؟ \_\_\_ مجھ سے بلا اجازت رشتہ کی بات کیوں چھیڑ دی؟“ وہ برہم سا صوفے سے کھڑا ہو گیا اور امی کو شک لگا۔

”تم۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ فروان! تم بھی زمان کی طرح اب الجھ رہے ہو جب تیر کمان سے نکل گیا ہے \_\_\_ مجھے اپنی ہی نند کے سامنے رُسو اور ذلیل کرنا چاہتے ہو؟“ وہ صوفے پر ڈھے گئیں۔

فروان کا تانتا چہرہ اور آنکھوں میں جھلکتی پتھر ضد انہیں اندر ہی اندر سے دہلا گئی۔

اُن کے تو کمان میں بھی نہ تھا کہ فروان بھی زمان کی طرح اُسی کے رنگ میں کھڑا ہو گا۔ وہی انداز، وہی پتھر یا لہجہ \_\_\_ یا امی!

”امی \_\_\_ امی! آپ سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ آپ کیا چاہتی ہیں کہ میں بھی زمان کی طرح اپنے قیمتی جواں سات سال اسی انداز میں گزار دوں \_\_\_ سر درویوں اور منجمد جذبوں کے ساتھ؟ \_\_\_ اور شاردابھابی کی طرح بے قصور ہوتے ہوئے بھی اشتراک سے قصور وار ٹھہرائی جائے؟ وہ بھی وہی دُکھ اٹھائے جو ماہی آپلی اور شاردابھابی نے اٹھائے ایک مرد کے ہاتھوں؟“

فروان کی آنکھوں میں گہری یاسیت سمٹ آئی۔ بہر کیف اس دُکھ سے کہیں زیادہ اشتراک کو پالینے کا دُکھ ہوتا ہے۔ وہ اُس کی تھی ہی کب۔ اُس کا دل جب کسی اور کے نام پر دھڑکتا ہو تو وہ محض جسمانی طور پر اُسے پا بھی لے تو نا آسودہ ہی رہے گا۔

اُس نے بے چینی سے انگلیاں مسلتے ہوئے امی کو دیکھا جو ناگوار نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔ پھر وہ اچانک کھڑی ہو گئیں۔

”اشتراک کو ناپسند کرنے کا جواز کیا ہے؟“ انہوں نے سیدھا فروان کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ پلکیں جھکانے پر مجبور ہو گیا۔

”جو شخص ناپسند نہ ہو، ضروری نہیں کہ وہ پسند ہی ہو۔ بس میں اُسے اپنی کزن سمجھتا ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں۔“ اُس کا لہجہ قطعی تھا۔

”ایسی بے معنی باتیں مت کرو مجھ سے۔ میں جانتی ہوں تمہارے پاس انکار کا کوئی جواز نہیں۔ اور کان کھول کر سن لو \_\_\_ اشتراک ہی میری بہو بنے گی۔ اور میں شاہ خانم سے بات چھیڑ چکی ہوں۔ اور میرا یہ فیصلہ پتھر کی لکیر سمجھ لو۔“



امی کا لہجہ از حد تلخ اور مضبوط تھا۔ وہ رکیں نہیں اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔

فروان نے بے چارگی سے انہیں جاتے دیکھا اور پھر لبوں کو دانتوں میں جکڑ لیا۔

”فرو! یہ تم یکایک اتنی بدلی بدلی باتیں کیوں کر رہے ہو؟“ سحر گل اُس کی طرف بڑھی۔ امی کی موجودگی میں وہ فون اسٹینڈ کے پاس دبکی کھڑی ہوئی تھی۔ فروان کی باتوں سے اُس کے اعصاب کو جھٹکا سا لگا تھا۔

”سحر! میں اشتراک کو منافقت کی زندگی گزارتے نہیں دیکھ سکتا۔ نہ ہی اتنا وسیع القلب اور اعلیٰ ظرف ہوں کہ کسی ایسی لڑکی کا شوہر کہلاؤں جو اپنے دل میں کوئی نرم اور روایتی جذبہ نہ لاسکے۔“ وہ بے حد سنجیدگی سے بولا اور سحر گل کو حیران چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

”اف خدا یا!“ سحر گل نے لمحہ بھر کو آنکھیں بند کر کے خود کو سنبھالا۔ وہ اتنی کم فہم یا سادہ لوح ہر گز نہ تھی کہ فروان کے جملوں سے اُس کا مفہوم اخذ نہ کر پاتی۔ تو کیا اشتراک کسی اور کو پسند کرتی ہے؟“ اُس نے بے حد تحیر سے سوچا۔

مہروز خان کو گل بی بی نے خصوصی طور پر بلوایا تھا۔ وہ زمینوں سے واپسی پر گل بی بی ہی کی طرف چلے آئے۔ بہن کی شادی کے بعد صبغت خان کا مزاج بھی یکسر تبدیل ہو گیا تھا۔ انہوں نے مہروزان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور خاصی آٹو بھگت کی۔

”آپ تو بڑے لوگ ہیں۔“ کبھی کبھار غریب خانے پر تشریف لاتے ہیں۔“ صبغت خان کے لبوں پر شکوہ مچل گیا۔ مگر اُن کا انداز جارحانہ نہیں بلکہ شگفتہ تھا۔ مہروز خان مسکرا کر رہ گئے۔ وہ کافی دیر ان کے پاس بیٹھے رہے، پھر اپنے کام پر چلے گئے۔ تب گل بی بی بھائی کے پاس اسپٹھیں۔

”شاندانہ کیسی ہے۔“ خیریت سے تو ہے؟“ مہروز خان نے پوچھا۔

”ہاں، اللہ کا فضل ہے۔ اور پھر دن ہی کتنے ہوئے ہیں اُسے رخصت ہوئے۔“ گل بی بی نے ان کے سامنے گرم گرم قہوہ رکھتے ہوئے کہا۔ پھر حور مینا کو آواز دینے لگی۔

”مینا! جانو باورچی خانے میں ٹرے رکھی ہے، وہ لے آؤ۔“

”ارے، ارے۔۔۔ گل! کچھ تکلف مت کرنا بھئی۔“ مہروز خان جلدی سے بولے۔

”شاندانہ کا باپ دے گیا ہے چیزیں۔ اُن کے مزاج کی تو آپ کو خبر ہے، جلدی برامان جاتے ہیں۔“ گل بی بی مسکرائیں اور پھر حور مینا کے ہاتھ سے لوازمات سے سچی ٹرے لے کر مہروز خان کے سامنے رکھ دی۔

”تمہارے شہر کے مہمان چلے گئے؟“

”ہاں۔۔۔ بس نند کی بیٹی ہشیمہ ہے۔ اشارانے اُسے زبردستی روک لیا ہے اُسے۔ اپنے ساتھ حویلی لے کر گئی ہے۔“ گل بی بی نے بتایا۔ ”مہروز لالہ! آپ تو کچھ لے ہی نہیں رہے۔ اگر ٹرے یونہی سچی رہی نا تو شاندانہ کا باپ مجھ پر خفا ہو گا کہ ہم غریبوں کا شاید حویلی والوں کو کچھ پسند نہیں آتا۔“ گل بی بی کہہ کر مسکرائیں۔ مہروز خان بھی ہنس دیئے۔

”کیسی باتیں کرتی ہو گل!۔۔۔ اچھا، تم نے مجھے بلوایا تھا۔ کیا کوئی خاص بات ہے یا بس یہ ٹرے خالی کرنے کے لئے ہی بلایا تھا؟“ مہروز خان نے کہا تو گل بی بی گہری سوچ میں کھو گئیں۔

وہ الفاظ تلاش کرنے لگیں کہ بات کا آغاز کس طرح کریں۔ کل ذولین نے اُن سے جو کچھ کہا تھا وہ اُن کے لئے بے پایاں خوشی کا باعث تھا۔ مگر کیا خبر مہروز خان اسے کس رنگ میں لیں۔ اور پھر بات صرف مہروز خان تک تو ختم نہیں ہوتی، شاہ خانم کا کردار ہر فیصلہ میں بھرپور ہوتا تھا۔

انہوں نے متفکر سی نظر مہروز خان پر ڈالی۔

”کیا بات ہے گل! تم کچھ پریشان ہو؟“ مہروز خان کو اُن کی خاموشی پر کچھ تشویش ہوئی۔

”بس لالہ! بات میری تو نہیں، مگر ایک طرح سے میری ہی ہے۔“ گل بی بی جیسے خود سے بولیں اور پھر سوچ کر کہنے لگیں۔ ”ذولین، فیروز لالہ کی نشانی ہے۔ اور میں جانتی ہوں کہ وہ تمہیں بے حد عزیز ہے۔ اشمیل سے بھی زیادہ۔“

”ک۔۔۔۔۔ کیا ہوا ذولین کو؟“ مہروز خان اُن کی ادھوری بات پر گھبرا گئے۔ یہ حقیقت تھی کہ ذولین ان کے خون میں بس رہا تھا۔ انہیں بے حد عزیز تھا۔

”نہیں لالہ! سب خیریت ہے۔“ گل بی بی جلدی سے بولیں۔ ”در اصل بات یہ ہے کہ میں چاہتی ہوں کہ ذولین کی شادی اشارا سے۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔۔۔“

”گل۔۔۔۔۔“ مہروز خان نے اُس کی بات کاٹ دی اور سر جھکا کر بے چینی سے قبوہ کی پیالی پر انگلیاں پھیرنے لگے۔

”کیوں۔۔۔۔۔ کیا تمہیں انکار ہوگا؟“ گل بی بی کا دل لرزا۔

”بات میرے انکار کی نہیں۔ اور پھر یہ تو تمہاری خواہش ہے گل! وہ مجھے بے حد عزیز ہے۔ اس سے مجھے کبھی بھی انکار نہیں۔ لیکن ضروری تو نہیں ہے کہ میں اس سے اپنی محبت کے بدلے یہ فیصلہ اس پر مسلط کر دوں۔ وہ عاقل بالغ ہے۔ اُسے پورا اختیار ہے۔ اور وہ اس معاملے میں بھی آزاد ہے۔“

”مہروز لالہ! آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دید۔“ گل بی بی زور سے ہنس دیں۔ اُن کے حلق میں انکی سانسیں پھر سے رواں ہو

گئیں۔ انہوں نے ایک نظر مہروز خان پر ڈالی اور پھر آہستگی سے گویا ہوئیں۔

”یہ صرف میری خواہش ہی نہیں، خود ذولین کی بھی یہی خواہش ہے۔ اُس نے مجھ سے خود کہا ہے کہ وہ اشارا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اور کہا کہ میں اس سلسلے میں آپ سے بات کروں۔“

”کیا۔۔۔۔۔ ذولین نے تم سے یہ کہا ہے؟“ مہروز خان بے یقینی کی سی کیفیت میں گل بی بی کو دیکھتے رہ گئے۔ بات صرف رشتے ہی کی نہیں، ذولین کی پسند کی بھی ہو رہی تھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ اور سچ پوچھو تو مہروز لالہ! ذولین تو ہیرا ہے۔ سچا ہیرا۔ اور پھر ہمارا اپنا خون ہے۔ اُس نے خود اشارا کا ہاتھ مانگا ہے۔ پہلی بار ہی تو اُس نے کچھ مانگا ہے۔ اُسے مایوس مت کرنا لالہ!۔۔۔۔۔ اُسے عزت بخشنا۔“ گل بی بی کی آواز بھاری ہو گئی۔

ذولین کی خاطر تو وہ مہروز خان سے لڑ کر بھی اُس کی خواہش کا دم بھرنے کو تیار تھیں۔ کتنے چاؤ سے اُس نے کہا تھا۔ ”گل بی بی! میں اشارا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا میں اس قابل ہوں؟“ اس لمحے اُس کی سبز آنکھوں میں کتنے ہیرے دمک رہے تھے۔ لبوں پر کتنی دلفریب مسکراہٹ سجی تھی۔ اور انہوں نے پیار سے اس کی فراخ پیشانی چوم لی تھی اور اسی لمحے سوچ لیا تھا کہ وہ اُس کی آنکھوں میں دکتے یہ سپنے بکھرنے نہیں دیں گی۔

اُدھر مہروز خان کے دل میں اس نرم جملے نے عجیب سی کیفیت پیدا کر دی تھی جو بیک وقت انہیں سرشار بھی کر گئی اور ملول بھی۔ گل سچ ہی تو کہہ رہی تھی کہ اتنے برس گزر گئے، اس بن ماں باپ کے بچے نے اُن سے کچھ بھی تو نہیں مانگا تھا۔ محبت اور توجہ بھی نہیں۔ وہ تو خود ہی محبت لٹاتے آئے تھے اُس پر۔

کتنا صابر تھا وہ۔۔۔۔۔ اور وہ کتنے لا پرواہ ہو گئے تھے اُس سے۔ اتنا توانا جوان ہو گیا تھا۔ اور ابھی تک اُس کی شادی کا سوچا تک نہ تھا۔ شاہ خانم، اشمیل کی شادی کے لئے کتنی بے چین تھیں۔ ماں تھیں اسی لئے جوان اولاد کی

خوشیاں اور دکھ نظر میں رکھتی تھیں۔ مگر ذولین؟

’نجانے میں نے اپنی ذمہ داری میں کہاں کہاں کوتاہیاں کی ہوں گی۔ کہاں کہاں نا انصافی کا مرتکب ہوا ہوں گا۔ یہ خیال، یہ احساس اُن کے خون میں اب بھی سلگ رہا تھا۔‘

”تم نے کوئی جواب نہیں دیا لالہ!“ گل بی بی دھیرے سے بولیں۔

”آں۔۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔۔کیا جواب دوں گل! ایسی خوشی، ایسا سرور تودل نے کبھی محسوس نہیں کیا۔۔۔۔۔  
یوں لگ رہا ہے جیسے سینکڑوں پھول میرے قلب میں مہک اُٹھے ہوں۔ میرے بیٹے نے مجھے بے پناہ مسرور کر دیا  
ہے۔۔۔۔۔یہ صرف اُس کی خواہش تو نہیں، یہ تو میری تمنا تھی۔“ مارے خوشی کے ان کی آواز کانپ رہی تھی اور  
آنکھوں میں ڈھیر سارے جگنو چمکنے لگے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

”ارے \_\_\_ آپ بیٹھے تو۔“ گل بی بی انہیں اٹھتا دیکھ کر بولیں۔

”نہ \_\_\_ اب تو بیٹھا بھی نہیں جا رہا۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھے۔

”میں ذولین سے کیا کہوں لالہ؟“ گل بی بی بھی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔ مہروز خان رُکے، پلٹے اور مبہم سے مسکرائے۔

”تو کیا اب بھی میرے کچھ کہنے کی ضرورت باقی رہتی ہے؟“ گل بی بی مسکرا دیں۔ اور پھر ان کے قریب آکر بولیں۔  
 ”میں جانتی تھی۔۔۔ میرا دل کہتا تھا کہ آپ کا جواب اقرار میں ہی ہو گا۔ آپ ذولین کے پیام کو ہر گز نہیں ٹھکرائیں  
 گے۔۔۔ مگر لالہ!۔۔۔ شاہ ہے تو یہ برداشت نہ کر پائے گی۔“ انہوں نے اپنے دل میں دھڑکتے خدشے کو زبان  
 دے دی تو مہروز خان کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اُن کا چہرہ تن گیا۔

”اشترا میری بیٹی ہے۔ اُس پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا شاہ ہے کا۔ اور آج تک اس نے جو چاہا وہی کیا ہے۔۔۔۔۔ اب کچھ فیصلے اسے میرے بھی قبول کرنے ہوں گے۔“ وہ یہ کہہ کر سرعت سے باہر نکل گئے۔

گل بی بی کے گھر سے وہ سیدھے حویلی میں آ گئے۔ مگر رہائشی حصے کی طرف جانے کی بجائے ان کے قدم انیکسی کی طرف اٹھ رہے تھے۔

حویلی کے بیرونی حصے اور لان کی بتیوں نے پوری حویلی کو جگمگادیا تھا۔ ڈھلتی شام سے ہی حویلی کو روشنیوں سے نہلا دینے کا حکم شاہ خانم کا تھا۔

انیکسی کے کوریڈور کا بڑا سا بلب بھی روشن تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ذولین انیکسی میں موجود تھا۔ وہ اتنی مدت بعد انیکسی کی طرف آئے تھے، ورنہ ہمیشہ ذولین ہی ان کے پاس آتا تھا، کبھی سلام اور خیریت پوچھنے یا کبھی کسی ضروری کام کے سلسلے میں وہ رہائشی حصے کی طرف آتا تھا۔ ورنہ ان دونوں کی ملاقات زمینوں پر ہی ہوتی تھی۔ اُن کے قدم تیزی سے اُٹھ رہے تھے۔

اپنے بیڈروم سے نکلتے ہوئے ذولین ٹھٹک گیا۔

”چچا خان۔۔۔۔۔ آ۔۔۔۔۔ آپ یہاں۔۔۔۔۔“ اُس کی آنکھوں میں تیر آمیز بے یقینی تھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔میں۔۔۔۔۔کیا بیٹھنے کو نہیں کہو گے؟“ مہروز خان مسکرائے تو وہ جلدی سے سنبھل گیا۔

”آں۔۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔۔کیوں نہیں۔ پلیز، بیٹھے نا۔“ اُس نے جلدی سے سٹنگ روم کا پردہ کھینچ کر کھولا تھا اور مہروز خان صوفے پر بیٹھ گئے۔

”تمہاری یہ حیرانگی بجا ہے۔۔۔ کبھی میں یہاں آیا جو نہیں ہے نا؟“ انہوں نے محبت آمیز نظروں سے اُسے

دیکھا تو وہ ہنس دیا۔

”آپ بیٹھے \_\_\_\_\_ میں آپ کے لئے قہوہ بنا کر لاتا ہوں۔“

”نہیں \_\_\_\_\_ کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔“ اُسے پلٹتے دیکھ کر مہروز خان صوفے سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

ذولین، اشمیل کے ہمراہ حویلی کی طرف آگیا۔ شاندا نہ کی رخصتی اور گل بی بی کی دل گرفتہ حالت نے دونوں پر اثر ڈالا تھا \_\_\_\_\_ دونوں کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

”یہ شان کو دیکھو، سب کوڑا لگئی۔“ آدھا راستہ طے ہوا تو اشمیل دھیرے سے بولا۔

”گل بی بی بہت اپ سیٹ ہو گئی ہیں۔“

”ہوں۔“ ذولین چونکا۔ ”تمہارے اب کیا ارادے ہیں \_\_\_\_\_ کتنے دن ہو یہاں پر؟“ اُس نے رُخ اشمیل کی طرف کر لیا۔

”پرسوں جا رہا ہوں۔ آج صبح ڈی ایس پی منظور احمد سے بات ہوئی تھی فون پر۔“

”اچھا \_\_\_\_\_ کیا بات ہوئی؟“

”ریحان پر اچھے روپوش ہو گیا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے اس بار شاہنواز پر اچھے کے ہاتھ پیر ڈھیلے ہیں۔“ ذولین نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں \_\_\_\_\_ اب کی بار ریحان کو میں سلاخوں کے پیچھے ڈال کر رہوں گا۔ وہ قاتل ہے اور اس کی سزا بہر کیف عمر قید یا پھانسی ہے۔ وہ بھاگ کر کہاں جائے گا \_\_\_\_\_ اس زمین اور اس آسمان کے نیچے ہی ہو گا۔“ اشمیل کا چہرہ تن گیا۔ ذولین نے اُسے دیکھا۔

”ڈی ایس پی اچھا آدمی ہے۔“

”ہاں \_\_\_\_\_ بے حد تعاون کر رہا ہے۔ خاصا محنتی بھی ہے۔ ریحان کو پولیس ڈھونڈ رہی ہے۔ وہ اپنے کسی فلیٹ میں منتقل ہو گیا تھا۔ مگر اب وہاں سے بھی فرار ہو گیا ہے۔“ اشمیل اُسے تفصیل بتا رہا تھا جو ڈی ایس پی منظور احمد نے اُسے دی تھی۔ وہ ایک ایک پل کی خبر رکھنا چاہتا تھا۔ اس بار وہ ریحان پر اچھے کو ہر حالت میں اس کے انجام تک پہنچانا چاہتا تھا۔

جیپ حویلی کے پورچ میں رک گئی۔ وہ دونوں نیچے اتر آئے۔

”اچھا پھر \_\_\_\_\_ خدا حافظ۔ اور ہاں، پرسوں مجھ سے ضرور مل کر جاننا۔“ ذولین نے اشمیل سے کہا اور پھر انیکسی کی طرف بڑھ گیا۔

اشمیل اپنی جگہ ایستادہ اُسے دیکھتا رہا۔

اُس کا اپنا خون، اُس کا عم زاد، اُس کا بھائی \_\_\_\_\_ مگر یہ درمیان کیسی دیواریں کھڑی تھیں؟ اُس کے قدم انیکسی کی جانب اُٹھ رہے تھے۔ اشمیل کے دل میں دھواں سا بھر گیا۔

”تم بہت مضبوط ہو ذولین! \_\_\_\_\_ بہت مضبوط۔“

وہ اچانک پلٹا اور اشمیل کو اپنی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتا پا کر مسکرایا اور ہاتھ ہلا دیا۔ اشمیل بھی مسکرا دیا اور پھر رہائشی حصے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ اندر آیا تو شاہ خانم بڑے کمرے میں تھیں۔ وہ خود بھی ابھی گل بی بی کے گھر سے واپس آئی تھیں۔ بھاری کپڑوں اور قیمتی زیورات میں ملبوس تھیں۔ اشمیل کو دیکھ کر وہ اپنے کمرے سے باہر آ گئیں۔



”مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

”مجھ سے۔۔۔۔۔؟“ وہ رک گیا۔ ”اس وقت تو میں بہت تھک گیا ہوں شاہ خانم! کیا بہت ضروری ہیں؟“ اس کے چہرے پر تھکن کے واضح رنگ پھیلے ہوئے تھے۔

”میری باتیں تمہاری تھکن میں اضافہ ہر گز نہیں کریں گی۔“ شاہ خانم مسکراتے لگیں۔

”اچھا۔۔۔ تو پھر ضرور کیجئے۔“

”ادھر آؤ، میرے کمرے میں۔“

”نہیں۔۔۔ میرا خیال ہے آپ میرے کمرے میں آجائیے۔“ اُس نے کہا تو شاہ خانم نے زیادہ تردد نہیں کیا اور اس کے ہمراہ اس کے کمرے میں آگئیں۔

صوفے پر بیٹھ کر اشمیل نے پیروں سے اپنے وزنی پٹاوری چپل اُتارے۔ اتنی دیر میں شاہ خانم اُس کے وسیع بیڈ کے کنارے اُس کے بالکل سامنے بیٹھتے ہوئے کچھ سوچنے لگیں۔

”کیا کوئی پرابلم ہے؟“ اُس نے جوتوں کو پیروں سے صوفے کے نیچے دھکیلتے ہوئے شاہ خانم کے چہرے کو بغور دیکھا۔

”آں۔۔۔ تم کب واپس جانے کا سوچ رہے ہو؟“ انہوں نے اُس کا جملہ سنا ہی نہیں یا پھر نظر انداز کر دیا۔

”پرسوں جا رہا ہوں۔۔۔ اگر آپ کہیں تو ایک دن اور رہ لوں؟“ اُس نے انہیں چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

”نہیں۔۔۔ اب اکٹھے ہی آنا۔“ وہ بغیر برامانے بولیں۔ پھر ایک گہری طویل سانس سینے کی تہہ سے آزاد کرتے ہوئے بولیں۔

”میں چاہتی ہوں کہ کم از کم تمہاری منگنی کر دوں۔“ انہوں نے اپنا اصل مدعا بیان کیا۔ ”بات ابھی طے ہو جائے۔ پھر جب تمہاری پڑھائی مکمل ہو جائے گی، شادی کر دوں گی۔ بس اب کوئی خوشی ہو گھر میں۔“ وہ بیڈ کے کنارے سے اُٹھ کر بیٹھنے لگیں۔

اشمل خان کا اُٹھا ہوا سر اسی زاویے پر رہ گیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے اس بارے میں؟“

”آپ فی الحال میری فکر چھوڑیں اور اشتراک کے بارے میں سوچئے۔“ اُس نے بے حد خوبصورتی سے بات گھمانے کی سعی کی۔ شاہ خانم نے اُسے دیکھا۔

”اشتراک کا ذکر کہاں سے آگیا؟“

”اشتراک کا ذکر ہی ہونا چاہئے۔ پہلے بہن رخصت ہونی چاہئے۔ اس کی فکر کرنی چاہئے۔“ وہ صوفے سے کھڑا ہو گیا۔ وہ ہر ممکن طریقے سے اپنی ذات کو اس موضوع سے بچانا چاہ رہا تھا۔

اُس کی پسند ہشمنہ ابرار تھی۔ اور وہ اس طرح کا کوئی ذکر کر کے اس معاملے کو سنگین نہیں بنانا چاہتا تھا۔

”اشتراک کا کیا ہے۔۔۔ وہ تو بیٹی ہے۔ کون سا اُس کی رضامندی لینی ہے۔“ شاہ خانم بولیں۔

”تو بھئی پھر اُسے فٹافٹ رخصت کرنے کی تیاریاں کیجئے۔“ اس نے ہلکی ہنسی کے ساتھ کہا۔

”تمہاری ممائی نے بات کی ہے مجھ سے اشتراک کے سلسلے میں۔“ شاہ خانم پھر بیڈ پر ٹک گئیں۔

اشمل کو جیسے کرنٹ سا لگا تھا۔

”ہاں، فروان کے سلسلے میں۔ گھر کا لڑکا ہے، دیکھا بھالا ہے۔ بس وہ لوگ تو میرے جواب کے منتظر ہیں۔“

”فروان اور اشٹارا \_\_\_\_“ اشمیل کو اپنی سماعت پر جیسے یقین نہ آ رہا تھا۔ ”آپ جانتی ہیں اشٹارا اور فروان کی عمروں میں کتنا فرق ہے اور \_\_\_\_\_“

”ہاں۔۔۔ ایک سال کا فرق ہے۔ وہ ایک سال چھوٹا ہے۔ بھلا کہیں سے لگتا ہے۔ کیسا اونچا لانا، گبھرو جوان ہے۔ اور پھر گھر کا لڑکا ہے۔“ شاہ خانم کے لہجے میں لاپرواہی تھی۔ ”تمہیں اشتراک کے سلسلے میں فکر کی ضرورت نہیں۔ یہ بتاؤ مجھے کہ سحر گل کیسی لگتی ہے تمہیں؟ میں نے سوچا ہے اشتراک اور فروان کے ساتھ تمہاری اور سحر گل کی بھی منگنی کر دوں۔“ یہ کہتے ہوئے شاہ خانم کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”اب اس حویلی میں رونق ہونی چاہئے۔۔۔ تم نے سحر کو دیکھا ہے نا؟“ انہوں نے پوچھا۔

اشتمل کی سماعتوں پر بر چھپی سی لگی تھی۔

یہ شاہ خانم کیا کرنے چلی تھیں؟ \_\_\_\_\_ وہ مارے تحیر کے اپنی جگہ دم بخود سارہ گیا۔

”تم نے بتایا نہیں، تمہیں سحر گل کیسی لگتی ہے؟ \_\_\_ بہت عرصہ ہو گیا ہے نا تم نے اُسے دیکھا نہیں ہے۔ اب دیکھو گے تو تمہیں یقیناً پسند آئے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے وہ بہت اچھی لگتی ہے۔“

شاہ خانم کے لہجے میں سحر گل کے لئے مٹھاس کا دریا بہہ رہا تھا۔

اُس کی سمجھ میں فوری طور پر کچھ نہ آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ ذہن مائوف ہو گیا تھا۔ کتنے ہی ثانیے وہ خالی خالی نظروں سے شاہ خانم کو تکتا رہا۔

یہ فیصلے صادر کرنے والی شاہ خانم اُس سے اجازت طلب کر رہی تھیں یا اپنے ارادوں سے باخبر کر رہی تھیں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ اُس کے خیالوں کے نرم پردوں پر ہشتمینہ ابرار کا چہرہ چمکنے لگا۔ نہیں۔۔۔۔۔ وہ لاکھ شاہ خانم کی عزت کرتا ہے، اُن کا فرمانبردار ہے۔۔۔۔۔ مگر یہاں منافقت کا راستہ نہیں اپنائے گا۔

”میں جانتی ہوں، تمہیں بھلا کیا اعتراض ہوگا۔“ شاہ خانم کے لہجے میں یقین تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھیں تو وہ یک دم ہوش میں آگیا۔

”میں آپ کو اس سلسلے میں کسی طرح کا بھی جواب نہیں دے سکتا۔“ اُس کا لہجہ سپاٹ تھا جس میں نہ انکار تھا اور نہ اقرار۔

”کیا مطلب؟“ شاہ خانم نے حیرت زدہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ اُس نے خود کو بروقت سنبھال لیا تھا۔ اُس کے شہر جانے میں صرف ایک دن رہ گیا تھا اور وہ جاتے وقت کوئی بد مزگی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا نہ کسی طرح کا تنازعہ اُٹھانا چاہتا تھا۔

یہ تو صرف شاہ خاں کی خواہش ہی تھی۔ کون سا وہ ابھی عملی قدم اٹھا رہی تھیں۔ اُس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اُس نے بے حد تدبیر سے صورتحال کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

”آپ جانتی ہیں، کل میں واپس ہاسٹل جا رہا ہوں۔ اور میں ذہنی طور پر اس چیز کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں صرف اور صرف اپنی پڑھائی مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ شادی کے لئے تو ایک عمر بڑی ہے۔“ وہ ہنس دیا۔

”میں جانتی تھی تمہارا جواب اتنا ہی فضول ہوگا۔“ شاہ خانم کا چہرہ تن گیا۔ ”اور پھر میں کون سا ابھی تمہاری شادی کر رہی ہوں۔ صرف منگنی۔“

”شاہ خانم! کیا ضرورت ہے ابھی کسی لڑکی کو بے کار رشتے میں باندھ دینا۔ بھئی جب شادی ہی ابھی نہیں کرنی تو یہ منگنی، یہ زبان دے دینا سب بے کار، بے معنی باتیں ہیں۔ ہو سکتا ہے اس دوران سحر گل کے لئے کوئی مجھ سے بہتر رشتہ مل جائے۔“ اُس نے شگفتہ انداز اختیار کیا۔

شاہ خانم کی پیشانی پر ڈھیر سارے بل پھیل گئے۔

”کچھ غلط کہا میں نے؟“ وہ پلنگ پر ڈھیر ہو گیا۔

”نہیں۔۔۔ بہت ٹھیک کہا۔ تم باپ بیٹے تو ہر بات ہی درست کہتے ہو۔ غلط تو صرف میں سوچتی ہوں اور میں ہی بولتی ہوں۔“

”ارے، ارے۔۔۔ آپ تو خفا ہو گئیں۔“ وہ اٹھ کر ان کے قریب چلا آیا۔ پھر یک بیک سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ”میں شادی سے انکاری تو نہیں ہوں۔ بس کچھ مہلت مانگ رہا ہوں۔“

”تو پھر سحر گل اچھی تو ہے نا؟“

”یقیناً ہوگی۔۔۔ آپ اُسے بہتر جانتی ہوں گی۔“

شاہ خانم نے اُسے دیکھا۔ وہ اس وقت اس موضوع پر بالکل سنجیدہ ہونے کے موڈ میں نہیں تھا۔ تھکن اور اکتاہٹ اُس کی بھوری آنکھوں میں ہلکورے لے رہی تھی۔

”میرے خیال سے تم اس وقت آرام کر ہی لو۔“ انہوں نے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ پھر رُک گئیں اور پلٹ کر بولیں۔ ”مگر یہ بات تمہاری پڑھائی ختم ہونے تک کے لئے ملتوی نہیں ہوگی۔ ہاں، اب کی بار تم آؤ گے تو پھر بات ہوگی اور حتمی ہوگی۔“ وہ یہ کہہ کر سرعت سے پردہ اٹھا کر باہر نکل گئیں۔

وہ ایک گہری سانس لے کر دوبارہ اپنے وسیع بیڈ پر دراز ہو گیا۔ اُسے شاہ خانم کی اس سوچ نے پریشان کر دیا تھا۔

”سحر گل۔“

اُس نے اپنے ذہن پر زور دے کر سحر گل کا تصور جمایا۔ پُرکشش سی لڑکی تھی۔ ہنستی، شرارتی۔ وہ اُسے عزیز تھی خونی رشتے کے ناطے۔

”آف، یہ شاہ خانم بھی کیا کرنے نکلی ہیں؟“ اُس نے سر جھٹک دیا اور آنکھیں موندیں تو ہشمنہ کا دلکش سراپا اٹھہرا اور دل جیسے ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی سے بھر گیا۔ سرخ شال میں گھبرائی گھبرائی وہ اُسے پہلی بار ڈھول بجاتی زور و شور سے شاندانہ کی شادی کے گیت گاتی کتنی مختلف لگی تھی۔ پھر وہ اُس سے ٹکرائی تھی اور ڈھیر ساری کانچ کی چوڑیاں ٹوٹ جانے پر کتنی خفا ہوئی تھی۔ مگر لمحہ بھر کے لئے۔

وہ آنکھیں موندے اُس کی رعنائیوں میں کھوتا جا رہا تھا۔

...☆☆☆...

شاندانہ کی شادی کے بعد گھر میں یکدم ہی جیسے سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ ایسے میں گل بی بی کا دل سخت بو جھل ہو رہا تھا۔ یہ تو ہشمنہ کا دم غنیمت تھا اور اُس نے بھابی اور اشناس بھائی کو زبردستی روک لیا تھا۔ ساتھ ہی اُس نے اشارہ کو بھی روک لیا تھا۔

”مجھے تمہاری ضرورت رہے گی نا۔“

”کیوں؟“ اشارہ نے اُسے شریر نظروں سے دیکھا۔

”بھئی اپنی وادی کی سیر نہیں کراؤ گی ہمیں؟“ اُس نے کہا تو اشارہ نے سر ہلا دیا اور پھر وہ اور بھابی، اشارہ کے ہمراہ وادی کی سیر کو نکل آئیں۔

”لگتا ہے یہاں تو بارہ مہینے سردی ہی رہتی ہے۔“ شام کا وقت تھا۔ ہشمنہ کو خنکی کا احساس ہوا۔ اُس نے شال اچھی طرح اپنے جسم پر لپیٹ لی۔

”تم عادی نہیں ہونا، اس لئے تمہیں زیادہ سردی لگ رہی ہے۔ یہ موسم تو بہار کا ہے۔ اس موسم میں تو پوری فضا

خوشبو سے بھر جاتی ہے اور ڈھیر سارے پھول کھلتے ہیں۔“

”دل کے؟“ بھابی نے شرارت سے پوچھا تو وہ ہنس دی۔

”دل کے پھول کھلنے کے لئے کسی موسم کی قید نہیں ہوتی۔ وہ تو جون جولائی کی گرمیوں میں بھی کھل اٹھتے ہیں۔“ ہشمنہ اونچے اونچے پہاڑوں پر نگاہیں جمائے بولی۔

وہ تینوں ہلکی پھلکی گفتگو کرتی ہوئی، ماحول سے لطف اندوز ہوتیں ایک خوبصورت جگہ پر آگئیں۔ یہ جگہ اونچے اونچے درختوں اور سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ سامنے پہاڑوں سے شور مچانا ہوا چشمہ بہہ کر مختلف پتھروں سے ٹکرا کر منقسم ہو جاتا اور ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار ارد گرد کے پھولوں کو نہلا دیتی۔

”یہاں کتنا حُسن ہے۔“ ہشمنہ کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ بھابی بھی مسحور سی ہو گئیں۔

”آہ\_\_\_\_ ہم شہر والے اتنی بڑی نعمت سے محروم ہیں۔ تم تو بڑی خوش قسمت ہو! اشارہ!“ بھابی نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”آپ بھی یہیں رہ جائیں نا۔“ اشارہ نے کہا تو ہشمنہ بے ساختہ ہنس دی۔

”پھر اشناس بھائی کا کیا ہوگا؟ اُن کا بیڑا غرق\_\_\_\_\_“

”ہشت\_\_\_\_ بد تمیز۔“ بھابی جھینپ گئیں اور آگے چلنے لگیں۔

”پھر ہشمنہ! تم یہاں آجاؤ ہمیشہ کے لئے۔“ اشارہ نے پیار بھری مسکراہٹ کے ساتھ اُسے دیکھا تو وہ سٹپٹا گئی۔

”مم\_\_\_\_\_ میں\_\_\_\_\_ نہ، میں یہاں کیوں رہنے لگی؟“

”اب تو مجبوری ہے۔“ اُس کی ہنسی معنی خیز تھی۔ ہشمنہ نے پلکیں جھپک کر اُسے دیکھا۔ اُس کا دل تیزی سے

دھڑکنے لگا۔ بھابی تو خاصی آگے نکل گئی تھیں۔

”اشمل لالہ کی خاطر تو رہنا پڑے گا نا۔ وہ تو وادی نہیں چھوڑ سکتے۔“ اُس نے اُس کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور ہشمنہ بھونچکا سی رہ گئی۔

اشارہ کے اس واضح جملے نے اُسے کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔ ایک بیک اُس کے رخسار سرخ ہو گئے اور پلکوں پر منوں بوجھ آن گرا۔

”وہ\_\_\_\_ میں تو\_\_\_\_“

”آں\_\_\_\_\_ آں\_\_\_\_\_“ اشارہ نے ہاتھ اٹھا کر اُسے کچھ بولنے سے پہلے ہی روک دیا۔ ”جنابہ! مجھے ٹالنے کی کوشش مت کرنا۔ ویسے یہ اشمل لالہ بڑے چھپرے ستم نکلے۔ اور تم اس سے بھی زیادہ۔ میرے بارے میں تو سب کچھ شاندا نہ سے پوچھ لیا اور اپنا آپ اُس بیچاری سے بھی چھپا گئے۔“

ہشمنہ کی پلکیں مارے خفت کے اٹھ نہ رہی تھیں۔

اشارہ کے سامنے سب کچھ کھل چکا تھا۔ وہ نہ جانے کب سے جانتی آئی تھی۔

”کیا اشمل نے تمہیں\_\_\_\_\_“ اُس نے بمشکل دل کو سنبھالتے ہوئے پوچھنا چاہا تو وہ زور سے ہنس دی۔

”میں نے کہا نا، وہ تو بڑے چھپرے ستم ہیں\_\_\_\_\_ بھنک تک نہیں لگنے دی مجھے۔ ویسے ہشمنہ! بالکل سچی سچی بتاؤ، تمہیں اشمل لالہ کتنے اچھے لگے ہیں؟“ اُس نے پوچھا تو ہشمنہ کا چہرہ گرم ہو گیا۔ اُس کی پلکیں رخساروں پر کانپ کر رہ گئیں۔



کتنی شریر ہو رہی تھی اس وقت اشارا \_\_\_ راز جو جان گئی تھی

اشارا اُس کی حالت سے خوب محظوظ ہو رہی تھی۔

”ارے تم دونوں وہیں اٹک گئیں۔“ بھابی نے پلٹ کر ان دونوں کو پکارا تو ہشیمینہ پلٹ کر ان کی طرف بڑھ گئی۔ وہ اشارا کی شریر نگاہوں سے بے حد نروس ہو رہی تھی۔

”ہائے ہشیمینہ! میں کیمرہ تو لانا ہی بھول گئی۔ تمہارے بیگ میں تو نہیں ہے کہیں؟“ بھابی اپنا بیگ ٹٹول کر بولیں۔

”نہیں \_\_\_ میرے پاس تو نہیں ہے۔ آپ نے نکال کے تو رکھا تھا۔“

”ہاں، شاید وہیں میز پر رکھا رہ گیا۔ ٹھہرو \_\_\_ میں ابھی جا کر لے آتی ہوں۔“

”ہائیں \_\_\_ واپس جائیں گی آپ؟“ ہشیمینہ نے انہیں دیکھا۔

”ہاں، تو کیا ہوا۔ زیادہ دُور تو نہیں ہے۔ کیوں اشارا! سامنے ہی سے آئے ہیں نا؟“

”ہاں \_\_\_ سامنے اُس پہاڑی سے اُتر کر دائیں طرف ہی تو گھر ہے۔“ اشارا نے کہا تو وہ خوش ہو گئیں۔

”اتنی حسین جگہ کی تصویر میں نہ لوں گی تو تا عمر افسوس رہے گا۔“ وہ بھاگیں اور ہشیمینہ اُن کی دیوانگی پر مسکرا کر رہ گئی۔

بھابی کے جانے کے بعد دونوں نے زیادہ آگے جانا مناسب نہ سمجھا اور قریبی پتھر پر بیٹھ گئیں۔

”تم نے بتایا نہیں؟“ اشارا نے اُسے دیکھا۔

”کیا؟“

”یہی کہ اشمل لالہ تمہیں کتنے اچھے لگتے ہیں؟“ اُس کی شوخی پھر عود کر آئی تو ہشیمینہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے اُسے دیکھا۔

”بتائوں؟“

”ہاں بتائو۔“

”اتنا جتنا تمہیں ذولین خان اچھا لگتا ہے۔“ اُس کا جملہ بالکل غیر متوقع تھا۔ اشارا ساکت رہ گئی۔ سنہری آنکھوں پر سایہ فگن پلکیں جھک گئیں۔

”ہا، ہا، ہا \_\_\_ اب بتاؤ کہ تمہیں ذولین کتنا اچھا لگتا ہے؟“ ہشیمینہ اُس کی ساری شوخی کو شرم میں بدلتے دیکھ کر ہنسنے لگی۔

”بہت بری ہو تم۔“ وہ خفیف ہو گئی۔

”ارے واہ \_\_\_ میں بری ہو گئی۔ میں نے تو صرف یہی پوچھا ہے جو تم مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔“

اشارا نے بس لمحہ بھر دیکھا اور پھر جھینپ کر پلکوں کی باڑھ دوبارہ گرالی۔

اسی دم دونوں کی نگاہیں چھوٹی سڑک کی جانب اٹھ گئیں جہاں سیاہ جیپ فرائے بھرتی اسی طرف آرہی تھی۔

”اشمل لالہ کی جیپ ہے یہ تو۔“ اشارا ایک دم کھڑی ہو گئی۔ ”لگتا ہے انہیں علم ہو گیا ہے کہ ان کے بارے میں ہم

باتیں کر رہے ہیں۔“ وہ ہنسی۔ پھر ہشیمینہ کو دیکھ کر بولی۔ ”وہ ادھر ہی آرہے ہیں، شاید تمہارا پیچھا کرتے ہوئے۔ گل

بی بی کے گھر جو تم نہیں ملی ہوگی۔“ اُس کی بات پر ہشیمینہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

اشارا کا اندازہ درست تھا۔ جیپ سامنے رک گئی تھی اور اس میں سے اشمل خان اُتر رہا تھا۔

اُس کی کیفیت عجیب سی ہونے لگی۔ نہ جانے کیوں وادی میں ہر بار اُس کا سامنا کرنے پر اُس کی کیفیت ایسی ہی ہو جاتی۔ شاید رومان پرور ماحول کا اثر ہوتا تھا یا پھر اشمیل خان کی بھوری آنکھوں میں ہلکورے لیتے رنگ میں ہی قیامت جھلکتی تھی۔ اُس کا دل پسلیوں میں بے قرار ہو کر مچل اٹھتا

لبوں کی معنی خیز مسکراہٹ اُس کی رگوں میں مچلتے خون میں طوفان مچا دیتی۔ اُسے اشمیل سے بے طرح شرم آنے لگتی۔

وہ ان دونوں کے قریب آچکا تھا۔

سیاہ سوٹ اور سرخ شال میں وہ جھپنی جھپنی اپنے دل کی حالت کو سنبھالنے میں سرخ ہو رہی تھی۔ اُس کے لبوں پر وہی دل موہ لینے والی مسکراہٹ بکھر گئی۔ ہشمنہ نے جلدی سے رخ موڑ لیا۔

”یہ تم کہاں کہاں گھومتی پھر رہی ہو؟“ وہ اُسے نظر انداز کرتا اشارہ سے مخاطب ہوا جو ہشمنہ کی حالت سے خوب محظوظ ہو کر دل ہی دل میں ہنس رہی تھی۔

”مہمانوں کو اپنے علاقے کی سیر کر رہی تھی۔ آپ نہیں جانتے انہیں، یہ گل بی بی کی خاص الخاص مہمان ہیں۔“ اُس نے یہ کہتے ہوئے ہشمنہ کی پشت کی طرف دیکھا۔ سرخ شال کے نیچے سے اُس کی لابی چوٹی نظر آرہی تھی۔

”اچھا۔۔۔ مگر گل بی بی کے تو سارے اہم اہم مہمان جاچکے ہیں۔ پھر یہ کیوں نہیں گئیں؟“ وہ لا پر واہی سے بولا تو اشارہ کے لبوں پر مسکراہٹ چھلک آئی۔

”میں نے کہا نا، یہ خاص الخاص ہیں۔ ارے ہشمنہ! ملونا اشمیل لالہ سے۔“ اُس نے بالکل اچانک اُس کا ہاتھ پکڑ کر رخ اشمیل کی جانب موڑ دیا۔ یہ جملہ بالکل غیر متوقع اور اچانک تھا۔ ہشمنہ سٹپٹا گئی۔

”اچھا۔۔۔ تو یہ ہیں گل بی بی کی خاص مہمان۔“ اُس نے لبوں کا ایک گوشہ دانتوں میں دبا کر اُسے دیکھا۔

”جی۔۔۔ یہ یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں آپ کی۔“

”پڑھتی ہیں یا پڑھتی تھیں؟“ اشمیل کے منہ سے بے ساختہ جملہ پھسلا تھا۔

”تو آپ جانتے ہیں انہیں؟“ اشارہ نے حیرانگی ظاہر کی تو اشمیل گڑ بڑا گیا۔

”مم۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ نہیں بھی، میں انہیں کیسے جان سکتا ہوں؟“

”تو اب جان لیجئے نا۔ ویسے لالہ! وادی کے لوگ جھوٹ بولتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔“ وہ اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی۔ پھر اچانک بولی۔ ”میں بھابی کو دیکھتی ہوں۔ نہ جانے وہ کہاں رہ گئی ہیں۔“ وہ پلٹ کر بھاگی۔ اشمیل اُس کے یوں بھاگنے پر حیران رہ گیا۔ ہشمنہ سمجھ گئی اس نے جان بوجھ کر ان دونوں کو بات کرنے کا موقع دیا ہے۔

وہ دونوں چند ثانیے ایک دوسرے کے مقابل خاموش کھڑے رہے۔ پھر اشمیل خان دھیرے سے بولا۔

”یہ تم عورتیں کوئی راز، راز ہی نہیں رکھ سکتیں۔“

”کیا۔۔۔۔۔ آپ کا مطلب ہے اسے میں نے کچھ بتایا ہے؟“ ہشمنہ نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔

”میرا تو یہی خیال ہے۔“ اُس نے شانے اُچکائے تو ہشمنہ کا چہرہ تپ اُٹھا۔

”آپ کا خیال غلط ہے۔ وہ آپ کی بہن ہے۔ اور ظاہر ہے آپ کی جانب سے ہی اُسے۔۔۔۔۔“ اُس نے بادل خواستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور لب بھیج لئے۔

اشمیل نے اُسے دیکھا وہ خفا سی ہو رہی تھی۔

”ویسے کہتے ہیں لوگ کہ عشق اور مشک چھپ نہیں سکتا۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔“ اُس نے اپنی سرمئی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اُسے بغور دیکھا۔ ”میں آج جا رہا ہوں واپس۔“

”اتنی جلدی؟“ وہ بے ساختہ بول اٹھی۔ پھر جھینپ گئی۔ ”مم۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔۔۔“

”تو کیا تمہارا واپس شہر جانے کا ارادہ نہیں ہے؟“ اُس نے اُس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے پوچھا تو وہ پلکیں اٹھا کر اُسے دیکھنے لگی اور ہولے سے مسکرا دی۔

”سچ کہوں اشمئل! اتنا حُسن، اتنا خلوص اور اتنے پیارے لوگوں کے درمیان سے جانے کو دل نہیں چاہتا۔“ اُس نے سچائی کے ساتھ کہا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے گل بی بی، شاندا نہ، اشتار اسب کے چہرے بنتے اور مٹتے گئے۔

”اس کا مطلب ہے اب جلد کچھ انتظام کرنا ہو گا۔“ وہ ہنسا۔

”اوہ، نہیں۔۔۔۔۔ میرا مطلب یہ تو نہیں تھا۔“ وہ گڑ بڑائی۔

”آج کل شاہ خانم میری شادی کے لئے بے تاب ہو رہی ہیں۔“ اُس نے قدرے توقف کے بعد لاپرواہ سے انداز میں اُسے اطلاع دی۔

”تو پھر کر لیں۔۔۔۔۔ کس نے روکا ہے؟“ وہ پلٹ کر آگے چلنے لگی۔

”جانتی ہوں انہوں نے لڑکی بھی پسند کر لی ہے۔“ وہ اس کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ رک گئی۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑکا۔

”سحر گل اچھی لڑکی ہے۔۔۔۔۔ فیصل ماموں کی بیٹی۔ میں نے سوچا کہ کم از کم منگنی ہی کر لوں۔ مگر پھر۔۔۔۔۔“

”اش۔۔۔۔۔ مل۔۔۔۔۔“ وہ یکدم پلٹی۔ اُس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور لب کپکپا گئے۔ شاہ خانم نے اُس کی زندگی کا فیصلہ کر لیا تھا تو یقیناً اب اشمئل اس سے سرتابی نہ کر پائے گا۔

”سحر گل۔۔۔۔۔“

یہ نام اُس کے سارے وجود کو ہلا گیا۔

”اشمئل! وہ بہت اچھی لڑکی ہے کیا؟“ اُس کی سیاہ خوبصورت آنکھوں کے فرش گیلے ہو گئے تھے۔

”ارے ہشمنہ!“ اشمئل اُس کی بدلتی حالت سے گھبرا کر اُس کی طرف بڑھا۔

”ارے بے وقوف لڑکی! یہ صرف مذاق ہے۔ تم نے سچ سمجھ لیا۔“ وہ مسکرانے لگا۔

”اشمئل! یہ شاہ خانم کا فیصلہ۔۔۔۔۔“

”کم آن ہشمنہ! بی ایزی۔۔۔۔۔ میں نے کہا نا، یہ صرف ایک مذاق ہے بس۔“

”کیا واقعی؟“ اُس نے اپنی بھیگی پلکیں جھپکیں۔

وہ مسکرا رہا تھا۔

اُس کے سارے اندیشے رفع ہونے لگے۔

اتنا خوفناک مذاق۔۔۔۔۔ اُس نے جھر جھری لے کر آنکھیں موند لیں۔ اشمئل نے اُسے دیکھا۔ اُس کے رخساروں کی رنگت پھر لوٹ آئی تھی۔

”ہشمنہ! اتنی شدت سے چاہتی ہو مجھے؟“ اُس نے اُس کے نرم ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں لے لیا۔

اُس کے مذاق میں کہے جملوں نے اُسے لرزایا دیا تھا۔ اُس کی حالت کو یکسر بدل دیا تھا۔ وہ کسی معصوم بچے کی طرح

بلکنے کو تیار تھی۔

”مجھ سے ایسا جان لیوا مذاق نہ کیجئے گا! شامل خان! میرے لئے تو کوئی ایسا خیال ہی بہت برا ہے۔“ اُس نے خود کو

سنجھالا۔

”پاگل لڑکی! تمہیں اس پہاڑی شخص نے چاہا ہے جس کی محبت بھی ان پہاڑوں کی طرح مضبوط، اٹل اور ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔ ہم اڑیل لوگ زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتے ہیں اور اپنی ساری زندگی اسی پر قربان کر دیتے ہیں۔“

اشمل کا لہجہ مضبوط تھا۔ ہشتمینہ کی رگوں میں طمانیت انگیز ٹھنڈک سرایت کر گئی۔

...☆☆☆...

ماہ گل نے دیکھا، سحر گل کی آنکھیں رونے سے سرخ ہو رہی تھیں مگر لبوں پر مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ ایسی جیسے کوئی وزنی بوجھ اُتارنے کے بعد مزدور کے لبوں پر چھا جاتی ہے۔ ایک اطمینان ان سرخ، روئی روئی آنکھوں میں ہلکورے لے رہا تھا۔ دُکھ اور خوشی کے مشترکہ احساس سے اُس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور بے اختیار ماہ گل سے لپٹ گئی۔

”آپی! سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھے خوش ہونا چاہئے یا دکھی۔“ وہ رُندھی آواز میں بولی۔ ماہ گل اُسے تھام کر صوفے پر لے آئی۔ اُسے خیال گزرا کہ وہ شاید اُس کے اور مسعود کے تعلقات استوار ہو جانے پر خوش ہے اور اُس کے اب یہاں سے چلے جانے پر اُداس۔

وہ ہولے سے مسکرائی۔ کیوں سحر! کیا بات ہے؟“ اُس نے اس کا سراونچا کیا۔

اُس کے آنسو اب خشک ہو گئے تھے اور چہرے پر گہری سنجیدگی آویزاں تھی۔

”آپی! فضلہ آئی تھی۔“ اُس نے ٹھہر کر بتایا۔

”فضلہ۔۔۔۔۔ کیوں؟“

”آپی! منصور کا بہت بری طرح ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ منصور، وہی لڑکا جو۔۔۔۔۔“ اُس نے بادل نحواستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ منصور کے ذکر پر اُسے جھجک نے آگھیرا۔

”ہاں، ہاں۔ یاد ہے۔“ ماہ گل نے سر ہلایا۔ ”کس طرح ہو گیا اُس کا ایکسیڈنٹ؟“ وہ پوری طرح متوجہ ہو گئی۔

”فضلہ بتا رہی تھی کہ وہ کسی کالج گرل کے پیچھے آج کل چکر لگا رہا تھا اور اس دن اس کے پیچھے اسکو ٹر بھگا رہا تھا کہ سامنے سے آتے ٹرک نے اُسے کچل دیا۔ اس حادثے میں اُس کی ایک ٹانگ بھی ضائع ہو گئی ہے۔“

”اف، توبہ۔۔۔“ ماہ گل کے دل کو دھچکا سا لگا۔ وہ صوفے سے اُٹھ گئی۔

”بہت بڑا حادثہ تھا۔۔۔ دوسرے بھی کئی گہرے زخم آئے تھے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔۔۔ دوسروں کے گھروں میں آگ لگانے والے خدا کے عتاب سے دنیا میں بھی نہیں بچ سکتے۔ بہنوں، بیٹیوں کے سر سے ردا کھینچنے والے کبھی نہ کبھی

”کئی دن ہو گئے ہیں، بات نہیں ہوئی اُن سے۔“ وہ صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”جی نہیں۔۔۔ کچھ اور بات ہے۔“ سحر گل مسکراتی ہوئی فون کی طرف بڑھی۔



”کہیں اشتراک کے سلسلے میں تو \_\_\_؟“ اُس نے بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا۔ امی بے ساختہ ہنس دیں۔

”آپ نے اُن سے بات تو کی تھی جب ہم حویلی گئے تھے۔ انہوں نے کیا جواب دیا تھا؟“

”ہاں \_\_\_ اسی سلسلے میں تو پوچھنا ہے۔ اس وقت تو انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اُن کے انداز میں انکار ہر گز

نہیں تھا۔ بس انہیں تو مہر و بھائی سے پوچھنا تھا۔“ امی اُٹھ کر اُس کے قریب آگئیں۔ ”تم جلدی سے نمبر تو ملاؤ۔“

”نہیں امی! آپ شاہ خانم کو فون نہیں کریں گی۔“ فروان کی آواز دروازے سے اُبھری تو امی اور سحر گل ایک ساتھ

پلٹیں۔

فروان کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

”میرے اور اشتراک کے رشتے کے سلسلے میں آپ شاہ خانم سے کوئی بات نہیں کریں گی۔“ وہ اندر آگیا۔ اُس کا لہجہ اٹل

تھا۔ سحر گل کو جھٹکا لگا۔

”کیا کہہ رہے ہو فرو! \_\_\_ تم ہوش میں تو ہو؟“ امی استعجاب سے اُس کی طرف بڑھیں۔

”آپ کو میرے لئے اتنی دُور سے لڑکی لانے کی کیا ضرورت ہے \_\_\_ کیا کوئی قریب قریب نظر نہیں آئی؟“ وہ یہ

کہتے ہوئے اطمینان سے پھیل کر بیٹھ گیا۔

”ہائے فروان! \_\_\_ یہ کیا کہہ رہے ہو؟“ سحر گل نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا۔ اُسے اُس کی دماغی حالت پر شک

سا گزرا۔ کہاں وہ اشتراک کے قصیدے پڑھتے نہ تھکتا تھا، اُس کی آنکھوں کی چمک اور لبوں کی مسکراہٹ سحر گل سے

چھپی تو نہ تھی۔ اور پھر وہ ذومعنی جملے۔ یہ سب مذاق تو ہر گز نہیں تھا۔ لاکھ وہ شوخ اور شرارتی تھا مگر اس قدر

بھونڈے مذاق کی توقع فروان سے وہ نہیں کر سکتی تھی۔

”ہاں امی! میں اشتراک سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔“ اُس نے بے حد واضح الفاظ میں کہا تو امی کا منہ بن گیا۔

”یہ تمہارے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں۔“

”کیا \_\_\_؟“ وہ اچھل پڑا۔ ”شادی میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ اور اس میں آپ کی پسند، ہر گز نہیں۔ زندگی مجھے گزارنی ہے

امی! اور ظاہر ہے میں اپنی پسند کو اولیت دوں گا۔ یہ کوئی کھیل تو نہیں ہے۔“ وہ خطرناک حد تک سنجیدہ ہو گیا۔

”ہاں \_\_\_ میں بھی یہی کہتی ہوں کہ یہ کوئی کھیل نہیں ہے۔ میں شاہ خانم سے بات کر چکی ہوں۔ اور انہیں یقیناً کوئی

انکار نہیں ہو گا۔ تم چاہتے ہو میں بات چھیڑ کر اب خود پہلو تہی کروں۔ ہر گز نہیں۔“

”تو آپ نے مجھ سے اس وقت کیوں نہیں پوچھا؟ \_\_\_ مجھ سے بلا اجازت رشتہ کی بات کیوں چھیڑ دی؟“ وہ برہم

ساصوفے سے کھڑا ہو گیا اور امی کو شاک لگا۔

”تم۔۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔۔ فروان! تم بھی زمان کی طرح اب الجھ رہے ہو جب تیر کمان سے نکل گیا ہے \_\_\_ مجھے

اپنی ہی نند کے سامنے رُسو اور ذلیل کرنا چاہتے ہو؟“ وہ صوفے پر ڈھے گئیں۔

فروان کا تانتا چہرہ اور آنکھوں میں جھلکتی پتھر ضد انہیں اندر ہی اندر سے دہلا گئی۔

اُن کے تو کمان میں بھی نہ تھا کہ فروان بھی زمان کی طرح اُسی کے رنگ میں کھڑا ہو گا۔ وہی انداز، وہی

پتھر یا لہجہ \_\_\_ یا الی!

”امی \_\_\_ امی! آپ سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ آپ کیا چاہتی ہیں کہ میں بھی زمان کی طرح اپنے قیمتی جواں سات سال

اسی انداز میں گزار دوں \_\_\_ سرد رویوں اور منجمد جذباتوں کے ساتھ؟ \_\_\_ اور شارد ابھابی کی طرح بے قصور ہوتے

ہوئے بھی اشتراک سے اس قصور وار ٹھہرائی جائے؟ \_\_\_ وہ بھی وہی دُکھ اُٹھائے جو ماہی آپی اور شارد ابھابی نے اُٹھائے

ایک مرد کے ہاتھوں؟“

فروان کی آنکھوں میں گہری یاسیت سمٹ آئی۔ بہر کیف اس دکھ سے کہیں زیادہ اشتاراکو پالینے کا دکھ ہوتا ہے۔ وہ اُس کی تھی ہی کب۔ اُس کا دل جب کسی اور کے نام پر دھڑکتا ہو تو وہ محض جسمانی طور پر اُسے پا بھی لے تو نا آسودہ ہی رہے گا۔

اُس نے بے چینی سے انگلیاں مسلتے ہوئے امی کو دیکھا جو ناگوار نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔ پھر وہ اچانک کھڑی ہو گئیں۔

”اشتاراکو نا پسند کرنے کا جواز کیا ہے؟“ انہوں نے سیدھا فروان کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ پلکیں جھکانے پر مجبور ہو گیا۔

”جو شخص نا پسند نہ ہو، ضروری نہیں کہ وہ پسند ہی ہو۔ بس میں اُسے اپنی کزن سمجھتا ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں۔“ اُس کا لہجہ قطعی تھا۔

”ایسی بے معنی باتیں مت کرو مجھ سے۔ میں جانتی ہوں تمہارے پاس انکار کا کوئی جواز نہیں۔ اور کان کھول کر سن لو \_\_\_\_\_ اشتاراکو میری بہو بنے گی۔ اور میں شاہ خانم سے بات چھیڑ چکی ہوں۔ اور میرا یہ فیصلہ پتھر کی لکیر سمجھ لو۔“ امی کا لہجہ از حد تلخ اور مضبوط تھا۔ وہ رکیں نہیں اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔

فروان نے بے چارگی سے اُنہیں جاتے دیکھا اور پھر لبوں کو دانتوں میں جکڑ لیا۔

”فرو! یہ تم یکایک اتنی بدلی بدلی باتیں کیوں کر رہے ہو؟“ سحر گل اُس کی طرف بڑھی۔ امی کی موجودگی میں وہ فون اسٹینڈ کے پاس دبکی کھڑی ہوئی تھی۔ فروان کی باتوں سے اُس کے اعصاب کو جھٹکا سا لگا تھا۔

”سحر! میں اشتاراکو منافقت کی زندگی گزارتے نہیں دیکھ سکتا۔ نہ ہی اتنا وسیع القلب اور اعلیٰ ظرف ہوں کہ کسی ایسی لڑکی کا شوہر کہلاؤں جو اپنے دل میں کوئی نرم اور روایتی جذبہ نہ لاسکے۔“ وہ بے حد سنجیدگی سے بولا اور سحر گل کو حیران چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

”اف خدایا!“ سحر گل نے لمحہ بھر کو آنکھیں بند کر کے خود کو سنبھالا۔ وہ اتنی کم فہم یا سادہ لوح ہر گز نہ تھی کہ فروان کے جملوں سے اُس کا مفہوم اخذ نہ کر پاتی۔ تو کیا اشتاراکسی اور کو پسند کرتی ہے؟“ اُس نے بے حد تحیر سے سوچا۔

مہروز خان کو گل بی بی نے خصوصی طور پر بلوایا تھا۔ وہ زمینوں سے واپسی پر گل بی بی ہی کی طرف چلے آئے۔ بہن کی شادی کے بعد صبغت خان کا مزاج بھی یکسر تبدیل ہو گیا تھا۔ انہوں نے مہروزان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور خاصی آؤ بھگت کی۔

”آپ تو بڑے لوگ ہیں \_\_\_\_\_ کبھی کبھار غریب خانے پر تشریف لاتے ہیں۔“ صبغت خان کے لبوں پر شکوہ مچل گیا۔ مگر اُن کا انداز جارحانہ نہیں بلکہ شگفتہ تھا۔ مہروز خان مسکرا کر رہ گئے۔ وہ کافی دیر ان کے پاس بیٹھے رہے، پھر اپنے کام پر چلے گئے۔ تب گل بی بی بھائی کے پاس اسپٹھیں۔

”شاندانہ کیسی ہے \_\_\_\_\_ خیریت سے تو ہے؟“ مہروز خان نے پوچھا۔

”ہاں، اللہ کا فضل ہے۔ اور پھر دن ہی کتنے ہوئے ہیں اُسے رخصت ہوئے۔“ گل بی بی نے ان کے سامنے گرم گرم قہوہ رکھتے ہوئے کہا۔ پھر حور مینا کو آواز دینے لگی۔

”مینا! جانو باورچی خانے میں ٹرے رکھی ہے، وہ لے آؤ۔“

”ارے، ارے \_\_\_\_\_ گل! کچھ تکلف مت کرنا بھئی۔“ مہروز خان جلدی سے بولے۔

”شاندانہ کا باپ دے گیا ہے چیزیں۔ اُن کے مزاج کی تو آپ کو خبر ہے، جلدی برامان جاتے ہیں۔“ گل بی بی مسکرائیں اور پھر حور مینا کے ہاتھ سے لوازمات سے سچی ٹرے لے کر مہروز خان کے سامنے رکھ دی۔

”تمہارے شہر کے مہمان چلے گئے؟“

”ہاں۔۔۔ بس نند کی بیٹی ہشیمہ ہے۔ اشارانے اُسے زبردستی روک لیا ہے اُسے۔ اپنے ساتھ حویلی لے کر گئی ہے۔“ گل بی بی نے بتایا۔ ”مہروز لالہ! آپ تو کچھ لے ہی نہیں رہے۔ اگر ٹرے یو نہی سچی رہی نا تو شاندانہ کا باپ مجھ پر خفا ہو گا کہ ہم غریبوں کا شاید حویلی والوں کو کچھ پسند نہیں آتا۔“ گل بی بی کہہ کر مسکرائیں۔ مہروز خان بھی ہنس دیئے۔

”کیسی باتیں کرتی ہو گل!۔۔۔ اچھا، تم نے مجھے بلوایا تھا۔ کیا کوئی خاص بات ہے یا بس یہ ٹرے خالی کرنے کے لئے ہی بلایا تھا؟“ مہروز خان نے کہا تو گل بی بی گہری سوچ میں کھو گئیں۔

وہ الفاظ تلاش کرنے لگیں کہ بات کا آغاز کس طرح کریں۔ کل ذولین نے اُن سے جو کچھ کہا تھا وہ اُن کے لئے بے پایاں خوشی کا باعث تھا۔ مگر کیا خبر مہروز خان اسے کس رنگ میں لیں۔ اور پھر بات صرف مہروز خان تک تو ختم نہیں ہوتی، شاہ خانم کا کردار ہر فیصلہ میں بھرپور ہوتا تھا۔

انہوں نے متفکر سی نظر مہروز خان پر ڈالی۔

”کیا بات ہے گل! تم کچھ پریشان ہو؟“ مہروز خان کو اُن کی خاموشی پر کچھ تشویش ہوئی۔

”بس لالہ! بات میری تو نہیں، مگر ایک طرح سے میری ہی ہے۔“ گل بی بی جیسے خود سے بولیں اور پھر سوچ کر کہنے لگیں۔ ”ذولین، فیروز لالہ کی نشانی ہے۔۔۔ اور میں جانتی ہوں کہ وہ تمہیں بے حد عزیز ہے۔ اشمیل سے بھی زیادہ۔“

”کک۔۔۔۔ کیا ہوا ذولین کو؟“ مہروز خان اُن کی ادھوری بات پر گھبرا گئے۔ یہ حقیقت تھی کہ ذولین ان کے خون میں بس رہا تھا۔ انہیں بے حد عزیز تھا۔

”نہیں لالہ! سب خیریت ہے۔“ گل بی بی جلدی سے بولیں۔ ”در اصل بات یہ ہے کہ میں چاہتی ہوں کہ ذولین کی شادی اشارا سے۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔۔۔“

”گل۔۔۔۔۔“ مہروز خان نے اُس کی بات کاٹ دی اور سر جھکا کر بے چینی سے قہوہ کی پیالی پر انگلیاں پھیرنے لگے۔

”کیوں۔۔۔۔ کیا تمہیں انکار ہو گا؟“ گل بی بی کا دل لرزا۔

”بات میرے انکار کی نہیں۔۔۔ اور پھر یہ تو تمہاری خواہش ہے گل! وہ مجھے بے حد عزیز ہے۔ اس سے مجھے کبھی بھی انکار نہیں۔ لیکن ضروری تو نہیں ہے کہ میں اس سے اپنی محبت کے بدلے یہ فیصلہ اس پر مسلط کر دوں۔ وہ عاقل بالغ ہے۔۔۔ اُسے پورا اختیار ہے۔ اور وہ اس معاملے میں بھی آزاد ہے۔“

”مہروز لالہ! آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔“ گل بی بی زور سے ہنس دیں۔ اُن کے حلق میں انگلی سانسیں پھر سے رواں ہو گئیں۔ انہوں نے ایک نظر مہروز خان پر ڈالی اور پھر آہستگی سے گویا ہوئیں۔

”یہ صرف میری خواہش ہی نہیں، خود ذولین کی بھی یہی خواہش ہے۔ اُس نے مجھ سے خود کہا ہے کہ وہ اشارا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اور کہا کہ میں اس سلسلے میں آپ سے بات کروں۔“

”کیا۔۔۔ ذولین نے تم سے یہ کہا ہے؟“ مہروز خان بے یقینی کی سی کیفیت میں گل بی بی کو دیکھتے رہ گئے۔۔۔ بات صرف رشتے ہی کی نہیں، ذولین کی پسند کی بھی ہو رہی تھی۔



”ہاں \_\_\_ اور سچ پوچھو تو مہر وزلالہ! ذولین تو ہیرا ہے۔ سچا ہیرا \_\_\_ اور پھر ہمارا اپنا خون ہے۔ اُس نے خود اشتارا کا ہاتھ مانگا ہے۔ پہلی بار ہی تو اُس نے کچھ مانگا ہے۔ اُسے مایوس مت کرنا لالہ! \_\_\_ اُسے عزت بخشنا۔“ گل بی بی کی آواز بھاری ہو گئی۔

ذولین کی خاطر تو وہ مہر وزخان سے لڑ کر بھی اُس کی خواہش کا دم بھرنے کو تیار تھیں۔ کتنے چائو سے اُس نے کہا تھا \_\_\_ ”گل بی بی! میں اشتارا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا میں اس قابل ہوں؟“ اس لمحے اُس کی سبز آنکھوں میں کتنے ہیرے دمک رہے تھے۔ لبوں پر کتنی دلفریب مسکراہٹ سجی تھی۔ اور انہوں نے پیار سے اس کی فراخ پیشانی چوم لی تھی اور اسی لمحے سوچ لیا تھا کہ وہ اُس کی آنکھوں میں دکتے یہ سپنے بکھرنے نہیں دیں گی۔

اُدھر مہر وزخان کے دل میں اس نرم جملے نے عجیب سی کیفیت پیدا کر دی تھی جو بیک وقت انہیں سرشار بھی کر گئی اور ملول بھی۔ گل سچ ہی تو کہہ رہی تھی کہ اتنے برس گزر گئے، اس بن ماں باپ کے بچے نے اُن سے کچھ بھی تو نہیں مانگا تھا۔ محبت اور توجہ بھی نہیں۔ وہ تو خود ہی محبت لٹاتے آئے تھے اُس پر۔

کتنا صابر تھا وہ \_\_\_ اور وہ کتنے لاپرواہ ہو گئے تھے اُس سے \_\_\_ اتنا توانا جوان ہو گیا تھا \_\_\_ اور ابھی تک اُس کی شادی کا سوچا تک نہ تھا۔ شاہ خانم، اشمیل کی شادی کے لئے کتنی بے چین تھیں۔ ماں تھیں اسی لئے جوان اولاد کی خوشیاں اور دُکھ نظر میں رکھتی تھیں۔ مگر ذولین؟

”نجانے میں نے اپنی ذمہ داری میں کہاں کہاں کوتاہیاں کی ہوں گی \_\_\_ کہاں کہاں نا انصافی کا مرتکب ہوا ہوں گا \_\_\_“ یہ خیال، یہ احساس اُن کے خون میں اب بھی سلگ رہا تھا۔

”تم نے کوئی جواب نہیں دیا لالہ!“ گل بی بی دھیرے سے بولیں۔

”آں \_\_\_ ہاں \_\_\_ کیا جواب دوں گل! ایسی خوشی، ایسا سرور تو دل نے کبھی محسوس نہیں کیا \_\_\_

یوں لگ رہا ہے جیسے سینکڑوں پھول میرے قلب میں مہک اُٹھے ہوں۔ میرے بیٹے نے مجھے بے پناہ مسرور کر دیا ہے \_\_\_ یہ صرف اُس کی خواہش تو نہیں، یہ تو میری تمنا تھی۔“ مارے خوشی کے ان کی آواز کانپ رہی تھی اور آنکھوں میں ڈھیر سارے جگنو چمکنے لگے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

”ارے \_\_\_ آپ بیٹھے تو۔“ گل بی بی انہیں اٹھتا دیکھ کر بولیں۔

”نہ \_\_\_ اب تو بیٹھا بھی نہیں جا رہا۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھے۔

”میں ذولین سے کیا کہوں لالہ؟“ گل بی بی بھی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔ مہر وزخان رُکے، پلٹے اور مبہم سے مسکرائے۔

”تو کیا اب بھی میرے کچھ کہنے کی ضرورت باقی رہتی ہے؟“ گل بی بی مسکرا دیں۔ اور پھر ان کے قریب آکر بولیں۔

”میں جانتی تھی \_\_\_ میرا دل کہتا تھا کہ آپ کا جواب اقرار میں ہی ہو گا۔ آپ ذولین کے پیام کو ہر گز نہیں ٹھکرائیں گے \_\_\_ مگر لالہ! \_\_\_ شاہے تو یہ برداشت نہ کر پائے گی۔“ انہوں نے اپنے دل میں دھڑکتے خدشے کو زبان دے دی تو مہر وزخان کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اُن کا چہرہ تن گیا۔

”اشتارا میری بیٹی ہے۔ اُس پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا شاہے کا \_\_\_ اور آج تک اس نے جو چاہا وہی کیا ہے۔۔۔۔۔ اب کچھ فیصلے اسے میرے بھی قبول کرنے ہوں گے۔“ وہ یہ کہہ کر سرعت سے باہر نکل گئے۔

گل بی بی کے گھر سے وہ سیدھے حویلی میں آ گئے۔ مگر رہائشی حصے کی طرف جانے کی بجائے ان کے قدم انیکسی کی طرف اٹھ رہے تھے۔

حویلی کے بیرونی حصے اور لان کی بتیوں نے پوری حویلی کو جگمگادیا تھا۔ ڈھلتی شام سے ہی حویلی کو روشنیوں سے نہلا دینے کا حکم شاہ خانم کا تھا۔



انیکسی کے کوریڈور کا بڑا سابلب بھی روشن تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ذولین انیکسی میں موجود تھا۔ وہ اتنی مدت بعد انیکسی کی طرف آئے تھے، ورنہ ہمیشہ ذولین ہی ان کے پاس آتا تھا، کبھی سلام اور خیریت پوچھنے یا کبھی کسی ضروری کام کے سلسلے میں وہ رہائشی حصے کی طرف آتا تھا۔ ورنہ ان دونوں کی ملاقات زمینوں پر ہی ہوتی تھی۔ اُن کے قدم تیزی سے اُٹھ رہے تھے۔

اپنے بیڈروم سے نکلتے ہوئے ذولین ٹھٹک گیا۔

”چچا خان۔۔۔۔۔۔ آ۔۔۔۔۔۔ آپ یہاں۔۔۔۔۔۔“ اُس کی آنکھوں میں تحیر آمیز بے یقینی تھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔ کیا بیٹھنے کو نہیں کہو گے؟“ مہروز خان مسکرائے تو وہ جلدی سے سنبھل گیا۔

”آں۔۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔۔ کیوں نہیں۔ پلیز، بیٹھے نا۔“ اُس نے جلدی سے سٹنگ روم کا پردہ کھینچ کر کھولا تھا اور مہروز خان صوفے پر بیٹھ گئے۔

”تمہاری یہ حیرانگی بجا ہے۔۔۔۔۔۔ کبھی میں یہاں آیا جو نہیں۔۔۔۔۔۔ ہے نا؟“ انہوں نے محبت آمیز نظروں سے اُسے دیکھا تو وہ ہنس دیا۔

”آپ بیٹھے۔۔۔۔۔۔ میں آپ کے لئے قہوہ بنا کر لاتا ہوں۔“

”نہیں۔۔۔۔۔۔ کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔“ اُسے پلٹتے دیکھ کر مہروز خان صوفے سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

”ذولین! آج میں بہت خوش ہوں۔“ انہوں نے ذولین کے مضبوط شانوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ ”تم نے مجھے سرخو کر دیا ذولین! میرے سارے خدشوں کو تم نے دور کر دیا۔“ ان کے لہجے میں تشکر تھا۔ ذولین نے اشارہ کا ہاتھ مانگ کر انہیں فخر ہی تو بخش دیا تھا کہ وہ ذولین کی ذمہ داری سنبھالنے میں کامیاب رہے ہیں۔ وہ اُن سے،

اُن کے خاندان سے خائف ہر گز نہیں ہے۔ اب ایک نیا رشتہ جوڑنا چاہتا ہے، اپنی خوشی سے۔

”میں سمجھا نہیں چچا خان!“ وہ ابھی تک حیران تھا۔

اُن کا انیکسی میں آنا۔

اُن کی آنکھوں کی جگمگاہٹ۔

اب یہ جملے۔۔۔۔۔۔

یہ سب کی سمجھ سے بالا تر تھے۔

”ارے میں نے تو تمہیں پریشان کر دیا۔“ مہروز خان اچانک پیچھے ہٹے اور مسکرائے۔ انہوں نے بروقت خود کو سنبھالا۔

”جاؤ، قہوہ بنا لاؤ۔۔۔۔۔۔ آج میں تمہارے پاس بہت دیر تک بیٹھ کر باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ انہوں نے پُر سکون انداز میں کہا اور صوفے پر بیٹھ گئے۔ اور ذولین ان کے حکم کی بجا آوری کے لئے تیزی سے کچن کی سمت بڑھا۔ مگر پھر رک گیا۔ احمد جان تو اس وقت تھا نہیں۔ رات کا کھانا تیار کر کے وہ آج جلدی ہی چلا گیا تھا۔

وہ پلٹا اور بابا خان کے پاس آیا۔

”چچا خان! کیا میرے ہاتھ کا بنا قہوہ برداشت کر سکیں گے؟“ اُس نے کہا تو مہروز خان ہنس دیئے۔

”ہاں۔۔۔۔۔۔ تمہارے ہاتھ کا ہی بیٹنا چاہتا ہوں۔“

”اوکے۔۔۔۔۔۔“ وہ واپس پلٹ گیا اور تھوڑی دیر بعد وہ قہوہ کے کپ اٹھائے سٹنگ روم میں آگیا۔

”ان کاموں میں بالکل انڈری ہوں۔“ اُس نے ایک پیالی مہروز خان کی طرف بڑھاتے ہوئے اپنی نااہلی کا اعتراف کیا تو مہروز خان ایک شفیق مسکراہٹ سے اُسے دیکھنے لگے اور پھر دھیرے سے بولے۔

”میں گل کے گھر سے سیدھا یہیں آیا ہوں۔“

ذولین ساکت رہ گیا۔ قہوہ کی پیالی جیسے اُس کے لبوں پر چپک گئی۔ ”تو پھر گل بی بی نے ضرور ان سے اشتراک کے بارے میں بات کی ہوگی۔ تو کیا ان کی خوشی کا سبب یہی بات ہے؟“

اُس نے دھڑکتے دل کے ساتھ مہروز خان کی طرف دیکھا جو پیالی پر نگاہیں لگائے کچھ سوچ رہے تھے۔

وہ دوبارہ اپنی سابقہ حالت میں آگیا اور دھیرے دھیرے قہوہ پیئے لگا۔ تب مہروز خان بولے۔

”ذولین بیٹے! مجھے ہمیشہ یہ خوف دامن گیر رہا ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ نجانے انصاف بھی کیا ہے کہ نہیں۔ اپنی اولاد سے کم تو تمہیں نہیں چاہا، تمہارا دل میری محبت سے سیراب بھی ہوا ہوگا کہ نہیں؟“ انہوں نے پیالی میز پر رکھ دی۔

”یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں چچا خان! آپ ہی تو میرے لئے وہ مضبوط شجر ہیں جس نے مجھے بچپن سے اب تک بے سائبان نہیں ہونے دیا۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”آپ کے یہ اتنے احسانات کیسے چکائوں گا؟“ مقروض تو میں ہوں آپ کا چچا خان!“

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں ذولین! میرے بچے!“ مہروز خان کا دل بھاری ہو گیا۔ ”تم نے اشتراک ہاتھ مانگا ہے تو اس پر تمہارا ہی حق ہے۔ اشتراک میری بیٹی ہے اور تم میرے بھائی کے بیٹے۔ میرا خون۔۔۔۔۔ پھر بھلا مجھے کیونکر انکار ہوگا۔“

”چچا خان۔۔۔۔۔“ ذولین ساکت رہ گیا۔

وہ کھڑے ہو گئے۔ اُن کے لبوں پر خود اعتمادی اور یقین سے بھرپور مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

وہ بے تابانہ اُن کی طرف بڑھا اور مہروز خان نے اُسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

”چچا خان۔۔۔۔۔ آ۔۔۔۔۔ آپ نے مجھے۔۔۔۔۔“ اُس نے بہت کچھ کہنا چاہا۔ تشکر بھرے جملے۔ مگر جذبات کی یورش نے اُس کی قوت گویائی جیسے سلب کر لی تھی۔

”تم تو ہمیشہ سے میرے بیٹے ہو۔“ بابا خان نے اُس کی کشادہ پیٹھ تھپکی اور اس سے الگ ہو کر محبت سے اسے دیکھا۔

مہروز خان کے یہ جملے مثل آبِ حیات تھے جو ذولین خان کی پورپور میں زندگی کا نیا رس گھول گئے۔

اُس سے یہ خوشی سنبھالنے نہ سنبھل رہی تھی۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے لکھت اُس کے اطراف ڈھیر سارے پھول کھل اُٹھے ہوں۔ ایسے پھول جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے اور ان کی خوشبو بالکل مانوس سی تھی۔

اُس کی قسمت کی تحریر چمک اُٹھی تھی۔

آج مہروز خان نے اُس کے سارے اندیشوں کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ اُس کے تمام وہموں اور خوف کی چادر کو کاٹ دیا تھا۔ اب اُس کی آنکھوں کے سامنے روشنی ہی روشنی تھی۔

مہروز خان جا چکے تھے۔ مگر وہ ابھی تک اسی سحر میں کھویا ہوا تھا اور کھویا ہونا چاہتا تھا۔

☆☆☆☆...

اُن دونوں نے مکان کے تمام افراد کو اپنی ریوالور کی زد میں لیا ہوا تھا۔

یہ پانچ افراد پر مشتمل گھرانہ ان دونوں اجنبیوں کے ریوالور سے بری طرح خوفزدہ تھا۔ سب سہمے ہوئے دیوار سے لگے کھڑے تھے۔

”اگر کسی نے بھی ہلنے کی یا کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں بے دریغ اُسے گولیوں سے چھلنی کر دوں گا“  
ریحان پراچہ غرایا۔

”مم۔۔۔۔۔ مگر ہمارا قصور۔۔۔۔۔؟“ آدمی منمنایا۔

”تم لوگ اگر ہمارا بھرپور ساتھ دو گے تو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ ہمیں بس تھوڑی دیر یہاں ٹھہرنا ہے۔ پولیس کہیں اور نکل جائے گی تو ہم بھی چلے جائیں گے۔“ یاور نے کہا اور پھر ریحان کی طرف دیکھا۔

”میرے خیال میں پولیس کہیں دوسری طرف نکل گئی ہے۔“ اُس نے کہا تو ریحان کھڑکی کی طرف بڑھا اور باہر کا جائزہ لیا۔ اُسے کچھ نظر نہ آیا تو جیسے اُس کی انگی سانسیں بحال ہوئیں۔ اُس کا ریوالور والا ہاتھ پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ وہ پلٹا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔۔۔ پولیس شاید آگے نکل گئی ہے۔“ وہ چلتا ہوا اس کے پاس آگیا۔

”ہوں۔۔۔۔۔“ یاور اُس سے باتیں کرتے ہوئے بھی ان پانچ نفوس سے غافل ہر گز نہیں تھا۔ مگر وہ کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ اُس نے اُن کی طرف دیکھا۔

”ایسا کرو تم سب اس کمرے میں چلے جاؤ۔“ اُس نے ایک کمرے کے کھلے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

”ک۔۔۔۔۔ کیوں جی؟“ عورت روہانسی تو پہلے ہی تھی، اب رودی۔

”اوہو۔۔۔۔۔ جو کہہ رہے ہیں وہ کرو۔“ ریحان دھاڑا۔ اور پھر ان سب کو کمرے میں دھکیل دیا اور باہر سے کنڈالگا

دید۔

”اب۔۔۔۔۔“

”اب کچھ سوچنا ہے۔۔۔۔۔ یعنی آگے کالائے عمل۔“

”یاور۔۔۔۔۔ یاور! اس طرح آخر کب تک۔۔۔۔۔؟“ ریحان جھنجلا گیا اور سامنے رکھی ٹوٹی ہوئی میز کو پیروں سے دُور اُچھال دید۔

”یار۔۔۔۔۔ تم تو بالکل ناکارہ ہو۔۔۔۔۔ صبر میرے شہزادے!۔۔۔۔۔ یہ آگ کا کھیل ایسا ہی ہوتا ہے۔ صرف اس کھلونے کو چلانا کوئی کام نہیں۔“ یاور نے ریوالور کو اچھالا۔ وہ اُس کی بے بسی پر کھل کر ہنس رہا تھا۔ پھر وہ اسی کھڑکی کی طرف بڑھا۔ ”اب مل کر ہی کوئی حل سوچیں گے۔“ اُس نے یہ کہہ کر کھڑکی کا پیٹ کھول دید۔ مگر دوسرے ہی لمحے دہشت سے پیچھے ہٹا۔

”ری۔۔۔۔۔ حان۔۔۔۔۔ ہم۔۔۔۔۔ پ۔۔۔۔۔ پ۔۔۔۔۔ پولیس کے گھیرے میں ہیں۔“ اُس کی کپکپاتی آواز اُبھری جو ریحان کو دہلا گئی۔

”ک۔۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔۔؟“

”ہاں۔“ اُس نے جلدی سے کھڑکی کے پیٹ بند کر دیئے۔ ”اس مکان کے چاروں طرف پولیس ہے۔“ وہ پلٹ کر ریحان کے پاس آیا۔ اُس کی آنکھوں میں خوف بھرا تھا۔ ”ریحان!۔۔۔۔۔ یہ بہت برا ہوا۔۔۔۔۔“

اسی لمحے لائوڈا سپیکر پر بھاری آواز گونجی۔

”تم دونوں اپنے ہتھیار پھینک کر خود کو پولیس کے حوالے کر دو۔۔۔۔۔ پولیس تمہیں چاروں طرف سے گھیر چکی

ہے۔ اس لئے اب تمہاری کوئی کوشش بے کار ہوگی۔“ یہ جملہ بار بار دہرایا جا رہا تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل خاموش کھڑے تھے۔ پھر یاور بولا۔

”یار ریحان! اب خود کو پولیس کے حوالے کر دینا ہی بہتر ہے۔“ اُس نے یہ کہہ کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اُس کا ریو اور والا ہاتھ لٹک گیا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔“ ریحان چلا لیا۔ اُس کی آواز میں غراہٹ تھی۔ ”ہرگز نہیں۔“

”کیا۔۔۔ کیا کرو گے اب تم۔۔۔۔۔؟“ یاور کو اُس کی دماغی حالت پر شک ہونے لگا۔

”فرار۔۔۔“ اُس نے بدستور اسی انداز میں کہا تو یاور بے بسی سے ہنسنے لگا۔

”فرار۔۔۔ کس سے فرار؟۔۔۔ پولیس چاروں طرف کھڑی ہے۔ اب کوئی راستہ نہیں ہے فرار کا۔“

”تو پھر اس طرح ہتھیار پھینک کر خود کو پولیس کے حوالے کر دینا گویا موت کو گلے لگانا ہی ہوا۔“

”نہیں۔۔۔ ہو سکتا ہے مقدمے میں کوئی بات بن جائے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں محسوس کر رہا ہوں اب آگے کوئی چانس نہیں۔ پایا اگر کچھ کر سکتے تو اس وقت پولیس ہمارے تعاقب میں یوں بھیڑیوں کی طرح نہ نکلتی۔“ اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وہ چند لمحے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ پھر اچانک کھڑکی کی سمت بھاگا۔

”ریحان!۔۔۔۔۔ یہ کیا کر رہے ہو؟“ یاور اُس کے ارادوں کو بھانپ گیا۔ مگر اس اثناء میں وہ کھڑکی سے چھلانگ لگا چکا تھا اور ساتھ ہی اپنے ریو اور سے فائرنگ کرتے ہوئے دوڑ لگا دی۔ اور پھر یکایک پولیس کی طرف سے جوابی فائرنگ ہونے لگی۔

”اوہ مائی گاڈ۔۔۔۔۔۔“ یاور نے خوفزدہ ہو کر کھڑکی پر سر ٹکا کر جیسے اس اندوہناک منظر سے بچنے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ ”یہ۔۔۔۔۔۔ یہ بہت برا کیا ریحان تم نے۔“ اُس کے سارے بدن پر کپکپی طاری ہونے لگی۔

”یہی بہر حال ہونا تھا۔“ ڈی ایس پی منظور احمد کی آواز گونجی تو وہ پلٹا۔ ”یہ ہتھیار پھینک دو اور خود کو ہمارے حوالے کر دو۔“

یاور نے ریو اور ڈی ایس پی کی طرف اُچھال دیا۔ ”اب اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے انسپکٹر!“ اُس کے لہجے میں برسوں کی تھکن تھی۔

”بدی کا انجام یہی ہوتا ہے۔۔۔ دیر سویر۔۔۔ بدلہ ضرور ملتا ہے مسٹر یاور!۔۔۔ بزدل ہو یا بہادر، مجرم بہر حال کبھی نہ کبھی سزا ضرور پاتا ہے۔ اپنی بہادری اور چالاکی کی وجہ سے وہ زیادہ سے زیادہ چند ماہ یا چند سال قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتا ہے مگر۔۔۔۔۔۔“

”وہ۔۔۔۔۔۔ ریحان۔۔۔۔۔۔“ یاور نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

”وہی ہوا، جو ایک نادان دہشت گرد کا انجام ہوتا ہے۔“

”کیا۔۔۔“ یاور اُچھلا۔ اُس کی سمجھ میں قطعی کچھ نہیں آیا۔

سپاہی اُس کے ہتھکڑی لگا کر باہر لے آیا۔ تب یاور کو اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

خون سے لت پت ریحان کو پولیس کے سپاہی اٹھائے جیپ میں ڈال رہے تھے۔

...☆☆☆...

شاہ خانم کی نگاہیں بار بار پھیل کر ہشمنہ کے چہرے پر اٹھ جاتیں اور کتنی ہی دیر وہ بغیر پلکیں جھپکے اُسے تک جاتیں۔



اُن کی بھوری بھوری آنکھوں میں نمانوس سے رنگ چمکتے، پھر معدوم ہو جاتے۔

پیازی رنگ کے سوٹ میں دمکتی رنگت، سیاہ دراز چوٹی جو آگے جھول رہی تھی، ستواں ناک میں سرخ نگوں والی کیل \_\_\_\_\_ وہ اس قدر دلکش لگ رہی تھی یا نہیں محسوس ہو رہی تھی۔

اور ادھر ہشمنہ، شاہ خانم کی نگاہوں کی محویت سے کبھی کبھار گھبرا جاتی۔ اشارا اُسے زبردستی اپنے ہمراہ حویلی لائی تھی۔ وہ واپس شہر جانے والی تھی اور اشارا اس سے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اُسے اب ہشمنہ، اشمل کے حوالے سے اور بھی اپنے قریب محسوس ہو رہی تھی۔

وہ دونوں کبھی کمرے میں بیٹھ کر ہنسی مذاق کرتیں، کبھی سٹنگ روم کے صوفے پر ٹک جاتیں تو کبھی باتیں کرتی ہوئی بغلی لان میں نکل جاتیں۔

شام ڈھلنے لگی۔ تب صبغت خان آئے تھے۔ ہشمنہ کو بلا یا۔ تب وہ شاہ خانم سے پہلی بار مخاطب ہوئی۔

”اچھا آئی! اب میں جانوں گی۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے شاہ خانم کی آنکھوں کو غور سے دیکھا جو بالکل اشمل کی آنکھوں سے مشابہہ تھیں

”شہر چلی جانو گی؟“ شاہ خانم نے پوچھا۔

”جی۔“

”کیوں \_\_\_\_\_ اتنی جلدی؟“ شاہ خانم سنبھل کر کرسی پر بیٹھ گئیں \_\_\_\_\_ وہ گل بی بی سے تعلق رکھنے کے باوجود انہیں اچھی لگی تھی \_\_\_\_\_ وہ بہت متانت سے اس سے بات کر رہی تھیں۔

”بس \_\_\_\_\_ بہت رہ لیا۔“ وہ ہنسی۔ ”اب تو شان بھی چلی گئی ہے۔“

”وادی میں شاندا نہ سے زیادہ بھی ایک اہم شخصیت ہے۔“ اشارا آہستگی سے بولی اور پھر ہنسنے لگی۔ وہ جھینپ گئی۔ اور اس کے ساتھ باہر آگئی۔

اشارا اُسے باہر تک چھوڑنے آئی تھی۔ اور تب تک کھڑی ہاتھ ہلاتی رہی جب تک وہ صبغت خان کی جیب میں بیٹھ کر اُس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

وہ شاندا نہ کی شادی کے بعد بالکل تنہا سی ہو گئی تھی۔ اشمل بھی اپنی رونقوں سمیت چلا گیا تھا اور شاندا نہ بھی پرانی ہو گئی تھی۔ اور سچ تو یہ تھا کہ اب اُسے ذولین سے بھی شرم آتی۔ اُس کی نگاہوں کی والہانہ چمک اُس کے حواس کو منتشر کر ڈالتی۔

وہ واپس آئی تو ٹھٹک گئی۔ بابا خان انیکسی سے نکل کر رہائشی حصے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ذولین انیکسی کے کوریڈور میں کھڑا تھا۔ وہ حیران رہ گئی۔ بابا خان انیکسی میں ذولین کے پاس گئے تھے \_\_\_\_\_ کیوں؟ اُس کی یہ حیرانگی فطری عمل تھا۔ کیونکہ مہروز خان کو طویل عرصہ ہو چکا تھا خود انیکسی میں گئے ہوئے۔

اُسے دیکھ کر ذولین کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ وہ رینگ پر ہتھیلیاں ٹکائے اب بغور اسی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ اچانک پلٹی۔ بابا خان اُس کے قریب سے گزر کر اندر بڑھ گئے تھے \_\_\_\_\_ اُن کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی اور وہ کسی خوشی میں مگن تھے۔

رات کے کھانے کے بعد شاہ خانم اپنے کمرے میں تھیں اور اپنی مخصوص چیئر پر بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔

مہروز خان نے انہیں غور سے دیکھا۔ وہ کسی حد تک تروتازہ اور خوش رنگ موڈ میں تھیں۔

”خیریت تو ہے؟“ شاہ خانم چونکیں۔ مہروز خان کی نگاہیں مسلسل انہی پر مرکوز تھیں۔

”کچھ باتیں کرنی ہیں تم سے۔“

”ہاں کہئے، کیا کوئی اہم بات ہے؟“

”ہوں۔۔۔ ہاں، بہت اہم۔“ مہروز خان مسکرائے پھر اٹھ کر دروازہ کاپٹ کھول کر ایک نظر لان کے جامد سناٹے پر ڈالی۔

”شاہ! اس وسیع کائنات میں انسان ہی وہ خوش نصیب مخلوق ہے جو محبت جیسے جذبے سے آشنا ہے۔ اسے سمجھتا اور حاصل کر کے دل روشن رکھتا ہے۔ محبت ہر روپ، ہر رشتے میں خوبصورت ہے۔۔۔ ہے نا؟“ انہوں نے شاہ خانم کو دیکھا جو حیران نظروں سے انہیں ہی تک رہی تھیں۔

”کیا بات ہے۔۔۔ آپ کو آج اپنی جوانی یاد آرہی ہے۔۔۔ یہ محبت پر بے لاگ تبصرہ۔“ وہ ہنسیں تو مہروز خان کے لب و لہجے، پھر باہم جڑ گئے۔

”جوانی نہیں۔۔۔ ہاں، وہ بیتے دن ضرور یاد آرہے ہیں۔ آج فیروز لالہ بہت شدت سے یاد آرہے ہیں شاہ!۔“ ان کی آواز بو جھل ہو گئی۔

فیروز خان کے نام پر شاہ خانم کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ انہوں نے خود کو سنبھالے رکھا۔

”آپ کچھ کہنا چاہتے تھے مجھ سے کچھ باتیں۔“

”ہاں شاہ بانو!۔۔۔ آج میں اپنا ایک فیصلہ تمہیں سنانا چاہتا ہوں۔ میں ذولین سے اپنی محبت اور اپنے رشتے کو اور بھی مضبوط کر رہا ہوں۔۔۔ میں اشترا سے اُس کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اُن کا لہجہ بے حد پُر سکون تھا۔

مہروز خان کا جملہ شاہ خانم کے لئے دھماکہ سے کم نہ تھا۔۔۔

انہیں لگا جیسے ان کے بے حد قریب کوئی بم بلاسٹ ہوا تھا۔۔۔ اور وہ کتنے ہی ثانیے اپنی جگہ سُن سی کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہو گئی تھیں۔

”وہ فیروز لالہ کی نشانی ہے۔۔۔ میرا خون ہے۔ اور پھر اشترا کے لئے بھی ہر لحاظ سے قابل ہے۔ اب کسی تردد کی گنجائش نہیں نکلتی۔“

مہروز خان نے کھڑکی کا پردہ گرا دیا۔

”کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔۔۔۔ یہ ہر گز نہیں ہو سکتا۔“ وہ یکدم ہوش میں آکر سخت برہمی کے ساتھ اپنی کرسی سے کھڑی ہو گئی تھیں۔

مہروز خان نے انہیں دیکھا مگر ان کے جملہ نے انہیں قطعی حیران، پریشان نہیں کیا تھا۔ وہ جانتے تھے شاہ اس فیصلے کو قطعی قبول نہیں کرے گی۔ ان کا رویہ اس سلسلے میں منفی ہی ہو گا۔ مگر اب وہ اپنے سارے اختیارات استعمال کرنا چاہتے تھے۔

”آپ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں اشترا کا رشتہ فروان سے طے کر چکی ہوں۔ اور ذولین سے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ ہنوز اسی برہمی سے گویا ہوئیں تو مہروز خان کا چہرہ تن گیا۔

”ذولین سے تمہاری یہ خود ساختہ نفرت میرے فیصلوں میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتی۔ اس اندھی نفرت نے تمہارے ذہن کو مسخ کر دیا ہے۔۔۔ تمہارے پاس سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں نہیں رہیں۔“

”مہروز خان!“ شاہ خانم بھڑک اُٹھیں۔

”فروان! اشترا سے ایک سال چھوٹا ہے۔ اور پھر آن میچور ڈ۔ ابھی اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہے۔ محض تمہارے بھائی کی اولاد ہے، اس لئے تم نے آنکھیں بند کر کے سارے فیصلے اُس کے حق میں دے دیئے۔“ نہیں شاہ بیگم! میری نرمی کا ناجائز فائدہ تم نے بہت اٹھالیا۔ سارے رشتوں کو تم نے نفرت کی بھٹی میں جھونک رکھا ہے۔ اب یہ سب کچھ نہیں ہوگا۔ اب میں جو چاہوں گا وہی ہوگا۔“ مہروز خان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھے۔

شاہ خانم کی رگوں میں انگارے دوڑنے لگے۔

”تم یہ قدم میرے جیتے جی نہیں اٹھا سکتے۔۔۔ میری زندگی اب اس عمر میں کسی انقلاب سے دوچار نہیں ہونا چاہتی۔“ وہ مہروز خان کے پیچھے لپکیں۔

اشعار اپنے کمرے سے تیزی سے باہر نکلی تھی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ بابا خان کے کمرے سے بابا خان کی اتنی بلند اور تیز آواز اُبھری تھی۔ نہ صرف ان کی بلکہ شاہ خانم بھی تیز تیز بول رہی تھیں۔ اُس کا دل دہل گیا۔ ”خدا یا! اب کون سا نیا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا ہے؟“ اُس نے لمبی راہداری عبور کی کہ زمیل اُس کے سامنے آگئی

”خان زادوی! اپنے کمرے میں چلی آؤ۔“ زیبیل نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

”کک۔۔۔۔ کیا ہوا زیہ؟۔۔۔۔ یہ شور کیسا ہے؟ بابا خان کس پر خفا ہو رہے ہیں؟ کک۔۔۔۔۔ کہیں مجھ سے تو کوئی غلطی۔۔۔۔؟“ اُس کا چڑپا جتنا دل دھک دھک کرنے لگا۔

اب سٹنگ روم سے آوازیں آرہی تھیں۔ شاہ خانم، مہروز خان کے پیچھے سٹنگ روم میں آئی تھیں۔

زیبل، اشتراکو واپس کمرے میں لے آئی۔

”وہی ہوا ہے خان زادی! جو ایک دن ہونا تھا۔“ اُس نے اشتاراکو دیکھا جو سخت خوفزدہ دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کی سنہری آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی تھی۔ زیبل نے آگے بڑھ کر اُسے تھام کر صوفے پر بٹھا دیا۔

”تمہاری اور ذولین خان کی شادی کا مسئلہ۔“ زیبل نے دھیرے سے کہا۔ ”میں نے کچھ سنا تو نہیں مگر اتنا اندازہ ہو گیا ہے، مہروز خان تمہاری شادی ذولین سے کرنا چاہتے ہیں اور شاہ خانم مخالف ہیں۔“

وہ دم بخود رہ گئی۔

”ذ۔۔۔۔۔ذ۔۔۔۔۔بابا خان ذولین سے؟“ اُس کے لب کپکا گئے۔ بابا خان اُس کے لئے شاہ خاں سے لڑ رہے تھے۔ اُس کی حمایت میں کھڑے ہو گئے تھے۔ اُس کی حالت غیر ہونے لگی۔

اُسے یکدم یاد آیا، بابا خان شام کو انیکسی سے نکل رہے تھے۔

’تو کی زولین خان نے اُن سے اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے؟‘ اُف۔ اُس نے اپنے دھڑکتے دل پر بے اختیار ہاتھ رکھ دیا۔

سُننگ روم میں اب خاموشی چھا گئی تھی۔ شاہ خانم شاید اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔ زیبل اُسے چھوڑ کر کمرے سے نکل گئی تھی۔ وہ ہسٹکی سے صوفے سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ تب بابا خان کی بھاری آواز نے اُس کے قدم جکڑ لئے۔

”اشترا! ادھر آؤ۔“ انہوں نے سنگ روم کے دروازے میں کھڑے کھڑے اُسے پکارا تو وہ پلٹی اور جلدی سے ان کے قریب آئی۔

”ادھر آؤ \_\_\_\_\_ بیٹھو۔“ انہوں نے کہا تو اُس نے دھڑکتے دل کو سنبھالا اور جلدی سے صوفے کے کنارے ٹپک گئی۔

مہروز خان اُس کے سامنے بیٹھ گئے۔ اُن کی رنگت دمک رہی تھی اور سبز آنکھوں میں غصہ لہرا رہا تھا۔ وہ چند ثانیے سر جھکائے کسی خلفشار کا شکار رہے، پھر سر اٹھا کر اشارہ کی طرف دیکھا جو ڈری سہمی بیٹھی تھی۔ انہیں بے ساختہ اس بے ضرر لڑکی پر ٹوٹ کر پیار آگیا۔

”ادھر میرے پاس بیٹھو اشارہ بیٹے!“ ان کے چہرے کا تناؤ کم ہو گیا اور لہجے میں ڈھیر ساری چاشنی گھل گئی۔ انہیں اشارہ بے حد عزیز تھی۔ وہ اٹھ کر ان کے قریب بیٹھ گئی اور حیرت پاش نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”بیٹی! میں جانتا ہوں کہ اس حویلی میں، اس وادی میں بلکہ اس پورے معاشرے میں بیٹیوں کو ان کے تمام حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ مگر میں ایسا نہیں چاہتا۔ تمہیں تمہارے کسی جائز حق سے دستبردار نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے کبھی نہیں چاہا کہ میں سخت گیر باپ کہلاؤں، غاصب کہلاؤں۔“

”بابا خان!“ اشارہ نے اُن کے ہاتھ پر اپنا کانپتا ہاتھ رکھ دیا۔ ”میں نے تو کبھی آپ کو ایسا نہیں سمجھا اور نہ آپ ایسے ہیں۔“

انہوں نے محبت سے اُسے دیکھا۔ ”ذولین تمہیں کیسا لگتا ہے؟“ اُن کا جملہ بالکل اچانک اور اُس کے لئے غیر متوقع تھا۔ اُس کے ہاتھ کانپ گئے اور پلکیں جھک گئیں۔

”میں ذولین کی چاہت میں اور نہ اپنی خواہش پر تمہیں قربان کرنا چاہوں گا۔ میں جانتا ہوں جذبات میں کئے گئے فیصلے اور جبر کے رشتے بہت ناپائیدار ہوتے ہیں۔ بتاؤ بیٹا! میں تم پر کوئی زبردستی نہیں کروں گا۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو کتنے ہی موتی اس کی آنکھوں سے ٹوٹ کر گرے۔ یہ ٹھنڈی چھانوں اُس کے لئے کس قدر تقویت کا باعث تھی۔ اُس نے تو ہمیشہ وادی کے مردوں کو ظالم اور غاصب دیکھا تھا۔ کتنی لڑکیوں کو باپ کے مظالم سے مرتے دیکھا تھا۔ زرسا نگہ کی موت اُسے یاد تھی۔ صبغت اللہ خان کو گل بی بی پر مظالم ڈھاتے دیکھا تھا۔ مگر کتنی

خوش بخت تھی وہ کہ اُس کے ساتھ یہ سب نہ تھا۔ اُس کا باپ اُس کے لئے ٹھنڈی چھانوں تھا۔ اُس کی پناہوں میں وہ کتنی مطمئن تھی۔

”بابا خان! آپ بہتر سوچ سکتے ہیں میرے لئے۔“ اُس کا سر اور بھی جھک گیا۔ مہروز خان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس کے جملے میں انکار ہر گز نہیں تھا۔ شرم تھی، احترام تھا۔

مہروز خان کھڑے ہو گئے۔

”شاہے ایک نا سمجھ اور کم عقل عورت ہے۔ اُس نے فیروز لالہ کی نفرت میں خود اپنی زندگی کو تباہ کر ڈالا ہے۔ خیر۔“ وہ خود سے بڑبڑائے اور پھر سنگ روم کا پردہ اٹھا کر باہر نکل گئے۔

☆☆☆...

اُس نے نیلے رنگ کا کادار سوٹ زیب تن کیا تھا۔ سحر گل نے اُس کے خوبصورت اور ریشمی بال زبردستی کھول کر پشت پر پھیلا دیئے تھے اور اُس کے نہ، نہ کرنے کے باوجود اُس کا ہلکا میک اپ کر دیا تھا۔ شاردابھابی نے جیولری بھی پہنا دی تھی۔ اور جب اُس نے نیلا دوپٹہ شانوں پر پھیلا کر خود کو قد آدم آئینے میں دیکھا تو شرم کر رہ گئی۔ بڑے بڑے ہلکورے لیتے آویزے، ہلکا میک اپ اور چہرے پر تازگی نے اُسے بے انتہاد لکش بنا دیا تھا۔ اپنا یہ روپ دیکھ کر وہ خود بھی حیران رہ گئی تھی۔ اتنے برسوں کے بعد اُس نے خود کو ڈھنگ سے سنوارا تھا۔ کلائیوں میں کھنکٹی سنہری چوڑیاں، سفید گردن میں طلائی لاکٹ۔ یہ سب کس قدر دلفریب لگ رہا تھا۔

”بھابی جان! مسعود بھائی گاڑی میں بیٹھ گئے ہیں۔“ شاردابھابی نے اُسے شانوں سے تھام کر بے حد خوبصورت انداز میں بھابی جان کہہ کر مخاطب کیا تو اُسے لگ رہا تھا جیسے وہ پہلی بار اس گھر سے رخصت ہو کر مسعود شاہ کے ساتھ جانے والی ہے۔ دل اپنی ایک الگ لے پردھڑک رہا تھا۔



امی نے اُس کی پیشانی چوم کر اُسے ڈھیروں دعائیں دیں۔ اور جب وہ سب کو خدا حافظ کہہ کر باہر آئی تو مسعود شاہ فرنٹ ڈور کھولے اُس کا منتظر تھا۔ اُسے دیکھ کر اُس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی اور اُس کی آنکھوں کی والہانہ چمک نے ماہ گل کے چہرے پر گلال بھر دیئے۔

برہمی اس کی سدا مجھ کو سزا دیتی رہی

کر چکا تھا وہ اس لطف کا عادی مجھ کو

مسکرا کے وہ کھلے دل سے ملا ہے اب کے

جانے کیا سوچ کر اُس نے یہ سزا دی مجھ کو

اُس کے قریب آنے پر لہک کر شعر پڑھا تو ماہ گل کا چہرہ گرم ہو گیا۔ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی اور گڈو کو گود میں بٹھالیا۔  
”بڑی نوازش جنابہ!“ اُس نے اُس کی طرف کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا اور پھر گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

”مُمی! میری پاپا سے دوستی ہو گئی ہے۔“ گڈو نے چھوٹے ہی نئی اطلاع فراہم کی تو ماہ گل ہنس دی۔

”ہاں بیٹا! اب تو دوستی کرنا آپ کی اور میری مجبوری ٹھہری۔“ اُس نے اُسے چھیڑنے کی غرض سے کہا تو مسعود شاہ نے اُسے گھورا۔

”یعنی ابھی تمہارے دماغ کے کچھ اسکر وڈھیلے ہیں جو مجھے کسنے ہوں گے۔“ اس نے کہا تو ماہ گل کھلکھلا کر ہنس

دی۔ اُسے بے تحاشہ ہنسی آرہی تھی۔ بات بے بات اس کے لب مسکرا رہے تھے۔ دل بے انتہا شانت تھا۔

مسعود شاہ کا پُر سکون چہرہ، اُس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتے رنگ اُس کے لئے کس قدر تقویت کا باعث بن رہے

تھے۔ اُس نے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن آن کر دیا اور غزل کے خوبصورت بول گاڑی میں گونجنے لگے۔

وہ دل ہی کیا تیرے ملنے کی جو دُعا نہ کرے

میں تجھ کو بھول کے زندہ رہوں خدا نہ کرے

رہے گا ساتھ تیرا پیار زندگی بن کر

یہ اور بات میری زندگی وفانہ کرے

سنہا ہے اس کی محبت دعائیں دیتی ہے

جو دل پر چوٹ تو کھائے مگر گلہ نہ کرے

اُس نے سر اٹھا کر مسعود شاہ کو دیکھا جس کے گداز لبوں پر دلفریب مسکراہٹ رقصاں تھی۔ وہ بہت غور سے غزل سن رہا تھا مگر اُس کی طرف سے غافل قطعی نہیں تھا۔

اُس نے آنکھیں موند کر سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔

”مسعود شاہ! تم بالکل نہیں بدلے۔ تمہیں اب تک یاد ہے کہ میں اس غزل کی دیوانی ہوں۔“

وہ آنکھیں کھول کر مسعود شاہ کو دیکھنے لگی۔ اُسے یاد تھا مسعود شاہ غزلیں بہت کم سنتا تھا مگر وہ اُسے زبردستی سنایا کرتی تھی اور وہ اُس کی خاطر سن لیا کرتا تھا۔ مگر اب گاڑی میں ان گنت غزلوں کے کیسٹ رکھے ہوئے تھے۔

”مسعود!“ اُس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”ہوں۔۔۔“ اُس نے پلٹ کر والہانہ نگاہیں اٹھائیں۔ ”ہاں، کہو جانِ مسعود۔۔۔“ اُس نے اُسے خاموش پا کر کہا۔

”کچھ نہیں۔“ اُس نے نگاہیں ونڈا سکرین پر کر لیں۔ اب کیا پوچھے۔ کچھ پوچھے جانے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اُس نے اُسے یاد رکھا تھا، اُس کی پسندیدہ کیسٹوں سے گاڑی سجا رکھی تھی۔ اب لفظوں کی وقعت کیا رہ گئی تھی۔

ڈھیر ساری طمانیت اُس کے اندر اتر رہی تھی۔

تشنہ نظریں ملیں شوخ نظروں سے جب

مے برسنے لگی جام بھرنے لگے

ساقیا آج تیری ضرورت نہیں

بن پیئے بن پلائے خمار اگیا

مسعود شاہ گنگنا رہا تھا۔ اُس کے انگ انگ سے خوشی چھلک رہی تھی۔

گاڑی گھر کے سامنے رکی تو ماہ گل کے پور پور میں گد گدی سی ہونے لگی۔ میٹھی میٹھی کسک۔۔۔ ٹھنڈی ٹھنڈی کسک۔ وہ گدو کو لے کر نیچے اُتری۔

”یہ ہے ہمارا گھر۔“ مسعود شاہ نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔ ”یاد ہے یا بھول گئیں؟“

”کیسے بھول سکتی ہوں۔۔۔ یہاں گزارا ایک ایک بل فلم کی طرح میرے ذہن میں چل رہا ہے۔“ ماہ گل کی آواز جذبات کی پورش سے بھاری ہو گئی۔

دروازہ امبر بھابی نے کھولا تھا اور بڑھ کر اُس کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ وہ مسعود شاہ کے ہمراہ اندر آگئی۔ سب سے پہلے وہ ساس سے ملی۔ انہوں نے بڑھ کر اُسے گلے لگا لیا اور پھر گدو کو گود میں بھینچ لیا۔ دونوں جیٹھانیاں مسکرا کر اس سے مل رہی تھیں۔ ماہ گل کو لگا جیسے وہ پہلی بار بیاہ کر اس گھر میں آئی ہو۔ نئی اور شوخ اُمنگیں لے کر۔ اور سب بڑھ کر اُسے نئی زندگی کی مبارکباد دے رہی تھیں۔ کسی کے لبوں پر معنی خیز یا طنز بھری مسکراہٹ نہ تھی۔ کوئی ہمدردی نہیں جتا رہا تھا۔۔۔ آج وہ کتنی معتبر ہو گئی تھی۔ اس لئے کہ مسعود شاہ کا مکمل اعتماد اس کے ساتھ تھا۔ اس کی بھرپور چاہت اور توجہ لئے وہ اس کے ہمراہ تھا۔ کوئی خوف اور دھڑکا نہ تھا۔۔۔ سارے اندیشے وہ پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

وہ مسعود کے ہمراہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ مسعود شاہ نے دروازے کا لاک کھول کر دروازہ پورا کھولا تو خوشبو کا ایک ریلا آیا اور ماہ گل کے سارے وجود کا احاطہ کر لیا۔ اُس کی آنکھیں حیرت اور مسرت سے جھپکنا بھول گئیں۔۔۔ پورا کمرہ مشکبار پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ بیڈ کی نیلی چادر پر سرخ سرخ پھول، ڈریسنگ، کرسیاں، میزیں، کھڑکیوں پر لڑیوں کی صورت میں کہ ایسا لگتا تھا جیسے ساری کائنات کے پھول ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں۔

وہ مسحور سی اندر بڑھی کہ اچانک ڈھیر سارے پھول اس پر آگرے اور جیسے اُس کا سارا وجود خوشبوؤں میں نہا گیا۔ اُس نے رخ موڑا تو مسعود شاہ اُسے محبت پاش نظروں سے تک رہا تھا۔

”یاد ہے۔۔۔ جب میں کبھی تم سے خفا ہو جایا کرتا تھا تو تم مجھ پر اسی طرح پھولوں کی بادش کرتی تھیں۔“ اُس نے کہا تو ماہ گل کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”تم کہتی تھیں پھول فاصلوں کو مٹا دیں گے۔ خفگی کو خوشبو میں بدل دیں گے۔“ وہ اُسے یاد دلایا تھا۔ مگر وہ بھلا کیا بھولی تھی۔ اُسے تو ایک ایک بات یاد تھی۔ اُس کی مسرت انتہا کو چھونے لگی۔

”مسعود! انت۔۔۔۔۔ تمہیں سب یاد ہے؟“ اُس نے فرط مسرت سے مغلوب ہو کر پوچھا۔ اُس کی پذیرائی کا یہ

انداز کتنا بھلا اور منفرد سا تھا۔ اُس کی رگوں میں خوشی و انبساط تھرکنے لگی۔

”ہاں۔۔۔ مجھے سب یاد ہے۔ اور مجھے تو یہ بھی یاد ہے کہ تم پھر ان پھولوں کا گجر بنالیتی تھیں اور میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے پہنا دیا کرتا تھا اور اس طرح فاصلے بالکل ہی ختم ہو جاتے۔“ مسعود شاہ یہ کہتا اُس کے قریب آیا تو وہ سرخ ہو گئی۔

”ابو۔۔۔“ گڈو کی آواز نے مسعود شاہ کے بڑھتے قدم روک لئے۔ وہ پلٹا اور لبوں پر خود بخود نرم مسکراہٹ بکھر گئی۔

”ارے میرا بیٹا۔“ اُس نے دروازے پر کھڑے گڈو کو اٹھالیا۔ ”مجھے تو یاد ہی نہیں رہا کہ ہماری شادی کو اتنا لمبا عرصہ ہو گیا ہے اور کباب میں ایک عدد ہڈی بھی ہے۔“

”کیا۔۔۔ کیا۔۔۔ میرا بیٹا ہڈی ہے؟“ ماہ گل نے اُسے دیکھا اور ہنسنے لگی۔

”ارے یہ ہڈی تو میری جان ہے۔“ اُس نے خود کو بیڈ پر گرا کر گڈو کو اپنے اوپر بٹھالیا۔

”ماہی جان! میں نے اس کمرے کو اور اس کی کسی شے کو بھی کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ بس اوپری اوپری صفائی ہوتی تھی۔ میں تمہارے سارے لمس کو کھونے نہیں دینا چاہتا تھا۔“ وہ کہہ رہا تھا اور ماہ گل نے خود کو صوفے پر گرالیا۔ یہ اتنی ڈھیر ساری خوشیاں اُسے سنبھالنا مشکل لگ رہا تھا۔ مسعود شاہ کے جملے اور یہ سارا ماحول اسے کتنا مغرور بنائے دے رہے تھے۔

فخر اور چاہے جانے کے احساس نے اُسے سرشار کر دیا۔

کتنی مکمل ہو گئی تھی آج اُس کی ذات اور اُس کا گھر۔

کوئی دراڑ نہ دلوں میں رہی تھی نہ سوچوں میں۔

”خدا یا!۔۔۔ تو میری اس زندگی کو حسین تر بنائے رکھنا۔ معبود! میری ان خوشیوں کو نظر بد سے بچانا۔“ اُس نے آنکھیں موند کر محبتوں کی ہمیشگی کی دُعائیں مانگ ڈالیں۔ اور جب آنکھیں کھولیں تو مسعود شاہ بیڈ پر بیٹھا اُسے والہانہ نگاہوں سے تنگ رہا تھا۔

...☆☆☆...

جامعہ کی سڑک، لابی، لان ہر جگہ گروپ کی شکل میں کھڑے اسٹوڈنٹس میں یہی خبر کئی دنوں سے گرم تھی کہ پولیس مقابلہ میں ریحان پراچہ مارا گیا۔ اشمیل کو بھی احسن نے پہلی خبر یہی دی تھی اور وہ کتنی دیر تک ششدر رہا تھا۔

”اُس کے ساتھ یاور بھی تھا۔ وہ پکڑا گیا تھا۔“ احسن نے اُسے تفصیل بتانی شروع کی۔ افتخار اور نعیم جان بھی اسی طرف چلے آئے۔

”اُس نے خود کو گرفتار کیوں نہیں کروایا؟“ اشمیل کا دل عجیب سے احساسات سے دوچار تھا۔ بہر کیف وہ ایک جوان موت تھی۔ لاکھ اُس کا مخالف تھا مگر اس زمین، اس ملک کا ایک سپوت تھا۔ تو انا لڑکا اس طرح موت کے منہ میں چلا جائے تو رنجیدگی ایک فطری عمل تھا۔

”بہت بے وقوف تھا ریحان۔ پولیس کے گھیرے میں سے بھاگنے کی کوشش کی۔“ افتخار نے بھی اس موضوع میں حصہ لیا۔ ”اپنے باپ کے اثر و رسوخ سے اس بار وہ شاید مایوس ہو گیا تھا۔ ویسے یہ ڈی ایس پی منظور احمد بھی بڑا خزانہ آدمی ہے۔ کہہ رہا تھا، پاتال سے بھی نکال لائوں گا۔ اشمیل! وہ واقعی مبارک باد کا مستحق ہے۔“

”ہاں۔۔۔“ اشمیل نے ایک گہری سانس سینے کی تہہ سے آزاد کی اور پھر کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ ”احسن! میں ہاسٹل جا رہا ہوں۔“ اُس نے احسن کو مخاطب کیا اور دروازے کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ احسن اُس کے پیچھے لپکا۔

”خیریت؟“

”احسن! طبیعت میں عجیب بے چینی سی محسوس ہو رہی ہے۔ ریحان کی موت صرف ایک دہشت گرد کی موت تو نہیں، ایک بیٹے کی بھی موت ہے۔ اس نے اپنے پیچھے اپنے والدین کو بالکل بکھیر کر رکھ دیا۔ کیا رہ گیا اُس کے والدین کے پاس اب؟“

”یہ تو اس کے والدین کو اس کی پشت پناہی کرتے وقت سوچنا چاہئے تھا۔“ احسن اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

”ہاں۔۔۔ شاہنواز پر اچھے جیسے لوگ اپنے اسٹیٹس کا غلط فائدہ اٹھا کر اپنی اولاد کو اس حال پر پہنچا دیتے ہیں۔۔۔ اچھی سوچ ہی اچھے معاشرے کو جنم دیتی ہے۔ کاش شاہنواز پر اچھے یہ بات سوچ لیتا تو اُس کی سوچ کا انداز بدل جاتا اور ریحان کو اس دلدل میں مزید دھنسانے کی بجائے اُسے نکالنے کی تدبیر کرتا۔“ اشمیل کو سخت تاسف ہو رہا تھا۔ ”یہ بات بہر کیف خوشی کی تو نہیں ہے۔“

”ہاں اشمیل! خوشی کی نہ سہی مگر ان دہشت گردوں کو سزا ضرور ملنی چاہئے۔ بے حد سخت۔ دوسروں کی زندگی سے کھیلنے والوں کا انجام یہی ہوتا ہے۔ اور ہونا بھی چاہئے۔ تمہیں شہباز کی موت یاد ہے؟“ احسن کو اُس کی بات سے اختلاف ہو رہا تھا۔

”یاد ہے۔۔۔ اور اُس کی ماں کی حالت بھی یاد ہے۔ اسی لئے تو سوچ رہا ہوں کہ۔۔۔۔۔ خیر۔“ اشمیل نے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

”اوکے، تم جاؤ اور ریسٹ کرو۔“ احسن نے اس کا شانہ تھپکا اور خود دوسری طرف نکل گیا۔

اشمیل ہاسٹل کی طرف آگیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کوئی ماں اپنے بیٹے کی موت کا صدمہ نہ جانے کیسے اور کس طرح سہتی ہو گی۔۔۔ اُسے یاد تھا کہ شاہ خانم اس کے آنے پر کس قدر کھل اُٹھتی تھیں اور اس کے واپس یونیورسٹی جانے پر بے حد ملول ہو جاتی تھیں۔

وہ اپنے کمرے میں آگیا۔

یہ اضمحلال اس پر پورے دن طاری رہا اور پھر گزرتے دنوں میں دوسری معاشرتی ذمہ داریوں نے اس واقعہ کو اس کے ذہن سے معدوم کر ڈالا۔ وہ یکسوئی سے اپنی پڑھائی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”یاد اشمیل! تم نے تو میری طرف نگاہ اٹھا کر اب دیکھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔“ احسن اس سے شکوہ کناں تھا۔ ”تمہیں یاد ہے میرا ناک نقشہ؟“

اُس کی اس غیر سنجیدہ بات پر اشمیل نے کتاب سے سر اٹھایا۔

”لگتا ہے اب تم سوچتے بھی صرف ہشتمینہ ابرار کے لئے ہو۔“ اُس کا جملہ برجستہ تھا۔ اشمیل کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔

”احسن!“ اُس نے خشمگین نظروں سے اُسے دیکھا۔

”اچھا بابا! معاف۔۔۔“ احسن نے جلدی سے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”میں تو ابھی یہ کہہ رہا تھا کہ تم کچھ

میری بھی سن لو، مجھے پھر دیکھ لو، بقول شاعر

ہو سکے تو نگاہ کر لینا۔۔۔ تم پر کچھ زور تو ہمارا نہیں۔“

”کیوں، خدا نخواستہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“



”اسے مایخو لیا ہو گیا ہے۔“ افتخار کا پیچھے سے قہقہہ بلند ہوا تو احسن پلٹا۔

”تم ضرور ٹپکنا \_\_\_ کبھی مجھے اور اشمل کو تنہانہ بیٹھنے دینا۔

”ارے واہ \_\_\_ تم دونوں کوئی لیلیٰ مجنوں ہو؟“ افتخار نے اُسے چڑایا تو احسن نے اُسے گھورا۔

”ہاں، یہی سمجھ لو \_\_\_ اور اشمل! میں کیا کہہ رہا تھا؟“ وہ پھر اشمل کی طرف گھوم گیا۔ پھر اُسے یاد آگیا، جلدی سے بولا۔ ”اشمل یدرا! میں آج کل بہت خوش ہوں \_\_\_ کیا میرے چہرے سے خوشی ظاہر نہیں ہو رہی؟“

”انگ انگ سے ظاہر ہو رہی ہے۔“ افتخار نے پھر بولنا ضروری سمجھا۔

”اس خوشی کا راز؟“

”جناب! اس لئے کہ اس کی فیانسی آج کل \_\_\_\_\_“

”افتخار! خدا کے لئے۔“ احسن نے افتخار کا جملہ کاٹ دیا اور اسے بری طرح گھورنے لگا۔ ”تم بیچ میں بولے بغیر نہ رہنا۔“

افتخار بھی کمال کا ڈھیٹ تھا۔ زور زور سے ہنسنے لگا۔

”میرے خیال سے تم دونوں پہلے لڑو۔ میں تو چلا۔“ اشمل اٹھ کر جانے لگا تو احسن نے اُسے پکڑ لیا۔

”چلو، کیفے چلتے ہیں۔ وہاں بتائوں گا میری خوشی کا راز۔ چلو بھوت! تم بھی چلو۔“ احسن نے افتخار سے کہا جو پہلے ہی تیار تھا۔

”اشمل! یہ بیچارے تین دن سے راز سنبھالے ہوئے ہلکان ہو رہا ہے۔“ کیفے میں داخل ہوتے ہوئے افتخار نے کہا۔

اشمل، احسن کی طرف پلٹا۔

”کیوں بھی \_\_\_ یہ تین دن سے سنبھالنے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے بتا دیتے۔“ اشمل نے کہا تو احسن صرف مسکرا دیا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”آج چائے میری طرف سے۔“

”ایں \_\_\_ صرف چائے \_\_\_ اتنی بڑی خوشی اور چائے؟“ افتخار نے پھر چھیڑا۔

”یدر افتخار! خدا کے لئے میری جاں بخشی کرو۔ ایمان سے، اشمل کی صحبت میں رہنے کے باوجود تم ذرا بھی کم گو نہ ہوئے۔“ احسن اس کے جملوں پر زچ ہو گیا تھا۔

”پیارے! تم پر اثر ہوا نہیں تو مجھ پر کیا اثر ہوگا۔ ویسے مجھے تو لگتا ہے کہ مجھ پر تمہارا ہی اثر ہونے لگا ہے۔ اچھا چھوڑو، تم خبر تو سناؤ۔“

”تم موقع دو تب نہ۔“ احسن نے سلگ کر کہا۔

”چلو اب احسن! جلدی سے سناؤ بھی۔“ اشمل ان دونوں کو مزید الجھنے سے بچانے کے لئے بولا۔

”میری فیانسی صاحبہ سے میرا جھگڑا ختم \_\_\_ یعنی اب وہ مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔“ احسن کچھ اس انداز سے بولا تھا کہ افتخار کے حلق سے ایک طویل قہقہہ اُبل پڑا۔ اشمل بھی بے ساختہ ہنسی کو نہ روک سکا۔

”یہ مذاق نہیں ہے \_\_\_ اب وہ مجھ سے شرمانے لگی ہے۔ پتہ ہے کیوں؟“ اس نے یہ کہہ کر اشمل کو دیکھا جیسے اب اس کے بعد بڑا انکشاف کرنے والا تھا۔

”مشرقی جو شانہ پی لیا ہوگا۔“ افتخار کی زبان سے پھر جملہ پھسلا۔ مگر احسن نے اُس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے

اپنی بات جاری رکھی۔

”میرے والدین اور سسرال والوں نے مل کر میری شادی کی تاریخ طے کر دی ہے۔ یعنی ٹھیک ایگزٹ کے فوراً بعد مابدولت کے سر پر سہرا سج جائے گا۔“

”یعنی سہرے کے اندر کارٹون۔“ افتخار زور سے ہنسا۔

”بکواس مت کرو\_\_\_ اتنی پیاری صورت ہے۔ دیکھنا تو سہی، سہرے کے پھول بھی شرم جائیں گے۔“

”چہ، چہ۔۔۔ اُن بیچاروں کا کیا قصور جو تمہارے سر پر سبھیں گے۔“

”ویسے احسن! یہ کچھ زیادتی نہیں؟“ اشمل نے مسکراہٹ دبا کر سنجیدگی سے احسن کو دیکھا تو وہ اُچھلا۔

”زیادتی کیسی؟ \_\_\_\_\_ کس کے ساتھ؟“

”تمہاری فیانسی کے ساتھ۔“ افتخاریہ کہہ کر ایک جھٹکے سے کرسی چھوڑ کر دور کھڑا ہو گیا، مبادا حسن اب کپ اٹھا کر اس کے سر پر نہ مار دے۔ وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اشمیل کو بھی اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اور احسن پوری طرح خفا ہو گیا تھا۔

”تم لوگوں کو خبر سنانا بے کار ہے۔۔۔ مجھے مبارک باد دو، اُلٹا مذاق بن رہا ہے۔ ہو۔ جاؤ، میں چائے وائے نہیں پلاتا۔“

اس نے کرسی سمیت اپنا رخ پھیر لیا۔

”ارے چائے تو ویسے بھی تم نہ پلاتے کچھ سوس! میں جانتا تھا۔ اتنی ہی بڑی خبر تھی تو مٹھائی لے کر ہی آنا چاہئے تھا۔“  
افتخار پھر کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا مگر ذرا فاصلے پر۔

”ارے بھئی افتخار! بہت ہو گیا۔ چلو احسن! آج تمہاری اس خوشی میں میری طرف سے برگرا اور چائے۔“ اشمل نے

اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ بولا۔

”یہ ہوئی نابات \_\_\_ دل خوش کر دیا تم نے۔“ وہیل بھر میں نارا ضگی بھول بھال کر مسکرا نے لگا۔

”بس یہی تو یہ چاہتا تھا۔“ افتخار جیسے اُس کی رگ رگ سے واقف تھا۔

## اشتمل نے آرڈر دے دیا۔

”اُحسن! ابھی تو تمہاری شادی میں لمبا ٹائم ہے۔ اس سے پہلے ایگزام کی فکر کرو ڈیر! جو بڑا امتحان ہے۔“

”ارے چھوڑو۔۔۔ بڑا امتحان تو شادی ہے جس میں پاس بہت کم ہوتے ہیں۔“ احسن برگر کھاتے ہوئے پھر اپنے موڈ میں آگیا۔

”آ۔۔۔۔۔ چھا۔۔۔۔۔“ اشمل نے چائے کا کپ لبوں سے لگا کر اسے دیکھا۔ ”تم کلیئر ہو جاؤ گے؟“

انکیج منٹ پیریڈ میں تو ناکام رہے ہو۔“ اشمل کے جملے پر احسن کھسیا گیا۔

”اب تم پر بھی افتخار کا اثر ہونے لگا ہے۔“ اس کا منہ بن گیا۔

وہ تینوں لگاتار دو پیریڈ فری ہونے کی وجہ سے کیفے میں ہی بیٹھے خوش گپیاں کرتے رہے۔ مگر جو نہی باہر نکلے ایک بری خبر ان کی منتظر تھی۔ جامعہ کی سڑک پر بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ شہزاد بھاگتا ہوا ان کی طرف آیا۔

”کیا ہوا شہزاد؟“ اشمٰل نے اُسے جلدی سے پکڑ لیا۔

”ارے اشمٰل بھائی! غضب ہو گیا۔ پبلک بس اور یو اینٹ بس آپس میں بری طرح ٹکرا گئی ہیں۔“

”کیا پوائنٹ کا ایکسیڈنٹ \_\_\_“ وہ تینوں متحیر رہ گئے اور اشمیل خود کو بروقت سنبھال کر جائے حادثہ کی سمت بھاگا۔

یونیورسٹی روڈ پر ایک کھرام پاتھ۔ دو بھری بسوں کا تصادم انتہائی ہولناک تھا۔ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ پولیس گاڑیوں اور ایمبولینس کی گھن گرج نے دُور والوں کو بھی چونکا دیا تھا۔

یوتھ فیڈریشن کا پورا گروپ ایکٹو ہو گیا تھا۔ وہ بس اور اپنی گاڑیوں میں بھی زخمیوں کو لے کر ہسپتال کی جانب رواں دواں تھے۔ تب نعیم جان نے بری طرح زخمی ہوئے سراج کیانی کو اشمیل کی گاڑی میں ڈالا۔ اُسے دیکھ کر اشمیل خان کو جھٹکا سا لگا۔ وہ درد سے کرا رہا تھا۔ اُس کا چہرہ اور ہاتھ خون سے لت پت تھے۔

”اشمیل! اس کی کنڈیشن بہت نازک ہے۔“

”تم رہنے دو \_\_\_ میں اسے لے جاتا ہوں۔“ اشمیل نے پھرتی کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اس وقت زخمیوں کی ایک ایک سانس قیمتی تھی اور جس کی حفاظت ان سب کو کرنی تھی۔ لیڈی ریڈنگ ہاسپٹل بھی اس بڑے حادثے سے بھرا ہوا تھا۔ لوگوں کا ایک انڈھام تھا۔ عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار، مردوں کی بھاگ دوڑ۔

اشمیل خان نے فون کر کے اپنے فیڈریشن کے سارے کارکنوں کو ہاسپٹل میں بلوایا تھا۔ اس وقت ہاسپٹل کا عملہ اتنے سارے مریضوں کے لئے ناکافی ثابت ہو رہا تھا۔ اسے مدد کی ضرورت تھی، جو کم از کم مریضوں کے رشتے داروں کو ڈیل کرے۔

دس اسٹوڈنٹس موقع پر ہی دم توڑ گئے تھے۔ اور پانچ کی حالت انتہائی نازک تھی۔ ڈاکٹر فیاض حسن تفصیل بتا رہے تھے۔ اشمیل خون دینے کے لئے ان کے کمرے میں آیا تھا۔

”ڈاکٹر فیاض حسن! کم از کم ان پانچ اسٹوڈنٹس کو بچا لیجئے گا۔“ احسن نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ ان سب پر ایک

کر بناک احساس طاری تھا۔

نعیم جان، شہزاد اور افتخار جامعہ میں گئے تھے تاکہ خون دینے کے لئے طلبہ و طالبات کو کنوئس کر سکیں۔ کیونکہ زخمیوں کے لئے خون کی اشد ضرورت تھی۔

ڈی ایس پی منظور احمد، ڈاکٹر فیاض کے آفس میں داخل ہوئے تو اشمیل کو لیٹے دیکھ کر مسکرا دیئے۔

”مجھے یقین تھا تم اس وقت اسی نیک کام میں مصروف ہو گے ینگ مین!“ انہوں نے اسے خون دیتے دیکھ کر کہا۔

”ڈپٹی صاحب! آپ نے ابھی تک یہ نیک فریضہ انجام نہیں دیا۔“ وہ ہولے سے مسکرایا۔

اس کی رگوں سے خارج ہوتا خون پلاسٹک بیگ میں جمع ہو رہا تھا۔ اُس نے ٹیوب سے گزرتے خون کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”یہ خون جو میرے جسم سے خارج ہو رہا ہے اس سے مجھے بے تحاشہ خوشی ہو رہی ہے \_\_\_ اس لئے کہ یہ ہم پر قرض ہے۔ ہر انسان کا خون، اس کا مال اور اس کی جان اگر دوسروں کے کام نہ آئے تو یقین جانئے، خود اس کے لئے بھی یہ جینا عبث ہے۔“ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

”ہیلو اشمیل \_\_\_ کیا حال ہے؟“ ڈاکٹر فیاض اندر آئے۔ ”کمزوری تو محسوس نہیں کر رہے؟“ انہوں نے اس کی رگ میں لگی ہوئی نیڈل کو چیک کیا۔

”میرے خیال میں اب میں سرنج نکال دوں۔ تم کافی خون دے چکے ہو۔“

”نہیں سر! میں بالکل فریش ہوں۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ حالانکہ اس کے چہرے کی سرخی معدوم ہوتی جا رہی تھی اور وہ کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ مگر وہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

ڈاکٹر فیاض نے اُسے محبت سے دیکھا اور اس کے شانے تھپتھپائے۔

”خوش قسمت ہو گا وہ شخص جس کی رگوں میں تمہارا خون دوڑے گا۔ ایک قابل اور ہمدرد انسان کا خون۔“

”تو پھر ڈاکٹر! جلدی سے مجھے اس کا خون ٹرانسفر کر دیجئے۔“ احسن نے ماحول کی گمبھیر تا کو کچھ کم کرنے کی سعی کرتے ہوئے پُر مزاح انداز میں کہا تو وہ سب مسکرا دیئے۔

”تم ابھی تک یہیں بیٹھے ہو۔۔۔ ارے ڈاکٹر فیاض! اس کا خون کسی کے کام نہیں آنے والا کیا؟“ ڈی ایس پی منظور احمد نے اُسے چھیڑا تو وہ کھسیا گیا۔

”ارے واہ \_\_\_\_\_ میں خون دے چکا ہوں۔“

”ہاں۔۔۔ مگر بہت کم۔“ ڈاکٹر فیاض نے برجستہ کہا تو اشمل کے چہرے پر سختی آگئی۔ اُس نے احسن کی طرف خفگی سے دیکھا۔

”کیوں تم نے خون۔۔۔۔۔“

”ارے نہیں اشمہل! میں تو مذاق کر رہا ہوں۔“ ڈاکٹر فیاض نے جلدی سے کہا۔ ”بھئی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جس فیڈریشن کالیڈر، یونین کا صدر انتہائی قابل، ہمدرد اور ایکٹو ہو، اس کے ساتھی مستعد نہ ہوں۔ احسن نے بھی کافی خون دیا ہے۔“

اشمل کے چہرے پر اطمینان اُتر آیا۔ اس کے سارے ساتھی جانفشانی سے اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ کہیں بھی تو اسے مایوس نہیں کیا تھا۔

احسن کر سی کھینچ کر اس کے قریب آگیا۔

”اشتمل! میرے پہلو میں بھی ایک ہمدرد اور نرم دل ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، اپنے سامنے کراہتے زخمیوں کو دیکھتے

ہوئے بھی بے حس بنا رہتا۔ نہیں اشمٰل! اس وقت میرا دل بھی غم سے پھٹا جا رہا ہے۔ یہ ہنسی مذاق تو محض میں ماحول کی سنجیدگی کو کم کرنے کے لئے کرتا ہوں۔“ اس کا لہجہ از حد سنجیدہ اور دکھی تھا۔ اشمٰل نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”نہیں احسن! میں تمہیں جانتا ہوں۔ اور مجھے اپنے تمام دوستوں اور ساتھیوں پر فخر ہے۔ انہوں نے مجھے کبھی کسی قدم پر مایوس نہیں کیا۔“

سراج کی رگوں میں اشمٰل کا خون دوڑنے لگا تھا۔ وہ بھی شدید زخمیوں میں سے تھا جس کے بچ جانے کے چانسز کم تھے۔ مگر اب وہ تیزی سے زندگی کی طرف واپس آ رہا تھا اور اب قدرے ہوش میں تھا۔ اور اب اشمٰل سے ملنا چاہتا تھا۔ اس نے نعیم جان سے بے حد اصرار کیا کہ وہ اشمٰل کو یہاں لے آئے۔ تب نعیم جان نے اشمٰل کو اس کا پیغام دیا تو اشمٰل اس کے پاس چلا آیا اور اسے ہوش میں دیکھ کر اس کے دل میں اطمینان اتر آیا۔

”اب کیسی طبیعت ہے؟“

”اشمل خان!“ سراج کیانی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ ہمیشہ سے اس کا مخالف رہا تھا۔ ریحان پراچہ کے ساتھ مل کر اس نے ہمیشہ اشمل خان کو ذاتی طور پر بھی زک پہنچانے کی سعی کی تھی۔ اور اب وہ اس کا محسن تھا۔ اسے دوبارہ حیات بخشنے والا۔ اگر وہ چاہتا تو اسے نہ اپنی گاڑی میں ڈالتا نہ اُسے خون دیتا۔

”میں تمہارا بے حد ممنون ہوں اشمیل! کہ تم۔۔۔۔۔“

”سراج! مجھے شرمندہ مت کرو۔ میں نے کوئی احسان نہیں کیا تم پر۔ بس اپنا فرض نبھایا ہے۔“ اس نے اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ ”میں نے کسی پادری کے توسط سے کام نہیں کیا، محض انسانیت کے ناطے کیا ہے۔“ کم

آن، بی ریلیکس \_\_\_ کوئی احسان نہیں ہے میرا تم پر۔“ اس نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکرا دیا۔ سراج کی



آنکھوں میں تشکر کے رنگ لہرا گئے۔

”تم اپنا احسان مانویانہ مانو! شمل خان! مگر میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ تمہارا خون اب مجھ پر قرض ہے۔ کبھی تمہیں زندگی کے کسی موڑ پر میری ضرورت پڑے تو مجھے ضرور آواز دینا۔“ اس نے اتنا کہا اور آنکھیں موند لیں۔

اس ہولناک سانحے نے ان سب کو دماغی اور جسمانی طور پر تھکا دیا تھا۔

اشمل خان بھی مسلسل تین دن ہاسپٹل میں رہا۔ پیرامیڈیکل اسٹاف کا مستعدی سے ساتھ دیتا رہا۔ اور اس دن ڈاکٹر فیاض نے اسے زبردستی ہاسٹل بھیج دیا۔ وہ ان کے بے حد اصرار پر ہاسٹل آگیا۔ اور جو نہی بیڈ پر لیٹا، اُسے گہری نیند نے آدبوچ لیا۔ تین راتوں سے وہ ڈھنگ سے نہ سویا تھا۔ اور تین دن مسلسل یہاں وہاں بھاگتے دوڑتے گزر گئے تھے۔ خون دینے کی کمزوری الگ تھی۔ بظاہر اس نے اپنے اوپر تھکن طاری ہونے نہیں دی تھی۔ مگر بیڈ پر گرتے ہی اُسے شدید تھکاؤ کا احساس ہوا اور پلکیں نیند سے بھاری ہونے لگیں۔ بس آنکھیں موندتے ہی اُسے کچھ ہوش نہ رہا۔ اور جب آنکھ کھلی تو شام اتر آئی تھی۔ اُس نے درتچے سے باہر جھانکا، زندگی کی رونق وہی تھی۔ ٹریفک کا شور۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائوں کا سحر۔

اُس نے سینے سے ایک گہری سانس خارج کی اور باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اور جب باہر آیا تو وارڈن نے اُسے ٹیلیفون کی اطلاع دی۔ اُس کے ذہن میں پہلا خیال ہشمنہ ہی کا آیا۔ یقیناً اُسی نے فون کیا ہوگا۔ کتنے دن ہو گئے تھے اس کی آواز سنے اور اسے دیکھے ہوئے۔ اس کے تصور کے ساتھ ہی اس کے دل پر ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار پڑنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف شاہ خانم تھیں۔

”ارے شاہ خانم! آپ \_\_\_ خیریت \_\_\_؟“

”خیریت نہیں ہے اشمل!“ شاہ خانم کی آواز میں غصہ بھرا ہوا تھا۔

اشمل بری طرح چونکا۔ ”کیا۔۔۔۔۔ کیا مطلب؟“

”تم فوراً آج یا کل حویلی آؤ \_\_\_ مجھے اس وقت تمہاری اشد ضرورت ہے۔“

”مگر ہوا کیا؟ \_\_\_ پلیز شاہ خانم! آپ کچھ بتائیے۔“ وہ ان کے انداز اور جملوں پر پریشان ہو گیا۔

”تم حویلی آجاؤ \_\_\_ تمہیں سب پتہ چل جائے گا۔ بات اتنی مختصر نہیں ہے کہ میں تمہیں فون پر بتا سکوں۔ بس یہ سمجھ لو کہ تمہارا باپ مجھے اور اس حویلی کو ڈھادینا چاہتا ہے۔“ ان کا لہجہ تناہوا تھا۔ اور پھر اشمل کو حیران پریشان چھوڑ کر رابطہ کاٹ دیا۔

☆☆☆☆...

ہشمنہ نے بھابی کو کوریڈور میں ہی جا پکڑا۔

”یہ آج صبحابی کے کمرے میں کیا میٹنگ ہو رہی تھی \_\_\_، شناس بھائی اور امی کے درمیان؟“ اُس نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پھیلا کر بھابی کو کھوجتی نظروں سے دیکھا۔

”بتا دوں؟“ بھابی نے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔

”بالکل۔“

”ادھر آؤ \_\_\_“ بھابی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ بھی ان کے پیچھے لپکی۔

”اب زیادہ سسپنس مت پھیلائیے۔“ وہ دروازے میں گھستے ہی چلائی۔ ”بائی دی وے، معاملہ گمبھیر ہے کیا جو آپ کے چہرے کی بتیاں بجھی بجھی ہیں؟“ اُس نے بھابی کی سنجیدگی کا مذاق اڑایا۔

”ہشمنہ! کے دوست انکل کمال کو تو تم جانتی ہو۔ اور ان کے بیٹے سلطان کو بھی۔“

”ارے بابا! سب کو جانتی ہوں۔“ وہ بھابی کی اس تمہید پر چڑ گئی۔

”سلطان سے تمہارا رشتہ طے کر رہے ہیں جان اور امی۔“

”کیا \_\_\_؟“ وہ بدک کریوں پیچھے ہٹی جیسے اس کے آگے کسی نے لہراتا ہوا سانپ ڈال دیا ہو۔ اُس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”کل ہی پرپوزل آیا تھا \_\_\_ اب سوچ بچار ہو رہی ہے۔“

”میری رائے، مرضی معلوم کئے بغیر یہ فیصلہ کر دیں گے؟“ اس کی کانپتی آواز ابھری۔

”نہیں \_\_\_ ہو سکتا ہے تمہاری مرضی معلوم کریں۔ مگر ہشمنہ! تم انکار کی وجہ کیا بتاؤ گی؟“ بھابی اس کے قریب آ گئیں۔

”آ \_\_\_ آپ جانتی تو ہیں کہ میں اشمل خان \_\_\_۔“

”میں جانتی ہوں نا \_\_\_ یا شناس تو نہیں جانتے۔“ بھابی نے اس کی بات کاٹ کر کہا تو وہ خالی خالی نظروں سے بھابی کو تنکے لگی۔ بھابی کو اس پر رحم آگیا۔

”گھبرانے کی بات نہیں ہے \_\_\_ بہت روشن خیال انسان ہیں۔ وہ جلد بازی میں فیصلہ نہیں کریں گے۔ تمہاری رائے کو مقدم جانیں گے۔“ بھابی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”بیٹھو ادھر۔“ وہ کرسی پر ٹک گئی۔ یہ خبر حقیقتاً اسے پریشان کر گئی۔ وہ انکار کا کیا جواز پیش کرے گی؟ \_\_\_ لاکھ روشن خیال سہی، مگر اتنے ہر گز نہ تھے کہ وہ ان کے سامنے اشمل خان کا نام پیش کر دیتی۔ اُس کے اور اپنے تعلق سے انہیں آگاہ کر سکتی۔

”میرے خدایا! یہ بھی ہونا تھا، اُس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ معاً اُس کی آنکھیں چمکیں۔ یہ ڈوبتے کوتنگے کا سہارا تھا۔

”یاد ہے بھابی! ابھی کچھ ماہ قبل ایک پرپوزل آیا تھا میرا اور میں نے انکار کر دیا تھا تو بھی فوراً مان گئے تھے۔ اور \_\_\_ اس کی خوش فہم نگاہیں بھابی کے چہرے پر ٹک گئیں اور بھابی بے ساختہ ہنسنے لگیں۔

”جنابہ! وہ لڑکا جرمنی میں رہتا تھا اس لئے امی پہلے ہی راضی نہ تھیں۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کو اتنی دور نہیں بھیجنا چاہتی تھیں۔ یوں بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر یہاں سلطان کمال کا پلہ بھاری لگتا ہے۔“

”آف \_\_\_“ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ ”کچھ بھی ہے، میں اس رشتے سے انکاری ہوں۔ اور اگر کچھ نہ ہو سکا تو یاد رکھئے گا، میں سلطان کمال کو یا پھر خود کو شوٹ کر لوں گی۔“ وہ پلٹ کر بھابی کے کمرے سے باہر نکل گئی۔

یہ اچانک کیسی افتاد آپڑی تھی۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے اُس کے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں یکدم مفلوج ہو چکی ہیں۔ اُسے یہ یقین تھا کہ اس سلسلے میں اُس کی رائے ضرور معلوم کریں گے۔ بلکہ اُس کی رائے کو مقدم بھی جانیں گے۔ اگر وہ انکار کرتی ہے تو وجہ ضرور ہونی چاہئے۔ اور اس کے پاس کو مطمئن کرنے کے لئے کوئی ایسا جواز نہیں تھا۔ سلطان کمال ہر لحاظ سے مکمل انسان تھا \_\_\_ اس کے گھرانہ سے انکل کے دیرینہ تعلقات تھے۔

”میرے اللہ \_\_\_“ اس پر سخت بے بسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔

بھابی اندر داخل ہوئیں تو وہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔

”نری پاگل اور بے وقوف ترین لڑکی ہو۔“ بھابی اس کے قریب آ گئیں۔ ”اس طرح بیٹھے بیٹھے یا جذباتی ہونے سے

کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتے۔“

”پھر آپ ہی بتائیے کیا کروں؟“ اس نے سر اٹھا کر بے چارگی سے انہیں دیکھا۔

”بھئی مل کر کچھ سوچتے ہیں۔“ بھابی نے کہا تو اس کے لبوں پر اُداس مسکراہٹ پھیل گئی۔

”کوئی حل نہیں ہے میرے پاس۔“ اس نے پھر سر گھٹنوں پر ٹکادیا۔ ”بھابی! میں اشمٰل خان کی محبت میں اس قدر آگے بڑھ چکی ہوں کہ واپسی کا اب کوئی راستہ نہیں رہا۔ میں اپنی ساری کشتیاں جلا کر آگے بڑھی ہوں۔ میں اس کے بغیر بالکل ادھوری ہوں۔ بھابی! میں اشمٰل خان کے ساتھ کسی لڑکی کا نام تک برداشت نہیں کر سکتی، کہاں اب خود کسی دوسرے سے خود کو منسوب کر لوں۔ یہ ناممکن ہے۔“ اس نے یہ کہہ کر ایک اذیت کے عالم میں آنکھیں بند کر لیں۔

”کوئی خاص میٹنگ ہو رہی ہے کیا؟“ شناس بھائی کی آواز پر دونوں سنبھل گئیں۔ وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

”میٹنگ کیا ہونی ہے۔“ ہشمنہ اس رشتے پر راضی نہیں ہے۔ ”بھابی نے موقع مناسب سمجھ کر بات چھیڑ دی۔ شناس بھائی چونکے۔

”کیا مطلب۔۔۔ کیوں؟“ انہوں نے ہشمنہ کی طرف نظریں اٹھائیں جس نے جلدی سے سر جھکا لیا تھا۔

”ارے واہ۔۔۔ مرضی ہے اس کی۔ اسے نہیں پسند سلطان۔ لڑکی کی بھی تو رضا ہوتی ہے۔“

بھابی نے بات کو سنجیدگی سے سچانے کے لئے شگفتہ انداز اختیار کیا۔ ”جس طرح مرد جب تک مطمئن نہیں ہوتے حامی نہیں بھرتے۔“

”نوب۔۔۔ مگر کوئی جواز تو ہوگا مطمئن نہ ہونے کا۔“ شناس نے کہا۔ پھر ہشمنہ سے مخاطب ہوئے۔ ”ہاں بھئی،

یہ تمہاری بھابی کیا اول فول بک رہی ہے۔“

”کیا۔۔۔ کیا میں اول فول بک رہی ہوں؟“ بھابی گھبرا کر بولیں۔ ”بس اسے نہیں پسند۔ آپ سے جا کر کہہ دیں کہ ہشمنہ کو انکار ہے۔“

”میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ اس نے سر اٹھا کر کہا تو بھابی کا دل چاہا سر پیٹ لیں۔ اتنا بوجہ سا جواز اتنی جلدی پیش کر دینے کی کیا ضرورت تھی۔

”دیکھو لڑکی! تم پہلے بھی کے لاڈ کا کافی ناجائز فائدہ اٹھا چکی ہو۔ بھئی بغیر جواز شادی نہ کرنا یا اس رشتے سے انکار حماقت ہے سراسر۔“ شناس بھائی نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا اور پھر بھابی کی طرف دیکھ کر بولے۔ ”اور تم اس کی حماقتوں کا ساتھ مت دیا کرو، اسے سمجھانے کی بجائے اُلٹا بہر کاتی ہو۔“ وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئے اور بھابی کا منہ بن گیا۔

”دیکھ لینا آپ نے۔۔۔ اب میں کو کیسے مطمئن کروں گی۔ جبکہ شناس بھائی کو ہی۔۔۔۔۔۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”تو کس نے کہا تھا کہ جا کر اشمٰل سے محبت کر بیٹھو۔ بس اب یہی حل ہے کہ تم اشمٰل خان سے کہو کہ وہ میدان میں کود پڑے۔ یعنی اپنی امی کو بھیجے۔“

”ہائے۔۔۔ یہ میں اس سے کہوں؟“ ہشمنہ کا چہرہ لال ہو گیا اور بھابی تلملا کر رہ گئیں۔

”ہائے مصیبت۔ یہ مشرقی لڑکیوں کی محبت بڑی مہنگی پڑتی ہے۔ ارے جب زبان کا قفل نہیں ٹوٹ سکتا تو یہ محبت کیسے کر لیتی ہو؟۔۔۔ نہ سے کچھ کہہ سکتی ہو اور نہ اشمٰل خان سے۔ کیا اب کوئی فرشتہ آئے گا تمہارا حل لے کر؟“

”بھابی!“ وہ لب کاٹ کر رونے لگی۔

پوچھا۔

”وہاں کئی اسٹوڈنٹس کی ڈیٹھ ہو گئی اور کئی زخمی ہوئے۔ اور دوسری پبلک بس کے بھی کئی مسافر زخمی ہو گئے ہیں۔“

”اوہ، میرے اللہ \_\_\_\_\_“ اُسے گہرے رنج نے آگھیرا۔

”سراج کیانی بھی بری طرح زخمی ہوا تھا۔ اب تو قدرے بہتر ہے۔ میں کل وادی جا رہا ہوں۔ کچھ ضروری کام ہے۔“

سوچا تم سے بات کرتا جانوں۔ کیا بات ہے، تم کچھ پریشان سی ہو؟“ اشمیل نے اس کی خاموشی کو بری طرح محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کچھ اپ سیٹ سی لگ رہی ہو۔“

”اشـــــــملـــــــ“ اُسے ضبط کا یاد نہ رہا اور بے اختیار سسک اٹھی۔

”فارگاڈ سیک ہشتمینہ! مجھے بتاؤ، کیا پرابلم ہے؟“

”میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔“ اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

”اوکے۔ کہاں، کس وقت؟“ وہ بے تاب ہو گیا۔ مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا حلق تک آنسوؤں سے بھر گیا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ تم لالہ زار آجاؤ، میں بھی پہنچ رہا ہوں۔“ اس نے کہا تو وہ کچھ نہ بول سکی۔

”دیکھو، جلدی پہنچنا دیر مت کرنا۔“ اس نے ریسپورر رکھتے ہوئے اسے تاکید کی تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

پھر اس نے خود کو کسی حد تک سنبھالا۔ ابھی اختیار سے کچھ باہر تو نہیں۔ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ اُس نے خود کو تسلی دی

اور جلدی جلدی اپنا حلیہ درست کر کے چادر اٹھا کر کمرے سے باہر آئی۔ امی کو خدا حافظ کہہ کر وہ پوربچ کی جانب

بھاگی۔ اُسے یقین تھا کہ اشمیل اس سے بھی زیادہ بے تاب ہو گا اور لالہ زار اس سے پہلے پہنچ جائے گا۔ وہ اُسے کس قدر

اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی تھی۔۔۔ بھابی نے ریسیور اٹھا لیا۔ پھر ہشتمینہ کی طرف دیکھ کر بولیں۔

”بندے کی عمر بڑی ہے۔ اشمٰل خان ہے۔“

”کیا۔۔۔ شامل خان؟“ وہ جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھی اور لپک کر بھابی کے ہاتھ سے ریسپورر جھپٹ لیا۔ بھابی

کمرے سے باہر نکل گئیں اور جاتے جاتے دروازہ بند کر گئیں۔

ہشتمینہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ہاتھ پیر سنسنانے لگے۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ ہیلو ہشتمینہ!“

”ہیلو اشمیل!“ اس نے بمشکل خود کو سنبھالا۔ اس کی آواز جیسے اس کی رگوں میں دوڑتے خون میں طوفان مچا گئی تھی۔

”بولتی کیوں نہیں ہو\_\_\_\_ خیریت تو ہے؟“

”آں، ہاں۔۔۔ سب خیریت ہے۔ آپ کیسے ہیں؟“

”میں تو ٹھیک ہوں۔ تم نے پڑھا تو ہوگا اخبار میں، پوائنٹ کی بس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ بس اس سلسلے میں مصروف تھا۔

”نہیں۔۔۔ میں نے تو نہیں پڑھی یہ خبر۔ کب، کیسے ہو گیا؟“ اُسے شاک لگا۔ اخبار تو روزانہ آتا تھا اور اور اشناس

بھائی باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ یہ خبر اس کی نظروں سے نہیں گزری ہوگی یا پھر وہ بتانا بھول گئے ہوں گے۔ اس

نے تو اخبار پڑھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

”بہت شدید حادثہ تھا۔ تین دن ہو گئے ہیں۔“

”اومائی گاڈ\_\_\_\_\_ مجھے تو کچھ خبر ہی نہ ہوئی۔ کیا بہت زیادہ جانی نقصان ہو گیا ہے؟“ اس نے گہرے تاسف سے



شدت سے چاہتا تھا، یہ فخر، یہ احساس تو اس کے جذبوں کو اور بھی شدید کر جاتا تھا۔

اس کا خیال درست تھا۔ وہ جب لالہ زار آئی تو اشمل خان بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی اس کی سمت لپکا۔ اس کے چہرے پر گہرا اضطراب ہلکورے لے رہا تھا۔ اور اس اضطراب کا سبب اُس کی وہ سسکیاں ہی تھیں جو اس نے فون پر سنی تھیں۔

”بیٹھو۔“ اس نے کرسی کھینچ کر کہا تو وہ سرمئی چادر کو سنبھالتی اس کے سامنے ٹک گئی۔ اُس کے چہرے پر گہرا رنج پھیلا ہوا تھا۔ اُس نے راستہ بھر بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا ہوا تھا۔ اشمل خان کو دیکھ کر پھر دل بے قرار آنسوؤں میں ڈھل جانا چاہتا تھا۔ مگر پلکوں کی مضبوط باڑھ نے آنسوؤں کو بہنے سے روک رکھا۔

اشمل نے کافی کا آڈر دے رکھا تھا۔ کافی آئی تو اس نے ایک کپ اس کی طرف بڑھادیا اور اسے غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

”اب مجھے بتاؤ، کیا معاملہ ہے؟“

اُس نے پلکیں اوپر اٹھائیں، پھر جھکا دیں۔ اُسے لگا جیسے یکدم لفظوں کے معاملے میں وہ بالکل تہی دامن ہو گئی ہو۔ وہ کیا کہے، کس طرح چھیڑے یہ مسئلہ۔۔۔ اچانک ڈھیر ساری شرم نے اُسے آگھیرا۔

”کم آن ہشمنہ۔۔۔ ڈونٹ وری۔۔۔ اینڈ ٹیل می ایوری تھنگ۔“ اُس نے تسلی آمیز نظروں سے اُسے دیکھا اور میز کی سطح پر رکھے اس کے سفید ہاتھ پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا۔

”نالوہری اپ۔“

”اشمل! میری شادی کے بارے میں سیریس ہو گئے ہیں۔“ وہ لمحہ بھر کور کی اور اشمل خان کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

”بھئی والدین اولاد کی شادی کے معاملے میں سیریس نہیں ہوں گے تو پھر کون ہوگا؟“

”اشمل! وہ میری شادی اپنے دوست کے بیٹے سلطان کمال سے کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا پروپوزل آیا ہوا ہے۔“ اُس نے اشمل کا جملہ کاٹ کر جلدی سے اپنی بات مکمل کی تو اشمل کے چہرے پر یکدم سنجیدگی چھا گئی۔

”آپ نہیں جانتے۔۔۔ سو فیصد راضی ہیں۔“ اس کی آواز میں شکستگی در آئی۔

چند لمحے اشمل خان کچھ بولنے اور سوچنے کی پوزیشن میں نہ رہا اور خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ اشمل کی یہ خاموشی اس کے رنج کو اور بھی سوا کر گئی۔

”میرے پاس انکار کا ایسا کوئی جواز نہیں ہے جو میں کے سامنے پیش کر سکوں۔ اشمل! نے مجھے لاکھ آزادی دی ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس لاڈ اور آزادی نے بھی مجھے ان کے سامنے گستاخ نہیں کیا۔ میں نے کبھی ان کے کسی حکم سے انحراف نہیں کیا۔ اور اس معاملے میں بھی شاید میں آواز نہ اٹھا سکوں۔ اشمل! اس آزادی نے میرے اندر شرافت اور مشرقی حمیت کو فنا نہیں ہونے دیا۔“ وہ سر جھکا کر سسکنے لگی۔

اشمل خان اس انکشاف کی زد میں چند لمحے ضرور رہا مگر پھر بہ دقت خود کو سنبھال لیا۔ اس نے دونوں کمئیاں میز پر ٹکا کر قدرے اس کی سمت جھکتے ہوئے کہا۔

”ہشمنہ! تم انتہائی احمق لڑکی ہو۔“ اس کا لہجہ ہلکی سی شرارت لئے ہوئے تھا۔ ہشمنہ نے چہرہ اٹھایا۔

”یہ بتاؤ، اس پروپوزل کو کتنے دن ہوئے ہیں؟“ اس نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ اب وہ اپنے دل پر چھائے اس خوفناک خبر کے اثرات کو بالکل زائل کر چکا تھا۔

”دودن۔“

”بس۔۔۔“ وہ بے ساختہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں تسلی تھی۔ ”بھئی تم اپنے کی لاڈلی بیٹی ہو اور ظاہر ہے وہ

اتجھے سے اتجھے پروپوزل پر بھی کم از کم ایک دو ہفتے تو ضرور غور کریں گے۔ ہے نا۔۔۔؟“ اس نے پوچھا تو اس نے سر ہلادیا۔

”تو پھر۔۔۔ ہمارے پاس بھی ایک ہفتہ سے زیادہ ہی وقت ہے نا بھی۔ ابھی کچھ ہمارے اختیار سے باہر نہیں گیا۔“ ہشمنہ نے رومال سے چہرہ رگڑ کر حیرت پاش نظروں سے دیکھا۔ وہ اس کی بات کسی حد تک سمجھ رہی تھی۔

”چلو آؤ۔۔۔ میرا خیال ہے تمہیں کھلی ہوا کی ضرورت ہے۔“ وہ مسکرایا اور کافی کاکپ میز پر رکھ کر سی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔ ہشمنہ بھی بادل نحواستہ اس کے ساتھ چلنے لگی۔ وہ اپنی گاڑی کیفے سے باہر چھوڑ کر اس کی گاڑی میں آ بیٹھی۔ اس کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ اشمل خان کا وجود، اس کے جملے اس کے لئے تقویت کا باعث بن رہے تھے۔ مگر دل پھر بھی اسی خدشے کی لپیٹ میں تھا۔

گاڑی دریائے کابل کے کنارے رک گئی۔ وہ دونوں نیچے اتر آئے۔

دریائے کابل کا بھور اپنی اپنی خوبصورتی سے تمام لوگوں کی توجہ کامرکز بنا ہوا تھا۔ ہشمنہ کی بھی ساری توجہ اس دریائی سمت ہو گئی۔ وہ اشمل خان کے ہمراہ اس کے کنارے کنارے چلنے لگی۔

”اشمل خان! میری محبت بھی اس دریائی طرح گہری ہے۔ بظاہر پُر سکون۔ مگر اندر سے شوریدہ سر اور بے تاب۔“ وہ دھیرے سے بولی۔ اُس کا لہجہ ملول تھا۔

”ہشمنہ! انسان کی زندگی ان تمام اصولوں، رشتوں اور روایتوں سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی با شعور انسان ان فانی چیزوں پر انسان کی قیمتی ذات کو قربان کر دے۔ ابراہان گل بہت سمجھ دار اور باشعور انسان ہیں۔“

”آپ کا کیا خیال ہے، میں ان کے سامنے یہی وجہ پیش کر دوں؟“ اس نے نہایت درجہ تعجب کے ساتھ پوچھا تو وہ

مسکرا دیا۔

”کوئی حرج بھی نہیں۔“ اُس کی بھوری آنکھوں کی جگمگاہٹ گہری ہو گئی۔ ہشمنہ کے رخسار تپ اٹھے۔

”ویسے اس کا ایک ہی حل ہے جو درست بھی ہے۔“ اس نے اس کے گہرے گلابی رخسار کو پُر شوق نظروں سے دیکھا۔ ”کہ اب وادی جا کر شاہ خانم کو لے آؤں اور تمہارے گھر روانہ کر دوں۔“

اُس کے جملے پر اُس نے اپنے چہرے کا رخ موڑ لیا۔ وہ دونوں ایک سایہ دار درخت کے تنے کے نیچے کھڑے تھے۔

”مگر ہشمنہ! پھر بھی ووٹ زیادہ سلطان کمال کے رہے تو؟“

”نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔“ اُس نے پلٹ کر بے ساختہ کہا۔ پھر خود ہی جھینپ گئی۔

”ہشمنہ! تم نے کیا کہا تھا کچھ دیر پہلے اس دریا کو دیکھ کر؟“ وہ لٹکتی ڈال کو ہٹا کر اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ ”میں نے سنا نہیں تھا۔“ وہ اُس کی شرم سے محفوظ ہو رہا تھا۔ اُس کے آزدہ جمال پر یک بیک شرم کارنگ پڑتا بے حد بھلا لگ رہا تھا۔ سیاہ آنکھوں پر تنی گھنی جھالریں رخساروں پر لرز رہی تھیں۔

”آپ وادی کیوں جا رہے ہیں؟“ اُس کی محویت توڑنے کے لئے دھیرے سے بولی یا پھر یہ سوال اس کے اندر مچل رہا تھا۔

”ہوں۔۔۔“ وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کے سوال پر ایک گہری سانس اس کے سینے سے آزاد ہوئی۔ اُس نے نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹا کر پانی کی سطح پر ٹکادیں۔

”مجھے شاہ خانم نے فون کیا تھا۔۔۔ کوئی مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ کوئی خود ساختہ مسئلہ ہے جو محض کسی نظریے سے اختلاف پر پیدا ہوا ہے۔“ وہ دفعۃً سنجیدہ ہو گیا۔ شاہ خانم کے لفظوں اور انداز سے وہ یہی اخذ کر سکا تھا یا

شاید وہ شاہ خانم کے مزاج سے آشنا تھا۔ ہمیشہ مسائل خود انہوں نے ہی پیدا کئے تھے۔

ہشتمینہ سراٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

”نظریے سے اختلاف؟“

”ہاں۔“ اُس نے کئی سبز پتیوں کو ایک ساتھ مسلا۔ ”ہشتمینہ! پتہ نہیں، بابا خان آج تک شاہ خانم کے نظریوں سے کیوں اختلاف نہیں کر پائے۔ یا پھر وہ ہمیشہ ان سے متفق ہی رہتے ہیں۔“ اس کی نگاہیں مسلے ہوئے پتیوں کو گھور رہی تھیں۔

شاہ خانم نے فون کر کے حقیقتاً اسے پریشان کر دیا تھا۔

”صرف یہی دور استے تو نہیں ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ محبت کا گداز جذبہ دل میں موجزن ہو تو فریق ثانی کی بات سے لاکھ اختلاف ہو مگر نظر انداز کا طریقہ اپنا لیا جاتا ہے۔“ ہشتمینہ نے کہا تو

وہ چونکا۔

”ارے میں بھی یہ کیا باتیں لے بیٹھا۔“

”کیا کوئی سیریس مسئلہ ہے اشمیل؟“

”ارے نہیں میں نے کہانا، ہو گا کوئی خود ساختہ مسئلہ۔ اور شاہ خانم جذباتی ہو جاتی ہیں معمولی معمولی بات پر۔“

وہ لا پرواہی سے ہنس دیا۔ اُسے اپنی کیفیات پر قابو پانے میں کمال حاصل تھا۔ اچانک وہ پلٹا تو بری طرح سٹیٹا گیا۔ وہ

دونوں اس کے سامنے اور بالکل قریب آگئے تھے۔

...☆☆☆...

ماہ گل ڈرائنگ روم میں اپنے دونوں بہن بھائی کو دیکھ کر خوشی سے آگے بڑھی۔

”ارے فروان! تم کب آئے۔ اور سحر! تم کیسی ہو بھئی۔ یہ آج اچانک؟“

”بس ٹھیک ٹھاک۔“ سحر بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھی اور ماہ گل سے لپٹ گئی۔ ماہ گل کو ملازمہ نے ہی مہمانوں کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں تھی اور تیار ہو رہی تھی۔ گھر میں اس وقت اس کے اور اس کی ساس کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ وہ بھی مسعود کے ہمراہ اس کے دوست کے بیٹے کی برتھ ڈے پارٹی میں جانے والی تھی۔ سحر گل نے دیکھا، نیلے ایمبرائیڈری والے نئے فیشن کے سوٹ اور جھلملاتے دوپٹے میں اس کا چہرہ بے حد دمک رہا تھا۔ سفید سٹول کلائیوں میں گولڈ کی چوڑیاں کھنک رہی تھیں۔ کانوں میں بڑے بڑے سنہری آویزے ہلکورے لے رہے تھے۔ میک اپ سے بے نیاز چہرہ بے حد نکھر اور تروتازہ لگ رہا تھا۔

سحر گل کو اس کا یہ روپ بے حد دلکش لگا۔ دل کی طمانیت اور خوشی ان کے چہرے پر نکھار بن کر سمٹ آئی تھی۔

”آپ کہیں جا رہی تھیں آپا؟“ فروان نے پوچھا۔

”ہاں میں مسعود کے فرینڈ کے بیٹے کی آنج بڑھ ڈے ہے۔“

”ارے پھر تو ہم غلط وقت پر آگئے۔“

”ارے نہیں، نہیں۔ ابھی تو مسعود گئے ہوئے ہیں۔ ان کو آنے میں آدھا گھنٹہ لگ جائے گا۔ تم لوگ بیٹھو، بہت خوشی

ہوئی تم دونوں کو دیکھ کر۔ گھر میں سب کیسے ہیں۔ امی، پاپا، شاد، زمان سب؟“ اس نے ایک ہی سانس میں

سب کے بارے میں پوچھ لیا۔

”مگر میں یہ ہونے نہیں دوں گا۔ وہ سراسر میری زندگی سے کھینا چاہتی ہیں۔ ایک ایسی لڑکی کو میری زندگی میں داخل کر رہی ہیں جو اپنے دل میں میرے لئے کوئی احساسات نہیں لاسکے گی۔ جس کے دل و دماغ میں کوئی اور بستا ہے۔“

ماہ گل آنکھیں کھولے اُسے عجیب سے احساسات سے دوچار کئے گی۔ ایک دُکھ سا اُسے اپنے وجود میں سرایت ہوتا

محسوس ہوا۔ اس قدر بدل گیا تھا فروان۔ کبھی اشتراکے نام پر اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمک اٹھتے تھے۔ لبوں

پر مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔ اور اب وہ اشارے اس قدر بدک رہا تھا جیسے وہ اس کی زندگی میں داخل کر دی گئی تو وہ

ہاں، یہ بالکل حقیقت ہے کہ کوئی مرد بھی ایسی عورت کو قبول نہیں کر سکتا جس کے بارے میں وہ مشکوک ہو اور کجا

اشترا، جو ذولین خان کی محبت میں پور پور ڈوبی ہوئی ہے اور فروان جس سے آشنا ہے۔ فروان اتنا اعلیٰ ظرف نہیں تھا کہ

وہ اٹھی اور فروان کے قریب بیٹھی۔

”فرو\_\_\_\_ میری جان\_\_\_\_“ اُس نے اس کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔ ”کبھی کبھی مجھے یہ پچھتاوا ڈسنے لگتا

ہے کہ میں نے تمہیں اشارا کے بارے میں یہ سب کچھ کیوں بتا دیا۔ کہیں یہ مجھ سے جرم تو سرزد نہیں ہو گیا۔ کہیں

”نہیں آپ! آپ نے بہت اچھا کیا جو مجھے بتا دیا۔“ اُس نے تیزی سے ماہِ گل کی بات کاٹ دی۔ ”اگر مجھے بعد



”ارے نہیں۔۔۔ اس میں پریشان کر دینے والی کون سی بات ہے؟ تم لوگ اپنے مسائل مجھے نہیں بتاؤ گے تو کس کو بتاؤ گے۔ ارے ہاں، میں نے تو تم لوگوں کو چائے تک کا نہیں پوچھا۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”نہیں آپ! اس کی ضرورت نہیں۔“ سحر گل نے اسے روکنا چاہا۔ مگر وہ رکی نہیں اور پردہ اٹھا کر ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔ وہ کچن کی طرف بڑھی تو سامنے سے آتے ہوئے مسعود شاہ کو دیکھ کر رک گئی۔

”ارے۔۔۔ آپ کب آئے؟“

”جناب! بس ابھی قدم ہی رکھا ہے اور آپ کے درشن ہوئے ہیں۔“ وہ سچی سنوری ماہ گل کو دلچسپی اور والہانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ ”پورے قتل کے سامان تیار رکھے ہیں۔“ وہ اس کی سمت بڑھا تو ماہ گل جلدی سے بولی۔

”جناب! ڈرائنگ روم میں فروان اور سحر گل آئے بیٹھے ہیں۔ اس لئے آپ اپنے قدم ڈرائنگ روم کی جانب بڑھا دیں۔“ ماہ گل یہ کہہ کر ہٹنے لگی تو مسعود شاہ اس کے قریب آکر اس کی چوٹی کو کھینچ کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا اور ماہ گل کچن میں چلی آئی اور پھرتی سے کیتلی میں پانی بھر کر چو لہے پر چڑھا دیا اور پتی اور چینی ڈال کر اس پر ڈھکن لگا دیا اور اتنی دیر میں ٹرے میں کپ سجانے لگی۔ تب سحر گل اندر داخل ہوئی۔

”ارے کیا ہوا؟“ ماہ گل نے اسے دیکھا۔

”مسعود بھائی اور فروان تو اپنی باتیں کر رہے ہیں۔۔۔ میں ان کے درمیان مس فٹ ہو گئی ہوں اس لئے یہاں آگئی۔ ویسے آپ! آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ وہ سلیب پر کمنیاں ٹکا کر ماہ گل سے بولی۔

”کیا نہیں بتایا؟“ ماہ گل نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”اشتار اور ذولین خان کے بارے میں۔“

”سحر جان! تم جان کر کیا کرتیں بھلا؟“ وہ مسکرائی۔

”کچھ نہیں تو کم از کم اشتار کی بچی کو چھیڑ ہی لیتی ذولین کا نام لے لے کر۔“ سحر گل یہ کہہ کر ہنسنے لگی تو ماہ گل بھی ہنس دی۔

چائے ابلنے لگی تو اس نے جلدی سے کپ میں دودھ انڈیلا اور چائے بھرنے لگی۔

”سحر۔۔۔“ اس نے اچانک کچھ سوچ کر سحر کو دیکھا۔ ”کیا امی بہت سیریس ہیں اس معاملے میں؟“

”ہاں آپ! بہت زیادہ۔ ویسے آپ! اشتار بہت پیاری ہے۔ اور مجھے یقین ہے فروان کا یہ وقتی جوش ہے۔ شادی کے بعد وہ۔۔۔۔۔“

”نہیں سحر!“ ماہ گل نے اُس کی بات کاٹ دی۔ اُس کے چہرے پر سایہ سا گر گیا۔ ”تم نہیں جانتی گڑیا! یہ مرد کوئی آسان اور سیدھا سادھا فلسفہ نہیں ہے۔ قدم قدم پر عورت کو مرد کی انا، غیرت اور ضد کی آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ پھر بھی نہ جانے وہ مرد کی نظر میں معتبر ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ سحر جان! فرو بھی مرد ہے۔۔۔ وہ ابھی سے اشتار کا مخالف ہو گیا ہے تو پھر شادی کے بعد وہ تو اُس کی بیوی اور ملکیت ہو جائے گی۔ اور جب عورت مرد کی بیوی ہو جائے تو مرد اس کے لئے صرف محبوب نہیں رہتا۔ چھوڑو۔۔۔ یہ چائے لے جاؤ۔ میں آرہی ہوں۔“ اُس نے سحر کے ہاتھوں میں ٹرے تھما دی اور خود بکھرے برتن سمیٹنے لگی۔

چائے پی کر فروان جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ مسعود شاہ کے بے حد اصرار پر بھی وہ نہ رکا اور دونوں بہن بھائی باہر نکل گئے۔

فروان نے گاڑی سڑک پر ڈالی۔ سحر گل بولی۔

”فرو! چلو نا \_\_\_\_ آج ہم دریائے کابل چلتے ہیں۔ کتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہیں وہاں گئے ہوئے۔“

فروان نے اُسے دیکھا۔ اُس کے چہرے پر التجا تھی اور دریائے کابل دیکھنے کی خواہش۔ اُس نے سر ہلادیا اور گاڑی کا رخ بدل لیا۔ حالانکہ اس وقت اس کا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا، کسی تفریحی مقام پر جانے کو۔

دریائے کابل ہمیشہ کی طرح دلفریب منظر پیش کر رہا تھا۔ وہ دونوں خاصی دیر اس کے کنارے کنارے چلتے رہے۔ پھر اچانک فروان کی نگاہ شمل خان پر اٹھی۔

”سحر! وہ شامل بھائی ہیں نا \_\_\_ وہ سامنے؟“ اُس نے سحر گل سے تصدیق چاہی تو سحر گل اچھل پڑی۔

[illegible]

”اوں ہوں۔ پہلے سے کوئی رائے قائم مت کرو۔ چلو چلتے ہیں ان کے پاس۔“ فروان نے قدم تیز کر دیئے اور دونوں اشمل اور ہشمنہ کے قریب پہنچ گئے۔ ان دونوں کو بالکل اچانک اپنے روبرو دیکھ کر اشمل لمحہ بھر کے لئے سٹپٹا گیا۔ ہشمنہ اس کے ہمراہ تھی جو ان دونوں کے لئے یقیناً اجنبی تھی۔

”السلام علیکم۔“ سحر گل کی آواز پر اُس نے جلدی سے خود کو سنبھالا۔

”وعلیکم السلام! یہ آج تم دونوں یوں اچانک؟“

”بس آج ایسے ہی نکل آئے۔ مگر آپ بہت برے ہیں! ایک شہر میں رہتے ہوئے بھی ہمارے گھر نہیں آتے۔“ سحر گل ہشمنہ کو چپکے چپکے بغور دیکھتے ہوئے اشمٰل سے مخاطب ہوئی۔

”ہم لوگ ماہی آبی کے گھر گئے تھے۔ واپسی پر سوچا دریائے کابل کی سیر ہو جائے۔ چلو اچھا ہو آپ سے بھی ملاقات ہو

گئی۔“

ہشتمینہ حیرانگی سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی جو شامل خان سے بے تکلف گفتگو کر رہے تھے۔

”ماہ گل کیسی ہے؟“

”بہت اچھی۔ اور اب بہت خوش۔“ سحر جلدی سے بولی اور نگاہیں پھسلتی ہوئی پھر ہشمدینہ پر اٹھیں تو اس نے اپنے دل میں محلتے سوال کو زبان دے دی۔

”آپ نے ان کا تعارف نہیں کرایا۔“

”یہ میری کولیگ ہیں۔“ اُس کی شرارت کو محسوس کرتے ہوئے اشمیل نے بے حد پُر اعتماد لہجے میں کہا تو وہ ہنس دی۔

”صرف کولیگ؟“ اُس سے برداشت نہ ہو رہا تھا۔ ڈھیر سارا تجسس اُمڈا جا رہا تھا۔

فروان ہنس دیا۔ ”تمہیں بڑی فکر لگ گئی ہے سحر!“ اس نے اسے ٹوکا۔ اشمیل کچھ خفیف سا ہورہا تھا۔

سحر گل کی آنکھوں میں سچے شریہ رنگ سب کچھ جان بھی رہے تھے مگر انجان بن کر وہ محض اس کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔

ہشتمینہ نے رخ موڑ لیا تھا اور پانی پر نگاہیں مرکوز کئے کھڑی تھی۔ وہ خود بھی جھینپ گئی تھی۔ تب اچانک سحر گل اس کے بالکل قریب کھڑی ہو گئی۔

فروان اور اشمل تو اپنی باتیں لے کر بیٹھ گئے تھے۔

”آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔“ اس نے ہشتمینہ کا بھرپور جائزہ لیا۔ سرمئی چادر کو سنبھالتی وہ اپنے دل کی کیفیت چھپانے میں سرخ ہو رہی تھی۔

”ہشمنہ نام ہے میرا۔ دراصل میں اشمل کی کولیگ ہوں۔ ایسے ہی ہماری ملاقات ہو گئی وہ بھی۔۔۔۔۔“

”آں ہاں، رہنے دیں جناب!“ سحر گل نے جلدی سے اُسے وضاحت سے روک دیا۔ ”اتنی پیاری لڑکی صرف اشمل بھائی کی کولیگ ہی نہیں ہو سکتی۔“ اس کا جملہ بے ساختہ تھا۔ ہشمنہ کے رخسار تپ اُٹھے۔

”ویسے یہ اشمل بھائی بڑے چھپے رستم ہیں۔ اور آپ بھی ان کے ڈر سے نہیں بتائیں گی۔ ہے نا؟“ وہ اس کی سمت جھکی۔ پھر اس کے سرخ رخساروں کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں اشمل بھائی کی ماموں زاد ہوں۔۔۔۔۔ سحر گل کہتے ہیں مجھے۔“ اس نے بے تکلفی سے اپنا تعارف کرایا اور ہشمنہ نے سکھ کا سانس لیا کہ وہ اس موضوع سے ہٹی تو سہی۔ پھر اُس کا اعتماد بحال ہونے لگا۔ وہ سحر گل کی بے تکلفانہ باتوں سے محفوظ ہوتی رہی اور تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں خاصی گھل مل گئیں۔۔۔۔۔ اور جب فروان اور اشمل ان دونوں کی طرف متوجہ ہوئے تو انہیں مصروف گفتگو دیکھ کر فروان کی رگ شرارت پھڑکی۔

”اشمل بھائی! یہ لڑکیاں یو نہی بدنام نہیں ہیں۔۔۔۔۔ باتیں کرنے کے لئے انہیں کوئی ملنا چاہئے۔ سارے اگلے پچھلے ریکارڈ توڑ دیں گی۔“

”ارے واہ۔۔۔۔۔ اس میں بدنام ہونے والی کون سی بات ہے؟ یہ تو ہم لڑکیوں میں خلوص ہوتا ہے جو ایک دوسرے کو قریب لے آتا ہے۔“

”خلوص نہیں، زبان بھی۔“ اشمل نے کہا تو سحر گل نے منہ بنایا۔

”اونہ۔۔۔۔۔ ابھی تو ہم لوگوں نے کچھ باتیں ہی نہیں کیں اور آپ لوگ پیچھے پڑ گئے۔“

”سبحان اللہ۔۔۔۔۔ کیا کہنے کہ ابھی تو انہوں نے باتیں ہی شروع نہیں کیں۔“ فروان نے آنکھیں پھیلا کر مصنوعی

حیرت کا اظہار کیا تو وہ دونوں بھی مسکرا نے لگیں۔ فروان کا موڈ بھی قدرے

خوشگوار ہو گیا تھا۔ ذہن پر چھائی پڑمردگی اور ڈپریشن کسی حد تک زائل ہو چکا تھا۔

”اب آپ ہشمنہ کو لے کر ہمارے گھر ضرور آئیے گا۔“ سحر گل، اشمل سے بولی۔

”فی الحال تو میں وادی جا رہا ہوں۔“

”ہم تو آپ کو بس کبھی کبھی اخبار میں دیکھ لیتے ہیں۔ ویسے بڑے کارنامے انجام دیتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔ خوب تعریفیں اور بیانات ہوتے ہیں آپ کے بارے میں۔“ سحر گل بولی۔

”آ۔۔۔۔۔ چھل۔۔۔۔۔“ اشمل کو حیرت ہوئی۔ ”مگر میں نے تو کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا، سوائے ایک کے۔“ اُس نے یہ کہتے ہوئے معنی خیز نگاہوں سے ہشمنہ کو دیکھا پھر مسکرا دیا۔

”ارے جناب! چاند کو کب خبر ہوتی ہے کہ وہ زمین والوں کے لئے روشنی کا کام انجام دے رہا ہے۔“ فروان نے زبردست جملہ کسا تو اشمل خان اس کھلی تعریف پر جھینپ گیا۔

”تم دونوں بہن بھائی بہت زیادہ شریر ہو گئے ہو۔ اوکے، پھر ملاقات ہوگی اگر زندہ رہے تو۔“ اشمل نے رسٹ وائچ پر نگاہ ڈالی تو اُسے وقت گزرنے کا احساس ہوا۔

”ارے واہ۔۔۔۔۔ زندہ کیوں نہیں رہیں گے۔ ابھی تو آپ کے سہرے کے پھول بھی کھلنے ہیں۔“ سحر گل جلدی سے بولی اور شرارت بھری نظروں سے ہشمنہ کو دیکھا اور ہنستی ہوئی فروان کے ساتھ آگے بڑھ گئی اور ہشمنہ اور اشمل اپنی گاڑی کی طرف۔

”آپ نے کبھی بتایا نہیں اپنی اس کزن کے بارے میں۔۔۔۔۔ بہت پیاری سی ہے سحر گل۔“

”جی، سب ہی پیارے ہیں۔ سوائے میرے۔“ اشمل نے جھک کر گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے کہا تو ہشمنہ نے قطعی

نہ سمجھتے ہوئے اسے دیکھا۔

”کیا مطلب؟“

”تم فردِ آفر دُاسب کی تعریف کر چکی سوائے میرے۔ اور میرا کیا قصور ہے۔“

”اوہ۔“ اُس نے گہرا کر جلدی سے پلکوں کی باڑھ جھکالی۔ ان بھوری آنکھوں کی جگمگاہٹ میں بڑی شرارت تھی۔ وہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”کیا یہ بندہ تعریف کے قابل نہیں؟“ اُس نے انگلیشن میں چابی ڈالتے ہوئے اس کے دھنک رنگ چہرے کو بے حد والہانہ پن سے دیکھا۔

”آپ کی تعریف میری شکست ہوتی ہے۔“ اس نے چہرے کا رخ کھڑکی کی طرف کر لیا۔ ”اور میرے لئے ایک شکست ہی کافی ہے۔ بار بار اس شکست کا اعتراف کرنا بہت مشکل ہے۔“ اس نے کہا تو اشمیل کی بھرپور ہنسی گاڑی میں بکھر گئی۔ اس نے سرشار انداز میں گاڑی شفاف سڑک پر فُل اسپید پر چھوڑ دی۔

...☆☆☆...

اُس کے تو گمان میں بھی نہ تھا کہ اتنا بڑا اندر مچ جائے گا۔ بات گو کہ معمولی نہ تھی کہ شاہ خانم خاموش رہتیں۔ مگر اب ان کے مقابل صرف وہ یازولین نہ تھا، بابا خان تھے۔ ان کے شوہر، ان کے مجازی خدا۔ یہ ان کی خواہش تھی۔ ان کا حکم تھا جس پر شاہ خانم سر تا پا سلگ اُٹھی تھیں۔

ذولین سے نفرت ان کی رگ رگ میں پھر جاگ اُٹھی تھی۔

اُن کے لبوں سے، اُن کی آنکھوں سے یہ نفرت اُٹنے لگی تھی۔

اشٹار کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ کمرے میں جلے پاؤں کی بلی کی طرح ٹہل رہی تھی۔ تب زور سے دروازہ کھلا اور شاہ خانم تنے تنے چہرے کے ساتھ اندر داخل ہوئیں۔

وہ لبی جگہ پر جم گئی۔

”اشٹار! ادھر آؤ، یہاں بیٹھو۔“ ان کی آواز میں بلا کی کر خنگی تھی۔ وہ کھٹ سے صوفے پر ٹک گئی۔

”تمہیں شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس گھر میں کون سا طوفان اٹھا ہوا ہے۔“ ان کے لہجے میں نرمی نام کو نہ تھی۔ اس نے سر جھکا لیا۔

”مہروز خان، انہونی کرنے نکلا ہے۔ جانتی ہو مجھے ذولین سے نفرت کیوں ہے؟ کیا ہے اس کی وجہ؟“ انہوں نے خود کو اس کے سامنے کر سی پر گر لیا۔

اشٹار نے بے حد آہستگی سے سر ہلایا۔

”ذولین کے باپ نے میری بہن کو سسکا سسکا کر مارا تھا اشٹار!\_\_\_\_ اس شخص کا باپ قاتل ہے گلناز کا۔ خود غرض تھا وہ شخص۔ میں اتنی جلدی اُسے معاف نہیں کر سکتی۔“

اشٹار نے بے اختیار سر اٹھایا۔

”اتنی جلدی\_\_\_\_ اب تو بہت دیر ہو گئی شاہ خانم! بہت عرصہ بیت گیا ہے۔ یہ جلدی تو نہیں رہی۔ بہت ظلم سہ لیا ذولین نے بھی اپنے ناکردہ گناہ کی سزائیں۔“ اس کی آنکھوں کے فرش گیلے ہو گئے۔

”فیروز خان خود نہ رہا مگر اپنی شبیہ چھوڑ گیا۔ مجھے تڑپانے کے لئے۔ گل کی موت کا منظر اب بھی میرے حافظے میں اسی طرح جو ان ہے۔ اس شخص نے میری بہن کی خوشیاں ڈس لی تھیں۔“ شاہ خانم کر سی دھکیل کر کھڑی ہو گئیں۔



ان کا سراپا غصے سے کانپ رہا تھا اور آنکھوں میں شرارے لپک رہے تھے۔

’اگر آپ کے مجرم تھے بھی تو فیروز چچا تھے۔ ذولین تو نہیں۔ اس نے تو اس وقت دنیا میں قدم بھی نہ رکھا تھا۔ پھر مجرم وہ کیونکر ہو گیا۔ نفرت کا حق دار وہ کیونکر بنا ہے؟ یہ تو بالکل نیا وجود ہے جو

’وعلیکم السلام! کب آئے تم؟‘ اُسے دیکھ کر شاہ خانم کا چہرہ چمک اٹھا۔

’میں ابھی آیا ہوں۔‘ اس نے کاندھے پر پڑا بیگ زمین پر رکھ دیا اور پھر ایک طائرانہ نگاہ اطراف میں ڈال کر شاہ خانم کو بغور دیکھا۔ ان کی روئی روئی، متورم آنکھیں اور چہرے پر چھائی گہری سنجیدگی نے اُسے مسئلے کی سنگینی کا احساس دلایا۔

’آئیے، ہم بیٹھتے ہیں۔‘ اس نے آگے بڑھ کر شاہ خانم کو محبت اور نرمی سے تھاما۔

’نہیں۔۔۔ تم تھک گئے ہو گے۔ پہلے کچھ کھا لو اور آرام کر لو۔‘

’ارے دو گھنٹے کی ڈرائیونگ میں کیا تھکا۔ میں بالکل فریش ہوں۔ اور بھوک تو بالکل نہیں ہے۔ زیبیل! یہ بیگ میرے کمرے میں رکھ دو۔ آئیے شاہ خانم!‘ وہ شاہ خانم کو لئے ان ہی کے کمرے میں چلا آیا۔

’میں نے ہاسٹل چھوڑ دیا ہے۔ اب یونیورسٹی بانی کار ہی جاؤں گا۔ چند ماہ ہی تو رہ گئے ہیں میرے فائنل میں۔‘ اس نے پہلی خبر ہی دی تو شاہ خانم کھل اٹھیں۔

’میں تو ہمیشہ ہی کہتی تھی۔ خدا کا شکر کہ تمہاری سمجھ میں آیا۔‘

وہ ہنس دیا اور ان کے آرام دہ صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔

’صرف آپ کی خاطر اب بھی یہ قدم اٹھایا ہے۔‘

’جانتی ہوں۔۔۔ ایک تم ہی تو ہو جسے میرا خیال ہے۔‘ شاہ خانم نے محبت سے اسے دیکھا تو اس کے چہرے پر سنجیدگی پھیل گئی۔

’نہیں شاہ خانم! آپ اپنے اطراف نگاہ ڈالیں تو محسوس کریں گی کہ اس گھر اور اس حویلی کے باہر سب آپ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ آپ کی عزت کرتے ہیں اور وہ سب آپ کی محبت کے خواہاں ہیں۔‘ اس نے دونوں بازو صوفے کی پشت پر پھیلا دیئے اور خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ’یہ بتائیے کہ یہ فون پر آپ نے کیسا بم بلاسٹ کیا تھا؟ بانی گاڈ، میں تو پریشان ہی ہو گیا۔ بھاگا چلا آیا ہوں۔‘

شاہ خانم کمرے میں ٹہلنے لگیں۔۔۔ پھر بڑے سنہری وال کلاک کے سامنے رکیں اور پلٹیں۔

’اس حویلی میں سمجھو بم بلاسٹ ہی ہوا ہے۔ اور یہ بلاسٹ مہروز خان نے کیا ہے اشمیل! تمہارا باپ وہ کرنے لگا ہے جو میری سوچ میں بھی نہیں تھا۔ اور نہ میں یہ کرنے دوں گی۔‘ ان کے چہرے پر غصہ کی سرخی دوڑ گئی۔

’کیا؟۔۔۔ مجھے کھل کر بتائیں۔‘ اشمیل سیدھا ہو بیٹھا۔

’وہ اشتار کی شادی ذولین سے کرنا چاہتے ہیں۔‘ شاہ خانم کے منہ سے نکلا ہوا یہ جملہ اشمیل کے لئے خوشگوار حیرت لئے ہوئے تھا۔

’میں تو کبھی اس رشتے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اشمیل!‘ شاہ خانم کا لہجہ آگ سے بھرا ہوا تھا۔ اشمیل کے چہرے پر کئی تاثرات آئے اور معدوم ہو گئے۔ وہ صوفے سے کھڑا ہو گیا۔ خوشگوار حیرت اب سنجیدگی میں ڈھل گئی تھی۔

’بابا خان کا یہ فیصلہ قطعاً غلط نہیں ہے شاہ خانم!‘ اُس نے سنجیدگی سے کہا تو شاہ خانم نے غایت درجہ حیرانگی اور غصہ

کے ساتھ اُسے دیکھا۔

”اش۔۔۔۔۔ مل۔۔۔۔۔ تم بھی؟“ ان کی آواز میں بے پناہ غراہٹ تھی اور جسم کا سارا خون یک بیک چہرے پر سمٹ آیا۔

”گستاخی معاف شاہ خانم! مگر یہ حقیقت ہے کہ بابا خان کا فیصلہ نہ صرف درست ہے بلکہ بہت ہی اچھا ہے۔ اشارا بہت خوش نصیب ہوگی اگر اُسے ذولین جیسا۔۔۔۔۔“

”شٹ یور ماؤتھ۔۔۔۔۔ اشمیل! تم۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔“ شاہ خانم نے تیزی سے اُس کا جملہ کاٹ دیا۔ غصہ سے ان کا جسم کانپنے لگا۔ اشمیل سے اُنہیں یہ اُمید ہر گز نہ تھی کہ وہ بھی مہر وز خان کا ساتھ دے گا۔ ان کے تپتے آبلوں پر مرہم رکھنے کی بجائے ان کے درد کو اور بھی چھیل دے گا۔

”نکل جاؤ میرے کمرے سے۔۔۔۔۔ ابھی اور اسی وقت۔۔۔۔۔“ انہوں نے شرارے برساتی نظروں سے اُسے دیکھا۔

”شاہ خانم! وقت تو ہر غم بھلا دیتا ہے۔ بڑی بڑی دیواریں ٹوٹ جاتی ہیں اور آپ نفرت کی اتنی کمزور اور بے وقعت دیوار کو تھامے کھڑی ہیں ابھی تک۔ گلنا زانی آپ کو یہ ذمہ داری تو نہیں سونپ کر گئی تھیں کہ خود کو اور ذولین کو بلکہ حویلی کے ہر فرد کو سزا دیں۔“ اشمیل نے حتی الامکان لہجہ کو نرم رکھتے ہوئے کہا۔ مگر شاہ خانم غصے سے پاگل ہو رہی تھیں۔ انہوں نے اشمیل کو اپنی حمایت کے لئے بلایا تھا۔ اب اس کی باتیں ان کی برداشت سے باہر تھیں۔

”میں اس دیوار کو نہیں گرا سکتی۔ اتنی مدتیں بھی میرے درد کا مداوا نہیں رہیں۔ زخم بھر جائیں تو داغ رہ جاتا ہے۔“

”آپ اتنی مدتیں اس غم کو تازہ رکھتی رہیں بلکہ اس درد کو، ان زخموں کو کھرچتی رہیں۔ ان میں اضافہ کرتی رہیں ہیں۔ آپ ٹھنڈے دل سے سوچئے گا، اس میں صرف ذولین کی ذات ہی نہیں، خود آپ کی بیٹی بھی ہے۔ اس کی

زندگی، اس کا مستقبل آپ کی اندھی نفرت کی بھینٹ نہ چڑھ جائے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ اشارا میری بیٹی ہے۔ وہ کبھی میرا مان نہیں توڑے گی۔ اُسے میری عزت اور میری انا بہت عزیز ہے۔“ ان کے لہجے میں تکبر تھا۔ فخر تھا۔ اور اشمیل کے لبوں پر دُکھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ وہ بیٹی ہے شاہ خانم! اور ہماری بیٹیاں ان ہی جھوٹی اناؤں کی بھینٹ چڑھتی آرہی ہیں۔ ان کی خواہشات، ان کے خوابوں کی کرچیوں پر ہم لوگ قدم رکھ کر بہت فخر محسوس کرتے ہیں۔“ اشمیل کے لہجے میں گہرا تاسف ہی نہیں، گہری کاٹ بھی تھی۔ شاہ خانم نے اُسے دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ صرف صورت ہی نہیں کسی حد تک مزاجاً بھی انہی پر گیا تھا۔ اس کی بھوری بھوری آنکھوں میں غم اور غصہ ہلکورے لینے لگا تھا۔

وہ کرسی پر ڈھیر ہو گئیں۔

”تم سب لوگ مل کر مجھے توڑ دینا چاہتے ہو۔۔۔۔۔ مجھے شکست دینا چاہتے ہو۔“ ان کی آواز میں اُدا سی گھل گئی۔

اشمیل اُن کے قریب بیٹھ گیا اور ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں دیکھا۔

شاہ خانم نے اسے دیکھا، پھر پلکیں موند کر کر سی کی پشت پر سر ٹکا کر بولیں۔

”مہر وز خان مجھے شکست دینے چلا ہے۔ مگر میں یہ مرتے دم تک نہیں ہونے دوں گی۔ اشارا، فروان کی امانت ہے اور سحر گل اس گھر میں بہو بن کر آئے گی۔“ انہوں نے کہا تو اشمیل ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ شاہ خانم نے اُسے دیکھا۔

وہ لب بھینچے جیسے ایک کرب سے گزر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت پھیل گئی۔

”تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا اشمیل! \_\_\_ اس جنگ میں تمہیں میرے ساتھ ہو کر لڑنا ہوگا۔“

”یہ جنگ نفرت کی بنیاد پر آپ نے اٹھائی ہے۔ اور میں ہر گز ساتھ نہیں دوں گا۔“ اُس نے قطعیت سے کہا اور پھر دھیرے سے بولا۔ ”شاہ خانم! میں سحر گل سے شادی نہیں کر سکتا۔ میرے دل میں سحر کے لئے ایسے کسی جذبے کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہ مجھے بہنوں کی طرح عزیز ضرور ہے مگر میں اُسے کسی ایسے رشتہ میں قبول نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ۔۔۔۔۔“ وہ لمحہ بھر رکا اور شاہ خانم کے متغیر چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ ”ہشتمینہ ابراہی پہلی اور آخری لڑکی ہوگی جو اس رشتہ سے اس حویلی میں آئے گی ورنہ اور کوئی نہیں۔“ وہ یہ کہہ کر رکا نہیں اور پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔

وہ شاہ خانم کو کسی دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ہر بات کھل کر کرنے کا عادی تھا۔ جھوٹ یا منافقت کے راستے اُسے ہر گز پسند نہ تھے کہ وہ اس پر قدم رکھتا۔

اور شاہ خانم اس کی زبان سے یہ اقرار سن کر سنائے میں رہ گئیں۔ اشمیل کے جملے کسی آہنی تیر کی طرح ان کے دل کے آر پار اتر گئے تھے۔

’یہ چاروں طرف سے بغاوت کے طبل کیوں بج رہے ہیں؟ \_\_\_ نہیں، میں یہ نہیں ہونے دوں گی۔‘ ان کی رگوں میں خون نہیں انگارے دوڑنے لگے۔ انہوں نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئیں۔

...☆☆☆...

زیل اشتار پر جھکی ہوئی تھی اور اُسے پکار رہی تھی۔

”خان زادی! کیا ہوا؟ \_\_\_ آنکھیں کھولو خان زادی!“ اُس کی آواز میں بلا کا خوف تھا۔

اشتار اُس کی آواز سن رہی تھی۔ وہ کرسی پر ڈھیر تھی۔ پھر اس نے بو جھل پلکیں کھول کر اُسے دیکھا۔

”کیا ہوا خان زادی؟“

”کیا ہو گا زیبے \_\_\_“

”میں تو بری طرح ڈر گئی تھی کہ خدا نخواستہ بے ہوش تو نہیں ہو گئیں۔ مگر یہ چہرہ کیوں زرد ہو گیا ہے تمہارا؟“

”جب خواب ٹوٹے ہیں نازیبے! تو اندر باہر سب کچھ ہی بکھر جاتا ہے۔ تم نے کبھی نم ہاتھوں سے کانچ کا برتن پھسلتے

دیکھا ہے \_\_\_ کبھی بارش کے قطروں کو مٹی میں ملتے دیکھا ہے؟ ہاں زیبے! میری آرزوئیں بھی یوں ٹوٹ گئی ہیں

جیسے کانچ کی نازک اور سبک چوڑیاں ہاتھوں سے گر کر کرچی کرچی ہو جائیں۔“ اُس نے اپنی چراغ ہوتی آنکھیں

اٹھائیں تو زیل پوری جان سے کانپ گئی۔ اُسے اس قدر ٹوٹا ہوا دیکھ کر وہ سخت حزیں ہو گئی۔ اُسے کچھ پوچھنے کی

ضرورت نہ رہی تھی۔ آج کل حویلی میں جو طوفان اٹھا ہوا تھا اس سے وہ بے خبر نہ تھی۔ اور شاہ خانم کا رویہ اس کے

لئے نیا نہیں تھا۔ ذولین خان سے ان کی نفرت اس سے چھپی نہ تھی۔

وہ اشتار پر جھک آئی اور اس کے سنہری بالوں کو پیار سے سہلانے لگی۔

”اتنی جلدی ہمت ہار دو گی تو وہ شخص کیا کر لے گا جو تمہارے ہی سہارے اتنا آگے بڑھ گیا ہے۔ وہ پھر تنہا ہو جائے گا۔

اس کے سارے حوصلے بکھر جائیں گے۔ نہیں اشتار! ذولین خان کو تمہاری ضرورت ہے \_\_\_ تمہاری ہمت اور

محبت کی ضرورت۔ اتنی جلدی شکست قبول کر لو گی تو کبھی کامیابی نہ پاسکو گی۔“

”زیو! مجھ میں حوصلہ ہی تو نہیں ہے۔“ اُس نے کرب سے لب کاٹے۔

”اوں، ہوں۔۔۔ محبت تو انسان کو نڈر بناتی ہے۔ تمہاری یہ بزدلی ذولین کے بھی قدم ڈگمگا دے گی۔ تم ہی پیچھے ہٹ جاؤ گی تو وہ کس آس پر آگے بڑھے گا؟ نہیں، نہیں خان زادی! اگر ذولین خان جیت گیا تو یہ صرف تمہاری محبت کی فتح نہ ہوگی بلکہ اس حویلی میں نفرت کی شکست اور خوشیوں کی فتح ہوگی۔“ زیبیل کا ٹھنڈا میٹھا لہجہ اُسے تقویت دے رہا تھا۔ ”اٹھو اور منہ دھو لو۔ ابھی تو تمہیں ذولین کو بھی حوصلہ دینا ہے۔ چلو شاباش۔“ زیبیل اُسے تھام کر ہاتھ روم کی طرف لے آئی۔

”ان بزدل آنسوؤں کو پانی سے دھولو۔ یہ آنسو صرف دکھ کو بڑھاتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے ہیں۔“ زیبل نے کہا تو اس نے اس کے مہربان چہرے کو محبت پاش نظروں سے دیکھا اور پھر ہاتھ روم میں چلی گئی۔

زیبل کے جملوں نے اس کے اندر پھر جیتنے کی اُمنگ بھردی تھی۔

ایک نئی توانائی۔

## ایک نیا حوصلہ۔

ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اُسے فرحت بخش رہے تھے۔ وہ تو لیے سے منہ پونچھتی ہوئی باہر نکلی تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اشمٰل اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”لالہ! آپ کب آئے؟“ وہ بے تابانہ اس کی طرف بڑھی۔

”زیادہ دیر نہیں ہوئی۔“ اس نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔ ”تم کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں۔۔۔ اس بار آپ جلدی آگئے اور وہ بھی بغیر اطلاع دیئے۔“ اشمیل کو دیکھ کر اس کا دل بے پناہ مسرت

محسوس کر رہا تھا۔

”مجھے شاہ خانم نے بلوایا تھا فون کر کے۔“ اس نے اطلاع دی تو وہ چند لمحے اپنی جگہ حیرت میں کھڑی رہی۔ اس کی پلکیں جھک گئیں۔

اشمل نے اسے دیکھا۔ پلکوں کے کنارے سرخ سرخ اور متورم تھے اور چہرے پر رنج پھیلا ہوا تھا۔

”تو آپ کو انہوں نے سب کچھ بتا دیا ہو گا۔“ اس نے جھکی جھکی نظروں کے ساتھ پوچھا تو اشمل نے لب بھینچ لئے۔

وہ چلتے ہوئے اس کے قریب آگیا اور پھر اس کے شانوں پر شفقت سے ہاتھ دھرتے ہوئے بولا۔ ”بابا خان کا فیصلہ بالکل درست ہے۔ اب اس حویلی میں انقلاب آئے گا۔۔۔ ضرور آئے گا۔“

”جی۔۔۔“ وہ سر اٹھا کر اشمہل کو دیکھنے لگی۔

”ہاں۔۔۔“ اُس نے سر ہلادیا۔ ”اُٹو میرے ساتھ باہر۔۔۔ دیکھو کتنا اچھا موسم ہو رہا ہے۔ تم تو اس منظر کی بہت دیوانی ہو۔ بادش کے بھی اتنا ہیں۔“ اُس نے ایک نظر دریچے سے باہر ڈالی اور پھر اسے لئے کمرے سے باہر آگیا۔

زیبل موسم کی مناسبت سے سبز قہوہ اور دوسرے لوازمات تیار کر رہی تھی اور اشتراکے ساتھ لان میں آگیا۔

موسم بے حد دلکش ہو رہا تھا۔ سیاہ بادل لا جو ردی آسمان کو ڈھانپ رہے تھے۔ فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی اور ہر سُو خوابیدہ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ وہ دونوں نرم نرم گھاس پر چلنے لگے۔ اشمل نے نظریں انیکسی کی طرف اٹھائیں۔

”ذولین ابھی نہیں آیا کیا؟“

”جی۔۔۔۔۔آل۔۔۔۔۔پتہ نہیں۔“ وہ جانے کن سوچوں میں کھوئی جا رہی تھی، جلدی سے چونکی اور پھر

سنجھ کر بولی۔ ”وہ اس وقت تو رائیڈنگ پر جاتے ہیں نہ۔“ اس نے بتایا تو اس کی معلومات پر اشمیل کے لبوں پر



دھیمی مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ ذولین کے بارے میں ایک ایک خبر رکھتی تھی۔

”اُس دیوانے کو رائیڈنگ کا کریزا بھی تک اتنا ہی ہے۔“

”آپ کو بھی تو بہت شوق ہے۔“ اشارے نے کہا تو اشمیل نے سر ہلادیا اور پھر یو کلپٹس کے خوشبودار پتوں سے کھیلنے ہوئے اشارے کی سمت دیکھا۔

”ایک بات پوچھوں اشارے؟“ اُس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ اشارے کی جھکی جھکی پلکیں اُٹھ نہ پائیں۔ اُس کا دل زور سے دھڑکا۔

”جی۔۔۔“ اُس نے پلکیں اٹھائے بغیر جواب دیا۔ وہ اس کے بالکل قریب آگیا تھا۔

”شاہ خانم جو چاہتی ہیں اس سے تم باخبر ہو۔۔۔ انہوں نے مجھے اسی سلسلے میں بلوایا ہے۔“ اُس نے تمہید باندھی۔ یا جو پوچھنا چاہتا تھا، یکدم پوچھنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔

”یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ شاہ خانم اس سلسلے میں تمہاری مرضی معلوم نہیں کریں گی۔ ان کا اپنا فیصلہ ہے جو اس حویلی کے ہر شخص نے آج تک قبول کیا ہے۔ جبری ہی سہی۔ مگر اب بات کچھ اور ہے۔ شادی دو انسانوں کے درمیان ایک گہر اور ہمیشہ کا بندھن ہے۔ یہ ایک جوا ہے جسے بہت سوچ سمجھ کر کھیلنا پڑتا ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ شاہ خانم کا جذباتی فیصلہ یا تمہاری بزدلی تا عمر کا پچھتاوا بن جائے۔ تم سمجھ رہی ہو نامیری بات۔۔۔؟“ اُس نے رک کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر گہرا اضمحلال پھیل گیا تھا۔ ”اشارے! تم اپنی رائے دو۔۔۔ بلکہ اپنے حق کے لئے آواز اٹھاؤ۔ یہ بہت ضروری ہے۔“

اشارے نے سر اٹھایا۔ اس کے چہرے پر کئی تاثر آئے اور معدوم ہو گئے۔ اشمیل کے جملے نے اس کے دل پر عجیب سی کیفیت پیدا کر دی جو بیک وقت اُسے حوصلہ بھی دے رہا تھا اور ملال بھی۔

اچانک آسمان سے موٹے موٹے قطرے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

”میں شاہ خانم کو نہیں، ان کی نفرت کو شکست دینا چاہتا ہوں۔“ اس نے اس کا بازو تھاما اور شیلٹر کے نیچے بچھی کر سیوں کی طرف آگیا۔ ”بیٹھو یہاں۔“

وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

موٹے موٹے قطرے تیز بارش میں بدل گئے اور بارش کے شور نے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اشارے نے ماحول کی پھیلتی سیاہی کو جیسے اپنے دل میں اترتا محسوس کیا۔

”اشمیل لالہ! اتنے برس بیت گئے اپنے اندر کی آوازوں کا گلا گھونٹتے ہوئے۔ اب احتجاج کی صدائیں بھی دم توڑ چلی ہیں۔“ اس کے لہجے میں گہری یاسیت تھی۔

”نہیں اشارے۔۔۔ جب تک سانس کی ڈوری جسم کے ساتھ رہتی ہے تب تک آواز بھی زندہ رہتی ہے۔ فطرتِ انسانی اُمید، مزاحمت اور نبرد آزمائی کے لئے ہمیں آگے، اور آگے بڑھانی چلی جاتی ہے۔ تم نے ذولین کی طرف قدم بڑھائے تو محض خوش آئند امید کے سہارے ہی نہ۔“ اشمیل کا جملہ اشارے کے چہرے کو سرخ کر گیا۔

تو اس کا بھائی سب کچھ جان چکا تھا۔۔۔ اس سے دور رہتے ہوئے بھی وہ اس کے اتنے قریب تھا۔ اس کے مزاج اور اس کے دل کے قریب۔ اس نے چہرے کو اور بھی جھکا لیا۔

زیبے ان کے درمیان رکھی میز پر قہوہ اور لوازمات رکھ گئی تھی۔ اشمیل نے قہوہ کی بلوری پیالی اٹھالی اور ہولے ہولے سپہ لینے لگا اور نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹا کر برستی بارش کو دیکھنے لگا۔ اشارے دونوں ہاتھ گود میں رکھے عجیب سے خلفشار کا شکار بنی بیٹھی رہی۔ تا عمر پابندیوں کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی۔ وہ یک دم ساری زنجیریں کیسے توڑ سکتی تھی۔

”نہیں۔۔۔ یہ بہت مشکل ہے۔۔۔ میں ہی بے وقوف تھی کہ حقیقتوں سے بے خبر آرزوؤں کے ایوان سجاتی رہی۔ چاند تاروں کے، بہاروں کے سپنے بُنے لگی تھی۔“

”اشٹارا! میں تمہاری بزدلی سے باخبر ہوں۔“ اشمل کی بھاری آواز گونجی۔ اُس کی نگاہیں اس کے کرب زدہ چہرے پر ٹپک گئیں۔ ”مگر یہ بہت ضروری ہے۔ شاہ خانم کو ان خود ساختہ نفرتوں کے جال سے نکالنا ہے۔ اور ذولین کو بھی اس کا حق ملنا چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ نیارشتہ ذولین اور ان کے درمیان تمام فاصلے سمیٹ لے گا۔“

اشٹارا کی آنکھوں میں آنسوؤں کے جالے تن گئے۔

”اشمل لالہ! میں فروان کے سنگ خوش نہیں رہ سکوں گی۔ میں نے اُسے کبھی۔۔۔۔۔“ وہ آنسو پیتے ہوئے گلوگیر لہجے میں بولی تو اشمل ہنس دیا۔

”بے وقوف لڑکی! یہی تو میں بھی سمجھا رہا ہوں کہ بس تھوڑی ہمت کرنی ہوگی تمہیں۔ میرا اور بابا خان کا ساتھ دینا ہوگا۔“ اشمل اٹھ کر اس کے قریب آگیا اور اس کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کے ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے۔ وہ سر جھکا کر بلک اٹھی۔ وہ سمجھ نہ سکی کہ یہ اتنے بہت سارے آنسو کیسے بہہ نکلے۔ شاید ذولین کو نہ پاسکے کا دھڑکا تھا۔۔۔ شاہ خانم کا خوف تھا یا اشمل کے سامنے خفت کا احساس مارے دے رہا تھا۔

وہ آہستگی سے اٹھی۔ تب لمحہ بھر اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔ ذولین بہت خاموشی سے ان کی طرف آگیا تھا۔ بلیک شرٹ، بلیک جینز اور لونگ شوز میں وہ شاید ابھی ابھی رائیڈنگ سے واپس آیا تھا۔ اشٹارا کے آنسو اور اشمل کی موجودگی نے اُسے متحیر کر دیا تھا۔ پھر چونک کر اشمل بھی پلٹا۔

”ارے تم۔۔۔“ اشمل اُسے دیکھ کر مسکرایا۔ ”تم کب آئے، اتنی رازداری سے؟“ ذولین آگے بڑھ کر اس سے بغل گیر ہو گیا۔ ”یوں بغیر اطلاع دیئے اور اتنی جلدی؟“ وہ واقعی حیران ہو رہا تھا۔

”ہاں یاد! بس آنا پڑا۔ اور اب تو ہاسٹل کو ہمیشہ کے لئے خدا حافظ کہہ آیا ہوں۔۔۔ آؤ بیٹھو۔“

ذولین نے کرسی کی جانب بڑھتے ہوئے اشٹارا کی سمت دیکھا جو آہستگی سے پلٹی اور اندر کی طرف بڑھ گئی۔

”بہت بزدل لڑکی ہے۔ اور بہت معصوم۔“ اشمل نے عجیب اُداس اور ملول سے لہجے میں کہا تو ذولین نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اُسے تو کبھی سمجھانے کے لئے فریق ثانی کو زیادہ لفظوں کی ضرورت نہ پڑی تھی۔ وہ لہجے سے ہی بہت کچھ جان لیتا تھا۔ اشٹارا کے آنسو اور اشمل کے جملے نے اسے سب کچھ نہ سہی مگر بہت کچھ سمجھا دیا۔

”رائیڈنگ سے واپس آئے ہو؟“ اشمل نے یکنخت موضوع بدل ڈالا۔

”ہاں۔۔۔ موسم یکدم بدل گیا اس لئے جلدی واپس آنا پڑا۔ مجھے خبر ہوتی کہ تم آنے والے ہو تو پھر ساتھ ہی جاتے۔ تم آئے بھی تو بغیر اطلاع ہو۔“ وہ بھی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

”مجھے تو لگتا ہے اب گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھنا بھول گیا ہوں۔ یا گھوڑا مجھے بٹھانا۔ اتنی مصروفیت میں سب کچھ ہی بھول گیا ہوں۔ ڈرنے لگا ہوں اب تو۔ خاص کر تمہارے اُس پالتو سے۔“

”کیا۔۔۔ ڈرنے لگے ہو؟“ ذولین نے اپنی سبز آنکھوں کو پھیلا کر اُسے دیکھا اور پھر دونوں ہنسنے لگے۔

”یہی سمجھ لو۔“ اس نے قہوہ پیالی میں بھر کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔

☆☆☆☆...

رقص میں ہے سارا جہاں جھوم میرے دل جواں

محفل میرے یاد کی ہے جھوم میرے دل جواں

ڈیک فُل والیوم سے نجر ہاتھ۔ گلوکار کی آواز پورے محلے میں گونج رہی تھی۔ سحر گل لپ اسٹک کا آخر ٹچ دے کر پلٹی۔

”لگتا ہے دُولہا والے آپکے ہیں۔ ڈیک کا والیوم کچھ زیادہ ہی تیز ہو گیا ہے۔“ وہ شارد ابھابی سے مخاطب تھی جو اپنی جمپر کٹنگ کر رہی تھیں۔

”یہ ڈیک تو صبح سے ہی اسی آواز میں نجر رہا ہے۔ توبہ میری، زمان تو کہہ رہے تھے شادی ایک گھر میں ہو رہی ہے اور بھگتناسب کو پڑ رہا ہے۔“ اُن کا انداز شگفتہ تھا۔ سحر گل ہنسنے لگی۔ پھر آئینے میں خود کو دیکھ کر مطمئن ہو کر ہٹ گئی۔ آج فضلہ کی مہندی دُولہا والوں کی طرف سے آنے والی تھی اور وہ پُر جوش انداز میں شرکت کر رہی تھی۔ فضلہ نے تو اُس سے کہا تھا وہ شادی تک اسی کے پاس رہے۔ خود آئی (فضلہ کی امی) نے بھی اس کے رکنے پر بہت اصرار کیا تھا۔ مگر اُس نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ ایک گلی چھوڑ کر ہی تو اس کا گھر ہے اور وہ روز آجایا کرے گی۔

”اتنے لشکارے نہ مارو۔۔۔۔۔ آج کل تو ویسے بھی مشکوک لوگوں کا آنا جانا بڑھ گیا ہے ہمارے گھر۔“ بھابی اس کے سراپا پر نگاہیں ڈال کر مسکرائیں۔

ڈارک گرین رنگ کے لمبے ڈھیلے کرتے اور شلوار پر جھلملاتا ستاروں والا دوپٹہ اوڑھے وہ ہلکے ہلکے میک اپ میں بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ اس کے تیکھے نقوش میک اپ نے نمایاں کر دیئے تھے۔ کھلتی رنگت پر سبز رنگ بے حد اٹھ رہا تھا۔

”روز کوئی نہ کوئی منہ اٹھائے چلا آتا ہے۔ اور آج تو ویسے بھی پوری کی پوری بیری کا پیڑ بن کر جا رہی ہو۔ پتھر آنے شروع ہو جائیں گے دھڑا دھڑ۔“ بھابی کپڑا پیٹ کر اٹھ کر اس کے قریب آئیں اور پھر ماشاء اللہ کہہ کر اُس پر دم کیا۔

”بیری بڑی مضبوط ہے۔۔۔۔۔ کسی کے ہاتھ نہ آئے گی۔“ وہ کھلکھلاتی باہر نکل گئی۔

ہری ہری مہندی کے نیچے سرخ گلاب

تیرے خواب تیری آنکھوں جیسے

ان ہی گلابوں جیسے چوے تیرے ہاتھ مہندی والی رات

ہری ہری مہندی

وہ فضلہ کے گھر پہنچی تو ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ لان میں لگے شامیانے مہمانوں سے کچا کچھ بھرے ہوئے تھے۔ اجنبی، نا آشنا چہروں کے درمیان وہ کچھ گھبرا سی گئی اور تیزی سے آگے بڑھی۔ تب بری طرح کسی سے ٹکرائی۔۔۔۔۔ وہ بتیاں لگا رہا تھا۔ اُس کے دھکے پر ہاتھ میں پڑا تاروں کا رول دھپ سے زمین پر گر گیا اور وہ خود اس بڑے ستون سے ٹکرا گیا۔ وہ پلٹا تو سحر گل کھسیا کر جلدی سے پرے ہو گئی۔ جھلملاتے دوپٹے کا کونا تاروں کے رول کے نیچے پھنس گیا۔

”سس۔۔۔۔۔ سوری! وہ میں۔۔۔۔۔ اتنا ہجوم تھا کہ کچھ نروس ہو گئی۔ آپ کو دیکھ نہ سکی۔“ اُس نے اس وجہ سے شخص کو لمحہ بھر دیکھا اور پھر خفت کے احساس کے ساتھ سر جھکا کر ہونٹ چبانے لگی۔

”اگر میں یہاں نہ ہوتا تو آپ اس ستون سے ٹکرا چکی ہوتیں بلکہ پاش پاش ہو چکی ہوتیں۔“ وہ اب اُسے بغور دیکھ رہا تھا۔ سبز کپڑوں میں دلکش سی یہ لڑکی کچھ گھبرائی گھبرائی سی اُسے خاصی دلچسپ لگی۔

”وہ۔۔۔۔۔ دوپٹہ۔۔۔۔۔“ اُس نے اپنے دوپٹے کی طرف اس کا دھیان دلایا تو وہ چونک گیا۔ جلدی سے جھک کر اُس کا دوپٹہ نکالا۔

”ارے کیا ہوا عر شان بھائی؟“ کوئی لڑکا اُس کی طرف آگیا۔ ”ابھی تک آپ تاروں میں الجھے ہوئے ہیں۔“

وہ اُس کا دوپٹہ نکال کر کھڑا ہو گیا تھا جبکہ سحر گل تیزی سے آگے بڑھ چکی تھی۔ عر شان نے تیوری چڑھا کر سیف کو



دیکھا۔

”کوئی ڈھنگ کے آدمی پھپھو کو نہیں ملے تھے۔ ایک سے ایک کٹا شخص ڈھونڈا ہے۔ سب دیکھو جیسی تیلیں لٹکا کر اڑا چھو ہو گئے ہیں۔“ وہ بجلی والوں کو کوسنے لگا اور پھر تاروں کا رول سیف کو تھما دیا۔

”اب تم بھگتو\_\_\_ آخر کو فضہ کے خالہ زاد ہو۔ کچھ تمہارا بھی حق ہے۔“ وہ موقع پا کر فرار ہو گیا اور سیف منہ بنا کر رہ گیا۔

رنگ و بو کا ایک سیلاب اُٹا ہوا تھا۔ مگر سحر گل اس اجنبی سے ٹکرا کر کچھ ایسی حواس باختہ ہوئی کہ جا کر فضہ کے پاس ہی ٹپک گئی۔

پیلے کپڑوں میں ملبوس فضہ اُدا اس دکھائی دے رہی تھی۔

”منصور تو بہت خوش ہوگا\_\_\_ اُس کے والدین نے اُسے معاف کر دیا ہے؟“ اُس نے فضہ سے پوچھا۔

”ہاں\_\_\_ اُسے اُس کی سزا جمل چکی ہے۔ سنو سحر! تم بھی اُسے دل سے معاف کر دینا۔ اب وہ شخص میری زندگی میں داخل ہو رہا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ۔۔۔۔۔“

”فضہ! پاگل ہو گئی ہو کیا؟“ سحر نے اُسے ٹوک دیا۔ ”اتنی فضول بات کر رہی ہو۔ وہ اب تمہارے رشتے سے میرا بہنوئی ہے۔ اور جانتی ہو یہ رشتہ کتنا معتبر ہوتا ہے؟ پاگل! میں نے تم سے کہا

تو تھا کہ میں وہ تاریک باب بند کر چکی ہوں۔ جب منصور کو اُس کے کئے کی سزا مل گئی، وہ اپنے کئے پر پشیمان ہے تو بس پھر رہ ہی کیا جاتا ہے۔“ اُس نے فضہ کو خود سے لپٹا لیا تو فضہ کے رُکے آنسو بہہ نکلے۔

”پتہ نہیں سحر! کہ یہ میری بد بختی ہے یا خوش نصیبی۔ مجھے خوش ہونا چاہئے یا دکھی؟ یوں لگتا ہے جیسے میرے

ہاتھوں میں پھول ہیں اور دل میں نہ بھرنے والا گھائو۔“

”میں جانتی ہوں تمہارا دکھ فضہ!\_\_\_ منصور کو اپنی غلطی کا احساس بہت دیر بعد ہوا۔ خیر پھر بھی۔ اب تم دُکھی نہ ہو فضہ! سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ منصور تمہیں یقیناً جیت لے گا۔“ اُس نے اُس کا چہرہ اٹھایا اور اپنی انگلیوں سے اس کے آنسو پونچھے۔

”ہاں\_\_\_ اُس نے مجھ سے بہت معافیاں مانگی ہیں۔“ فضہ سیدھی ہو بیٹھی۔ تبھی اچانک شور بلند ہوا۔

”شاید دُولہا والے مہندی لے کر آگئے ہیں۔“ سحر چونکی۔ ”ٹھہرو، میں دیکھتی ہوں۔“ وہ کھڑی ہو گئی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

دُولہا کے گھر سے لڑکیاں مہندی خوبصورت انداز میں سجا کر لائی تھیں اور گیت کا مقابلہ ہر حال میں جیت کر جانا چاہتی تھیں۔ ایسی ایسی تیز طرار لڑکیاں تھیں، آتے ہی دُلہن والوں پر چھانے لگی تھیں۔ مگر فضہ کی طرف کی لڑکیاں بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں۔

سحر گل ایک کرسی پر ٹپک کر دونوں طرف سے ہونے والے حملوں پر محفوظ ہونے لگی۔ کبھی وہاں سے اسکاڈ میزائل سے حملہ کیا جاتا تو یہاں جیسے ایٹم بم تیار تھا۔ اس وقت اُس کی نظریں اٹھیں۔ وہ عورت مسلسل اُسے نگاہوں کے حصار میں لئے ہوئے تھی۔ آنکھوں میں پسندیدگی اور اپنائیت بھری مسکراہٹ تھی۔ نگاہیں ملنے پر وہ مسکرانے لگیں۔ سحر گل بھی جواباً مسکرا دی۔ اُسے الجھن سی ہونے لگی۔

”توبہ\_\_\_ یہ بیٹھے بٹھائے ان محترمہ کو کیا دورہ پڑ گیا۔“ وہ کرسی پر پہلو بدلنے لگی۔ تب ایک لڑکی اُس کے قریب رکھی خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ نیچے گیت گاتی لڑکیوں کے گروپ سے اٹھی تھی اور بکھرے بالوں کو سمیٹ کر اُس سے مخاطب ہوئی۔



”لڑکے والے بڑے کم بخت ہیں۔ ایک پر ایک بم بلاسٹ کر رہے ہیں۔“ بھئی اپنی توہمت جواب دے گئی۔ وہ بے تکلفی سے گویا ہوئی۔ ”آپ شاید فضہ کی فرینڈ ہیں۔“ اُس نے درست اندازہ لگایا تھا۔

”جی۔۔۔ اور آپ؟“ سحر گل کو اس کا دم غنیمت لگا۔

”میں فضہ کی کزن ہوں۔ نانکھ۔“ اُس نے اپنا تعارف کرایا۔ خاصی باتونی لڑکی تھی۔ جلد ہی سحر گل سے کھل مل گئی اور خود سحر گل بھی ایسے ہی مزاج کی تھی۔ اُس کے پاس بھی باتوں کا خاصا اسٹاک جمع رہتا تھا۔

تیری یادوں سے مہکے میری ہر شام وئی وئی

میری نظروں کا پہنچے تجھ کو سلام وئی وئی

”وعلیکم السلام۔۔۔ وعلیکم السلام!“ لڑکوں کی طرف سے جوابی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ وہ شاید کب سے ضبط کر رہے تھے۔ اب درمیان میں ٹپکنا شروع کر دیا تھا۔ لڑکیاں چلانے لگی تھیں۔

”اتنی خوش فہمی کب سے ہو گئی۔“ سب کورس میں چلائیں۔

”جب سے آپ کو دیکھا ہے۔“ کسی منچلے نے جملہ کسا۔

”اپنی چونچ بند رکھئے۔“

”آپ لوگ بھی اب اپنے یہ گانے بند کریں۔ یوں لگ رہا ہے جیسے بھنڈی گاجر بیچ رہی ہیں۔“

”کیا کہا؟“ دُلہا کی طرف کی لڑکیاں جیسے جلتے تنور پر جا بیٹھیں۔ دُلہن والوں کی طرف سے لڑکے اب برابر ساتھ دے رہے تھے۔ اُن کی لڑکیاں تو بیچاری منمنا کر رہ گئی تھیں۔ اور دُلہا والوں کو اپنی فتح ہار میں بدلتی نظر آنے لگی۔

”یہ فائول ہے۔۔۔ لڑکے درمیان میں نہ آئیں۔“ ایک لڑکی اُٹھ کر بولی۔

”تو پھر لڑکے کہاں جائیں۔۔۔ آخر ففتی پر سنٹ اس دنیا میں موجود ہیں۔“ لڑکوں کی طرف سے جواب حاضر تھے۔

”گانے سننے ہیں تو ہمارے سنئے۔۔۔ آپ کافی بھنبھنا چکی ہیں۔“ پھر کسی منچلے نے لڑکیوں کی قوم کو لاکارا۔

”ارے آئے بڑے گانے سنانے والے۔۔۔ اپنی آواز سنبھال کر رکھئے۔ کہیں اور کام آئے گی۔“

”آج ہی کیوں نہ کام آئے محترمہ!“ لڑکے بھی کم نہ تھے۔

”یہ لڑکے بڑے خبیث ہیں۔“ نانکھ مسلسل ہنس رہی تھی۔

”آؤ فضہ کو لے آئیں۔ اب وہ لوگ مہندی کی رسم کریں گے۔“ نانکھ اُٹھی اور سحر گل بھی اس کے ہمراہ ہو گئی۔

مہندی کی دھماکہ رات بھی ڈھل گئی۔

دوسرے دن شادی کے ہنگامے تھے۔ شادی والے دن ہال میں سحر گل کے ہمراہ شاداب بھابی بھی آئی تھیں مگر وہ تو ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گئی تھیں۔

ویسے بھی ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ سحر گل ہی اُسے زبردستی لائی تھی۔ وہ بھابی کو بیٹھے دیکھ کر خود اسٹیج پر چلی آئی جہاں فضہ آف وہائٹ شرارے میں اپنے حُسن کی بجلیاں گرا رہی تھی۔ اُس پر ٹوٹ کر روپ آیا تھا۔

”آخا۔۔۔ تو آج آپ دُلہن کے مقابلے پر آئی ہیں۔“ نانکھ نے اُسے پیچھے سے تھام لیا تو وہ پلٹی اور نانکھ کی تو صیفی نگاہوں پر جھینپ گئی۔

میر و ن پشواز میں وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ فضہ اُس کی بیسٹ فرینڈ تھی۔ وہ اُس کی شادی کے ہر فنکشن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔

”آؤ، میں تمہیں اپنی امی سے ملواؤں۔“ نائلہ اُسے پکڑ کر اسٹیج سے نیچے اتر آئی۔ وہ ہر طرف نگاہیں دوڑانے لگی۔ معاً اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔

”ادھر آؤ۔“ اُسے ساتھ لئے کر سیوں کے درمیان سے گزر کر رک گئی۔

”ان سے ملو۔“ یہ ہیں میرے اکلوتے بھائی۔ آرمی میں خیر سے میجر ہیں۔“ نائلہ نے کہا تو اس نے آہستگی سے سراٹھایا۔ اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ سامنے ڈنر سوٹ میں اونچا لمبا وہی شخص تھا جو ستون سے لپٹا ہوا تھا اور اس سے وہ بری طرح ٹکرا گئی تھی۔

اُس کی خوبصورت آنکھوں میں شناسائی کی چمک لہرائی تھی جو سحر گل کو نخل کر گئی۔

”عرشان بھائی! یہ میری بہت پیاری دوست سحر گل ہے۔“

”تمہاری یہ دوست کہیں جمناسٹک کی کوئی کھلاڑی تو نہیں ہے؟“ اُس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

سحر گل کی پلکیں لرز گئیں۔

”کیا کہا؟“ نائلہ چلائی۔ ”یہ آپ کو اتنی نازک سی لڑکی جمناسٹک کی ماہر لگی ہے؟“

”میں نے ماہر کا لفظ تو نہیں کہا۔ ماہر ہوتی تو۔۔۔۔۔۔“ وہ جملہ دانستہ ادھورا چھوڑ کر ہنس دیا اور بڑے بے نیاز انداز میں پلٹ گیا۔

سحر گل کا چہرہ تپ اُٹھا۔

اس کے بعد نائلہ اُس کو لے کر ایک خاتون کے پاس جا کر رُک گئی۔

”امی! یہ سحر گل ہے۔ اور سحر! یہ میری پیاری امی ہیں۔“ سحر گل نے مسکرا کر مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے کر

دید۔ یہ وہی عورت تھی جو کل مہندی کے روز اُسے مسلسل تاڑے جا رہی تھی۔ اُس نے بہت محبت سے سحر گل کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ پھر وہ نائلہ کے ہمراہ دوبارہ اسٹیج پر آگئی۔ تب منصور دوستوں کے جلو میں اسٹیج تک آید۔ گرے تھری پیس سوٹ میں اسٹک کے سہارے چلتا ہوا وہ اسٹیج پر چڑھا اور فضلہ کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سحر گل کو اُس کی یہ حالت دیکھ کر شاک تو نہ لگا تھا مگر تاسف ضرور ہوا تھا۔

کہاں فاتح عالم بن کر شہر بھر میں سکوتر اڑتا منصور۔ اور اب ایک بے جان اسٹک کے سہارے چلتا ہوا منصور۔

اُس نے دیکھا اُس کے چہرے پر مسکراہٹ ضرور تھی مگر آنکھوں میں گہری اُداسیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ خوش تھا۔ اتنا ہی جتنا فضلہ تھی یا شاید اس سے بھی کم۔ اب وہ صرف اسٹک کا ہی نہیں، فضلہ کا بھی محتاج تھا۔ فضلہ نے اُسے بھیک میں اپنا آپ تو دے دیا تھا مگر وہ بھی یقیناً جانتا تھا کہ یہ اُس کی بھی مجبوری کا سودا ہے۔ کہیں نہ کہیں، کبھی نہ کبھی اپنے کئے کی سزا ضرور ملتی ہے۔ اُس نے ایک گہری سانس سینے کی قید سے آزاد کی۔

مووی بنواتے ہوئے منصور کی نظر اچانک اُس پر اُٹھی تو خفت اور ندامت کے رنگ اس کے چہرے پر پھیل گئے۔ اس نے فوراً نظریں چرائیں۔ مووی کی تیز لائنس منصور اور فضلہ کے چہرے پر دھڑا دھڑا ٹکرا رہی تھیں۔

پھر اچانک کھانے کا دور چلا تو آہستہ آہستہ اسٹیج خالی ہوتا چلا گیا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ڈولہاؤ لہن کو چھوڑ کر سب نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ سحر گل بھی فضلہ کی کرسی سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور اسٹیج سے اترنے لگی۔ تب منصور کی آواز نے اُس کے قدم روک دیئے۔

”مس سحر۔“

وہ پلٹی تو منصور کا چہرہ عجب خلفشار کا شکار ہو رہا تھا۔ سحر گل نے فضلہ کی سمت نگاہیں اٹھائیں۔

”میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔“ یقین جانیے میں نے فضلہ سے کئی بار کہا کہ میں آپ سے مل کر خود معافی

”اچھا۔۔۔ تم جا رہی ہو؟“ نانہ، سحر گل کی طرف پلٹی۔ ”میں ابھی عرشان بھائی کو لے کر آتی ہوں۔“ اُس نے کہا اور پلٹ گئی۔ عرشان کے نام سے پھر سحر گل کے دل میں عجیب سی کیفیت پھیل گئی۔ نہ جانے کیوں اُس شخص کو دیکھ کر اُس کی پلکوں پر بوجھ آن گرتا۔ خفت کا یا اُس کی نگاہوں کی چمک کا۔

”میں تو فون کر کے فروان کو بلوالیتی۔ مگر آنٹی نے منع کر دیا۔“ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہی نائلہ سے بولی۔ تب عرشان نے چونک کر ویو مرسے دیکھا۔ وہ اُسے جتنا ہی تھی یا یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ اُس کا احسان بحالت مجبوری لے رہی ہے۔ اُس کے لبوں پر موہوم سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

نہ جانے کیوں اُسے دیکھ کر عرشِ شانِ نوید کے ذہن میں رنگین سی دُھند چھانے لگی تھی۔ نامعلوم سے احساساتِ دل کی سرزمین سے اُٹھنے لگے تھے۔

محبت دل میں رہے تو پاکیزہ رہتی ہے۔ یہ اُس کا اپنا نقطہ نظر تھا۔ اُس کے پاس سحر گل کو پانے کا ایک بہت مہذب طریقہ تھا۔

”منصور صاحب! اگر یہاں کسی کو غلط کاموں کی سزا ملے تو یہ دنیا بہت بھیانک ہوتی۔ اور پھر میں نے آپ کو بددعا نہیں دی تھی۔ بہر کیف خدا آپ کو اور فضلہ کو سچی خوشیاں نصیب کرے۔“ وہ تدریس سے بولی اور اسٹیج سے اتر آئی۔ تب بھابی اُسے ڈھونڈتی ہوئی آگئیں۔

کھانے کا دور ختم ہوا تو رات کا تقریباً ایک بج رہا تھا۔ فضلہ کی امی نے ان دونوں کو روک لیا۔

”نہیں آنٹی! میں فون کر لیتی ہوں۔ فروان آجائے گا۔“ سحر گل نے آنٹی کو یہاں وہاں نظریں دوڑا کر کسی لڑکے کو ڈھونڈتے دیکھ کر تکلف برتا۔

”ارے جا کر سیف یا عامر سے کہو کہ وہ گاڑی نکالے۔ سحر گل کو ان کے گھر چھوڑ آئے۔“



گاڑی اُس کے بنگلے کے سامنے آئی تو وہ اپنی سوچوں سے باہر نکل آیا۔ بھابی گاڑی سے اتر کر بیل بجا رہی تھیں۔ نانکہ، سحر گل کا ہاتھ پکڑے کھڑی تھی۔

”سحر گل! تم میں واقعی ایسا کوئی سحر ہے جس نے مجھے ایسا کر دیا ہے۔“ نانکہ کھنکتی ہنسی کے ساتھ بولی تو عرشان کا دل خوش رنگ انداز میں دھڑک اٹھا۔ نانکہ نے جیسے اُس کے دل کی ترجمانی کر ڈالی تھی۔ سحر گل کے چہرے پر سرخی سی دوڑ آئی۔

”بہت فضول لگتی ہو تم۔“ اُس نے ہاتھ چھڑایا۔ ”اندر نہیں آؤ گی؟“

”ارے نہیں بابا! اتنی رات گئے مہمان بننے کا کیا لطف۔ اور یہ تم نے کیا خطرناک شے پال رکھی ہے؟“ اُس نے سفید بلڈاگ کو دیکھا جو اجنبی چہروں کو دیکھ کر مسلسل بھونک رہا تھا۔ ”ویسے اچھا ہوا، میں نے تمہارا گھر دیکھ لیا۔“ نانکہ معنی خیز لہجے میں بولی اور پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ”اب آنا جاندار ہے گا۔“

”ضرور۔“ سحر گل بولی اور نگاہیں بے ساختہ عرشان پر اٹھیں مگر پھر فوراً جھک گئیں۔

وہ بھی بے خیالی میں اُسے مسلسل تکیے جا رہا تھا۔ نگاہیں ملنے پر اُس نے جلدی سے رخ موڑ لیا اور گاڑی گیر میں ڈال دی۔ نانکہ نے اُسے ہاتھ ہلا کر دروازہ بند کر دیا اور عرشان نے گاڑی آگے بڑھادی۔

...☆☆☆...

بتا رہی ہے یہ آنکھوں کی منجمد لالی

کڑے دنوں میں کٹھن رتجگوں سے گزرے ہو

بجھا بجھا سا ہے چہرہ، دھواں دھواں آنکھیں

خوشی کی کھوج میں کتنے غموں سے گزرے ہو

وہ سفید مرمر کی بیٹیچ پر دونوں ہاتھ گود میں رکھے بیٹھی تھی

بڑے دنوں بعد غم کی گنگھور گھٹائیں اُس کے من آنگن میں گھر گھر آئی تھیں اور وہ جو اُس کے سامنے ذولین خان کھڑا تھا، اُسے پانا کتنا آسان لگتا تھا۔ مگر اب وہ اتنے قریب ہونے کے باوجود کتنا دور تھا۔

وہ ذولین کے بلانے پر ہی آئی تھی اور جانتی تھی کہ ذولین نے اُسے کیوں بلایا ہے۔ اس حویلی میں اُٹھتے طوفان سے وہ بے خبر نہیں تھی۔ کچھ اندازہ اسے بھی ہو گیا تھا۔ اور اُسے تو سمجھانے یا سمجھنے کے لئے کبھی کسی وضاحت یا ڈھیر سارے لفظوں کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ وہ تو صرف اس کی آنکھوں سے اس کے دل کی کیفیت اور اس حویلی میں ہونے والے واقعات کا اندازہ لگا لیتا تھا۔ اب کس قدر مشکل تھا اس سے یہ سب کچھ چھپانا۔ وہ تو تذبذب کا شکار تھی کہ اُسے بتائے یا چھپالے۔ وہ اپنے تئیں خود کو سنبھالنے کی سعی کرنے لگی مگر اُس کی اُداس آنکھیں اور ملول چہرہ بول رہا تھا۔ اپنی داستان سن رہا تھا۔

ذولین خان نے اُس کے آزرہ جمال پر ایک نظر ڈالی۔

”اشارا! تم کیا سمجھتی ہو، میں بے خبر ہوں؟ نہیں، میں آج سے نہیں، اُسی روز سے ایسے طوفان سے آشنا تھا۔“ وہ پیام کے تنے سے ٹیک لگا کر خلاؤں میں گھورنے لگا۔

اشارا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور ایک تیز سسکاری اس کے لبوں سے آزاد ہو گئی۔

”میں اسی دن سے اس طوفان سے ڈرتا تھا۔ میں نے اپنے جذبوں میں اس لئے بے حسی کی برف جمائی چاہی تھی کہ تم اور میں الگ الگ ہی رہیں۔ ان دو کناروں کی طرح ہی رہیں۔ اس لئے کہ انجام میرے سامنے تھا۔ میرے تصور میں تھا۔ مگر۔۔۔ میں ہار گیا۔“ اُس نے شدت ضبط سے اپنے بے تحاشا سرخ ہونٹ دانتوں میں دبائے۔ اشارا کے



دل پر بر چھی سی چل گئی۔

”تو اب پچھتاوے ڈس رہے ہیں؟“ اُس نے دُکھی لہجے میں پوچھا تو ذولین نے اُسے دیکھا اور پھر اُس کے قریب آگیا۔

”میں نے تم سے کہا تھا ایک بار کہ ہم جہاں ہیں، وہاں یہ محبت نہیں، اذیت ہوگی۔ عمر بھر کی۔ اور یہ اذیت ہم دونوں کے لئے ہے۔ کیونکہ میں نے بھی بہت سے خوش نما خواب دیکھے تھے۔ میں نے زندگی میں اس سے پہلے کبھی خواب نہیں دیکھے تھے۔ میں خوابوں میں رہنے والا شخص نہیں تھا۔ میرا دل ایک پتھر تھا۔ میرا وجدان پتھر آگیا تھا۔

مگر پھر تم نے اسے موم بنا ڈالا۔ اب یہ موم سادل معمولی سی چوٹ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ تم نے کیا، کیا اشتارا! تم نے ذولین خان جیسے شخص کو بکھیر دید۔ خود کو چٹان سمجھنے والا ریت کی طرح بکھر گیا ہے۔“ ذولین نے اُسے دیکھا۔ چہرہ آگ ہو رہا تھا اور آنکھیں دھول۔

”ذولین۔۔۔“ اشتارا تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے غایت درجے کی شگفتگی سے اُسے دیکھا۔ ”آپ۔۔۔ ذولین! آپ نے اتنی جلدی حوصلہ ہار دیا؟ مجھے تو شامل لالہ نے بہت سنبھالا دیا تھا۔“ اُس نے کہا تو ذولین نے چونک کر اُسے دیکھا۔

”م شامل نے؟“ اُس کے لہجے میں حد درجہ تعجب تھا۔ اشتارا نے پلکیں جھکادیں۔

”ہاں۔۔۔ وہ جانتے ہیں کہ۔۔۔“ اُس نے گلابی لب دانتوں میں دبائے۔ اور یہ انکشاف ذولین خان کے لئے نہایت حیران کن تھا۔ ”م شامل لالہ کو شاہ خانم نے اسی سلسلے میں بلوایا ہے۔ مگر وہ باباجان سے متفق ہیں۔“ اشتارا کے اس جملے نے اُسے بیک وقت حوصلہ بھی بخشتا اور ملول بھی کر دیا۔

”مگر ذولین! اگر باباجان ہار گئے تو شامل لالہ کچھ نہیں کر سکیں گے۔ شاہ خانم کے آگے بھلا کب کسی کی چلی ہے۔“ اُس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر آنسو روکنے کی سعی کی۔ پھر پلٹ کر جانے لگی تب ذولین نے اس کے شانے پر

ہاتھ رکھ کر اُسے روکا۔ اُس کا انداز جارحانہ تھا۔ اُس کے مضبوط ہاتھ نے اُس کا رخ دوبارہ اپنی طرف موڑ دیا۔

”تم کیا سمجھتی ہو۔۔۔ میں شاہ خانم کے ہاتھوں شکست کھا جاؤں گا؟۔۔۔ انہوں نے میری حالت ریگ زار کر دی ہے۔ مجھے زندگی بھر محض ناکردہ گناہوں کی سزا دیتی رہی ہیں۔ نہیں اشتارا۔۔۔ اب یہ جیت ان کی نہیں ہوگی۔ اب انہیں شکست سہنا ہوگی۔۔۔ بہت بھاری۔۔۔ بہت تکلیف دہ۔“ اُس کا لہجہ اکھڑا ہوا اور سرد تھا۔

اشتارا نے بھیگی بھیگی پلکیں اوپر اٹھائیں۔ اُس کا چہرہ تنا ہوا تھا۔

”تم میری محبت ہو۔۔۔ اور میں اپنی محبت سے اتنی آسانی سے دستبردار نہیں ہوں گا۔ اور تمہیں شاہ خانم سے چھیننا میری ضد ہے۔“ اس کے شانوں پر اس کے مضبوط ہاتھوں کا دباؤ بڑھ گیا۔

وہ وحشت زدہ ہو گئی۔ اس کی سبز آنکھیں طوفان کی زد میں آئے سمندر کا عکس پیش کر رہی تھیں اور تنا ہوا چہرہ خطرناک حد تک سرخ ہو رہا تھا۔

”اگر تم چچا خان کی عزت نہ ہوتی تو میں تمہیں یہاں سے۔۔۔۔۔“

”ذولین۔۔۔۔۔“ وہ خوف سے چلا اٹھی۔ اُس کے پیروں جلنے لگے جیسے وہ ریت کے تپتے ہوئے ٹیلے پر ایستادہ ہو۔

ذولین خان اس لمحے وحشی ہو رہا تھا۔ اس سے کچھ بعید نہ ہوتا۔ اگر اُسے مہر وز خان کی عزت کا پاس نہ ہوتا تو وہ محض شاہ خانم کو نیچا دکھانے کے لئے اُسے یہاں سے لے جاتا۔ کہیں بھی۔

”اُف خدایا۔۔۔“ اُس نے خوف سے جھر جھری لے کر ذولین کی طرف دیکھا۔

”میں کبھی بزدل نہیں رہا اشتارا! مگر اس عورت کا احترام ہمیشہ مجھ پر غالب رہا۔ عورت سے انتقام لینا میری سرشت

نہیں ہے۔ وگرنہ میں چاہتا تو ان سے پوچھ سکتا تھا کہ وہ محض فیروز خان سے نفرت کا زہر مجھ پر کیوں اندیل رہی ہیں۔ اور مجھے فخر ہے اپنے باپ پر۔ میرا سر اٹھا ہوا ہے اشتارا! کہ میرے باپ نے ان کی بہن سے کوئی بد عہدی نہیں کی تھی

انہیں کوئی سپنے نہیں دکھائے تھے۔ انہوں نے محض اپنی والدہ کے فیصلے سے انکار کیا تھا اور منافقت کی راہ سے خود کو بچا لیا تھا۔ ہاں اشتارا! میں ایک ایک سوال کا جواب چاہوں تو ابھی جا کر ان سے مانگ سکتا ہوں۔ اور میں جانتا ہوں کہ ان کے پاس کوئی جواب نہیں، کوئی وزنی دلیل نہیں ہے اس نفرت کی۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا، نہ ہی کروں گا۔ یہ میری شان کے خلاف ہے۔ یہ محض اُن کی ذہنیت کی پستی ہے۔ ان کی خود ساختہ نفرت ہے۔ ہاں، مگر اب تمہارا حصول میری ضد ہے۔ اور اس کے لئے مجھے اگر حویلی کے اندر آکر بھی لڑنا ہو گا تو میں لڑوں گا۔“

اشتارا سر جھکائے سنتی رہی۔ اُس کا دل از حد دکھی ہو رہا تھا۔ اُسے منزل عشق کا راستہ کتنا آسان اور روشن لگتا تھا جب ذولین اُس کے سامنے ہوتا، اُس پر پیار بھری نگاہیں اٹھاتا تھا۔ اُس کا مضبوط وجود اُس کے لئے کتنی تقویت کا باعث رہا تھا۔ مگر

اب منظر بدل گیا تھا۔

حقیقت یہ تو نہ تھی۔

منزل عشق کا راستہ بے حد تاریک اور مہیب ہو گیا تھا۔ بلکہ وہ تو ہمیشہ ہی تھا۔ بس وہی انجان تھی۔

اُس کے قریب ہوتے ہوئے بھی کتنی دوری کا احساس ہو رہا تھا۔ سمندر میں اتر کر بھی جیسے وہ پیاسی ہی رہی تھی۔

تشنگی اُس کے انگ انگ میں ابھی بھی اسی طرح رچی ہوئی تھی۔

ایسا لگتا تھا جیسے چم چم کرتی خوشیوں کی تتلیاں اُس کی ہتھیلی سے پھر سے اڑ گئی تھیں اور اس کے چاروں طرف کانٹے اُگ آئے ہوں۔

دھنک کے سارے منظر اس پار رہ گئے تھے۔

آہ۔۔۔ کب بجھے گی یہ آشفتمیاس۔

پھر وہی تشنگی۔

وہی ماتمی نوے۔

اور پھر وہی اُجڑنے کا موسم۔

اور پھر وہی ناآسودگی کے جال میں قید ہو گئی تھی۔

اچانک ذولین کے ہاتھوں کی نرم ٹھنڈک نے اُسے چونکا دیا۔ اُس نے اپنی مغموں پلکیں اٹھائیں اور پھر جھکادیں۔

”جاؤ اشتارا۔۔۔ اندر جاؤ۔“ اُس نے کہا تو وہ کسی فرمانبردار بچے کی طرح خاموشی سے پلٹ گئی اور رہائشی حصے کی طرف بڑھ گئی۔

”تم کیوں خوفزدہ ہو پاگل لڑکی! میں اتنی آسانی سے تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ تمہارا حصول ہی میری زیست ہے اور میں اپنی زیست کے لئے آخری سانس تک جنگ کروں گا۔“ اب تشنگی میرے حصے میں نہیں آئے گی۔ اب ہاں میرا مقدر نہیں بنے گی۔ اب شاہ خانم کی زندگی میں انقلاب آئے گا اور آنا بھی چاہئے کہ انقلاب میری زیست کی بقاء ہوگی۔ یہی انقلاب نفرتوں کے گھر مہندم کرے گا۔ اور یہی انقلاب میری محبت کی فتح ہوگا۔“

اُس کی نگاہیں دُور ہوتی اشتارا پر جمی تھیں۔ اُس نے اپنے لہو میں کھولتے الاؤ کو بہت تحمل سے ٹھنڈا کیا اور پھر پلٹ کر

انیکسی کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆...

بڑی سی گول کرسی پر بیٹھی شاہ خانم گہری سوچ میں گم تھیں۔ اُن کا ذہن اب تمام درپیش حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔

مہروز خان کی ضد۔

اشمل کی حمایت۔

یہ سب انہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ مہروز خان کی خاموشی اور صلح جو مزاج کا رنگ ٹوٹ چکا تھا۔ اب اُن کی ضدی طبیعت عود کر آئی تھی۔ اور مرد جب ضد پکڑ لے تو مضبوط سے مضبوط عورت بھی بے بس نظر آنے لگتی ہے۔ اور انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ اب وہ مزید تن کر مہروز خان کے سامنے ٹھہر نہ سکیں گی۔ اور پھر جب اشمل بھی ان ہی کا حمایتی تھا۔ ایسے میں ان کا ذہن کچھ اور سوچ رہا تھا۔ کوئی نئی پلاننگ کر رہا تھا۔

ہار کا تصور ہی ان کے لئے بے حد خوفزدہ کرنے والا تھا۔

”میرے خدا!“ وہ وحشت زدہ سی اُٹھ کر ٹہلنے لگیں۔ پھر کچھ سوچ کر کمرے سے باہر نکل آئیں۔

مہروز خان احتیاطاً حویلی میں کم آتے تھے۔ صبح کے گئے گہری شام کو ان کی واپسی ہوتی تھی اور یہ بات شاہ خانم کو بڑی اذیت دیتی تھی۔ مگر دونوں کے درمیان یہ سرد جنگ مسلسل جاری تھی اور جھکے کو کوئی تیار نہ تھا۔

شاہ خانم کو یہ گوارہ نہ تھا کہ فیروز خان کے بیٹے ذولین کو داماد کی صورت میں قبول کر لیں اور مہروز خان اپنے فیصلے پر روزِ اول کی طرح ڈٹے ہوئے تھے۔ مگر شاہ خانم کا خیال تھا کہ اشمل خان اُن کے پاس ایک ایسا مہرہ ضرور ہے جو مہروز خان کو جھکانے میں اُن کی مدد کر سکتا ہے، بصدا اصرار۔

وہ راہداری تیزی سے عبور کرنے لگیں کہ سامنے سے آتی اشتراٹھٹک گئی۔

”خیریت شاہ خانم؟“ وہ احتراماً اُن کے قریب آئی۔

”ہاں۔۔۔ اشمل کہاں ہے؟“

”اشمل لالہ تو اپنے کمرے میں ہیں۔“ اشتراٹھٹک حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”آپ کہیں تو میں آپ کے کمرے میں بھیج دوں؟“

”نہ۔۔۔ نہیں، میں خود ہی جا رہی ہوں۔“ شاہ خانم نے اُس کی بات رد کر دی اور خود اشمل کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

اشمل کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ شاہ خانم کو دیکھا تو لونگ شوز پہنتے پہنتے رک گیا۔

”آپ۔۔۔ آئے۔۔۔ مجھے بلوایا ہوتا۔“ وہ احتراماً گھڑا ہو گیا۔

”کہیں جا رہے ہو؟“ شاہ خانم اندر آگئیں اور اُس کی تیاری واضح طور پر محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ بس یونہی ذولین کے ساتھ ذرا رائیڈنگ کا پروگرام بن گیا تھا۔ کوئی کام تھا کیا مجھ سے؟“

”ہاں۔۔۔ اگر تمہارا جانا ضروری نہیں ہے تو۔“

”ارے نہیں، اتنا ضروری نہیں ہے۔ آپ بیٹھئے، میں ابھی آیا۔“ وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

”قابل نواز!“ اُس نے گرل کے پاس جا کر پورچ کی طرف جاتے قابل نواز کو پکارا تو وہ بھاگا آیا۔

”جی خان جی؟“

”ذولین سے کہہ دو جا کر کہ شامل ایک گھنٹے بعد آئے گا۔ تم اس وقت چلے جاؤ۔ سنو، ابھی ہی جا کر کہہ دینا، وہ میرا انتظار کر رہا ہو گا۔“ وہ پیغام بھیج کر واپس کمرے میں آگیا۔

”یو نہی بس فارغ تھا تو پروگرام رائیڈنگ کا ہی بناؤ الا۔ کافی دن ہو گئے تھے رائیڈنگ کئے ہوئے۔ آپ کہتے، جو کہنا چاہتی ہیں۔“ وہ جیکٹ اتار کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

شاہ خانم سر جھکائے چند ثانیے کچھ سوچتی رہیں، پھر بولیں۔

”میں بہت اپ سیٹ ہوں شامل!\_\_\_ مجھے لگتا ہے اس فضا میں میرا دم گھٹ جائے گا۔“

اشمل نے انہیں دیکھا۔ ”نفرت کی ان اونچی فصیلوں میں تو آپ کا کبھی دم نہ گھٹا تھا شاہ خانم! اب جبکہ بابا خان یہ دیواریں گرا نا چاہتے ہیں، فضا میں بسا زہر مٹا دینا چاہتے ہیں تو یہ سب کچھ آپ کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ آپ کو محبتوں سے اتنی نفرت کیوں ہے شاہ خانم؟“ اُس نے تاسف سے سوچا۔

”تم اپنے بابا کو سمجھاتے کیوں نہیں ہو شامل؟“

”میں \_\_\_؟“ اشمل نے استفسار بھری نظروں سے انہیں دیکھا اور پھر سنجیدگی سے بولا۔ ”نہیں شاہ خانم! میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں، بابا خان کا فیصلہ درست ہے۔ آپ سوچئے، غور کیجئے تو آپ بھی متفق ہو جائیں گی۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، میں اشتار کی بہتری نہیں چاہتی؟“ انہوں نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔ ”میری بیٹی ہے \_\_\_ میں نے اُسے اپنی کوکھ سے جنم دیا ہے۔ اُس کا اچھا برا میں بہتر انداز میں سوچ سکتی ہوں اور سوچتی ہوں۔“

”مگر یہاں تو آپ محض اپنی انا کا مسئلہ اٹھائے بیٹھی ہیں۔“

”اشمل!“ شاہ خانم کو اُس کا یہ جملہ سخت ناگوار لگا۔ انہوں نے خشمگین آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ ”تم حد سے زیادہ گستاخ ہوتے جا رہے ہو۔“ وہ سخت مشتعل ہو گئیں اور کرسی سے اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگیں کہ شامل ان کے سامنے آگیا۔

”گستاخی کی معافی چاہتا ہوں شاہ خانم! مگر آپ ٹھنڈے دل سے سوچئے، اگر آپ اس سلسلے میں مجھ سے بات کرنے آئی ہیں تو پھر بیٹھئے اور سکون سے میری بات بھی سنئے۔ بے شک آپ کا غم اپنی جگہ مگر اب جزیشن چینیج ہو گئی ہے۔ وقت کا دھارا بہت گزر چکا ہے۔“ اُس کا لہجہ صلح جو نہ تھا مگر نرم ضرور تھا۔ اُس نے شاہ خانم کو نرمی سے شانوں سے تھام کر دوبارہ بٹھا دیا۔

وہ سنجیدگی سے اس مسئلے کا حل چاہتا تھا۔ بلکہ شاہ خانم کو قائل کرنا چاہتا تھا۔ وہ سخت الجھا ہوا تھا۔ ذولین، بابا خان کی حمایت میں کہا ہوا ایک جملہ ہی شاہ خانم کو برا فروختہ کر دیتا تھا۔ مگر اُس نے سوچ لیا تھا کہ جب وہ میدان میں اتر ہی آیا ہے، بلکہ اُسے اتارا گیا تھا تو وہ یہ میدان فتح کر کے ہی رہے گا۔ اُس کے سامنے ذولین خان کے ساتھ کی گئی نا انصافیاں تھیں۔

اشتار کی خاموش زبان مگر بولتی آنکھیں اور خود اُس کی اپنی خواہش۔

وہ ہر حال میں شاہ خانم کو قائل کرنا چاہتا تھا۔

”تم کہتے ہو شامل! کہ وقت کا دھارا بہت گزر چکا ہے۔ مگر میرے لئے نہیں بدلا۔ سب کچھ ویسا ہی ہے۔ وہی ماہ و

سال ہیں۔“ شاہ خانم گہری یاسیت سے بولیں۔

”سب کچھ بدل گیا ہے شاہ خانم! بس آپ نہیں بدلیں۔ بدلنا نہیں چاہتیں۔ یقین جانئے میرا مقصد نہ آپ کی مخالفت



ہے اور نہ بابا خان کی حمایت۔ مجھے تو صرف اشتار کی خوشی عزیز ہے۔ اور اس حویلی میں محبتوں کی جیت چاہتا ہوں اور صرف وہی چاہتا ہوں جس سے سچی خوشیاں وابستہ ہیں۔“ اُس نے ٹھنڈے میٹھے لہجے میں سمجھانا چاہا۔ مگر شاہ خانم پر خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ وہ تو کچھ اور ہی سوچ رہی تھیں۔ اور پھر جیسے کوئی خیال بجلی کی طرح ان کے ذہن میں کوندا۔

”اشمل! \_\_\_“ انہوں نے چونک کر اُسے پکارا۔ ”تم نے ایک بار مجھ سے ذکر کیا تھا ہشمنہ کا۔“

”جی۔“ اُس نے حیرت سے شاہ خانم کو دیکھا۔ یہ بھلا اشتار اور ذولین کے ذکر کے درمیان ہشمنہ کا ذکر کہاں سے آ نکلا۔

”تم نے سحر گل کے رشتے سے انکار کرتے ہوئے ہشمنہ کا نام لیا تھا۔ ہاں، وہ لڑکی مجھے بھی بہت پسند آئی اور یقیناً وہ پسند کئے جانے کے قابل بھی ہے۔“

”آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟“ اُس نے اپنی حیرت کو قابو کرتے ہوئے پوچھا اور شاہ خانم کو دیکھا۔ اُن کا چہرہ کسی احساس کے تحت سرخ ہو رہا تھا۔ اچانک وہ اپنی جگہ سے اُٹھیں اور اشمل کے بے حد قریب آ گئیں۔

”اشمل! میں ایک شرط پر ہشمنہ کو اس حویلی میں بہو بنا کر لاسکتی ہوں کہ تم مہر و زخان کی یہ ضد توڑنے میں میرا ساتھ دو۔“

اُن کی چمکتی بھوری آنکھیں اشمل کے چہرے پر ٹکی تھیں۔ اور دروازے کے باہر کھڑی اشتار جو کچھ دیر پہلے ہی کسی کام کے سلسلے میں اشمل کے کمرے کی طرف آئی تھی، شاہ خانم کی آواز پر رُک گئی تھی۔

اس جملے پر اُس کا سارا وجود جیسے مٹی کے ڈھیر کی طرح بیٹھتا چلا گیا۔ اُس نے جیسے غم کے بوجھ سے پھٹتے دل پر ہاتھ رکھا اور مغموم پلکیں اٹھا کر شاہ خانم کے سامنے کھڑے اشمل کی طرف دیکھا۔

غم و صدمے سے اشمل کی قوتِ گویائی کتنے ہی ثانیے تک سلب رہی۔ اُس نے بے یقینی اور دُکھ کی کیفیت سے شاہ خانم کو دیکھا۔ وہ ایک ماں تھیں اور محض اپنی انا کا پرچم بلند رکھنے کے لئے اولاد سے سودا کر رہی تھیں۔ اور وہ کیسے اور کیونکر اشتار کے حصے میں غم ڈال کر اپنی خوشیاں خرید لیتا۔ دوسروں کے خوابوں کے کھنڈر پر اپنی محبت کا محل بنا لیتا۔

اُس نے اس ذہنی صدمے سے خود کو سنبھالا اور شاہ خانم کی طرف عجیب ناآسودہ انداز میں دیکھا۔

وہ جواب کی منتظر تھیں یا اپنی فتح کی۔

”شاہ خانم! کاش آپ نے یہ بات کہنے سے پہلے سوچ لیا ہوتا۔“ اُس نے خود کو صوفے پر گرا لیا۔

”اشمل! تم میرے بیٹے ہو \_\_\_ اور جانتے ہو مائیں بیٹوں سے زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔ تم مجھے نہتا کر کے چاہتے ہو کہ مہر و زخان مجھے پچھاڑ دے؟“

”پلیز شاہ خانم! آپ نے مجھے اتنا پست انسان کیسے سمجھ لیا کہ میں اشتار کی خوشیاں چھین کر اپنی زیست کو سجالوں۔ وہ میری بہن ہے \_\_\_ مجھے بے حد عزیز۔“

”اشمل!“ شاہ خانم نے کڑے تیوروں سے اُسے دیکھا۔ ”اُسے اس بات سے غرض نہیں ہے کہ اُس کی شادی کس سے ہونی چاہئے۔ فروان یا ذولین \_\_\_ اُس کے یہ لئے بات کوئی معنی نہیں رکھتی۔“

”یہ تو آپ کا خیال ہے نہ۔“ ایک تلخ مسکراہٹ اشمل کے لبوں کو چھو گئی۔ وہ صوفے سے کھڑا ہو گیا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ شاہ خانم نے اُسے حیران کن نظروں سے دیکھا۔

”وہ فروان کو کبھی دل سے قبول نہیں کرے گی اور نہ کسی اور کو \_\_\_ ذولین اُس کی خواہش ہے۔“

”اش \_\_\_ مل \_\_\_“ شاہ خانم پوری قوت سے دھاڑیں۔

”گستاخی معاف شاہ خانم! آپ اپنی بیٹی کی خوشیاں چھین کر محض اپنے دل کا سکون حاصل کرنا چاہتی ہیں تو یہ کوئی مشکل نہیں ہو گا آپ کے لئے کہ جا کر آپ اشترا کو زبردستی اپنے فیصلے پر سر جھکانے پر مجبور کر دیں اور اپنی خوشیاں حاصل کریں۔ پھر بھلا بابا خان کیا کر لیں گے؟“ اگر آپ ماضی کی گلناز کو زندہ کرنا چاہتی ہیں، اشترا کے روپ میں تو میں نہیں رو کوں گا۔ اگر اشترا کو گلناز خالہ کی طرح سسک سسک کر ماردینا چاہتی ہیں اور اسی میں آپ کا دلی سکون پنہاں ہے تو جاییے، آپ اپنا یہ سکون ضرور حاصل کریں۔ وہ بے زبان لڑکی اس لئے دنیا میں بھیجی گئی ہے کہ ہم جیسے باختیار لوگ اُسے محض اپنی ضد اور انا کی بھینٹ چڑھا دیں۔“

”اشتمل! چپ ہو جاؤ۔ گستاخ۔ بد زبان!“ شاہ خانم کا ہاتھ پوری قوت سے اشتمل کے رخسار پر پڑا۔ اُن کا بدن غم و غصے سے کانپنے لگا۔ چہرہ خطرناک حد تک سرخ ہو رہا تھا۔

”دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ دفع ہو جاؤ اس حویلی سے۔ میں تم جیسے گستاخ بیٹے کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔“ وہ غضب ناک ہو کر دھاڑیں اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

اشتمل نے اس طوفان کی پذیرائی بہت تھل سے کی اور پھر شاہ خانم کے کمرے سے جاتے ہی خود الماری کی طرف بڑھا اور چرمی بیگ نکال کر اس میں اپنے کپڑے بھرنے لگا۔ وہ اب اس

حویلی میں ایک پل نہیں رہنا چاہتا تھا جہاں اپنی انا کی حفاظت نہیں کی جاسکتی۔ جہاں محبتیں نہیں، رعب اور دبدبہ ہی سب کچھ تھا۔

اُس نے جان لیا تھا کہ شاہ خانم کو سمجھانا عبث ہے۔ اور اس میں اتنی تاب نہ تھی کہ وہ اشترا کے اُجڑنے کا تماشا دیکھتا رہے۔

ذولین کے ساتھ کی گئی نا انصافیوں پر اب مزید بیٹھ کر کڑھتا رہے۔ اُسے اپنے کہے ہوئے جملوں پر کوئی پشیمانی

نہیں تھی۔ اُس نے سچ کہا تھا۔ اُس نے شاہ خانم کو صحیح سمت دکھانے کی سعی کی تھی۔

کپڑے ہینگمر سے نکال نکال کر اُس نے بیگ میں بھر لئے اور زپ بند کر دی۔ تب اشترا اڑپتی ہوئی اُس کے پاس آئی۔

”اشتمل لالہ! یہ کیا کر دیا آپ نے؟“ وہ بے اختیار ہو کر اشتمل کے شانے سے آگلی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”میں نے ٹھیک کیا ہے اشترا! میں شاہ خانم کی آنکھیں کھول دینا چاہتا ہوں جو اندھی نفرت نے بند کر رکھی ہیں۔ وہ اب تمہیں بھی گلناز خالہ کا روپ دینا چاہتی ہیں۔“

”نہ۔۔۔۔۔ نہیں لالہ! یہ بہت برا ہوا۔ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہو رہا ہے۔ اتنا بڑا طوفان۔ میں پیدا ہوتے ہی مریوں نہ گئی۔“

”پاگل ہو گئی ہو اشترا!“ اشتمل نے ہچکیوں سے روتی اشترا کو خود سے لپٹا لیا۔

”آپ چلے جائیں گے؟“

”ہاں۔۔۔ میرا اس وقت چلے جانا ہی بہتر ہے۔ میں بزدل نہیں ہوں اشترا! مگر اتنا بہادر بھی نہیں کہ تمہارا دکھ آنکھوں سے دیکھ سکوں۔ شاہ خانم کو بدلنا واقعی بہت مشکل ہے۔ اور اس حویلی میں انقلاب لانا ممکن ہے۔“ اُس نے ایک گہری سانس لی اور اشترا کو خود سے الگ کیا اور بیڈ سے اپنا بیگ اٹھا لیا۔

”نہ جائیں لالہ آپ۔“ اُس نے ملتجی نظروں سے دیکھا تو اشتمل کا دل پگھل پگھل کر بہنے لگا۔ مگر وہ مجبور تھا۔ جانتا تھا کہ اس کا یہاں مزید ٹھہرنا شاہ خانم کو مستقلاً مشتعل رکھے گا۔

”تم سمجھو گڑیا! میرا یہاں رہنا بھی مشکل ہے۔ اور سنو! تم شاہ خانم کے ہر سوال کا جواب وہی دینا جو تمہارے حق

میں بہتر ہو۔ اور سچ ہی تمہارے لئے بہتر ہے۔“ اُس نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ سسک کر اس کے سینے سے لگ گئی۔

”تم سارے اختیار ہار گئے تو میں بے بس، بے اختیار لڑکی اتنا بڑا انقلاب کیسے لاسکتی ہوں؟“ پھر کب آئیں گے آپ؟“ اُس نے خود کو سنبھال کر پوچھا۔

”میں فون کرتا ہوں گا۔“ گویا جلدی آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اُس نے بیگ اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

...☆☆☆...

وہ سخت اُداس اور ملول ہو رہی تھی جب اُسے پتہ چلا کہ اشمل خان نے ہاسٹل چھوڑ دیا ہے۔ اُس دن اتفاق سے اس کی احسن سے ملاقات ہو گئی تھی اور اُس نے ہشمنہ کو پہلی خبر یہی سنائی تھی اور اُس کا دل سخت حزیں ہو گیا۔ وہ ہاسٹل چھوڑ چکا تھا اور کئی دنوں سے یونیورسٹی بھی نہیں آ رہا تھا۔ یہ بات اُسکے لئے پریشان کن تھی۔ اُس نے احسن سے حویلی کے فون نمبر بھی لے لئے مگر کبھی اس میں اتنی ہمت پیدا نہ ہوئی کہ وہ اشمل کو فون کرتی۔ کئی بار اُس نے ریسپور اٹھایا اور پھر رکھ دیا۔ نہ جانے کیوں اشمل کی آواز سننے ہی جیسے وہ لفظوں کے معاملے میں بالکل ہی بے زبان ہو جاتی۔ شرم اُسے اپنا مسئلہ اٹھانے نہ دیتی اور زبان ساتھ دینے سے انکار کر دیتی۔ وہ شخص کتنی تسلیاں دے کر گیا تھا۔ مگر لگتا تھا کہ اب وہ ساری سسکیاں بھول گئی تھی۔ وہ سب کچھ اس کے بے قرار دل کے لئے بہت کم تھیں۔ یہاں، سلطان کمال کی زور و شور سے انکوائری کروا رہے تھے۔ اور ایسے میں وہ پریشان ہوا اُٹھتی۔

اُس نے خود کو کمرے میں مقید کر لیا تھا۔

’ہائے اشمل! دیکھو تو، کتنی تنہا ہو گئی ہوں۔ تمہاری ذات کا بخشا ہوا وہ حوصلہ اب ٹوٹ رہا ہے۔ میں اندر

سے چیخ رہی ہوں۔“

وہ بری طرح رو دی۔ موٹے موٹے قطرے سیاہی کو مٹانے لگے۔

پھر یکدم اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا۔ وہ اس سحر سے، اس خوشبو سے باہر نکل آئی۔ اشناس بھائی دروازے پر ہولے سے دستک دے کر اندر آئے تھے اور انہیں دیکھ کر وہ سٹیٹا کر کھڑی ہو گئی۔

”آپ۔۔۔۔۔ آئیے۔۔۔۔۔“ اُس نے جلدی سے اپنی بھگی پلکیں دوپٹے کے کنارے سے رگڑ دیں۔ سرخ سرخ چہرہ، روئی روئی متورم آنکھیں، ملگجے کپڑے اور دودن سے کنگھی نہ کئے ہوئے بال۔ اشناس بھائی نے ایک نظر میں سب کچھ محسوس کر لیا۔ وہ ایسی تو ہر گز نہ تھی۔ ہمیشہ خود کو صاف ستھرا رکھنے والی، ہر دم ہنسنے کھلکھلانے والی یکدم ہی تنہائی پسند ہو گئی تھی۔ خود سے بے نیاز ہو گئی تھی۔

”بیٹھے ناآپ۔“ وہ خود کو بروقت سنبھال کر جبراً مسکرائی۔

”ہاں۔۔۔ بیٹھنے ہی آیا ہوں۔ اور تم بھی میرے پاس بیٹھو۔“ وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ ”دودن سے میں نے تمہاری صورت نہیں دیکھی۔“ اشناس بھائی نے اُسے بغور دیکھا تو اُس کا چہرہ جھک گیا۔

”جج۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ آپ شاید زیادہ مصروف ہو گئے ہیں۔“

”نہیں۔۔۔ تم کمرے میں بند ہو گئی ہو۔ کیوں گڑیا! کیا بات ہے۔ کیا پُرشن ہے تمہیں؟“ وہ اُٹھ کر اس کے قریب سیٹی پر بیٹھ گئے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”پروپوزل تو ہر لڑکی کا آتا ہے۔ اور اس سے پہلے بھی تمہارے کئی پروپوزل آچکے ہیں۔ مگر اس بار تم بالکل اپ سیٹ ہو



گئی ہو۔۔۔ کیوں؟“ انہوں نے نرمی اور یگانگت سے اُس کے سر کو تھپکتے ہوئے پوچھا تو ہشمنہ کا دل پگھل گیا۔ وہ بے اختیار ہو کر اُن کے گلے لگ کر بلک اُٹھی۔ کاش وہ شناس بھائی کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ سکتی۔ مگر وہ ایسی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بس جی بھر کر روتی رہی اور شناس بھائی نے اُسے رونے دینا کہ دل کا غبار نکل جائے۔

”تم ہم سب کو کتنی عزیز ہو ہشتمینہ! شاید تمہیں اندازہ نہیں۔ اور ماما تمہارے اس گھر سے جانے کا سوچ کر کتنے اُداس ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ ایک فرض بھی ہے ان کے کندھوں پر اور ایک خوشی بھی جس میں سکون اور اطمینان بھی ہے۔ انہوں نے اُس کا سراپا اٹھا کر اُسے دیکھا تو وہ چہرہ دوپٹے سے پونچھ کر سیدھی ہو بیٹھی۔

”دیکھو ہشمنہ! سلطان بہت اچھا لڑکا ہے۔ کمال انکل سے کے بہت اچھے مراسم ہیں۔ اور پھر ان کی فیملی بہت ایجوکیٹڈ اور بہت نفیس ہے۔ تمہیں ایڈجسٹ ہونے میں یقیناً کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“ شناس بھائی اٹھ کر ٹہلنے لگے۔ پھر اُس کی رائٹنگ ٹیبل کے پاس رُک گئے۔ وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھی رہی۔

”تمہارا یہ بلا جواز انکار نہ میری سمجھ میں آرہا ہے اور نہ کی۔“ وہ رُکے، اُن کی نگاہیں ہشمنینہ کے جھکے سر سے پھسلتیں یکدم میز کی سطح پر رکھی سیاہ ڈائری پر رُکیں جس کا پہلا صفحہ کھلا ہوا تھا اور اس پر واضح انداز میں ”اشمل خان“ کا نام سرخ مار کر سے لکھا نظر آرہا تھا۔ اور جیسے لمحہ بھر کو اُن کے اعصاب کو جھٹکا لگا۔ ”اشمل خان“ یہ نام اُن کے لئے اجنبی نہ تھا۔ اور وہ ہشمنینہ کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا۔ اس سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھے۔ اچانک ہی ہشمنینہ کا انکار اُن کی سمجھ میں آنے لگا۔ اُن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”کیا تمہارا کسی سے کٹ منٹ ہے؟“ انہوں نے بالکل اچانک پوچھا تھا۔ ہشمنہ نے سر اٹھایا اور اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ شناس بھائی کا لہجہ قدرے تیز تھا اور چہرے پر بے پناہ سختی تھی۔ وہ چل کر اُس کے قریب آئے۔

”یہی جواز رہ جاتا ہے۔“ انہوں نے بہت غور سے کھوجتی نظروں سے اُسے دیکھا۔

”نن۔۔۔۔۔ نہیں اشناس بھائی!“ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

”سچ سچ بتاؤ ہشمنہ!“ ان کے لہجے میں نرمی نام کونہ تھی اور ہشمنہ کو لگا جیسے وہ نیچے ہی نیچے تاریک وادیوں میں گرتی چلی جا رہی ہو۔ شناس بھائی کی کھوجتی نگاہیں اُس کے جسم کے آر پار ہونے لگیں۔

‘میرے خدا’

اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اُس کا یہ متواتر بلا جواز انکار کسی کو اس رُخ پر بھی سوچنے پر مجبور کر دے گا۔ اور وہ جو اپنی عزت، غیرت اور حمیت کی حفاظت کرتے نہ تھکتی تھی اس لمحے اُسے اپنا آپ بالکل پست لگنے لگا۔ اُسے خود سے کراہیت ہونے لگی۔

یہ اس نے کیا کر دیا؟

اُس شخص کی خاطر وہ جان دے سکتی تھی مگر اپنی عزت کا نیلام کسی صورت گوارا نہ تھا۔ باپ اور بھائی کے سامنے اُس کا سر جھک جاتا۔ وہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہتی۔ کے اعتماد کو اتنی بڑی ٹھیس پہنچا دے۔۔۔ ایک محبت پانے کے لئے اتنا سب کچھ کھودے۔۔۔۔۔ نہیں، یہ اُسے گوارا نہ تھا۔ اُس کی شریانوں میں خون اُبلنے لگا اور چہرہ گرم آگ ہو گیا۔

”نہیں اشناس بھائی! میرا کسی سے کٹ منٹ نہیں ہے۔ اور نہ میرے انکار کی یہ وجہ ہے۔“ اُس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”تو پھر؟“ شناس بھائی سوالیہ نشان بن گئے۔

”آپ \_\_\_ سے کہہ دیں، مجھے اس رشتے پر کوئی انکار نہیں۔ جب جواز ہی نہیں تو مجھے انکار نہیں کرنا چاہئے۔ وہ ہنس



دی۔ غصے کے ضبط سے اس کا چہرہ لال بھوکا ہو رہا تھا اور دروازے سے داخل ہوتی بھابی کا کلیجہ پانی ہو گیا۔

اشناس بھائی اُسے چند لمحے خالی نظروں سے تکتے رہے، پھر پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہ کیا کر دیا ہشمنہ!“ بھابی بھاگ کر اندر آئیں۔ ”دیوانی تو نہیں ہو گئی ہو؟“

اُس نے سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ آگ ہو رہا تھا اور آنکھیں دھول۔

”میرے پاس کوئی جواز نہیں تھا انکار کا۔ اور میں بے غیرت بیٹی بن کر سب کے سروں سے عزت کی چادر نہیں کھینچ

سکتی تھی۔ نہیں ہے مجھ میں اتنی تاب کہ محض ایک کو پانے کے لئے اپنی عزت، اپنی غیرت اور کے اعتماد کو بکھیر

دوں۔ میں اپنے ضمیر کے آگے سر خرور ہنا چاہتی ہوں۔ اس گھر میں اپنی عزت، اپنا مقام برقرار رکھنا چاہتی ہوں۔ میں

خود کو قربان کر کے اپنا اعتماد قائم رکھنا چاہتی ہوں۔“ وہ صوفے پر ڈھلے گئی۔

”مگر ہشمنہ! اس لڑکے اشمیل کا کیا ہوگا؟ اُسے کس بات کی سزا دے رہی ہو؟ اُس کی زندگی سے کیوں دشمنی کر

رہی ہو تم؟ خود تم بھی۔۔۔۔۔ نہیں ہشمنہ!۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔“ بھابی کا گلارندھ گیا۔ واس کے

پاس بیٹھ کر اُسے جھنجھوڑنے لگیں۔

”میں اور کیا کروں بھابی! آج اشناس بھائی نے مجھ سے جو کچھ پوچھا میں نے اس نوبت کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اس لئے میں خود اپنی نظروں میں گر گئی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایک شخص کو پانے کے لئے آنکھوں میں نامحرم کے

خواب سجانے کے لئے مجھے اتنی بھاری قیمت ادا کرنی ہوگی۔ پھر مجھے اپنا آپ اتنا گرا ہوا اور پست لگے گا۔ مجھے لگا جیسے سر

عام بھائی کے سامنے میں ننگے سر کھڑی ہو گئی ہوں۔ آہ، بھابی! میرے دل میں جیسے کسی نے نیزے کی انی چبھو

دی تھی۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بلک اٹھی۔

بھابی کا جگر بھی پانی پانی ہو گیا۔ ”کیا اشناس کے علم میں آگئی ہے یہ بات؟“

”نہیں۔۔۔ مگر میں نہیں چاہتی کہ اب یہ نوبت بھی آجائے۔ میں اس لمحے سے بہت ڈرتی ہوں بھابی! جب امی کے

سامنے کھڑے ہو کر میں سر بھی نہ اٹھا سکوں۔ ان کے بازوؤں میں جھول کر یہ بھی نہ کہہ سکوں کہ۔۔۔۔۔“

اُس کا گلا آنسوؤں سے بھر گیا۔ آنسو اور بھی تو اتر سے بہنے لگے۔

بھابی نے اُسے ترحم بھری نظروں سے دیکھا اور پھر آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھیں۔ وہ اس وقت اُسے تنہا جی بھر کر

رونے کا موقع دینا چاہتی تھیں۔ دل کا غبار نکال کر یقیناً وہ پُر سکون ہو جاتی۔ وہ کمرے سے باہر نکل گئیں اور جاتے

ہوئے دروازہ بند کر گئیں۔

...☆☆☆...

مہروز خان، چڑھتی شام میں ہی حویلی آگئے تھے۔ ان کے ہمراہ گل بی بی بھی تھیں۔ اشتار، زبیل کے ساتھ لان میں

ٹہل رہی تھی۔ مہروز خان کے ساتھ گل بی بی کو آتے دیکھ کر اُسے ایک انوکھی خوشی ہوئی۔

اس اُجاڑ، بے کیف اور تلخ فضا میں جیسے گل بی بی پیار کا نازہ جھونکا محسوس ہوئیں۔ مہروز خان اندر بڑھ گئے جبکہ گل بی

بی اس کے پاس ٹھہر گئیں۔

”السلام علیکم گل بی بی!“ وہ کرسی سے اٹھ کر ان کے پاس آگئی۔

”جیتی رہو۔۔۔ میری طرف تو تم نے آنا چھوڑ دیا ہے بالکل۔ گل مینا بہت یاد کرتی ہے تمہیں۔“ انہوں نے اشتار کو

سینے سے لگالیا اور اس کی پیشانی چوم لی۔

”شاندانہ بھی اس ماہ کے آخر میں آئے گی۔ اور زیادہ دن رکے گی۔“ گل بی بی کی بات پر اشتار خوش ہو گئی۔

”میں بھی شان کی کمی بہت محسوس کرتی ہوں۔۔۔۔۔ سچ، اس کے جانے کے بعد بالکل تنہا سی ہو گئی ہوں۔۔۔۔۔ آئیے نا، ہم اندر بیٹھتے ہیں۔“ وہ گل بی بی کو لئے اندر کے حصے میں آگئی۔ تب مہروز خان کے گرجنے، برسنے کی آواز آئی۔

”تم چلو اپنے کمرے میں۔۔۔۔۔ میں ابھی آتی ہوں۔“ گل بی بی کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا۔ انہوں نے اشارہ کو تھپک کر کہا اور خود سٹنگ روم میں چلی آئیں جہاں مہروز خان اور شاہ خانم کے درمیان تلخ کلامی جاری تھی۔

”گل! اسے سمجھا دو اچھی طرح کہ اب اس کے لئے شور مچانا عبث ہے۔ میرا یہ آخری فیصلہ ہے اور اس جمعہ کو میں اشارہ اور ذولین خان کا نکاح کر رہا ہوں۔“ مہروز خان کی بھاری اور غصے سے بھری ہوئی آواز حویلی میں گونج رہی تھی اور اشارہ اس خبر پر سنائے میں رہ گئی تھی۔

”مہروز خان! یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میرے جیتے جی تم اس فیصلے پر قدم نہیں اٹھا سکتے۔“ شاہ خانم کا چہرہ لا بھبھوکا ہو رہا تھا۔

”خدا کے لئے شاہ!۔۔۔۔۔ تم ہی ضد چھوڑ دو۔“ گل بی بی گھبرا کر آگے بڑھیں۔ ”ذولین ہمارا ہی بچہ ہے۔ خون ہے ہمارا۔“

”نہیں گل۔۔۔۔۔ یہ شخص مجھے اس طرح جھکانا چاہتا ہے۔“ شاہ خانم نے گل بی بی کی بات کا کوئی اثر لئے بغیر غصے سے کہا اور اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔ ”مہروز خان! تم بھول رہے ہو کہ اشارہ میری بھی بیٹی ہے۔ اس پر میرا بھی حق ہے۔“ وہ اپنے مخصوص تتنے کے ساتھ مہروز خان کے سامنے جا کھڑی ہوئیں۔

”ہاں۔۔۔۔۔ تم نے اپنا حق بہت جتالیا ہے اور قدم قدم پر تم یہ بات بھولتی رہی ہو شاہ بیگم! کہ تمہارا اٹھا ہوا یہ سر میرے دم سے ہے۔ میں نے تمہیں کبھی توڑنا نہیں چاہا۔ ورنہ تم نے تو اس حویلی کو قدم قدم پر ڈھانے کی کوشش کی ہے۔ اس گھر کی خوشیوں کو ڈستی رہی ہو اور میں چپ رہا۔“

مہروز لالہ!۔۔۔۔۔ نہ۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔“ گل بی بی گھبرا کر دونوں کے درمیان آگئیں۔ آج مہروز خان کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور وہ اس انتہائی غصے میں کچھ بھی کہہ سکتے تھے۔ گل بی بی خوفزدہ ہو گئیں۔ ”یہ بات امن و سکون سے بھی کہی جاسکتی ہے۔ شاہ کو میں سمجھاؤں گی۔“

”نہیں گل۔۔۔۔۔ ہٹ جاؤ تم درمیان سے۔ آج میں اس عورت کے چہرے سے نقاب کھینچ کر اسے اس کا اصلی چہرہ دکھائوں گا کہ وہ کیا تھی اور کیا ہے۔“ مہروز خان نے گرج کر گل بی بی کو بازو سے پکڑ کر سامنے سے ہٹا دیا اور شاہ خانم کے سامنے تن کر کھڑے ہو گئے۔

”شاہ بیگم! تمہارا یہ فخر۔۔۔۔۔ تمہارا یہ غرور۔۔۔۔۔ میں پہلے روز ہی توڑ سکتا تھا۔ مگر محض فیروز لالہ کی طرف سے لگائے دکھ پر مجھے تم سے ہمدردی ہو گئی تھی اور میں نے چاہا کہ یہ ہمدردی محبت

میں ڈھل جائے۔ مگر تمہارے رویوں نے کبھی ایسا نہ ہونے دیا۔ تمہارے رویوں نے مجھے، اس حویلی کے ہر مکین کو دکھ پہنچایا۔ تم اپنے نام نہاد غم کے انبار تلے ہم سب کو دبائے رکھنا چاہتی تھیں۔ شاہ خانم بن کر مجھ پر، اس حویلی پر حکومت کرتی رہیں۔ مگر کبھی ہمارے دلوں پر راج کرنے کی کوشش نہ کی۔ جھانکو ہمارے دل میں شاہ خانم!۔۔۔۔۔ جھانکو میرے دل میں کہ تم یہاں موجود بھی ہو یا نہیں؟۔۔۔۔۔ تم صرف ان اونچی اونچی دیواروں میں قید ہو، میرے دل میں نہیں۔“

”مہروز۔۔۔۔۔ خا۔۔۔۔۔ ان۔۔۔۔۔“ شاہ خانم کا سارا وجود لرز اٹھا۔ ان کے جسم کا سارا خون یک بیک چہرے پر سمٹ آیا۔ اتنا غضب ناک دیکھا تھا۔ وہ آج پہلی بار شاہ خانم جیسے بُت کو توڑنے کے لئے آگے آئے تھے۔ گل بی بی الگ اپنی جگہ دم سادھے دکھ سے دوچار ہو رہی تھیں۔

”دیکھو شاہ بانو! ان اونچی اونچی دیواروں کو دیکھو جو تمہارے خوف سے سہمی ہوئی ہیں۔ خود تمہاری اولاد جس کے دل

میں تمہارا احترام نہیں، خوف ہے۔ ہاں، ایسا خوف جو محبت میں ڈھل نہیں سکتا کبھی۔“

”چپ ہو جاؤ مہروز خان۔“ چپ ہو جاؤ۔“ شاہ خانم چلا گئیں۔ مہروز خان کے جملے اُن کا دل چیرے دے رہے تھے۔ خود کو ہمیشہ مضبوط اور تناور درخت کی طرح سمجھنے والی اندر سے اس قدر کھوکھلی ہے۔ یہ احساس ان کے قدم اُٹھا گیا۔ وہ لڑکھڑا گئیں۔

”گلناز یقیناً ایک عظیم عورت تھی جو اپنا غم خود سے بھی چھپا گئی۔ مگر تم اس کی تشہیر کرتی رہیں۔ درحقیقت تمہیں گلناز سے محبت نہیں تھی۔ تم اس طرح اپنے کسی جذبے کی تسکین کرتی رہیں۔ فیروز لالہ اور ذولین سے نفرت دراصل تمہارے ذہن کی پستی ہے۔ تمہارا حسد نفرت میں بدل گیا اور نفرت انتقام میں۔“ مہروز نشتر بھرے لہجے میں بولے اور شاہ خانم کو دیکھا جو ان جملوں کی تاب نہ لا کر جیسے بکھر گئی تھیں۔ ایک لاوا تھا جو برسوں سے پک رہا تھا، آج بھڑک اُٹھا تھا۔ مہروز خان آج وہ سب کچھ کہہ دینا چاہتے تھے جو برسوں سے نہ کہہ پائے تھے یا نظر انداز کرتے رہے تھے۔

”تم۔۔۔ شاہ بانو! تم نے اپنا سکہ بٹھانے کی کوشش کی۔ تمہیں تسکین ملتی تھی جب کوئی تم سے خوفزدہ ہو جاتا تھا۔ تمہارے حکم کے آگے جھک جاتا۔ چاہے وہ تمہاری اولاد ہی کیوں نہ ہو۔ چاہے شوہر ہی کیوں نہ ہو۔ کاش شاہ بیگم! تم نے ہم سب کی محبت حاصل کرنے کی سعی کی ہوتی۔ اپنا رعب و دبدبہ بٹھانے کی بجائے اپنا آپ محبت سے منوایا ہوتا۔ مگر نہیں۔۔۔ تم میری نظروں میں گر گئی ہو شاہ بانو! تم میری نرمی اور برداشت کو اپنی جیت گردانتی رہیں۔ مگر حقیقت میں تم ایک شکست خوردہ اور ناکام عورت ہو۔ ایک ہاری ہوئی عورت۔ تم نے اپنا سب کچھ ہار دیا۔ اپنا مان، اپنا اعتبار سب کچھ کھو دیا تم نے۔۔۔ میری محبت، میری ہمدردیاں۔“

انہوں نے گویا آخری تیر شاہ خانم کے سینے میں پیوست کیا تھا اور قدم اٹھاتے کمرے سے باہر نکل گئے۔

شاہ خانم کا سارا وجود چکرا گیا۔ وہ نیم مردہ تو پہلے ہی ہو رہی تھیں۔ گل بی بی آگے بڑھیں اور جلدی سے انہیں تھام لیا۔ اشتار ابھی مہروز خان کے کمرے سے جانے کے بعد اپنی سسکیاں دباتی بھاگ کر شاہ خانم کے قریب آئی۔

”گل!۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ سب کیا تھا؟“ شاہ خانم نے پتھرائی نظروں سے گل بی بی کو دیکھا۔ گل بی بی انہیں تھام کر ان کی خواب گاہ میں لے کر آئیں۔

”شاہ! تم نے بھی بے کار کی ضد کی۔“ گل بی بی کی آواز آنسوؤں میں گھل گئی۔ شاہ خانم بیڈ پر ڈھے گئیں۔ اور پھر جیسے ضبط کے بند ٹوٹ گئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ انہیں لگ رہا تھا جیسے مہروز نے انہیں بہت اونچائی پر لے جا کر زمین پر پٹخ دیا ہو اور ان کے وجود کے ریزے ریزے یہاں وہاں بکھر گئے ہوں۔ سب کچھ بکھر گیا تھا۔ کچھ نہ بچا تھا۔ نہ عزت، نہ انا، نہ ذات کا فخر و غرور۔

آہ۔۔۔ سب کچھ ملیا میٹ ہو گیا تھا۔ وہ اتنے برسوں کی ریاضت کے بعد بھی جیسے خالی ہاتھ رہ گئی تھیں۔ آج ان کے شوہر، ان کے مجازی خدا نے انہیں ایسے داغا تھا کہ وہ تڑپ تڑپ اٹھی تھیں۔ انہیں یک لخت ہی توڑ دیا تھا۔ جیسے جسم سے روح ہی کھینچ لی تھی۔

’ہائے مہروز خان! یہ تم نے کیا کر دیا۔۔۔ اس عمر میں مجھے تم نے بالکل تہی داماں کر دیا۔ کچھ بھی نہ بچا میرے پاس۔۔۔ کتنی بے اعتبار ہو گئی ہوں۔‘

ان کے آنسو تو اتر سے بہنے لگے اور یہ آنسو اشتار کے دل پر بر چھئی کی طرح لگ رہے تھے۔

ہمیشہ چٹان کی طرح مضبوط، ستون کی طرح تنی ہوئی شاہ خانم کو یوں ریزوں کی طرح بکھرتے دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ اس سے ضبط نہ ہوا تو وہ کمرے سے باہر نکل آئی اور مرمر کے چکنے ستون سے لپٹ کر بے اختیار رو دی۔



اس حویلی میں اٹھے اس طوفان کی قصور وار وہ خود کو ٹھہرا رہی تھی۔ کاش \_\_\_ کاش اُس نے ذولین کو چاہنے کی غلطی نہ کی ہوتی۔ وہ شخص اس کے سامنے آیا ہی نہ ہوتا۔ اور اگر آیا تھا تو وہ اپنا دل سخت کر لیتی۔

کاش ذولین! تم ہی \_\_\_ تم نے ہی میرے جذبوں کو روند ڈالا ہوتا تو آج یہ دن مجھے نہ دیکھنا پڑتا۔“

اُسے اپنے دل کی نگری اُڑنے کے غم سے زیادہ شاہ خانم کے ٹوٹنے کا غم تھا۔ اُس نے تو ہمیشہ شاہ خانم کو فاتح دیکھا تھا۔ سر بلند ایک تتنے کے ہمراہ اپنا آپ منواتے ہوئے۔ اور بابا خان کو

ان کی تعظیم کرتے ہوئے۔ کس نے سوچا تھا کہ عمر کے اس حصے میں انہیں ایسا ناقابل برداشت غم ملے گا۔

آہ \_\_\_ کب پہاڑوں کو اُس نے ٹوٹے دیکھا تھا۔

ستاروں کو کب زمین پر گرتے دیکھا تھا۔

آج اُس کی آنکھوں نے خوفناک منظر دیکھ لیا تھا۔ شاہ خانم مٹی کا ڈھیر ہو گئی تھیں۔ بابا خان کے جملے زہر قاتل ہی تو تھے ان کے لئے۔

”ہائے بابا خان! یہ کیا کر دیا آپ نے \_\_\_ کیوں کیا یہ سب کچھ؟“

”اشترا! صبر کر میری بچی!“ گل بی بی نے اُسے محبت سے تھاما تو وہ ان کے سینے سے لگ گئی۔

”میری شاہ خانم ٹوٹ گئی ہیں گل بی بی \_\_\_ یہ حویلی بکھر گئی ہے۔ اسے سنبھالیں گل بی بی! اسے سنبھالیں وگرنہ ہم سب اس کے بلے تلے دب جائیں گے۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”نہ میری جان۔۔۔۔۔ بس کر۔“ گل بی بی نے اسے خود سے لپٹا لیا اور خود بھی رونے لگیں۔

شاہ خانم کی حالت ان سے بھی نہ دیکھی گئی تھی۔ وہ ان کے کمرے سے باہر نکل کر آئی تھیں۔ اب اشترا کا تڑپ تڑپ کر رونا نہیں نڈھال کر رہا تھا۔ مگر انہوں نے خود کو سنبھالنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انہیں تو ابھی شاہ خانم اور اشترا کو سہارا دینا تھا، تسلی دینی تھی۔ حویلی کے بکھرتے حالات کو سنبھال دینا تھا۔ مہروز خان کے غصے کو ٹھنڈا کرنا تھا۔

”گل بی بی! \_\_\_ میں شاہ خانم کو ٹوٹے ہوئے نہیں دیکھ سکتی \_\_\_ میں انہیں بلکتا ہوا نہیں دیکھ پائوں گی۔ وہ میری ماں ہے \_\_\_ انہوں نے مجھے اپنی کوکھ سے جنم دیا ہے۔ ان کا ہر فیصلہ مجھے قبول کرنا ہے۔ ان کی فتح ہی میری فتح ہے \_\_\_ ان کا اٹھا ہوا سر میری عزت ہے۔ میں ذولین سے شادی نہیں کروں گی۔“

”اشترا \_\_\_“ گل بی بی لرز گئیں۔ اشترا ان کے بازوؤں سے نکل آئی۔

”ہاں گل بی بی! میں ذولین سے شادی نہیں کروں گی۔ اور جو شاہ خانم کا فیصلہ ہے وہ مجھے قبول ہے۔“

”اشترا! پاگل ہو رہی ہو کیا \_\_\_ مہروز لالہ حق پر ہیں اور شاہ خانم سنبھل جائے گی۔“ گل بی بی نے اُسے خوفزدہ نظروں سے دیکھا جس کے چہرے پر اپنی بات پوری کرنے کا عزم تھا۔

”نہیں \_\_\_ وہ کبھی نہیں سنبھلیں گی۔ یہ چوٹ بہت بھاری ہے گل بی بی! بابا خان نے اپنی عمر بھر کی خاموشی کو جس رنگ میں توڑا ہے یہ شاہ خانم کے لئے شدید صدمہ ہے۔ وہ عادی نہیں تھیں۔ انہوں نے تو کبھی تصور بھی نہ کیا ہو گا کہ بابا خان انہیں اتنی بڑی شکست دیں گے۔“ اشترا کی آنکھیں بھرا آئیں۔ ”مجھے نہیں روکیے گا گل بی بی! میں خود غرض نہیں ہوں کہ محض اپنی خوشیاں پانے کے لئے اپنی عظیم ماں کو شکست سے دوچار کروں۔ مجھے اپنے خوابوں سے زیادہ شاہ خانم کی جیت، ان کی آسودگی منظور ہے۔“ وہ پلٹ گئی۔ اس نے یک دم ہی فیصلہ کر لیا تھا۔ اس میں نہ جانے کہاں سے اتنی ہمت آئی تھی کہ وہ بابا خان کے سامنے اپنا فیصلہ سنا دینا چاہتی تھی۔

مہروز خان اپنی لا بھریری میں تھے۔ وہ اپنے تمام حواسوں کو سنبھالتی، اپنی ہمتوں کو مجتمع کرتی ان کے پاس آئی تھی۔



”بابا خان!“

”انہوں نے سراٹھایا۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی اور چہرے پر ابھی تک غصے کی سرخی جمی ہوئی تھی۔

”ہوں۔۔۔“ انہوں نے سوالیہ نگاہیں اشتاراکے چہرے پر ٹکا دیں۔

”بابا خان! میں ذولین سے شادی نہیں کر سکتی۔“ اس نے بے حد روانی میں کہہ دیا۔ نہ زبان لڑکھرائی نہ دل دھڑکا اور نہ ہتھیلیوں میں پسینے کی لہریں بنی تھیں۔

اس کی نگاہوں کے سامنے تو بس شاہ خانم کا کرب آلود چہرہ گھوم رہا تھا۔ دھول ہوتی ہوئی آنکھیں اور مجروح وجود تھا۔

”کیا کہہ رہی ہو تم؟“ مہر و خان زور سے گرجے۔

”گستاخی معاف بابا خان! میں یہ انکار کسی دباؤ کے تحت نہیں کر رہی ہوں۔ مجھے بس اس گھر کی، اس حویلی کی خوشیاں عزیز ہیں۔۔۔ میں ایسا کوئی فیصلہ قبول نہیں کر سکتی جو اختلافات کا باعث بنے۔“ اس نے جھکے سر کے ساتھ کہہ دیا اور پلٹ کر ان کی لائبریری سے نکل آئی۔ اس نے عذابوں کی پذیرائی بہت تحمل سے کی۔

خود کو تقسیم کے نادیدہ عمل سے بہت صبر سے گزار دیا۔

اگر اُس کے دل کی دنیا جڑی تھی تو کیا ہوا۔۔۔ شاہ خانم کا فخر تو زندہ رہ جائے گا۔ اُن کا اٹھا ہوا سر اور فتح مندی کا احساس تو سلامت رہے گا۔ وہ اور ذولین خان ہی زندگی کی بازی ہارے تھے۔ حویلی اختلافات کے سیلاب سے یقیناً بچ جائے گی۔

اُس کا ضمیر مطمئن تھا۔ اُس نے اپنی ماں کا سر جھکنے سے بچا لیا تھا۔

”سوری بابا خان! میں ایک ساتھ سب کو مطمئن نہیں کر سکتی۔۔۔ میں نے کسی فردِ واحد کو نہیں بلکہ اس حویلی کو

آنے والے سنگین طوفان سے بچا یا ہے۔ میرے خواب، میری خواہشیں کم حیثیت ہیں۔ اور اس حویلی کی آن، عزت بہت قیمتی۔ اور قیمتی شے کے لئے بے وقعت اور سستی شے قربان کی جاتی ہے۔ اُس نے صوفے کی پشت پر سر ٹکا کر جلتی آنکھیں موند لیں۔

...☆☆☆...

وہ سب جامعہ کی بغلی لان میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ موسم بھی صبح سے ہی خوشگوار ہو رہا تھا۔ دُھوپ تو نام کو نہ تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائوں نے ماحول کے ساتھ احساسات میں بھی خوشگوار بھر دی تھی جس کا مظاہرہ وہ سب کر رہے تھے۔

”یار! بیت بازی کا مقابلہ ہو جائے۔“ افتخار نے وقت کو پُر لطف انداز سے گزارنے کی ایک ترکیب پیش کی۔

”ارے نہیں یار۔۔۔ مجھے شاعری واعری سے دلچسپی نہیں ہے۔“ سدا کے خشک مزاج نعیم جان نے منہ بنایا تو احسن نے اُسے گھور کر دیکھا۔

”شاعری کو وہ لوگ ناپسند کرتے ہیں جن میں ذوقِ لطیف کی کمی ہوتی ہے۔“

”چلو یہی سمجھ لو کہ مجھ میں یہ لطیفی حس نہیں ہے۔“ نعیم جان نے کہا تو اس کے لطیفی کہنے پر سب کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

”تو پھر ایسا کرو پیارے! کہ دور اس تنہا کنج میں بیٹھ کر کچھ دیر کو اونگھ لو۔ تب تک ہم اپنا شاعرانہ شوق پورا کر لیں۔“ احسن نے کچھ اس طرح کہا کہ نعیم جان کو باوجود غصہ کے ہنسی آ گئی۔

”انتہائی کمینے انسان ہو۔۔۔ اگر کوئی شاعری نہ کرے تو ضروری ہے کہ اونگھنے لگے؟ تم لوگ اپنا شوق پورا کرو، میں

جبر آسن لیتا ہوں۔“

اُس نے گویا ان سب کو اجازت دے دی تھی۔

”اچھا \_\_\_ ابتدا میں کرتا ہوں۔“ شہزاد مچل کر بولا۔

”تو کرو بھائی! دیر کیوں کر رہے ہو؟“ احسن اُس کی اس اوپر ہنسا۔

شہزاد نے کالر جھٹکے اور خاصی ادا سے شعر پڑھا۔

آپ سے اختلاف ہے، مگر چہ

آپ کی بات پھر بھی پیاری لگے

ایسا لگتا ہے آپ اپنے ہیں

آپ کو زندگی ہماری لگے

”لاحول ولا\_\_\_\_ یہ ہے تمہارا شاعرانہ ذوق؟“ احسن نے شہزاد کو یوں گھورا جیسے ابھی اس کا سر بھاڑ ڈالے گا۔ اور شہزاد واقعی سہم گیا۔

”کک۔۔۔۔۔ کیا ہوا؟ \_\_\_\_\_ اتنا اچھا تو ہے۔“

”یہ۔۔۔۔۔آپ۔۔۔۔۔آپ۔۔۔۔۔کچھ زیادہ ہی عاجزانہ، انکسارانہ اور احمقانہ نہیں ہو گیا۔“ افتخار بھی دل کھول کر شہزاد کے شعر پر ہنس رہا تھا۔ شہزاد کا منہ بن گیا۔

”بھئی اپنی اپنی پسند ہے۔۔۔ مجھے فلسفیانہ شعر نہیں پسند۔ بس مجھے سادگی پسند ہے ہر چیز میں۔“ اُس نے ناراضحگی سے کہا۔

”واللہ \_\_\_\_\_ کون نہ مر جائے اس سادگی پر۔ ویسے وہ ہے کون شخصیت جس کی ہر بات تمہیں پیاری لگے؟ \_\_\_\_\_  
کہیں وہ خوش نصیب میں تو نہیں؟“

”احسن \_\_\_\_\_ تم \_\_\_\_\_“ شہزاد اس پر جھپٹا۔

”اوہو یاد! تم لوگ تو اس بے چارے کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو۔ اب ایک شعر پر ہی سارا تبصرہ لٹا دو گے۔ آگے بھی بڑھو۔“ نعیم جان نے شہزاد کی حمایت کی۔ اُسے معصوم سے، بے ضرر شہزاد پر رحم آ گیا جو مسلسل ان سب کے نرغے میں تھا۔

”ہاں یار احسن! اب تم سناؤ کوئی ایسا ہی شعر۔“

”اس جیسا کیوں؟ \_\_\_\_\_ تمہیں نہیں خبر، میرا شاعرانہ ذوق بہت اعلیٰ ہے۔“ احسن اکڑا۔ پھر بے اختیار اس کی نگاہ اشمل خان پر اُٹھی جو سامنے بیچنچر بیٹھا بظاہر ان کی محفل میں شامل تھا۔ مگر حقیقتاً وہ کہیں اور ہی تھا۔ اُسے نہ شاعری سے دلچسپی تھی اور نہ وہ سن رہا تھا۔ اُس کے سامنے تو ڈھیر ساری الجھنیں اور مسائل کھڑے تھے۔ جن سے چاہتے ہوئے بھی وہ پیچھا نہیں چھڑا پا رہا تھا۔

عجیب رسم ہے رسم وفا بھی اے ہمد

ہے دل ہمارا مگر اختیار کس کا ہے

”واہ۔۔۔۔۔واہ۔۔۔۔۔“ سب لہک کر اسے داد دینے لگے۔ البتہ شہزاد نے ناک بھوں چڑھائی۔ نعیم جان ہنس دیا۔

”چلو افتخار! اب تم سناؤ۔“ اُس نے گویا ناک سنبھال لیا تھا۔ ہتھیلی کو مٹھی کی شکل دے کر اس نے افتخار کے سامنے کر دی۔

احسن آہستگی سے ان کے درمیان سے اٹھ گیا اور اشمل کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو وہ چونکا۔

”آں۔۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔۔ کیا کہا؟“

”خوب۔۔۔ یعنی آپ ہیں کہ اور ہی دنیا کی سیر میں مصروف ہیں۔ ادھر یہ عالم کہ آوازیں لان میں بیٹھے تمام اسٹوڈنٹس کے کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی ہیں اور ادھر یہ آپ کی بے نیازی۔“ احسن اٹھ کر بیچ پر بیٹھ گیا۔

”کیا بات ہے یاد! یہ چہرے پر سوا بارہ کیوں بچ رہے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ کافی دیر سے سوئی ایک جگہ ہی اٹک گئی ہے۔ اگر شعر پسند نہیں آ رہا تو کوئی دوسرا پھڑکتا سنا دیتا ہوں۔ مثلاً

یہ اُداسی، دُھواں چاندنی چوک میں

چاندنی ہے کہاں چاندنی چوک میں

”احسن! بی سیریس پلیز۔“ اشمل نے سر اٹھا کر اسے تنبیہی نظروں سے دیکھا۔

”کیا۔۔۔۔۔“ احسن اچھلا۔ ”یعنی کہ اس محفل زعفران میں بھی آپ کو سنجیدگی کا دورہ پڑا ہے۔“ احسن نے اسے بغور دیکھا اور پھر بری طرح چونکا۔ وہاں نہ صرف سنجیدگی تھی بلکہ ایک گہری اُداسی مستور تھی۔ وہ بھوری بھوری

آنکھیں عجیب دکھ سے بھری ہوئی تھیں اور یہ صرف احسن محسوس کر سکتا تھا۔

”کیا بات ہے اشمل! میں دیکھ رہا ہوں تم جب سے وادی ہو کر آئے ہو، بہت بدل گئے ہو۔“ احسن نے سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ لیا۔

لڑکوں کی محفل ابھی تک جمی ہوئی تھی اور وہ سب بے تکی اشعار پڑھ کر ایک دوسرے کو داد دے رہے تھے۔ اشمل اس شور سے گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ احسن بھی اس کے ساتھ اٹھ گیا۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ احسن نے اس کا بازو تھام لیا۔

”کہاں؟“ اشمل نے استفسار نہ نظروں سے دیکھا۔

”وہاں جہاں تم بیٹھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکو۔ کم آن اشمل! لیٹ می نو ایوری تھنگ۔“ احسن کی بات پر اشمل کے چہرے کی سنجیدگی گہری ہو گئی۔

”احسن! میں واقعی بہت اپ سیٹ ہوں۔“

”مجھے شبیر کرنے دو گے اپنا غم۔۔۔ اپنا بوجھ؟“ احسن نے اسے دیکھا تو اشمل کے لبوں پر ایک ناسودہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ دونوں یونیورسٹی روڈ پر چلنے لگے۔

”غم بانٹنے سے دل پر چھائی پڑمردگی کم ہو جاتی ہے۔“

”نہیں احسن! میری پریشانیاں تم شبیر نہیں کر سکتے۔ اور نہ میں ان کی تشہیر چاہتا ہوں۔“ اُس نے قدم اپنی گاڑی کی طرف بڑھا دیئے۔ ”کچھ بوجھ انسان تنہا ہی اٹھاتا ہے۔ اور میں تمہیں اس میں شریک نہیں کر سکتا۔“

”اتنا بے اعتبار ہوں میں؟“ احسن اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

”ارے نہیں۔۔۔ بات اعتبار کی نہیں ہے۔“

”تو پھر؟“ احسن نے اس کے ہاتھ سے گاڑی کی چابی چھین لی۔ ”تمہارے بوجھ اگر میں شیئر نہیں کر سکتا تو مجھ پر لعنت ہے۔ سمجھے تم؟“

اشمل ہنس دیا۔

”اچھا چابی ادھر دو۔۔۔ آج میرا دل چاہتا ہے میں بے مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا پھروں۔۔۔ تنہا۔“ اُس نے آخری لفظ پر زور دیا تھا۔

”ہر گز نہیں۔۔۔ یہ تنہائی ہی تمہیں کسی دن لے ڈوبے گی۔ ایمان سے اتنے فضول لگ رہے ہو۔“ احسن فرنٹ سیٹ پر ٹھس کر بیٹھ گیا اور چابی اس کی طرف اچھال دی۔ ”میں اس وقت تک تمہارے ساتھ سڑکوں کی خاک چھانتا پھروں گا جب تک تم مجھے اعتبار نہیں بخشتے۔“

اشمل نے اُسے ممنون نظروں سے دیکھا۔ وہ بے حد ڈھیٹ ہو رہا تھا۔ پھر اُس نے گاڑی میں رکھی سگریٹ کی ڈبیاز نکال کر اس میں سے سگریٹ نکالی اور اسے لبوں میں دبا کر لائٹر کا شعلہ دکھایا۔

احسن پر تو جیسے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ اشمل کو وہ پہلی بار سگریٹ پیتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہ تم سگریٹ۔۔۔۔۔“ احسن کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔

”ہوں۔“ اُس نے لبوں سے دھواں باہر نکالا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

”کبھی جب ڈپریشن کا شکار ہوتا ہوں تو ایسی ہی کمزور شے کا سہارا لیتا ہوں میں۔ اس خوش فہمی میں کہ شاید یہ دھواں میرے ڈپریشن کو بھی اپنے ہمراہ اڑالے جائے۔“ اس نے گاڑی فل اسپید پر چھوڑ دی۔

احسن کے لئے یہ انکشاف بڑا حیران کن تھا۔ وہ کئی لمحوں بعد سنبھلا اور جیسے اشمل کا نادیدہ دکھ اُسے کبیدہ کر گیا۔ وہ اشمل کو تکتے لگا۔ کیا دکھ ہو سکتا ہے اس جیسے مکمل شخص کو؟ پھر اچانک وہ چونکا۔

”ارے ہاں اشمل! تم یونیورسٹی نہیں آرہے تھے تو ہشمنہ ابرار سے میری ملاقات ہوئی تھی۔

ہشمنہ کے نام پر اشمل کی ساری توجہ احسن کی طرف ہو گئی۔

”کیا جامعہ آئی تھی؟“

”ارے نہیں۔۔۔ مجھے وہ لالہ زار کے قریب ملی تھی۔ تمہارے ہاسٹل سے چلے جانے کا میں نے اُسے بتایا تھا اور تمہارے جامعہ نہ آنے کا بھی بتایا تھا۔ اُس نے مجھ سے حویلی کے فون نمبرز لئے تھے۔ شاید تم سے بات نہیں ہو سکی ہو گی۔“

”نہیں۔۔۔“ اشمل نے دھواں اپنے سامنے پھیلا لیا۔ ”اس نے فون کیا ہی نہیں تھا۔ اور نہ وہ کرے گی۔“ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ لالہ زار کے نام پر اس کی آنکھوں میں کئی منظر لہرا گئے۔

اُس کی ہشمنہ سے بڑی خوبصورت ملاقاتیں لالہ زار میں ہی ہوئی تھیں اور آخری بھی۔ کتنا روئی تھی وہ۔۔۔ کس قدر اپ سیٹ تھی جب وہ جا رہا تھا۔

”مائی گاڈ۔۔۔۔۔ انسان خود کو لاکھ فاتح، آزاد اور خوش حال سمجھے مگر وہ قدرت کی زنجیروں میں جکڑا جاتا ہے۔ محض خوش فہم یا کم فہم۔ ہزاروں خواب ایک ساتھ بُن لیتا ہے۔ اپنے آپ کو آسودہ خیال کر کے یہ سمجھ لیتا ہے کہ تعبیروں کا حصول اس کے لئے کون سا مشکل ہے۔ جب تک آزمائش کی گردش میں نہیں آتا، خود کو مکمل اور فاتح خیال کرتا رہتا ہے۔“



”اشمل! کیا ہشمنہ کی وجہ سے کوئی پریشانی ہے؟“ احسن نے اسے چند لمحوں کے بعد پکارا تو اس نے بہت محبت سے احسن کو دیکھا جو اس کے غم میں سنجیدہ ہو گیا تھا اور کسی حد تک دکھی بھی۔

”احسن! کچھ پریشانیاں ایسی ہوتی ہیں جن کی تشہیر کرنے سے عزت پر حرف آتا ہے یا شاید انہیں بتانا غیرت گوارا نہیں کرتی۔ بس تم یوں سمجھو کہ اس پر پردہ پڑا رہنے سے تمہارے دوست کی عزت پر پردہ ہے۔ اس کے خاندان کی عزت اسی پردہ پڑے رہنے میں ہے۔“ اس نے گاڑی احسن کے بنگلے کے سامنے روک دی تھی اور احسن اس کی ادھر پر مسکرا کر رہ گیا۔

”بڑے بد تمیز ہو یاد۔ مگر خیر اس وقت تمہیں معاف کرتا ہوں۔ مگر دوست! میری فضول باتوں اور سچی بے غرض محبت کی ضرورت پڑے تو مجھے ضرور پکارنا۔ اور ہاں، ہشمنہ ابرار سے ضرور مل لینا۔ وہ بہت اپ سیٹ لگ رہی تھی۔“ وہ گاڑی سے اتر گیا۔

”خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔ تھینک یو سو مچ۔“ اشمل نے اس پر ایک تشکر بھری نگاہ ڈالی اور گاڑی آگے بڑھادی۔

وہ کتنی ہی دیر سڑکوں پر بے مقصد گاڑی دوڑاتا رہا۔ اس کا ذہن ایک طرف حویلی کے حالات سے پریشان تھا تو دوسری طرف احسن نے ہشمنہ کا ذکر چھیڑ کر اس کے درد میں اضافہ کر دیا تھا۔ اُس کی سوچوں کی افیت بڑھادی تھی۔ اپنی ان الجھنوں اور ڈپریشن میں اس نے ہشمنہ کو بھلا یا نہ تھا مگر اشارا کے آنسو اور ذولین کے دکھ اُسے اپنے خوابوں اور اپنی خواہشوں سے بڑھ کر اہم ہو گئے تھے۔

”آہ، اشارا! میری بہن۔ کتنا بزدل نکلا تمہارا بھائی۔ کچھ بھی تو نہ کر سکا تمہارے لئے۔ کاش بابا خان کی فتح ہو جائے۔“ اُس نے صدقِ دل سے دعا مانگی۔ مگر نہ جانے کیوں اُسے اپنی دعا کی قبولیت کی اُمید نہ تھی۔ شاید اس لئے کہ

وہ از حد مایوس اور پراگندہ ذہن ہو رہا تھا یا پھر۔۔۔ شاہ خانم کی ضد اور بابا خان کی نرمی سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ اور اشارا تو تھی ہی بے زباں لڑکی جسے جہاں چاہا، جس نے چاہا اپنی مرضی پر چلا لیا۔

اُس نے گاڑی پبلک کال آفس کے سامنے روک دی اور اتر کر اندر داخل ہو گیا۔ نمبر ملا یا تو چند گھنٹیوں کے بعد کسی نے ریسپور اٹھایا مگر وہ ہشمنہ قطعی نہ تھی۔ وہ لمحہ بھر کو گڑبڑا گیا۔ اُس نے ہشمنہ کے کمرے میں لگے فون کا ہی نمبر ملا یا تھا۔ دوسری طرف مسلسل ہیلو، ہیلو کی گردان ہو رہی تھی۔ اُس نے چند لمحے ٹھہر کر جواب دیا۔

”ہیلو۔۔۔ السلام علیکم۔“

”ارے، آپ اشمل ہیں؟“ دوسری طرف بھابی کی آواز میں اُمید، جوش اور کھنکا تھا۔ اُس نے اہستگی سے جی کہا۔

”ہشمنہ کو بلا دیجئے۔ آپ شاید مسز اشناس ہیں۔“

”ہشمنہ!۔۔۔“ بھابی نے ریسپور پکڑے، صوفے میں دھنسی ہشمنہ کو پکارا۔ مگر وہ یونہی خاموش اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ ہاں البتہ اس کے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا تھا اور آنکھوں میں درد ہلکورے لینے لگا تھا۔

”اشمل! وہ انکار کر رہی ہے۔“ چند لمحے بعد بھابی کی آواز ابھری تو اشمل کو شاک لگا۔

”کیا۔۔۔ کیوں۔۔۔؟“

”پاگل ہو گئی ہے یہ لڑکی۔ میں اب کیا بتاؤں آپ کو۔“

”پلیز بھابی! اُسے بلائیے۔“ وہ بے قرار ہو گیا۔ اُس کا دل انجانے خدشہ سے لرزنے لگا۔

”اچھا۔۔۔ میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔“ انہوں نے ریسپور ٹیبل پر رکھ دیا۔

اشمل کو اچانک ہی اپنی کوتاہی کا احساس ہونے لگا۔ اُسے یہاں آتے ہی ہشمنہ سے رابطہ قائم کرنا چاہیے تھا۔ وہ لڑکی

محض اُس کے بھروسے پر تو خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔ نہ جانے اب اس کے ساتھ کیا گزرا ہوگا۔ کہیں وہ اُس سے بد گمان تو نہیں ہوگئی۔

”ہیلو\_\_\_\_“ ہشمنہ کی کانپتی آواز برقی تاروں سے لہراتی اشمَل کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ سنبھل گیا۔

”ہشمنہ! کیا ہو گیا ہے؟\_\_\_\_ کیوں بات نہیں کر رہی تھی؟“ اُس کے لہجے میں جیسے سارے جہاں کی بے قراری تھی۔ مگر ہشمنہ کی قوتِ گویائی تو جیسے سلب ہوگئی تھی۔ اشمَل کی آواز نے اُس کے دل کو بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ جتنی مشکلوں سے خود کو جوڑنے میں لگی ہوئی تھی اور اب پھر دل کے ریزے یوں بکھر گئے تھے جیسے تیز ہوا میں سُکھے پتوں کا ڈھیر بکھر جاتا ہے۔

”فار گاڈ سیک ہشمنہ!\_\_\_\_ میرے ضبط کا امتحان مت لو\_\_\_\_ کچھ تو بولو\_\_\_\_ میں مانتا ہوں مجھ سے کوتاہی ہوگئی۔ مگر یقین جانو میں خود سخت الجھا ہوا تھا۔ جانتی ہو اس لمحے مجھے تمہاری شدید ضرورت محسوس ہو رہی ہے\_\_\_\_ ہشمنہ! پلیز۔“

”اش\_\_\_\_ مل\_\_\_\_ اب کہنے کو کچھ نہیں رہا\_\_\_\_ میرے وہ سارے خواب شاید میری نادانی تھے۔“

”ہش\_\_\_\_ مینہ\_\_\_\_“ اشمَل کے اعصاب کو جھٹکا لگا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟\_\_\_\_ ہوش میں تو ہو؟“

”کاش اشمَل! میرا یہ سفر یکطرفہ ہی ہوتا تو میں شاید سنبھل جاتی۔“ وہ رونے لگی اور اشمَل پریشان ہو گیا۔

”مجھ سے ملو ہشمنہ! ابھی اور اسی وقت۔“

”نہیں اشمَل! ناؤٹ از امپا سیبل\_\_\_\_ میں واپس پلٹ جانا چاہتی ہوں۔ اب میں یادوں میں اضافہ نہیں کرنا

چاہتی۔ یہ یادیں بہت افیت دیتی ہیں۔\_\_\_\_“

اور اشمَل کتنے ہی سماعت سنائے کا شکار ہو کر رہ گیا۔ ہشمنہ کے آنسو، اس کے جملے اس کے لئے بے پناہ افیت کا باعث بن رہے تھے۔

”کیا تم مجھے کھل کر نہیں بتا سکتیں؟“ کئی لمحوں بعد اس کی شکستہ آواز ابھری اور ہشمنہ کے آنسو تواتر سے بہنے لگے۔

اُس نے روتے ہوئے اُسے سب کچھ بتا دیا۔ اور کتنے ہی لمحے دونوں کے درمیان جامد خاموشی چھا گئی۔ بس وقفہ وقفہ سے ہشمنہ کی سسکیاں ابھرتی رہیں۔ وہ کس کرب سے گزر رہی تھی، اشمَل کو اس کا پورا پورا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اس وقت تقسیم کے نادیدہ عمل سے گزر کر کس طرح بکھر رہی تھی، اس سے بڑھ کر اور کون جان سکتا تھا۔ مگر وہ اُسے کیا تسلی دیتا۔ اُسے کیسے جوڑتا کہ خود اس کے وجود کی کرچیاں ٹوٹ ٹوٹ کر دل کے اندر گر رہی تھیں اور دل کی دیواروں پر خون قطرہ قطرہ رسنے لگا تھا۔

اُس نے بے تحاشہ ضبط سے اپنے عنابی لب دانتوں میں جکڑ لئے۔

”میں نے تو ایسا کبھی سوچا تک نہ تھا اشمَل! میں نے تو ہمیشہ خوش آسند مستقبل ہی نگاہوں میں رکھا تھا۔ یہ اتنی کڑی سزا کیوں ملی ہے مجھے\_\_\_\_ یہ انسان محبت کی بازی ہار کر ہی کیوں انا اور حمیت کی جنگ جیتتا ہے\_\_\_\_ کسی کا اعتماد سنبھالنے کے لئے خود کو کتنی اذیتوں سے گزارنا پڑتا ہے۔ اور میں تو بیٹی ہوں اشمَل! جس کے سر پر ویسے بھی ماں باپ کی عزت کا بوجھ ہوتا ہے۔ ان کے جھکے ہوئے سر ہی والدین کے اُٹھتے سروں کی ضمانت ہیں\_\_\_\_ تم ہی بتاؤ اشمَل! میں اور کیا کرتی؟ کچھ بولو اشمَل!“

اشمَل نے ایک گہری سانس سینے سے کھینچ کر آزاد کی۔

”کیا بولوں\_\_\_\_ تم نے تو مجھ سے جینے کی اُمنگ ہی چھین لی\_\_\_\_ مجھے تاریک خلاؤں میں لا پھینکا ہے۔ مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دیتا\_\_\_\_ تم نے اپنا درد آنسوؤں میں بہا دیا۔ مگر مجھ جیسے مرد کو کیسی افیت دے دی۔ تا عمر تڑپنے کی سزا

سنادی۔

”نہیں اشمٰل\_\_\_ یہ کیا کہہ رہے ہو تم\_\_\_ میرے آنسو تو میرے درد کو اور بھی صیقل کرتے رہے ہیں۔ مجھے آکر دیکھو اشمٰل! کس طرح جی رہی ہوں۔ کیا یہ جینا ہوا؟ بولو اشمٰل! کیا یہ۔۔۔۔۔“ ہشمنہ کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی اور دوسری طرف اشمٰل نے رابطہ کاٹ دیا۔

اُس کے پاس ضبط کی دولت یلکھت ختم ہو گئی تھی۔ بظاہر مضبوط اور کڑیل نظر آنے والا اشمٰل خان اندر ہی اندر مٹی کے ڈھیر کی طرح بیٹھتا چلا گیا۔ اُس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور کال کی پے منٹ کاؤنٹر پر رکھ کر نڈھال قدموں سے گاڑی میں آبیٹھا۔

...☆☆☆...

شاہ خانم کی خواب گاہ میں گہرا سکوت تھا۔ ابھی ابھی مہر وز خان بے حد خاموشی اور کسی حد تک بے نیازی سے تیار ہو کر زمینوں پر چل دیئے تھے۔ انہوں نے کمرے میں موجود شاہ خانم پر ایک نگاہ غلط ڈالنا بھی گوارا نہ کی تھی بلکہ اس طرح ظاہر کیا تھا جیسے وہ ان کی موجودگی سے بے خبر ہیں۔ اور ان کے جانے کے بعد شاہ خانم خالی الذہنی کے ساتھ کھڑی رہ گئی تھیں۔ حالات نے یوں پلٹا کھایا تھا کہ وہ ششدر رہ گئی تھیں اور کچھ سوچنا چاہتی تھیں تو دل پر ہر بار ایک نیاز خم لگ جاتا تھا۔

”آہ\_\_\_“ ایک تیز سسکاری ان کے لبوں سے آزاد ہو گئی۔ مگر انہیں سوچنا تھا۔ وہ سوچنے پر مجبور تھیں۔ یہ حالات بھی ان کے لئے اذیت ناک تھے۔

مہر وز خان اپنے اندر کا زہر نکال چکے تھے۔

اشمٰل کو وہ حویلی سے نکال چکی تھیں۔

اشتار الگ کمرے میں بند تھی۔

بس ایک گل بی بی تھیں جو انہیں گاہے بگاہے تسلیاں دے جاتی تھیں۔ مگر ان تسلیوں سے ان کی کب تسلی ہوتی تھی۔ ان کے دل پر لگے زخم بہت گہرے تھے۔ وہ ساری رات آنکھوں میں کٹیتیں اور دن کمرے میں بند مضحل سوچوں میں گزر جاتا۔

”کیا کروں میں خدا یا؟“ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ ”یہ کیا کر دیا مہر وز خان! تم نے؟“

”مگر تم نے بھی آج تک کسے خوشی بخشی ہے شاہ خانم؟“ دل کے اندر سے آواز ابھری۔ ”اشتار اور اشمٰل کے لئے کب ماں جیسی شفیق ہستی بنی ہو؟“ ہمیشہ رعب و دبدبہ والی شاہ خانم\_\_\_ حویلی پر حکمرانی کرتی شاہ خانم کبھی دلوں پر راج نہ کر سکی۔“

”آہ\_\_\_“ ایک گہری اور زخمی کراہ ان کے لبوں سے آزاد ہو گئی۔ مہر وز خان کے لفظ ہتھوڑے کی طرح اب بھی ان کے اعصاب پر برس رہے تھے۔ کس قدر کڑوا تھا لہجہ اور کس حد تک سچ۔

”تم محض شاہ خانم بن کر اس حویلی پر حکومت کرتی رہی ہو\_\_\_ مگر کبھی ہمارے دلوں پر راج کرنے کی سعی نہیں کی۔ میرے دل میں جھانکو کہ تم یہاں موجود ہی نہیں ہو۔ تم صرف ان اونچی اونچی دیواروں تک قید ہو، میرے دل میں نہیں۔“

”شاہ بانو! ان اونچی اونچی دیواروں کو دیکھو جو تمہارے خوف سے سہمی ہوئی ہیں۔ خود تمہاری اولاد جن کے دلوں میں تمہارا احترام نہیں صرف خوف ہے۔ ایسا خوف جو محبت میں ڈھل نہیں سکتا۔“

شاہ خانم نے ایک جگر سوز کراہ کے ساتھ کر سی چھوڑ دی۔



”نہیں۔۔۔ نہیں مہروز خان!۔۔۔ یہ تم نے کیا کہہ دیا۔ میری اولاد۔۔۔ میری اولاد سے میرا محبت کا رشتہ نہیں ہے۔“ وہ پھر کرسی پر ڈھیر ہو گئیں جیسے ٹانگوں میں جان نہ رہی تھی۔ مہروز خان کے جملوں کی بازگشت ان کا دل نئے سرے سے چیرنے لگی۔

”قدم قدم پر تم یہ بات بھولتی رہی ہو کہ تمہارا یہ اٹھا ہوا سر میرے دم سے ہے۔۔۔ میں نے تمہیں کبھی توڑنا نہیں چاہا ورنہ تم نے اس حویلی کو قدم قدم پر ڈھانے کی سعی کی ہے۔ تمہارا فخر میں پہلے روز ہی توڑ سکتا تھا۔ اور کاش توڑ دیتا۔“

’ہاں مہروز خان۔۔۔ تم نے میرا فخر توڑ دیا۔۔۔ میرا غرور۔۔۔ مگر نہیں۔ تم نے مجھے میری اصلیت دکھائی ہے۔ ہاں مہروز خان! سچ ہے، تم نے میرے چہرے سے نقاب کھینچی ہے اور مجھے میری ہیبت ناک صورت دکھائی ہے۔ مجھے میری بد صورتی سے آگاہ کیا ہے۔۔۔ خدایا! میں واقعی ظالم ہوں۔ میں نے ظلم کیا ہے۔ صرف ان دیواروں پر حکمرانی کی ہے۔ کسی کے دل کو تسخیر کرنے کی کوشش نہیں کی۔‘

’تو پھر میں واقعی ایک ناکام اور ہاری ہوئی عورت ہوں۔ ہاں، میں ہاری ہوئی عورت ہوں۔‘ اُن کا سر چکرانے لگا۔ گلناز آپی! تم ٹھیک کہتی تھی۔‘

انہیں وہ اُداس، اُجاڑا اور زرد شام یاد آگئی جب گلناز آپی اپنے اندر کے زخموں کو چھپائے اُسے سمجھا رہی تھی۔

”شہا ہے! اس آگ کو باہر مت نکلنے دینا۔ اندر ہی بجھا دینا۔ کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس آگ سے صرف تمہارا اپنا ہی وجود خاکستر ہوگا۔۔۔“

’ہاں آپی! ٹھیک کہا تھا تم نے۔۔۔ میں اس آگ کو بجھانہ سکی اور اپنا آپ جلا دیا۔‘

وہ کرب سے مٹھیاں کر سی کے ہتھ پر برسائے لگیں۔ ان کی ذہنی حالت سخت گرفتہ ہو رہی تھی۔ انہیں خود اپنی اس

ذہنی حالت سے خوف آنے لگا۔

اک دم دروازہ آہستگی سے کھلا اور گل بی بی اندر داخل ہوئیں۔

”شہا ہے!“ انہوں نے دھیرے سے پکارا۔ ان کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا جسے انہوں نے تپائی پر رکھ دیا۔ ”تم نے ناشتہ بھی نہیں کیا اور کل بھی کچھ کھایا یا نہیں تھا۔“ گل بی بی کو ان کی حالت پر بے حد افسوس ہوتا تھا۔ لیکن وہ کیا کر سکتی تھیں۔ مہروز خان کے رویے نے انہیں بھی دکھی کیا تھا۔ مگر مہروز خان کی بھی اپنی مجبوری تھی۔ ورنہ انہوں نے کب شاہ خانم کے ساتھ ناروا سلوک اس سے پہلے روا رکھا تھا۔ کب ان کی غلطیوں پر باز پرس کی تھی۔ کب انہیں احساس دلایا تھا کہ وہ نا انصافی کی مرتکب ہو رہی ہیں۔ ہمیشہ شاہ خانم کو شہزادیوں جیسی آن بان سے رکھا تھا۔

”یہ دودھ پی لو۔۔۔ پہلے ہی ذہنی اذیت کم سہہ رہی ہو جو خود کو جسمانی اذیت بھی دے رہی ہو۔“ انہوں نے محبت سے ان کے شانے کو تھپکا اور دودھ کا گلاس ان کی طرف بڑھا دیا۔

”جینا تو ہے ہی گل! آج نہیں تو کل پرسوں کھاپی لوں گی۔“ انہوں نے دودھ کا گلاس دوبارہ تپائی پر رکھ دیا۔

”تم میرے پاس بیٹھو گل! میں خود کو بہت تنہا محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے مہروز خان نے احساس دلایا ہے۔ واقعی میں ایک نادان عورت ہوں جس نے محبتوں کی کبھی قدر نہ کی۔ ساری عمر خود ساختہ اور کڑے اصولوں پر قربان کر دی۔ سارے رشتوں کو نفرت کی بھٹی میں جھونک دیا اور پھر بھی خالی ہاتھ رہی۔“ وہ سسکا اٹھیں۔ ”دیکھو، کیا ہے میرے پاس۔۔۔ نہ شوہر کا فخر، نہ اولاد کی محبت۔ مجھ جیسی بد نصیب عورت اور کون ہوگی گل! مجھ جیسی شکست خوردہ اور ناکام عورت اور کون ہوگی؟“

شاہ خانم کے آنسو گل بی بی کے دل پر خار کی طرح چبھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کے فرش بھی گیلے ہو گئے تھے۔

”ایک بات کہوں شہا ہے!۔۔۔ مہروز لالہ نے یہ سب کچھ نفرت میں نہیں کیا۔ بس ایک غصہ تھا انہیں اس وقت



\_\_\_\_\_ انہوں نے یہ سب کچھ اپنے اندر زہر کی طرح بھر کر نہیں رکھا تھا۔ وہ اب بھی تم سے محبت کرتے ہیں۔ شاید تمہاری ضد کو توڑنے کے لئے انہوں نے یہ قدم اٹھایا ہے۔ یہ الفاظ محض تمہاری کوتاہیوں کا احساس دلانے کے لئے ان کے لبوں سے آزاد ہوئے ہیں۔ وگر نہ وہ اب بھی اپنے دل میں تمہارے لئے احترام اور محبت رکھتے ہیں۔“

”بہلا رہی ہو مجھے؟“ شاہ خانم کے لبوں پر عجب ناآسودہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”نہیں۔۔۔ یہ بہلاوے نہیں ہیں۔ میں مہر و زلالہ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ اور پھر سوچو، آج تک وہ چپ رہے تو تمہاری محبت کی وجہ سے ہی نا۔ ورنہ مرد ذات کب انا اور غیرت کے آگے کسی کی سنتا ہے۔ عورت ذات تو ان کے عتاب کا سب سے پہلے نشانہ بنتی ہے۔ اور یہ بھی سچ ہے شاید کہ مرد کی انا کو اتنا نہیں آزمائے، ان کی مردانگی پر کبھی ضرب نہیں لگائے۔ یہ عورت کے حق میں بڑی خطرناک بن جاتی ہے۔ اپنی کوتاہیوں کو تسلیم کر لینا ہی سب سے بڑی جیت ہے۔“ گل بی بی شاہ خانم کو سمجھا رہی تھیں، ہولے ہولے تھپک رہی تھیں اور شاہ خانم کو جیسے قرار آ رہا تھا۔ ان کے غم سے لبالب بھرے دل میں ٹھنڈک سی اتر رہی تھی۔

”ذولین نے آج تک کبھی نا انصافیوں کا شکوہ نہیں کیا۔ اس نے تو ہوش سنبھالتے ہی تمہیں اور مہر و زلالہ ہی کو دیکھا تھا۔ اس کے دل پر وہی رقم ہوتا جو تم اور مہر و زلالہ کرتے۔ مگر دیکھو، تمہارا کیا، اس نے کبھی اپنے دل پر نقش نہ ہونے دیا۔ اُس کے دل میں تمہارے لئے نفرت نہیں ہے۔ اور سچ ہے شاہ! اُسے تم سے نفرت کرنے کا حق ہے۔ تمہاری طرف سے کی گئی نا انصافیوں پر احتجاج کرنے کا حق ہے۔ مگر اس کا ظرف دیکھا، اُس نے پلٹ کر محض اس لئے تمہیں جواب نہیں دیا کہ وہ عورت ذات کا احترام کرتا ہے۔“

شاہ خانم نے چہرہ اٹھایا۔ گل بی بی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ وہ ذولین کی یا مہر و زخان کی حمایت نہیں کر رہی تھیں، شاہ خانم کو ان کی کوتاہیوں کا احساس دلا رہی تھیں۔

آہ۔۔۔۔۔ انہوں نے ہمیشہ ظلم کیا ہے۔ ذولین نے ان سے کیا چھینا ہے ان کا۔۔۔۔۔ اسے وہ کس بات کی سزا دیتی آئی ہیں؟

اُن کا چہرہ جھک گیا۔ آج ان کی آنکھوں سے نفرت کی سیاہ پیڑی اُتری تھی تو انہیں ہر جگہ اپنا ہی جرم نظر آ رہا تھا۔ ہر جگہ وہ خود قصور وار نظر آ رہی تھیں۔

وہ کھڑی ہو گئیں۔۔۔ اپنی نا انصافیوں اور ظلم پر اتنا بھر بھر کر رونا آ رہا تھا، خود سے انہیں کراہیت محسوس ہونے لگی۔ کاش۔۔۔ کاش وہ پہلے ہی سنبھل چکی ہوتیں۔ ان کے دامن میں اتنے جرم تو نہ ہوتے۔ ان کے شانوں پر اتنا بوجھ نہ دھرا ہوتا۔ کیسے چکائیں گی وہ حساب۔ کہاں سے ملے گا انہیں انصاف۔

گل بی بی اپنی جگہ سے اٹھیں۔

”مجھے معاف کر دینا شاہ! میں یہ سب کچھ صرف اس لئے کہہ رہی ہوں کہ یہ باتیں تمہارے۔۔۔۔۔“

”نہیں، نہیں گل!۔۔۔ تمہاری یہ باتیں میرے دکھ کو کم کر رہی ہیں۔ میری اذیت کا تریاق ہیں۔“ شاہ خانم نے بڑھ کر گل بی بی کے ہاتھ تھام لئے۔ ”مجھے بہت خوف آ رہا ہے اپنی اس بد صورتی سے۔ اپنا احتساب کرتے ہوئے بھی ڈر رہی ہوں۔ درحقیقت میں بلندی پر نہیں، بہت پستی میں گری ہوئی تھی۔“

گل بی بی نے چادر کے کنارے سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ ان کے چہرے پر ہلکی روشنی چمکی۔ انہوں نے بے اختیار شاہ خانم کو سینے سے لگا لیا اور پھر کتنی ہی دیر دونوں ہولے ہولے روتی رہیں۔ گل بی بی کی آنکھوں میں یہ آنسو خوشی کے تھے اور شاہ خانم اپنا سار اور دان آنسوؤں میں بہا کر ہلکی پھلکی ہو جانا چاہتی تھیں۔

شاہ خانم ان سے الگ ہوتے ہوئے بولیں۔ ”اشکارا کہاں ہے؟“

”کمرے میں ہے اپنے۔ اس لڑکی نے بھی حد کر دی بے وقوفی کی۔“ گل بی بی کو اس کی حماقت یاد آگئی۔

”کیا کیا ہے اُس نے؟“ شاہ خانم کا دل لرزا۔ کتنا تڑپ تڑپ کر روئی تھی وہ معصوم اور بے زبان لڑکی۔ انہیں یکدم ہی اشترا پر کئے گئے ستم یاد آگئے۔ پھول جیسی بچی کو انہوں نے کبھی اپنے سینے سے نہیں لگایا۔ کبھی ماں بن کر اس کی آنکھوں میں مچلتی خواہشیں نہیں پڑھیں۔ اس کے دل میں کیا ہے؟ کبھی جھانکنے کی سعی نہیں کی۔ انہیں اشمیل کا کہا ہوا جملہ یاد آگیا۔

”اگر آپ ماضی کی گلناز کو زندہ کرنا چاہتی ہیں اشترا کے روپ میں، اشترا کو گلناز خالہ کی طرح سسک سسک کر مار دینا چاہتی ہیں اور اسی میں آپ کا دلی سکون پنہاں ہے تو آپ اپنا سکون ضرور حاصل کیجئے۔“ وہ بے زبان لڑکی اسی لئے دنیا میں بھیجی گئی ہے کہ ہم جیسے اختیار رکھنے والے لوگ اسے محض اپنی ضد اور خواہش کی بھینٹ چڑھا دیں۔“

”نہیں۔۔۔ خدا نہ کرے۔۔۔ میری بچی۔“ شاہ خانم کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ وہ معصوم وجود کیسے دُکھ سے دوچار ہے۔ وہاں ہوتے ہوئے اُس کے لئے ڈھال نہ بن سکیں تو کیسی ماں۔ کہاں کا رتبہ۔۔۔ اس مقدس رشتے کی تو بین اس سے زیادہ اور کیا ہوگی۔ انہوں نے تڑپ کر گل بی بی کو دیکھا۔

”کیا کر دیا اُس نے؟“ ان کا دل انجانے خوف سے لرزنے لگا۔

”اُس نے مہر و زلالہ سے جا کر کہہ دیا کہ وہ ذولین سے ہر گز شادی نہیں کرے گی۔ اور اسے تمہارا فیصلہ قبول ہے۔“ گل بی بی نے کہا تو شاہ خانم کی آنکھوں میں دھند چھا گئی۔

”گل! یہ تو خوش نصیبی ہے میری کہ میرے ان رویوں کے باوجود میری اولاد میرا احترام کرتی رہی۔ کتنی ناشکری ہوں میں کہ ان ہیروں کی قدر نہ کی۔ میری اشترا تو بہت معصوم ہے۔ میرے جگر کا ٹکڑا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس کی خواہشوں کا احترام نہ کروں۔۔۔ پاگل ہے وہ لڑکی تو۔ اسے اب میں سمجھاؤں گی۔ ابھی اور اسی وقت۔“

شاہ خانم کے لہجے اور آنکھوں میں اشترا کے لئے محبت کا ایک سمندر اُٹ آیا تھا۔

انہوں نے گل بی بی کی طرف دیکھا تو گل بی بی مسکرا دیں۔ وہ بھی جواباً مسکرا دیں اور کمرے سے باہر نکل کر اشترا کے کمرے کی طرف بڑھیں۔

ان کی ممتا اشترا کے وجود سے سیراب ہونا چاہتی تھی۔ وہ اُسے اپنے سینے سے لگا کر بے تحاشا پیار کرنا چاہتی تھیں جو اس کا حق تھا۔

اشمیل خان نے عارضی طور پر فلیٹ کرائے پر لے رکھا تھا۔ اُس نے ہاسٹل چھوڑ دیا تھا اور وادی بھی اسی روز سے نہیں گیا تھا جس روز شاہ خانم سے اس کا تنازعہ ہوا تھا۔ اب وہ کرائے کے خوبصورت آراستہ فلیٹ میں رہائش پذیر تھا جس کا علم صرف احسن کو تھا اور وہ کئی بار اس کی اس حماقت کی وجہ جاننے کی کوشش کر چکا تھا۔ مگر سوائے اشمیل کی ڈانٹ کے اُسے کچھ حاصل نہ ہوا تھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اپنی زندگی میں اتنی گھٹن کہاں سے لے آئے ہو؟“ احسن نے جھنجھلا کر موٹی جلد والی کتاب اپنے سر پر ماری اور پھر کتنی ہی دیر تک دونوں ہاتھوں میں سر تھامے رہا۔ اُس کی اس حرکت پر اشمیل بے ساختہ مسکرا ہٹ کو نہ روک سکا۔

”اسی لئے تو کہتا ہوں اتنا تردد مت کرو بے کار لوگوں کے لئے۔“ اس نے آہستگی سے کتاب اس کے ہاتھ سے لے لی۔

”کیا کیا کہا۔۔۔ بے کار لوگ۔۔۔ مائی گاڈ، اشمیل! یہ تم اپنے لئے ایسے بے ہودہ القاب کب سے استعمال کرنے لگے ہو؟ یونین کا صدر، جامعہ پشاور کا ہیرو، ہشیمینہ ابرار جیسی لڑکی کے من مندر میں بسنے والا وادی کا خوبرو، دلیر اشمیل خان، بے کار کیسے ہو گیا؟“ احسن نے اُسے کھوجتی نظروں سے گھورا۔ پھر اچانک اچھلا۔ ”کیا ہشیمینہ ابرار کو

علم ہے تمہاری اس جائے پناہ کا؟“

اشمل نے رخ پھیر لیا۔ اُس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا اور جھک کر پیروں میں سیلپہ اڑائے اور بیڈ سے کھڑا ہو گیا۔

”میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔ یہ منہ پھیر کر کون سے تاثرات چھپانا چاہتے ہو مجھ سے؟“

”احسن! پلیز، لیو دس ٹاپک۔“ اشمل نے پلٹ کر اتنے برہم انداز میں کہا کہ احسن لمحہ بھر کے لئے سناٹے میں رہ گیا۔ پھر اس کی سنجیدگی کا احساس کر کے بیڈ سے کھڑا ہو گیا۔

”سوری۔۔۔ ویری سوری۔ میں نے پھر تمہاری پرائیویسی میں مداخلت شروع کر دی۔ حالانکہ مجھے اس کا بالکل حق نہیں ہے۔ سوری فور دیٹ۔“ وہ پلٹا اور اس کے فلیٹ سے باہر نکل گیا۔

اشمل نے اسے جاتے دیکھا پھر کرب سے لب دانتوں میں دبا کر کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ اُسے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ اُسے احسن کے ساتھ یہ سلوک نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اُس نے کفِ افسوس ملا۔ مگر یہ سب بھی از خود ہو رہا تھا۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے اس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں رہا ہو۔ کسی پر اس کا کنٹرول نہیں رہا۔

ذہن۔۔۔ دل۔۔۔ زبان

اُسے اپنی ذہنی حالت سے سخت الجھن ہونے لگی اور کسی حد تک خوف محسوس ہونے لگا۔ ہشمنہ ابرار نے اس کی زندگی میں اتنی تاریکیاں بھر دی تھیں کہ اسے کچھ سمجھائی نہ دے رہا تھا۔

”بزدل، بے وفا، کمزور۔ اونہ۔۔۔“ اُس نے ہشمنہ کا تصور کر کے غصے سے لب بھیج لئے۔

اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کو شوٹ کر دے۔ سارا چیمبر اس بزدل اور کم ہمت لڑکی پر خالی کر دے۔ کیا حق پہنچتا تھا اُسے اُس کی زندگی میں زہر گھولنے کا۔ اس کے ساتھ پھر کیوں اُس نے محبت کا یہ کھیل رچایا تھا۔ جب مشرق کی

بیٹی بن کر ایک دن اُسے اپنے باپ کی خواہشوں پر سر جھکا دینا تھا؟

کیوں اُس نے اُس کے جذبوں کی پذیرائی کی تھی؟

کیوں بھول گئی تھی وہ کہ اُسے مشرقی روایتوں کا بہر کیف پابند رہنا ہے؟

”آئی ول نیور فار گیو یو!“ اُس نے ہتھیلی پر مکا مارا۔

”مگر نہیں۔۔۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کوئی بد دعا بھی نہیں دے سکتا کہ تم اب بھی اسی طرح میرے دل میں براجمان ہو۔ بالکل اسی طرح جس طرح پہلے روز تھیں۔“

بے بسی کا شدید غلبہ اس پر حاوی ہو رہا تھا۔

زندگی کتنے دکھوں، غموں اور صعوبتوں سے گزرتی ہے۔۔۔ مگر کوئی غم، کوئی دکھ روگ بن جاتا ہے۔۔۔ ساری ہستی کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔ پھر کچھ نہیں بچتا۔۔۔ نہ جذبے۔۔۔ نہ اُمنگیں۔۔۔ نہ جینے کی خواہشیں۔

اُسے بھی تو کئی مسائل کا سامنا ہوا تھا۔ کئی دکھ تھے اس کے سامنے مگر اس بار تو جیسے سوچنے کی صلاحیتیں مفقود ہو گئی تھیں۔ دل کے اندر بس آگ دہک رہی تھی جو اس کا سارا وجود جھلسائے دے رہی تھی۔

اُس کے سامنے اشتار اکا دکھ تھا۔

اپنا دکھ تھا اور ہشمنہ ابرار کا دکھ تھا۔

وہ بھی تو اسی طرح تڑپ رہی ہوگی جس طرح وہ تڑپ رہا ہے؟۔۔۔ وہ کیسے سلطان کمال کے ساتھ اتنی لمبی زندگی

گزارے گی؟۔۔۔ یقیناً کوئی لمحہ بھی تو سکون کا نہیں پائے گی۔ آخر کو اُس کی محبت اتنی ناپائیدار تو نہ تھی۔ اُس کی ہستی یوں نظر انداز کر دینے والی تو نہ تھی۔



اشمل خان کی ذات اتنی غیر اہم اور بے وقعت نہ تھی کہ وہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے فراموش کر پائے گی۔

اُس نے اشارہ کی آنکھوں میں اُداسی کا اتنا دبیز رنگ دیکھا تھا اور یہ محسوس کیا تھا کہ عورت لاکھ مشرقی روایتوں کو قبول کر لے، ہزار والدین کی عزت کا بار اٹھا کر سر جھکا لے مگر اس کے اندر کی

تڑپ بہت شدید ہوتی ہے جو اسے اندر ہی اندر گھلا دیتی ہے۔ شاید کسی غم زدہ مرد سے زیادہ ہمدردی کے قابل اور رحم کے لائق ہوتی ہے۔ اسے دوہری سزا ملتی ہے۔ دوہرے عذاب سے گزرتی ہے۔ ایک محبت کو نہ پانے کا غم اور دوسرا ساری عمر دوسرے مرد کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی افیت۔

اُسے اس لمحے اشارہ اور ہشمنیہ کا درد مشترک لگ رہا تھا۔

مکاش عورت اتنی کم ہمت نہ ہوتی، اُس نے جلتی آنکھیں موند لیں۔ مگر نہیں۔ عورت کو بزدل اسی معاشرے نے بنایا ہے۔ خود اس کے والدین کی جھوٹی آن اور انانے۔ ان روایتوں نے جو صرف عورت کے خون سے ہی پلتی ہیں۔

اشارہ۔ ہشمنیہ

دونام، یہ دو ہستیاں شاید قربان گاہ پر چڑھ گئی ہیں۔ آہ۔ اب تک تو وہ سب کچھ ہو گیا ہو گا۔ والدین کی جھوٹی اناب تک تسکین پا چکی ہو گی۔

آہ۔ شاہ خانم۔ جس نے اشارہ کو اپنی آرزوؤں کی بھینٹ چڑھا دیا ہو گا اور اپنا دلی سکون حاصل کر چکی ہوں گی۔

اُس کی سوچوں کا رخ یکلخت اشارہ کی طرف ہو گیا۔ بے اختیار اور بے بس اشارہ امہر وز جو تا عمر خوفزدہ نظروں سے

اپنے اطراف پھیلے جال کو تنکتی رہی اور حکم کی تعمیل کرتی رہی۔

وہ کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ پھر درتچے کا پٹ کھول کر بے مقصد باہر جھانکنے لگا۔ اُسے بے ساختہ سگریٹ کی طلب ہوئی تو دراز کی طرف آیا۔ تبھی خاصی زور سے کال بیل بجی تھی۔

وہ چونکا۔ کون ہو سکتا تھا؟ سوائے احسن کے کسے علم تھا اس کے فلیٹ کا؟ اُس نے خاصی حیرانگی کے ساتھ سوچا۔

کال بیل پر جس نے بھی انگلی رکھی تھی وہ ہٹانا بھول گیا تھا۔ وہ تیزی سے کمرے سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھا کہ اچانک اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ دروازہ احسن کھلا ہی چھوڑ گیا تھا اور آنے والے یونہی رسما کال بیل بجا کر اندر آچکے تھے۔ سب سے آگے شاہ خانم تھیں، اُن کے پیچھے زمان بھائی، پھر سحر گل اور اشارہ۔ گویا جلوس سا تیار ہو کر آیا تھا۔

اشمل خان اپنی جگہ ششدر تھا۔ اُسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا تھا۔ تب شاہ خانم نے آگے بڑھ کر اُسے گلے لگانے کے لئے اپنے بازو کھول دیئے۔

☆☆☆☆...

اشمل سے فون پر بات کرنے کے بعد ہشمنیہ کی ذہنی حالت پھر خراب ہونے لگی تھی۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اُس نے تو اپنی عزت اور انا کو سر بلند رکھنے کے لئے بڑے ضبط کے ساتھ سلطان کمال کے حق میں فیصلہ دیا تھا مگر اب۔۔۔ اشمل خان کی آواز سن کر اس کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی۔ اُس کا ضبط محض پانی کا بلبلہ ثابت ہوا تھا۔

وہ کمرہ بند کر کے اس قدر ٹوٹ کر روئی کہ جیسے اس کے بعد اب کبھی نہ رو سکے گی۔ ہاں اب اس کو اپنے آنسو بھی



چھپانے ہوں گے۔۔۔ ان پر بھی اختیار نہ رہے گا۔

اُسے منافقت کا لبادہ اوڑھ کر سلطان کمال کے سنگ اتنی لمبی زندگی گزارنی ہوگی۔

دوہرا عذاب۔۔۔ دوہرا جرم۔

”خدا یا! یہ سب میرے حصے میں ہی کیوں؟“

کب سوچا تھا، اشمل خان کو چاہنے کا اتنا خوفناک انجام ہوگا۔۔۔ زندگی موت سے بدتر نظر آنے لگے گی۔ آہ۔۔۔ اُس نے نہ صرف خود کو بلکہ اشمل کو بھی تباہ کر دیا۔ وہ شخص اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ وہ اس کی روح کی قاتل جو تھی۔۔۔ اشمل خان کے کہے ہوئے جملے اس کا دل چیرے دے رہے تھے۔

”تم نے مجھ سے جینے کی اُمنگ ہی چھین لی۔۔۔ مجھے تاریک خلاؤں میں لا پھینکا ہے جہاں مجھے کچھ سچائی نہیں دیتا۔ آہ۔۔۔ تم نے اپنا درد تو آنسوؤں میں بہا دیا۔ مگر مجھ جیسے مرد کو ذہنی افیت بخش دی۔ تا عمر تڑپنے کی سزا سنا دی۔“

آہ۔۔۔ اُس کی سسکیاں شدید ہو گئیں۔ ”مجھے معاف کر دینا اشمل۔۔۔ میں شاید تمہارے قابل نہیں تھی۔۔۔ کمزور، بزدل، ہر لمحہ اپنی انا کی حفاظت کرنے والی کم ہمت لڑکی تمہارے قابل نہیں تھی۔ مگر اشمل خان! یہ بھی سچ ہے کہ میرے ضمیر پر کوئی ایسا بوجھ نہیں رہے گا جس کا بچھتاؤ مجھے تا عمر ڈستار ہے گا۔۔۔ میں نے والدین کی عزت کا بھرم قائم رکھا ہے اور مجھے ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔۔۔ اُن کی محبتوں کا احترام مجھ پر واجب تھا۔۔۔ ہاں اشمل مہروز خان!۔۔۔ میری پلکیں بے شک بھیگی ہوئی ہیں مگر میرا سراٹھا ہوا ہے۔ میں نے اپنے ناتواں کندھوں پر ان کی عزت کا بار اٹھالیا ہے۔

اس نے تھک کر صوفے کی پشت پر سر ٹکا کر جلتی آنکھیں موند لیں۔۔۔

تبھی دروازہ کھلا اور بھابی اندر داخل ہوئیں۔

”ہشتمینہ! کیا سو گئی ہو؟“

”آں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ نہیں۔“ اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

”گل ممانی آئی ہیں۔“

”گل ممانی؟“ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ جھٹکے سے صوفے سے کھڑی ہو گئی۔

”حلیہ تو درست کر لو۔“ بھابی اُسے دروازے سے نکلتے دیکھ کر بولیں مگر وہ سنی ان سنی کرتی باہر نکل گئی۔

گل بی بی سٹنگ روم میں ہی تھیں۔ ہشتمینہ کو دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھیں تو ہشتمینہ قریب آکر ان سے لپٹ گئی اور با آواز آنسو بہانے لگی۔ گل بی بی کے شانے پر اس کے گرم گرم آنسو گرے تو وہ چونک گئیں۔

”ارے ہشتمینہ۔۔۔ میری جان!“ انہوں نے اس کا چہرہ اٹھا کر چوم لیا۔ ”رور ہی ہو۔۔۔ کیوں؟“ انہوں نے اُسے محبت پاش نظروں سے دیکھا تو وہ کوئی جواب نہ دے پائی۔

”آپ اکیلی آگئیں؟ شائدانہ اور ماموں کیوں نہیں آئے؟“ بھابی نے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ میں تو شاہ خانم اور اشتارا کے ہمراہ آئی ہوں۔ آٹو بیٹھو میرے پاس۔“ انہوں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ہشتمینہ کو بھی اپنے قریب بٹھالیا۔ ”بالکل اچانک پروگرام بناتھا۔“

”اشتارا بھی آئی ہے تو ساتھ کیوں نہیں لائیں اُسے؟“ ہشتمینہ اشتارا کا سن کر اس سے ملنے کو بے قرار ہو گئی۔

”شاہے تو اپنے بھائی کے ہاں ٹھہری ہے۔ اشتارا بھی وہی ہیں۔ ہم سب اشمل کے لئے آئے تھے۔ وہ خفا ہو کر حویلی سے چلا آیا ہے۔ یہ لڑکا بڑا ضدی ہے۔“

اشمل کے ذکر پر ہشمنہ کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ ”مگر کیوں ناراض ہو کر آیا ہے؟“ اُس نے سوچا۔ مگر گل بی بی سے پوچھنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ ایک تو سامنے شناس بھائی بیٹھے تھے۔ اور اب وہ اپنی زبان پر اشمل کا نام بھی لانا چاہتی تھی۔ دل و ذہن پر تو اس کا اختیار نہ تھا۔

”اشٹار اور ذولین کے نکاح کی بھی تیاریاں ادھوری پڑی ہیں۔ اب تو سب کچھ اشمل ہی کرے گا۔“ گل بی بی نے امی کو نئی اطلاع فراہم کی۔

”ارے \_\_\_ اشٹار اور ذولین کا نکاح کب ہے؟“ اتنی رازداری سے؟“ ہشمنہ کو خوشگوار حیرت ہوئی۔

”ہاں \_\_\_ خدا خدا کر کے شاہے کی بھی ضد ٹوٹی۔ ویسے بھی کوئی حتمی تاریخ نہیں رکھی۔ بس اشمل آجائے گا تو کوئی دن بھی رکھ لیں گے۔ رخصتی تو اشمل کے امتحانوں کے بعد ہوگی۔ اشٹار ابھی بائولی نے شور مچا رکھا ہے کہ پہلے اشمل کی دُہن حویلی میں آئے گی، پھر وہ رخصت ہوگی۔ تم سب کو آنا ضرور ہے۔ اور ہاں، میں تو ایک بہت ضروری کام سے آئی ہوں۔“ گل بی بی یہ کہہ کر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگیں اور ہشمنہ کو محبت پاش نظروں سے تکتے لگیں۔

”ایسا کون سا ضروری کام ہے \_\_\_ کچھ خبر ہمیں بھی تو ہو۔“ شناس بھائی پہلی بار بولے۔

”ہے \_\_\_ تبھی تو کہہ رہی ہوں۔“ گل بی بی مسکرائیں۔ ”ارے تم کہاں چل دیں؟“ انہوں نے ہشمنہ کو اٹھتے دیکھ کر پکارا۔

”میں آپ کے لئے کافی بنالائوں۔“

”تم بیٹھو۔ مجھے ابھی کافی دانی نہیں پینی۔“ گل بی بی نے اُسے روکنا چاہا مگر وہ نہ رکی۔ کیونکہ امی سلطان کمال کے رشتے کا ذکر گل بی بی کے سامنے چھیڑ چکی تھیں۔

کچھ دیر بعد وہ کافی اور دوسرے لوازمات سے ٹرے سجائے اندر داخل ہوئی تو شناس بھائی کمرے سے جا چکے تھے اور گل بی بی اور امی ایک دوسرے کے بے حد قریب بیٹھیں نہ جانے کون سے اہم مسئلے حل کر رہی تھیں۔ گل بی بی بے حد سرگوشیانہ انداز میں بول رہی تھیں۔

”دیکھو \_\_\_ کوئی فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کر بیٹھنا۔ لڑکی ذات کے لئے شادی کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔“

”ہاں \_\_\_ شناس تو کہہ رہا تھا کہ ابھی دو ہفتے اور ٹھہر لیتے ہیں اس بات کو۔ وہ بھی کہہ رہا تھا جلدی نہ کریں۔“

ہشمنہ نے چونک کر امی کی طرف دیکھا تھا۔ ”یہ شناس بھائی اس کے اتنے ہمدرد کب سے بن گئے؟ حالانکہ یہ تو سلطان کمال کے سب سے زیادہ حمایتی تھے۔ خیر یہ دو ہفتے۔ اونہم، میرے لئے کون سی یہ نئی خوشیاں لائیں گے۔“ اس نے سر جھٹک دیا اور کافی بنانے لگی۔

”پھر میری بات ابراہ بھائی کے کان میں ڈال دینا۔“ گل بی بی امی کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر تاکیداً بولیں تو امی نے سر ہلا دیا۔

”ارے \_\_\_ یہ تم اتنی مرجھا کیوں گئی ہو؟ صورت دیکھی ہے، پیلی سرسوں ہو رہی ہے۔“ اُس نے گل بی بی کو کافی کا مگ بنا کر دیا تو گل بی بی نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اس کا بھرپور جائزہ لیا اور پھر پُر تشویش لہجے میں بولیں تو وہ مسکرا دی۔

”ارے اس لڑکی نے تو سب کو پریشان کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔ سارا سارا دن کمرے میں بند پڑی رہتی ہے۔ نہ کہیں آنا، نہ جاننا۔ دو گھڑی میرے پاس بھی نہیں بیٹھتی اب تو۔“ امی نے اس کی شکایات کے دفتر کھول دیئے۔

”ادھر بیٹھو میرے پاس“ گل بی بی نے اپنے قریب اس کے لئے جگہ بنائی۔ ”میرے ساتھ وادی چلنا۔ شان بھی آنے والی ہے \_\_\_ تمہارا دل بہل جائے گا۔ اور پھر اشٹار کے نکاح کا ہنگامہ بھی ہوگا۔ بس خیر سے یہ اشمل کا معاملہ

بھی نمٹ جائے۔“ انہوں نے محبت آمیز نظروں سے ہشمنہ کو دیکھا اور پھر امی کی طرف قدرے جھکیں۔

”میں زیادہ دن نہ لوں گی ہاں۔ سُن لو آپا!“

امی ہنس دیں۔ ”ارے بھابی! آپ تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے چلی ہیں۔“

”ہاں۔۔۔ بس یہی سمجھ لو۔“ گل بی بی ہنس دیں۔ پھر اچانک چونکیں۔ ”ارے ہاں، میں ذرا فون کر لوں شاہے کو۔۔۔ نہ جانے ان کی اشمیل سے بات ہوئی کہ نہیں۔ یہ لڑکا بھی جانے کب سدھرے گا۔ سب کو پریشان کر کے رکھ چھوڑا ہے۔ اب تو نکیل ڈال کر ہی رہوں گی میں۔“ وہ بولتے ہوئے فون کی طرف بڑھ گئیں۔ ہشمنہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ اشمیل کے ذکر سے اس کے دل کی دیواروں سے لہور سنے لگتا تھا۔ یہ نام، یہ چہرہ جس کا تصور، جس کا ذکر اب اس کے لئے سوائے اذیت کے کچھ نہ رہا تھا۔

وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

...☆☆☆...

اشمیل نے بڑی حیرانگی کے ساتھ ان سب کو اندر آتے دیکھا تھا۔ شاہ خانم آگے بڑھیں اور اُسے بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ احتراماً جھکا تو اُس کی پیشانی چوم لی۔

”ایسی بھی کیا ناراضگی بیٹے! کہ پلٹ کر پوچھا ہی نہیں۔۔۔ ہم سب کو پریشان کر کے رکھ دیا۔“

”آ۔۔۔۔۔ آپ لوگ۔۔۔۔۔ یہاں۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔“ وہ ابھی تک الجھا ہوا تھا کہ ان سب کو اس فلیٹ کا پتہ کس نے بتایا؟

تبھی دروازہ کھول کر احسن اندر داخل ہوا اور جیسے اشمیل کی ساری الجھن اور حیرانگی رفع ہو گئی۔ اُس نے ایک گہری سانس کھینچی اور خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

”یار! ایک بار پھر معافی۔“ احسن نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”میں ہاسٹل افتخار کی طرف جا رہا تھا کہ زمان بھائی مجھے نظر آئے۔ خاصے پریشان تھے۔ سو میں نے تمہاری اس جائے پناہ کا راز افشا کر دیا۔ سوری، مجبوری تھی۔ میں تمہاری والدہ کو پریشان نہیں دیکھ سکتا تھا۔“ اس نے تفصیل بتا کر مسکین سی صورت بنائی اور اشمیل اسے صرف دیکھ کر رہ گیا۔

”کیا ہمیں اندر بیٹھنے کو نہیں کہیں گے اشمیل لالہ؟“ اشارہ پہلی بار گویا ہوئی تو وہ چونکا۔

”اوہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔ آؤ، اندر آؤ۔۔۔ کیسی ہو تم؟“ اس نے قریب آتی اشارہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر سب کو لے کر اپنے بیڈ روم میں ہی آگیا۔

شاہ خانم نے کمرے کا طائرانہ جائزہ لیا اور پھر اشمیل کو دیکھنے لگیں۔ سلوٹ زدہ سفید شلوار قمیض، بکھرے بال اور چہرے پر بڑھی ہوئی شیو اُس کی ذہنی پراگندگی کا پتہ دے رہی تھی۔ اُس کی بھوری آنکھوں میں گہری اُداسی منجمد تھی۔ اُس کی اس حالت نے شاہ خانم کو دکھی کر دیا۔ انہوں نے اس کے ساتھ سلوک بھی بہت ناروا کیا تھا۔ اب اس کا ازالہ کریں گی۔ انہوں نے سوچا۔

اشارہ، اشمیل کے قریب بیٹھ گئی۔ احسن ان سب کو چھوڑ کر فلیٹ سے جا چکا تھا۔

”تم نے ہاسٹل چھوڑ دیا اور فلیٹ لے لیا۔۔۔ مجھے خبر تو دی ہوتی۔“ شاہ خانم نے ہلکا سا شکوہ کیا، پھر بولیں۔ ”خیر کتنے دن سے ہو یہاں؟“

”چند دن ہی ہوئے ہیں۔“ اس نے ہنوز سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

”کوکنگ آپ خود کرتے ہیں اشمیل بھائی؟“ سحر گل نے کچن کا جائزہ لے کر اندر آتے ہوئے شگفتہ انداز میں استفسار کیا تھا۔ اشتراہنس دی۔

”یہ کیا کریں گے۔۔۔ انہیں تو چائے بھی بنانی نہیں آتی۔ شاید یہ بھی نہیں معلوم کہ چائے میں دودھ کتنا ملا یا جاتا ہے۔“

اشمیل نے چونک کر اور بڑی حیرت سے اشتراہ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اُسے جس حال میں چھوڑ گیا تھا وہ ایسی تو ہر گز نہ تھی۔ بے حد کھلکھلاتی ہوئی، مسکراتی، سنہری آنکھوں کی ساری توانائیاں جاگ اُٹھی تھیں۔

”تو کیا سمجھوتہ انسان کو مطمئن کر دیتا ہے؟“ اُس نے بے حد تحیر کے ساتھ سوچا تھا۔

”پھر تو کوئی ملازمہ رکھی ہوگی۔۔۔ کوئی شہری، ماڈرن سی۔“ سحر گل کی بات پر سب مسکرا دیئے۔

”ارے، کیوں تنگ کر رہی ہو میرے بچے کو؟“ شاہ خانم بولیں۔ ”تم لوگ جائو، ذرا دوسرے کمرے میں بیٹھو۔ مجھے اشمیل سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“ انہوں نے سحر گل اور اشتراہ سے کہا تو وہ دونوں باہر نکل گئیں۔

”ارے زمان! تم بیٹھے رہو۔۔۔ میں تو ان لڑکیوں سے کہہ رہی تھی۔“ شاہ خانم، زمان بھائی کو اٹھتے دیکھ کر جلدی سے بولیں۔

”نہیں آنٹی! میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔۔۔ ایک آدھ گھنٹے بعد آپ لوگوں کو لے جائوں گا۔ بھی اشمیل! تم بھی تیار رہنا یہاں سے کوچ کرنے کے لئے۔“ انہوں نے اشمیل کو چھیڑا تو وہ مسکرا دیا۔

زمان کے جانے کے بعد شاہ خانم اٹھ کر اشمیل کے قریب آئیں جو اپنی جگہ سے اٹھ کر درتچے میں کھڑا ہو گیا تھا۔

”مجھے معاف نہیں کرو گے اشمیل۔۔۔؟“ شاہ خانم کی آواز میں نرمی گھل گئی۔

”ارے آپ شرمندہ کر رہی ہیں مجھے۔“ اس نے درتچے کلپٹ بند کر دیا۔ اس کے چہرے پر استعجاب سمٹ آیا تھا۔ شاہ خانم کے لہجے پہ وہ چونک پڑا تھا۔

”یہ تم نے کیا حالت بنا ڈالی ہے اشمیل۔۔۔ بے وقوف لڑکے! وادی اگر معلوم تو کر جاتے کہ حویلی میں انقلاب آچکا ہے۔ تمہاری ماں شاہ خانم کتنی بدل گئی ہے اور اس تبدیلی پر کوئی دکھ نہیں ہے۔ بلکہ ایک انوکھی خوشی ملی ہے مجھے۔۔۔ جانتے ہو یہ تبدیلی تم اور مہروز خان لے کر آئے ہو۔“ انہوں نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔ ”بیٹھو یہاں۔“

وہ کسی فرمانبردار بچے کی طرح ان کے سامنے ٹک گیا اور تحیر آمیز بے یقینی سے شاہ خانم کو تکتا رہا۔

”اشتراہ کا رشتہ ذولین سے طے ہو گیا ہے۔ بس تمہارے حویلی میں آنے پر نکاح ہو جائے گا اور پھر دھوم دھام سے رخصتی۔“

وہ اپنا پروگرام بھی ساتھ بنا رہی تھیں اور اشمیل پر جیسے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ یہ خوشگوار انقلاب آچکا تھا جس کا وہ منتظر تھا، خواہاں تھا۔

شاہ خانم کے انداز میں تبدیلی۔۔۔ اشتراہ کی مسکراہٹیں۔۔۔ یہ سب اس کا وہم نہ تھا، حقیقت تھی۔

منظر بدل گیا تھا۔۔۔ محبتوں نے بالآخر نفرتوں کو شکست دے دی تھی۔۔۔ حویلی میں حیرت انگیز طور پر انقلاب آچکا تھا۔

”اوہ میرے خدا۔۔۔“ اُس کے دل میں مسرت انگیز طراوت سرایت کرنے لگی۔ اس کے چہرے پر چمک لہرا گئی۔ وہ فوراً مسرت سے کھڑا ہو گیا تو شاہ خانم نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور بے آواز رونے لگیں۔



”مجھ سے بہت بڑے بڑے جرم ہوئے ہیں اشمٰل! میں مہر وز خان کی، تم سب کی مجرم ہوں۔ گناہگار ہوں۔ بیٹا! مجھے معاف کر دینا۔“

”نہیں شاہ خانم! ہم نے کبھی آپ کو مجرم نہیں گردانا۔ آپ سے کبھی نفرت نہیں کی۔ ہاں، کبھی کبھار شکوہ لبوں سے نکل جاتا ہے مگر۔“ اُس نے شاہ خانم کے آنسو لپنی انگلیوں سے پونچھے تو وہ مسکرا دیں۔

”تم میرے ساتھ حویلی چلو گے نا؟“

”ارے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ اشمٰل کی خوشی میری خوشی ہے۔ اشمٰل! اشمٰل! اشمٰل“ اشمٰل نے اُسے آواز دی تو وہ اندر آگئی۔

اُس کے گلابی چہرے پر شرم کی سرخی بکھر گئی تھی۔ اس نے شاہ خانم کی باتیں سن لی تھیں اور اشمٰل کے آواز دینے پر اُسے ڈھیروں شرم محسوس ہونے لگی تھی۔ سرمئی چادر کے ہالے میں دمکتا اشمٰل کا معصوم چہرہ اشمٰل کو بے حد پیرا لگا۔

”اتنی بڑی خبر مجھ سے چھپا گئیں تم۔ تمہیں تو اتنے ہی یہ خبر سنانی چاہئے تھی۔“ اس نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”ارے، ارے اشمٰل بھائی! اپنی بہن کو اتنا بے شرم کب سے سمجھ لیا؟ آخر مشرقی لڑکیوں کی کچھ حیا ہوتی ہے۔“ سحر پٹ سے بولی تو اشمٰل بھرپور انداز میں ہنس دیا۔

”خوب۔ میں تو بھول ہی گیا کہ تم بلی بھی آئی ہو۔“

”کیا۔ کیا۔ یعنی ابھی تک آپ خالی الذہنی میں سب کو تک رہے تھے؟ چلیں معاف کیا۔ بندہ کچھ اپ سیٹ تھا۔ اب چلیے شاہ خانم! ہمارے غریب خانے پر۔ تاکہ ہم لوگ کچھ خاطر مدارات کر کے ثواب کما سکیں۔“

شاہ خانم ہنسنے لگیں۔

”ہاں، ہاں۔ کیوں نہیں چلیں گے۔ زمان کو تو آلینے دو۔“

”ہاں۔ آپ لوگ بیٹھے، میں کوک وغیرہ منگواتا ہوں۔“ اشمٰل کو جیسے یکدم احساس ہوا۔ وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

فلیٹ کے کچن میں تو سوائے چند خالی برتنوں کے کچھ نہ تھا۔ اس نے ابھی تک چولہا تک نہیں جلایا تھا۔ ہوٹل سے ہی کھانا کھاتا تھا۔

فلیٹ کے چوکیدار سے کولڈ ڈرنک منگوا کر وہ واپس آگیا۔

”مجھے تو آپ کی خاطر مدارت کرنی چاہئے تھی۔ سوری، میں بھول ہی گیا۔“ وہ کچھ پزل سا ہو گیا تھا۔

”چلیں، اب کی بار تو معاف کیا۔ ویسے ہم آپ سے عنقریب شاندار ٹریٹ لیں گے۔ کیوں اشمٰل؟“ سحر گل اشمٰل کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائی تو اشمٰل نے سر ہلادیا۔

”بالکل۔ میں تو دونوں طرف سے لوں گی۔“

”ہیں۔ یہ دوسری طرف سے کیوں؟“ سحر گل نے آنکھیں پھاڑیں۔

”بھئی وہ میری فرینڈ جو ہوئی۔“ اشمٰل آہستگی سے بولی اور پھر ہنس دی۔ ان دونوں کی معنی خیز گفتگو اشمٰل کے پلے خاک نہ پڑی۔ اس نے شاہ خانم کی طرف دیکھا جو ان کی باتوں پر ہولے ہولے مسکرا رہی تھیں۔

”گل بھی آئی ہوئی ہے۔“ شاہ خانم نے اطلاع دی۔

”ارے۔ تو پھر یہاں آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئیں؟“ وہ خوش ہوا اور حیران بھی۔

”وہ اپنی نند کے ہاں ٹھہری ہے۔“

”یعنی ہشمنہ کے گھر۔۔۔“ اشارہ شوخی سے بولی تو شامل کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں دُھند سی چھائی مگر اس نے بروقت خود کو سنبھالا۔ دُور بیل کی

آواز پر وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کوئلہ ڈرنک کی بوتلیں اور کئی لفافے تھے جنہیں اُس نے ٹیبل پر رکھ دیا۔

”ارے۔۔۔ ان سب چیزوں کی کیا ضرورت تھی؟“

”ضرورت تھی نہیں شاہ خانم! مگر میری خوشی سمجھ لیں اسے۔“ وہ مسکرا دیا۔

وہ سب خاصی دیر تک خوشگوار ماحول میں باتیں کرتے رہے اور جب زمان خان آئے تو وہ ان کے ہمراہ فیصل ماموں کے گھر چل دیئے۔

...☆☆☆...

عرشان اس سلسلے میں خاصا خوش بخت ثابت ہوا کہ سحر گل کی فیملی کے خاص ممبر مسعود شاہ سے اس کے دیرینہ تعلقات تھے۔ اُسے تو نائلہ کے ذریعے پتہ چلا کہ جب وہ لوگ اس کا پروپوزل لے کر گئے تھے تو وہ مسعود شاہ کو دیکھ کر چونکی۔ اس نے عرشان کے البم میں اس کی تصویر دیکھی تھی اور ایک دوبارہ اسے عرشان کے ہمراہ اپنے گھر آتے ہوئے بھی دیکھ چکی تھی۔ اور اسے جب باتوں میں پتہ چلا کہ مسعود شاہ، سحر گل کے بہنوئی ہیں تو اس نے فوراً ہی یہ تازہ انکشاف عرشان سے کیا تھا اور عرشان کو جیسے اپنی منزل مقصود کا راستہ صاف نظر آنے لگا تھا۔

مسعود شاہ اُسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا کیریئر بہت صاف تھا اور اچھے مہذب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ یقیناً

مسعود شاہ اس کی حمایت کرے گا۔ اسے یہ یقین تھا۔

سحر گل کو پانے کا خواب اس نے دیکھا تھا۔۔۔ اور اب اس کے جذبوں میں شدت آگئی تھی۔

ڈری سہمی لیکن قدرے پُر اعتماد اور شوخ سی نظر آنے والی سحر گل اُسے بے طرح پسند آگئی تھی۔ فضلہ سے اُس نے اُس کے بارے میں زیادہ کرید نہیں کی تھی کہ اسے اچھا نہیں لگتا تھا، پرانی لڑکی کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنا۔ اُس نے توسیدھے سادھے مہذب طریقے سے امی اور نائلہ کو اس کے گھر بھیج دیا تھا بے حد امیدوں کے ہمراہ۔ اور اُس کا یقین سچ ثابت ہوا، مسعود شاہ اس کا پکا حمایتی بن گیا تھا۔

”آئی! میں عرشان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔۔۔ وہ ہر لحاظ سے مکمل اور قابل انسان ہے۔“

امی الجھ سی گئی تھیں۔ اور یہ تو اچھا ہوا تھا کہ شاہ خانم یہیں تھیں۔ وہ ان سے صلاح مشورہ کرنا چاہ رہی تھیں۔

سحر گل کی تو حالت بری تھی۔ اس کے تو گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ شخص جس سے وہ نادانستگی میں ٹکرا گئی تھی اس کو حاصل کرنے کے درپے ہو جائے گا۔ اُس کے ذہن کے افق پر رنگین سی دھند چھانے لگی تھی۔ اس کا سراپا نہ جانے کیوں اس کے حافظے میں محفوظ رہ گیا تھا۔

”مجھے تو لگتا ہے کچھ چکر ضرور ہے۔“ اشارہ انے اسے اکیلے اکیلے مسکراتے دیکھ کر کہا تو وہ گھبرا گئی۔

”ہائے، نہیں اشارہ! میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں ہے۔“

”جھوٹ۔۔۔ بالکل جھوٹ۔ بھابی کہہ رہی تھیں کہ فضلہ کی شادی میں رات اسی کی گاڑی میں تم لوگ واپس آئی تھیں۔“ اس نے اسے کھوجتی نظروں سے گھورا تو سحر گل کی پلکوں پر منوں بوجھ آگرا اور پھر اس سے کچھ نہ بولا گیا۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر اشارہ کھل کھلا کر ہنس دی۔

سے سحر کی طرف دیکھا جو خود اسی الجھن میں گرفتار ہو گئی تھی۔

”میرے خیال میں ہم اس سے بات کر لیتے ہیں۔“ سحر گل کے ذہن میں آیا تو وہ تیزی سے فون کی طرف لپکی مگر پھر رک گئی۔

”ہاں۔۔۔ میری ڈائری میں ہے۔“ اشتار نے سر ہلایا اور جلدی سے بیگ سے ڈائری نکال کر ہشتمینہ کا نمبر نکال کر سحر کو دے دیا۔ اور سحر گل کی انگلیاں تیزی سے ہشتمینہ کا نمبر ڈائل کرنے لگیں۔

ہشتمینہ نے بے حد حیرانگی کے ساتھ گل بی بی کے ہمراہ شاہ خانم اور ماہ گل کو آتے دیکھا تھا۔ شاہ خانم اس سے بڑی محبت سے ملیں۔ اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ ماہ گل بھی اس سے محبت سے ملی۔ اس کی نگاہوں میں پسندیدگی کی جھلک تھی۔ ہشتمینہ سخت منتشر ذہن ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔

ایک سسکاری اس کے لبوں سے آزاد ہو گئی۔ پھر شوریدہ سر لہریں مچل مچل کر ساحل دل پر سر پٹخنے لگیں۔ اس کی رگوں میں دُکھ گردش کرنے لگا۔

اس نے زخمی ذہن سے سوچا اور پھر ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ وہ فون کی طرف بڑھی۔ وہ اشترا سے بات کرنا

”ہیلو\_\_\_ میں ہشتمینہ بول رہی ہوں۔ اشترا سے بات کرنی ہے۔“ اس کی آواز برقی تاروں سے گزرتی اشمٰل کی سماعت پر بر چھی کی طرح لگی۔ ایک لمحہ کو اس کا دل چاہا وہ خاموشی سے بس اس کی آواز سنتا رہے۔ کتنی تکلیف دے رہی تھی یہ آواز۔ مگر پھر بھی دل کی تمنا یہی تھی کہ سنتا رہے۔

”ہیلو۔۔۔۔۔“ اُس نے قدرے توقف کے بعد اپنی خاموشی توڑی اور دوسری سمت چند لمحے کو سناٹا چھا گیا۔

”اشمل\_\_\_“ اُس کے لب کھپکا گئے۔

”تمہاری انا\_\_\_\_ تمہاری عزت پر کیا اب حرف نہ آئے گا؟“ وہ اچانک ہی برافروختہ ہو گیا۔ ”کیوں کیا ہے فون تم نے\_\_\_\_ جب کچھ بھی نہیں رہا، تم نے سارے تعلقات پل بھر میں توڑ دیے ہیں۔ اب باقی کیا رہ گیا ہے۔“ اس نے تلخ لہجے میں کہا اور اس کا جواب سنے بغیر ریسپور کریڈل پر پٹخ دیا۔

اُس کے جسم کا سارا خون چہرے پر جم گیا تھا اور آنکھوں میں شعلے سے لپک اٹھے تھے۔ اس لڑکی نے اس سے جینے کی امنگ چھین لی تھی۔ وہ رکا نہیں اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

سحر گل اور اشتاد دونوں دم بخود رہ گئی تھیں۔ ان دونوں کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ دوسری طرف ہشمنہ ابرار تھی۔ کتنی ہی دیر بعد وہ دونوں چونکیں تو اشتاد جیسے روہانسی ہو گئی۔

”سحر۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ یہ کیا ہو گیا؟ اشمٰل لالہ اور ہشمنہ کا جھگڑا ہو گیا ہے۔“ اس نے خوفزدہ نظروں

چاہتی تھی۔ اسے سب کچھ بتادینا چاہتی تھی کہ اب ان کی کوشش عبث ہے۔ وہ تو کے فیصلے کی بھینٹ چڑھے گی۔ ان کی خواہش پر سلطان کمال کی حیات میں شامل ہو جائے گی۔ تا عمر تڑپنے اور سسکنے کے لئے۔

اس نے ڈائری سے سحر گل کا نمبر ڈھونڈ کر نکالا جو سحر گل نے اسے دیا تھا۔ اسے گل بی بی نے ہی بتایا تھا کہ اشتراوہیں رکی ہوئی ہے۔ ایک اشترا تو تھی اس کے راز سے آگاہ۔ یقیناً وہ اسے اپنے غموں میں شامل کر سکے گی۔ شاید اپنا دکھ کہہ لینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

اس نے نمبر ملایا تو تیسری بیل پر ریسیور اٹھالیا گیا۔ مگر دوسری سمت اشمل کی آواز سن کر اس کے وجود میں برقی لہریں سرایت کر گئیں۔

اُف\_\_\_ مگر وہ اس سے کس قدر خفا تھا۔ سخت نالاں تھا۔ آگ بھرے نشتر برسا کر فون پٹچ دیا تھا۔ اُسے مرغِ بسل کی طرح تڑپنے کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ اس کا دل تو پہلے ہی چھلنی تھا۔ اس نے لفظوں کے کئی نشتر اس کے زخمی دل میں پیوست کر دیئے۔

اس نے بے جان ہاتھوں سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ تبھی بیل بج اٹھی۔ اشمل کے جملوں نے اس کے جسم سے جیسے روح کھینچ لی تھی۔ اس کو اندر باہر سے زخمی کر دیا تھا۔ اس نے آنسو پیتے ہوئے ریسیور اٹھالیا۔ دوسری سمت اشترا تھی جس کی آواز ہشمنہ کے ضبط کو بکھیر گئی۔

”اشترا!“ وہ بلک اٹھی اور کتنی ہی دیر روتی رہی۔

وہ اس کی خیر خواہ تھی۔

اس کی رازداں۔

اس کی بہترین رفیق تھی۔ اُس نے اپنا غم اس کے سامنے کھول دیا۔

”مرد کبھی عورت کی مجبوریوں کو نہیں سمجھ سکتے\_\_\_ اشمل خان بھی مجھے ہی قصور وار ٹھہرا رہے ہیں۔“ اس نے ٹوٹے لہجے میں کہا تو اشترا کا جگر چھلنی ہو گیا۔ وہ اسے بے جان لفظوں میں تسلیاں دیتی رہی۔ خود کو سنبھالتے ہوئے اسے سنبھالا دیتی رہی۔

مگر اب ہشمنہ کی تشفی نہ ہوئی۔

اس کے حوصلوں کی چٹانیں تڑخ چکی تھیں۔

کوئی حرف بھی اس کے درد کا مداوانہ بن سکا تھا۔

اس نے فون رکھ کر خود کو صوفے پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔

”کتنا مشکل ہے اشمل خان! تمہیں بھولنا۔ تمہاری یادوں سے دامن چھڑانا۔ وہ سارے لمحے جو تمہارے سنگ گزرے ہیں، اب مجھے ڈستے رہیں گے۔ پچھتاوے بن کر میری رگوں میں دوڑتے رہیں گے۔“

اس کی آنکھوں میں ریت چھپنے لگی۔

پھر کئی دن گزر گئے۔ وہ سارا سارا دن کمرے میں بند رہتی۔ اب تو بھابی نے بھی اُسے تسلیاں دینا چھوڑ دی تھیں۔ وہ کم ہی اس کے کمرے میں جھانکتی تھیں۔ ملازمہ ہی اسے کھانے کے لئے بلانے آتی تھی اور وہ محض گھر والوں کی نظروں میں اپنا وجود معتبر رکھنے کے لئے ان کے درمیان بیٹھ کر چند نوالے حلق سے اتارتی تھی۔

آج پورے پانچ دن بعد بھابی اس کے کمرے میں آئی تھیں۔

”ہشمنہ! آج موسم بڑا خوشگوار ہو رہا ہے\_\_\_ ہلکی ہلکی بارش بھی ہو رہی ہے۔“ انہوں نے اس کے کمرے کا دریاچہ



کھول دید۔ سبز لان کا خوبصورت منظر ہشمنہ کی نگاہوں کے سامنے آگیا۔ وہ ابھی نہا کر نکلی تھی۔ گیلے بال سلجھا رہی تھی۔ چلتی ہوئی درتچے کے پاس آگئی۔

”میرے اندر تو بس ایک ہی موسم ٹھہر گیا ہے۔ یہ برسات تو بہت ہو چکی میرے اندر۔“

”بھابی ہولے سے ہنس دیں۔ ہشمنہ نے انہیں دیکھا اور لب بھینچ لئے۔

وہ پلٹ کر ٹہلنے لگی کہ بھابی نے اس کا بازو تھام لیا۔

”میں تمہیں موسم کا حال سننے نہیں آئی تھی۔ ایک خبر سنائی ہے۔ ہے تو دکھ کی مگر ہشمنہ! ہمت سے سننا ہوگی اور سہنا ہوگی۔“ بھابی نے اپنے اوپر گہری سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا تو ہشمنہ کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔

”نے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے۔ کل وہ لوگ اگر تمہیں انگوٹھی پہنا۔۔۔۔۔۔ ارے کیا ہوا ہشمنہ؟“ بھابی نے گہرا کر اُسے تھما جو لڑکھڑائی تھی۔

”نہیں۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے خود کو بھابی کی گرفت سے چھڑا کر قریبی کرسی پر گرالیا۔

”دیکھو ہشمنہ! تمہیں ہمت سے کام لینا ہوگا۔ یہ فیصلہ تمہارا ہی ہے۔“ بھابی نے اسے دیکھا جو سر جھکائے اس اذیت ناک خبر سے منتشر ہوئے دل کو سنبھال رہی تھی۔ اس کا چہرہ خطرناک حد تک سرخ ہو گیا تھا۔

”اپنی انا اور عزت کی خاطر تم نے یہ سب کیا ہے تو پھر اب آخری مرحلہ ہے۔ یہاں بزدلی کا ثبوت دوگی تو ساری محنت اکارت چلی جائے گی۔“ بھابی کے جملے اس کے دل میں پیوست ہوتے گئے۔

”کل کے لئے خود کو تیار کر لینا۔“ بھابی جھک کر اس کے شانے کو تھپک کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔

...☆☆☆...

”اوہ میرے خدا! میں کیا سمجھوں اسے۔ کوئی معجزہ یا میرے صبر کا پھل۔ خدا کا کرم۔۔۔۔۔۔ ادنیٰ سی نیکی کی جزا۔“

اشمل اس خبر پر کتنی ہی دیر بے یقین سارہا۔ وہ اشتاراکو دیکھتا رہا جو قطرہ قطرہ اس کی سماعت میں امرت اندیل رہی تھی۔ اسے نئی زندگی کی نوید سنارہی تھی۔

”ہشمنہ کے بھائی نے ہماری بھرپور حمایت کی اور پھر گل بی بی کے ووٹ بھی ہماری طرف تھے۔ اور پھر آپ میں کس بات کی کمی ہے؟ برابر انکل خود ذاتی طور پر آپ کو جانے دیں۔ پھر بھلا انکار کا کیا جواز رہتا تھا ان کے پاس۔۔۔۔۔۔ ہشمنہ کو ہم لوگ کل انگوٹھی پہنانے جائیں گے۔“

اشمل نے بے اختیار اپنے خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ کتنا مہربان، غفور و رحیم ہے۔ اس کی آنکھوں کے بجھے دیے جل اٹھے۔ سحر گل بھاگ کر آئی تھی۔

”اشمل بھائی! یہ بات راز رہنی چاہئے۔ یعنی ہشمنہ کو بے خبر رکھا گیا ہے کہ اس کی منگنی آپ سے ہو رہی ہے۔ جبکہ وہ تو سمجھ رہی ہے کہ سلطان کمال کے گھر والے کل آ رہے ہیں اسے انگوٹھی پہنانے۔۔۔۔۔۔“

”ارے سچی؟“ اشتاراکو اس خبر پر ہنسنے لگی۔

”اُن کی بھابی کا ابھی فون آیا تھا۔ انہوں نے تاکید کی ہے۔“

اشمل بھی خاصا حیران ہوا۔ بے ساختہ اس کے تصور میں ہشمنہ کا سراپا لہرا گیا۔ یقیناً وہ بے حال ہو رہی ہوگی۔

”ویسے سحر! یہ ظلم نہیں؟۔۔۔۔۔۔ ہشمنہ تو بیچارہ۔۔۔۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ کوئی ظلم نہیں۔“ سحر گل نے اشتار کی بات کاٹ دی۔ پھر اشمیل کی طرف دیکھا۔ ”کیوں اشمیل بھائی!“  
کیا خیال ہے آپ کا۔۔۔ تھوڑا مزید تنگ نہ کیا جائے؟“

اشمیل اُس کی بات پر ہنس دیا۔ اس لڑکی نے مجھے بھی تو اتنا ہی تڑپایا ہے۔۔۔ تھوڑا اسے سبق ضرور ملنا چاہئے۔ ایک دن وہ اذیت میں گزار لے گی۔ وہ سوچ کر مسکرا دیا۔ اسے ہشمنہ کی محبت کی شدت کا اندازہ ہو ہی گیا تھا۔ وہ اس کے تڑپنے کا مزہ لینے کا سوچ کر مسکرا دیا۔

جب وہ اپنے کمرے میں آیا تو اپنے اندر ایک نئی توانائی ابھرتی محسوس کر رہا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کی رگوں میں اشتار نے زندگی کا نیار س انڈیل دیا ہے۔۔۔ اس کے دل کی ویران بستی میں بے شمار قمقمے جل اٹھے ہیں۔

وہ سرشار انداز میں ہنس دیا اور درپچے سے باہر جھانکا۔ باہر کا موسم بھی اس کے دل کی طرح خوشگوار اور دلفریب ہو رہا تھا۔

”مبارک ہو اشمیل بھائی!“ فروان اندر داخل ہوا تو وہ جلدی سے سیدھا کھڑا ہو گیا اور اپنی بے پناہ مسرت کو قابو کرتے ہوئے اسے محبت سے دیکھا۔

”تھینک یو۔“

”ویسے آپ کی حالت بالکل مجنوں جیسی ہو گئی تھی۔۔۔ قیس کو تو میں نے نہیں دیکھا ہے مگر آپ کو دیکھ کر سوچتا تھا اس کی حالت اس سے مختلف نہ ہو گی۔ مجھے ڈر تھا کہ آپ صحرائیں نہ نکل جائیں۔“ فروان کی شرارت عود آئی تھی۔ اشمیل جھینپ رہا تھا۔

”چلئے، باہر چل کر موسم کا مزہ لوٹتے ہیں۔ اور ہشمنہ بھابی کی باتیں کرتے ہیں۔“

”فروان!“ اشمیل نے اُسے مصنوعی خفگی سے گھورا مگر وہ کہاں متاثر ہوا تھا۔

”ویسے اچھے لگ رہے ہیں۔۔۔ بلکہ غضب کے۔“

اشمیل اس کی طرف بڑھا تو وہ ہنستا ہوا پیچھے ہٹا۔

”میں تو آپ کو یہ کہنے آیا تھا کہ وہ دونوں لڑکیاں بڑا ظلم کر رہی ہیں ہشمنہ صاحبہ کو بے خبر رکھ کر۔۔۔ اور ایک ان کی بھابی، توبہ توبہ، کیا خطرناک شے ہیں۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔“

فروان کی بات پر اشمیل کے لبوں پر مسکان بکھر گئی۔

وہ تصور کر سکتا تھا کہ ہشمنہ اس وقت کس حال میں ہو گی اور کیسے کرب سے گزر رہی ہو گی۔ مگر جب اس قدر اذیت سہہ لینے کے بعد اتنی بڑی خوشخبری سنے گی تو وہ خوشی ہی انوکھی ہو گی۔ جان سے پیارے لوگ بچھڑ کر ملیں تو وہ لمحہ زندگی کے حسین لمحوں سے کہیں زیادہ دلکش اور مسرت انگیز ہوتا ہے۔۔۔ اور کل ہشمنہ کے لئے وہی لمحہ رنگین ہو گا۔

”کیا سوچنے لگے۔۔۔ کیا آپ کا دل نہیں تڑپ رہا اس لڑکی کے لئے؟“ فروان اسے چھیڑنے کی غرض سے کہہ رہا تھا مگر اسے بھی کمال حاصل تھا اپنی بے چینی اور بے قراری کو چھپانے میں۔

”ہوں۔۔۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ ان کی بھابی اور نند کا معاملہ ہے۔“

”کیا۔۔۔؟“ فروان اچھلا۔ ”کس قدر سنگ دل انسان ہیں آپ۔ جائیں اور جا کر فون کیجئے اسے۔“

”نہیں۔۔۔ یہ کھیل خاصا دلچسپ ہے۔“ اشمیل نے انکار کر دیا اور فروان منہ بنا کر رہ گیا۔

...☆☆☆...

وہ سب شام کو ہشمنہ کے بنگلے پر پہنچے تھے۔

اشٹار اکا دل تو مارے خوشی کے بلیوں اچھل رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ ڈرائنگ روم سے اٹھ کر دوڑ کر ہشمنہ کے پاس جا کر اسے یہ خبر سناتی۔

بھابی مسکرا مسکرا کر ان سب کی خاطر مدارات کر رہی تھیں۔ پھر شاہ خانم کے اصرار پر ہشمنہ کے کمرے میں آئیں۔

”چلو بنو! \_\_\_\_\_ اپنے سسرال والوں کا دیدار کر لو۔ اور انہیں اپنے رُخ روشن کا دیدار کراؤ۔“

”بھابی!“ اُس نے تڑپ کر بھابی کو زخمی نظروں سے دیکھا پھر کرب سے لب کاٹنے لگی۔ اُسے لگا کہ اس کی سانسیں جواب دے رہی ہیں۔ صبح سے خود کو سنبھالنے میں لگی تھی۔ بس اس لمحے بکھر رہی تھی۔

بھابی نے اُسے زبردستی کا مدار سوٹ پہنایا تھا اور اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود ہلکا میک اپ کر دیا تھا۔ اور پھر اسے زبردستی کھینچتی ہوئی ڈرائنگ روم تک لے آئیں

”بندی اس جرم کی معافی مانگ رہی ہے \_\_\_\_\_ ویسے ایمان سے، مزا بڑا آیا۔ تمہاری صورت دیکھ کر ایک بار دل چاہا کہ بتا ہی دوں۔ مگر پھر \_\_\_\_\_“ وہ ہنسنے لگیں۔

ہشمنہ کو تو اتنی بڑی خوشی سنبھالنا دشوار ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس وقت کیا ردِ عمل ظاہر کرے۔ اونچے اونچے قہقہے لگائے یا آنکھیں بند کر کے بے خود سی پڑی رہے۔ اس سے اپنا لپکتا دھڑکتا دل سنبھال نہ رہا تھا۔ تب وہ آہستگی سے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔

اپنے کمرے میں آکر وہ دیوار کا سہارا لے کر چند لمحے گہرے گہرے سانس لیتی رہی \_\_\_\_\_ معافون کی گھنٹی چیخا اٹھی تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ پھر چلتی ہوئی فون کے قریب آئی۔

نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ دوسری طرف اشمیل ہوگا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے ریسپور تھام لیا۔

”ہیلو، ہشمنہ!“ اشمیل کی بے تاب آواز اس کی سماعت پر خوشبو بکھیر گئی۔ ”میں تو انتظار ہی کرتا رہا کہ تم فون کرو گی۔ مگر خیر، مبارک ہو۔“ اس کی آواز جذبات کی پورش سے بھاری ہو گئی۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا اشمیل!“ اس کے لب کپکپائے۔

”میں سامنے آؤں گا تو یقین آجائے گا۔“ وہ ہنسا۔ ”آجائوں کیا؟“

”نن۔۔۔۔۔ نہیں۔“ وہ گھبرا گئی۔ ”ابھی تو سب بیٹھے ہوئے ہیں۔“

”اچھا \_\_\_\_\_ جب چلیں جائیں تو بتا دینا۔“ وہ اس کی گھبراہٹ سے بھرپور انداز میں محفوظ ہو رہا تھا اور وہ بری طرح جھینپ گئی۔

”آپ نے مجھ سے کیوں چھپایا؟“ وہ شکوہ کرنے لگی۔ ”میں کس عذاب سے لمحہ لمحہ گزری ہوں، آپ کو شاید اندازہ نہیں۔“

”خوب \_\_\_\_\_ اور جیسے میں تو گھوڑے بیچ کر سوتا رہا تھا۔“ وہ بگڑ کر بولا۔ ”محترمہ! تم نے تو مجھے مار دینے میں کوئی کسر

نہ اٹھا رکھی تھی۔ اپنی انا کا پرچم بلند کرنے چلی تھیں۔ ویسے یہ سچ ہے کہ میرے علم میں بھی آج صبح ہی یہ بات آئی ہے۔ ان سب نے بڑے خفیہ طریقے سے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔“ اشمیل کے لہجے میں بشاشت سمٹ آئی۔

اسے بے ساختہ فون والی آخری ملاقات یاد آگئی۔ اشمیل کا لہجہ کس قدر ٹوٹا ہوا تھا۔ اور وہ خود مایہ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اپنے اُجڑنے کا پورا یقین ہو گیا تھا اسے۔

”ہشمنہ!“ اشمیل کی خوبصورت آواز گمبھیر ہو گئی۔ ”اتنی خوشیاں ایک ساتھ ملی ہیں کہ دامن بھی تنگ لگتا ہے۔“

ساری دعائیں ایک ساتھ بارگاہِ الہی میں قبول ہوئی ہیں۔“

”ہاں اشمیل! محبتوں کی شدت کا اندازہ تو سمجھڑنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ اور انہونی اور الو ہی خوشی تو جدائیوں کے مرحلے طے کرنے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔“

اس کا مطلب ہے کہ تم نے جدائی کے لمحوں کو بہت انجوائے کیا ہے۔“ وہ اسے چھیڑنے کی غرض سے بولا۔

”جی نہیں۔۔۔ یہ بات تو اب سوچنے پر اچھی لگ رہی ہے۔ وگرنہ وہ لمحات تو میرے لئے۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔

”ہاں، کہو نا۔“ اشمیل اس کی خاموشی سے بے تاب ہو گیا۔ ”میں بھی تو سنوں ہجر و فراق کے المناک واقعات۔“

بے اختیار ہشیمینہ پر ڈھیر ساری حیا غالب آگئی۔ اُسے بے ساختہ اپنے اور اشمیل کے مابین رشتہ کا دھیان آگیا تو زبان پر قفل پڑ گئے۔

”مم۔۔۔۔۔ میں فون رکھ رہی ہوں۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔ اسے کمرے سے باہر قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

”ارے نہیں ہشیمینہ!۔۔۔ فون مت رکھنا۔ ابھی تو مجھے تم سے ڈھیروں باتیں کرنی ہیں۔“

”نہیں، پلیز اشمیل!“ ہشیمینہ نے اس کے انکار کے باوجود ریسپورر رکھ دیا اور پلٹی تو وہ سب دروازے میں کھڑی اسے رنگے ہاتھوں پکڑ چکی تھیں۔ اُس نے شرما کر گردن جھکا دی۔

...☆☆☆...

وہ سب وادی جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں اور اشتاد کو بڑی پھرتی سے پیکنگ کرتے دیکھ کر سحر گل ہنسنے لگی۔

”لگتا ہے ذولین خان بہت یاد آ رہا ہے۔“

”ک۔۔۔۔۔ کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ محترمہ کو وادی جانے کی اس قدر جلدی ہے۔ ظاہر ہے ایک وہی رہ جاتے ہیں۔ ہائے بے چارے ذولین بھائی درپچہ میں منہ پھنساۓ دید کی اس لئے بیٹھے ہوں گے۔“

”فضول ہی بکنا۔“ اشتاد کو اس کے ”منہ پھنساۓ“ کہنے پر ہنسی آگئی۔

”کیوں ماہی آپنی! ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟“ اس نے اندر آتی ماہ گل سے پوچھا جو اس کا جملہ سن چکی تھی اور زیر لب مسکرا رہی تھی۔

”بس ماہی آپنی! سحر گل کو بھی اب جلدی سے نکال ڈالیں۔“ اس نے سحر سے بدلہ لینا چاہا۔

”ارے، بات بدلنے کی کوشش مت کرو۔“ سحر نے آنکھیں دکھائیں۔ ”سنو، فون آیا تھا ذولین بھائی کا۔“ وہ بولی۔

”ہائے۔۔۔ کیا؟“ اشتاد نے بے تابانہ پلٹ کر پوچھا اور جواباً سحر گل کا قہقہہ بکھر گیا اور وہ بری طرح نجل ہو گئی۔

”ہائے رے بے تابی۔“

”میں تمہیں مار ڈالوں گی سحر!“ وہ سحر کی طرف جھپٹی۔ لیکن اسی اثناء میں وہ چھلانگ لگا کر بیڈ سے اتر کر کمرے سے بھاگ چکی تھی۔

شاہ خانم، ہشیمینہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھیں۔ ”اشتاد کے نکاح میں اس کی شرکت ضروری ہے۔“

امی کا اصرار تھا کہ وہ ٹھیک نکاح کے روز ہی ان سب کے ہمراہ پہنچے گی۔ مگر گل بی بی بھی اپنی ضد کی ایک تھیں۔

انہوں نے خود ابراہیم بھائی سے بات کی تھی اور پھر ہشیمینہ کو لے جانے پر انہیں راضی کر کے دم لیا تھا۔



اشترا بہت خوش تھی۔

”یہ دانتوں کی اتنی نمائش کیوں ہو رہی ہے؟“ ہشمنہ نے اُسے چھیڑا۔

”تمہارے آنے کی خوشی میں۔“ وہ اس سے لپٹ گئی۔

”جی نہیں۔۔۔ ذولین سے ملنے کی خوشی میں۔“ سحر گل نے اسے چڑایا تو اس کے چہرے پر گلال بکھر گئے۔ یہ بھی سچ تھا کہ ان ہنستے مسکراتے دنوں میں ذولین خان کی یاد ہریل، ہر لمحہ آئی تھی۔ ان دونوں کے مابین اتنا خوبصورت رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ گل بی بی نے اسے ذولین کے نام کی انگوٹھی پہنا کر اس کے سارے خوابوں کو خوش رنگ تعبیریں بخش دی تھیں۔ وہ سارا دن اس بے یقینی میں گزار دیا تھا۔

یہ معجزہ ہی تو تھا اس کے لئے۔

شاہ خانم کا بدلنا۔۔۔ حویلی میں انقلاب آنا۔۔۔

وہ جو مایوسیوں کے گہرے سمندر میں غرق ہو گئی تھی، جانے کیسے اور کون سی لہر نے اُسے ساحل پر لا ڈالا تھا۔

وہ زندہ تھی۔ اپنی پوری توانائیوں کے ہمراہ۔

اور اس کی آنکھوں کے سامنے ہر شے دُھلی دُھلی اور نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ اور پھر اُسے اپنی خوش بختی پر یقین آ گیا۔

شاہ خانم اور بابا خان ذولین کو حویلی کے اندر لے آئے تھے اور رات کو شاندار ڈنچہ منج کیا تھا۔

نیلے کرتے شلوار پر سیاہ واکٹ پہنے ذولین خان کس قدر مکمل اور مسرور نظر آ رہا تھا۔ اس کی سبز آنکھوں میں فتح پالینے کا نشہ اس کی آنکھوں کو اور بھی دلکش بنا رہا تھا۔

وہ اس کے سامنے جانے کی خود میں تاب نہ پا رہی تھی۔ چوری چوری کمرے کے درتچے سے اُسے دیکھتی رہی اور ذولین کس قدر بے چین تھا اُس کی ایک جھلک دیکھنے کو۔ مگر پھر مایوس لوٹ گیا۔

اور دوسرے دن وہ شہر آگئی۔ یقیناً وہ خفا ہوا ہو گا۔ اتنے دن اُس نے اُسے بے تحاشیاد کرنے میں گزار دیئے ہوں گے۔ اُسے اس بات کا پکا یقین تھا کہ وہ ذولین کے جذبات کی شدت سے اچھی طرح واقف تھی۔

سحر اور ہشمنہ کے چھیڑنے پر اس کے چہرے پر گلابی بکھر جاتی۔ اس کی آنکھوں میں بے تابی سمٹ آتی اور ان دونوں کے جملے اس کی بے تابی کو اور بھی سوا کر جاتے۔

فروان اور سحر گل بھی ان کے ہمراہ وادی آرہے تھے جبکہ باقی سب کا فنکشن سے ایک دن پہلے وادی پہنچنے کا ارادہ تھا۔ اشمل نے احسن اور دوسرے چند دوستوں کو خصوصی دعوت نامے دیئے تھے۔ وہ سب اسی شام وادی روانہ ہو رہے تھے۔

فروان کی گاڑی میں شاہ خانم، گل بی بی اور ماہ گل بیٹھی تھیں۔ اشمل جو گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اس میں سحر گل اور اشترا نے اپنے ہمراہ ہشمنہ کو بھی گھسیٹ لیا تھا۔ وہ بری طرح شرما رہی تھی۔ اُس نے اپنی سرمئی چادر کھینچ کر چہرے پر ڈال رکھی تھی اور اشمل مرر میں اسے دیکھ رہا تھا۔

”حواسوں میں رہ کر چلائیے گا اشمل بھائی! ہم ناتواں لوگ بھی بیٹھے ہیں۔“ سحر گل اُس کی چوری پکڑ کر شرارت سے بولی تو اشمل جھینپ گیا۔

”بے فکر رہو۔۔۔ میرے حواس بہت مضبوط ہیں۔ آزمائے جا چکے ہیں۔“ اس نے ہشمنہ کو نظر بھر کر دیکھا۔ کچھ اسے جتا بھی دیا اور وہ زیر لب مسکرا دی۔

”چلیں تو پھر دوسروں کے حواس کو خطانہ کریں۔“ سحر گل کہاں کم تھی۔ اور اشمل کا بے ساختہ قہقہہ گاڑی میں گونج اٹھا۔

سحر گل اور اشمل کی نوک جھونک سے اشتار اور ہشمنہ محفوظ ہو رہی تھیں اور انہی خوشگوار باتوں میں راستہ کٹ گیا۔ دونوں گاڑیاں حویلی کے بڑے سے پورچ میں رک گئیں۔ ان کے استقبال کے لئے مہروز خان، ذولین اور شاندا نہ کھڑے تھے۔

شاندا نہ تو شاہ خانم کو سلام کر کے بھاگ کر ان کی طرف آئی اور اشتار اسے گلے لگ گئی۔

”ہائے اشتارے! \_\_\_ کتنی بے مروت ہو۔ اتنی بڑی خوشی اکیلے اکیلے ہی ہضم کر گئی۔ یہ نہ ہوا کہ میرے آنے کا انتظار ہی کر لیتی۔“ اس نے چھوٹے ہی شکایت کا دفتر کھول دیا۔

”ارے، ارے دھیرج \_\_\_ بی بی! دھیرج۔“ سحر گل نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ ہنس دی۔ اور پھر سحر سے ہاتھ ملا کر ہشمنہ سے لپٹ گئی۔

”ایمان سے مجھے تو ذولین لالہ نے کچھ بھی نہیں بتایا۔ یہ تو مہروز ماموں کی ہی کرم نوازی ہے۔ اور پھر زیبل نے ساری تفصیل عرض کی۔ سچی، مجھے تو لگ رہا ہے کہ خوشی سے مرہی نہ جائوں۔“

”ایک خوشخبری اور بھی ہے۔“ اشتار نے اس کی کمر کے گرد بازو جمائل کرتے ہوئے کہا تو وہ چونک اٹھی۔

ہشمنہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ جانتی تھی کہ اب اشتار کیا کہنے والی ہے۔ سوتیزی سے گل بی بی کی طرف بڑھ گئی۔

”اشمل لالہ کو ہشمنہ کی نکیل بھی ڈالی جا چکی ہے۔“ سحر گل بلند آواز میں بولی تو اشمل نے جو ذولین کے ساتھ کھڑا تھا اس کی بات پر اسے گھورا۔

”میری ناک میں نکیل؟“

”میں نے ناک تو نہیں کہا۔ کہیں بھی لگا لیں۔“ وہ جواباً بولی تو سب ہنسنے لگے۔

”ہائے اشمل لالہ! یہ کیسی بے مروتی۔۔۔۔۔ میری شادی کیا ہو گئی، مجھ سے تو سب نے آنکھیں پھیر لیں۔ اتنا سب کچھ ہو گیا اور مجھے کانوں کان خبر نہ ہوئی۔“ وہ اشمل کی طرف بڑھی۔ ”اب میں آپ دونوں سے لمبی ٹریٹ لوں گی۔“ وہ ذولین اور اشمل دونوں کو بیک وقت مخاطب کر کے بولی۔

”بھئی ٹریٹ تو تم اپنی کزن سے لو۔“ اشمل نے کہا۔

”کس سے \_\_\_ اشتار اسے؟“

”او نہوں \_\_\_ ہشمنہ سے \_\_\_“ ذولین نے برجستہ کہا تو شاندا نہ منہ بنا کر رہ گئی۔

”بڑے چالاک ہیں آپ دونوں \_\_\_ خیر ان دونوں کو بھی بخشوں گی نہیں۔“ وہ اپنے خطرناک ارادوں سے دونوں کو باخبر کرتی اندر کی طرف بڑھ گئی۔

حویلی کی رونق اپنے عروج پر تھی۔ سارے ہی قریبی اور دور کے عزیز مہروز خان اور شاہ خانم کی خوشی میں شریک تھے۔ حویلی کو خوبصورت برقی قہقہوں سے سجایا گیا تھا۔ اندر باہر روشنیاں جگر جگر کرتیں ماحول کو فسون خیز بنا رہی تھیں۔

اشمل کے کئی دوست بھی اس کی خوشی میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ احسن کی شوخیاں تو اپنے عروج پر تھیں۔ ایک طرف فروان کے چٹکے اور دوسری طرف احسن کی گل افشانیوں نے ماحول میں بجلیاں بھر دی تھیں۔ فروان نے بہت خوبصورت دھمال ڈالی تھی۔

”ذولین بھائی! آپ بھی میرا ساتھ دیں۔ ایمان سے، جب تک دولہا دھمال نہ ڈالے، دولہا نہیں لگتا۔“ اس کے فلسفے پر ذولین ہنس دیا اور معذرت کر لی۔

”آپ آجائے! شامل بھائی! خیر سے آپ بھی قریب قریب دولہا ہیں۔“

”نہیں بھائی! مجھے تو معاف ہی رکھو۔ ہاں اپنی شادی پر کر لوں گا بقول تمہارے تاکہ دولہا لگوں۔“ اس کے جملے نے سب کو محظوظ کیا۔

...☆☆☆...

اے ہے \_\_\_ خدا کی پناہ \_\_\_ ذرا دیکھو تو، کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی۔ اندر باہر ایسا شور مچا ہے کہ الاماں۔“ گل بی بی کانوں پر ہاتھ دھرے اندر آئیں۔ ساری لڑکیوں نے اشارہ کے کمرے میں دھاوا بول رکھا تھا۔ اشارہ تخت پر بیٹھی تھی اور ہشمنہ اس کے ہاتھوں پر مہندی لگا رہی تھی۔ اور باقی لڑکیاں اس کے ارد گرد بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ اشارہ کو چھیڑ بھی رہی تھیں اور اپنے ہاتھوں پر مہندی بھی لگاتی جا رہی تھیں۔ گل بی بی، اشارہ کے پاس آئیں۔ ان کی آنکھوں میں بہتیرے جگنو چمک اٹھے۔ گوٹے لگے زرد دوپٹے میں اشارہ کا معصوم چہرہ بے پناہ دمک رہا تھا۔ اُن کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

”خدا یا! تو اسے سدا شاد و آباد رکھنا۔“ انہوں نے چپکے سے دعا مانگ لی۔

”کیا بات ہے ممانی جان \_\_\_ شور سے نالاں ہیں آپ؟“ ہشمنہ ان کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

”اے ہائے، میں کیوں نالاں ہونے لگی۔ یہ شور تو خوشیوں کا احساس دلا رہا ہے۔ ارے میں تو بھول ہی گئی کہ یہاں کیوں آئی تھی۔“ گل بی بی کو اچانک اپنی آمد کا مقصد یاد آیا تو وہ شاندانہ کی طرف متوجہ ہوئیں جو بڑے مزے سے اپنے

ہاتھوں کو مہندی سے سجا رہی تھی۔

”دیکھو تو اُسے، نہ کام کی نہ کاج کی اور مہندی لے کر بیٹھ گئی ہے۔ ارے تیری کون سی بارات آئی باقی ہے۔ اُٹھو اور مجھے چاند نیاں نکال کر دو۔ مردان خانے میں کم پڑ گئی ہیں۔“ گل بی بی نے شاندانہ کو باقاعدہ ڈپٹنے کے انداز میں کہا تو اس کا منہ بن گیا۔

”میں ہی نظر آتی ہوں آپ کو \_\_\_ مہندی خراب ہو جائے گی۔“

”ارے توبہ شاندانہ! اشارہ کی شادی میں مہمان بن کر صرف ٹھونسنے آئی ہو یا کچھ ہاتھ پیر بھی چلاؤ گی \_\_\_ ارے میں تو بوکھلا کر رہ گئی ہوں۔“

”میں نکال دیتی ہوں۔“ ہشمنہ جلدی سے اٹھ گئی۔

”ارے نہیں بیٹی \_\_\_ تم پہلے ہی اشارہ کو مہندی لگا کر تھک گئی ہو۔ یہ کس کام کی ہے۔“

”ارے رہنے دیں ممانی جان! بیچاری نے دس گھنٹے میں تو اتنی سی مہندی لگائی ہے۔ وہ بھی خراب ہو جائے گی۔“ ہشمنہ نے مسکرا کر اس پر لطیف سا طنز کیا تو وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

”اچھا \_\_\_ تم بس یہ کرو کہ زیبیل سے کہو کہ چاند نیاں نکال دے۔ کچھ مردانے میں بھجوادے اور کچھ زنانے میں بچھا دے۔“ گل بی بی بڑی جلدی میں تھیں۔ یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔

”اس لڑکی نے سب کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ اب یوں دھماکہ خیز انداز میں نکاح کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب رخصت ابھی نہیں ہونا تو پھر یہ بیڑیاں کس خوشی میں ہیں۔“ شاندانہ، اشارہ کو گھورنے لگی تو وہ جھینپ گئی۔

”مم۔۔۔۔۔ میں نے یہ تو نہیں کہا تھا۔ یہ تو بابا خان اور شاہ خانم کر رہی ہیں۔“ اس نے جلدی سے وضاحت کی تو

ہشتمینہ کا بے ساختہ قہقہہ ابل پڑا۔

”شاندا نے \_\_\_“ ذولین کی آواز پر وہ سب چونکیں۔

”جی ذولین لالہ! اندر آجائیے۔ یہاں کوئی بھی غیر نہیں ہے سوائے اشتار کے۔“ شاندا نے کوثرات سو جھی تھی اور اشتار کے دل کی دھڑکنیں تو ذولین کی آواز پر ہی منتشر ہو رہی تھیں، اب شاندا نے اُسے بلارہی تھی۔ وہ گھبرا گئی۔

”کک۔۔۔۔۔ کیا کر رہی ہوشان؟“ وہ چلائی اور جھٹ سے پیلا دوپٹہ کھینچ کر سر پر ڈالا اور کھڑی ہو گئی۔

”بھئی مردانے میں کچھ چاند نیاں چاہئیں۔“ وہ اندر آگیا تھا مگر اسی اثناء میں اشتار ابھاگ کر کمرے کے دوسرے حصہ میں جا چکی تھی جہاں بڑا سا پردہ درمیان میں تھا۔ اُس کا پیلا جھلملاتا دوپٹہ لہرایا، پھر پردہ کے پیچھے غائب ہو گیا۔

”اوہ سوری \_\_\_ مجھے خبر نہ تھی کہ اشتار یہاں ہے۔“ وہ کچھ خفیف سا ہو گیا۔ دوسری لڑکیاں بھی شاندا نے کی شرارت سے محظوظ ہو رہی تھیں۔

”ہاں \_\_\_ امی کہہ گئی ہیں۔ مگر ذولین لالہ! آپ دولہا ہو کر یہاں وہاں مصروف ہیں۔ اب ٹک کر بیٹھ جائیے۔“ شاندا نے شرارت سے گویا ہوئی۔

”دولہا ہوں \_\_\_ دلہن نہیں کہ او جھل ہو جائوں۔“ اس نے ایک اچھلتی نظر پر پردہ پر ڈالی مگر پردہ اتنا دبیز تھا کہ اسے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ ذولین، اشتار امہر وز کی ایک جھلک دیکھنے کو بے قرار ہو گیا تھا۔ وہ تو اس خوبصورت بندھن کے بعد سات پردوں میں جا چھپی تھی اور اس کی بے تابی کو اور ہوا دے رہی تھی۔

وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ کچھ شاندا نے کی شرارت کی وجہ سے اور کچھ دوسری لڑکیوں کی موجودگی کی وجہ سے۔

دوسرے دن صبح ہی سے مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ فیصل ماموں کی فیملی اور ہشتمینہ کے گھر والے بھی آ

چکے تھے۔ قریبی علاقوں کے مہمان شام کو آنا شروع ہو گئے تھے۔ دودن سے چھائی گھما گھمی میں یک بیک اضافہ ہو گیا تھا۔ لڑکیاں اپنی تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ اتنے دنوں پہلے سے تیاریاں کرنے کے باوجود اس وقت بھی انہیں کوئی چیز کم محسوس ہو رہی تھی۔ یہاں وہاں ایک ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔

اشتار اپنے تخت پر بیٹھی ان طوفانی تیاریوں کو دلچسپی سے تک رہی تھی۔

”ارے سحر بیٹی \_\_\_ ارے کوئی سنو تو \_\_\_“ شاہ خانم اندر کمرے میں آئیں۔

”جی \_\_\_ جی فرمائیے۔“ شاندا نے ہاتھ روم سے نکل کر ان کی طرف آئی۔

”تمہاری امی کہاں ہیں \_\_\_ نظر نہیں آرہیں۔“

”امی تو شامل لالہ کے ہمراہ شہر گئی ہیں۔“

”ہیں \_\_\_ شہر \_\_\_ اس وقت کیوں؟“

”دوپہر سے گئی ہیں۔ وہ دراصل ذولین لالہ کو اشتار کے لئے شرارہ پسند تھا۔ امی نے نکاح کے لئے پشتواز بنوایا تھا۔ اب وہ شرارہ لینے شہر گئی ہیں۔ کہہ رہی تھیں جلد ہی لوٹ آئیں گی۔“ شاندا نے کی پلکیں خود بخود جھک گئیں۔

”ارے اس لڑکے کو بھی کیا سو جھی۔ پشتواز میں بھلا کیا برائی ہے۔ یہی تو پہنایا جاتا ہے دلہن کو۔“ شاہ خانم حیران ہوئیں اور پھر کمرے سے نکل گئیں۔

”ذولین لالہ کہہ رہے تھے، پشتواز میں تو اشتار کو کئی بار دیکھ چکا ہوں \_\_\_ اسی لئے شرارہ منگوایا ہے۔“

”رخصتی کے لئے شرارہ رکھ لیتے۔ ابھی کون سا دیکھ سکیں گے وہ۔“ سحر گل بھی اس دلچسپ موضوع میں شریک ہو گئی۔



”ارے واہ\_\_\_ کیوں نہیں دیکھ سکیں گے۔“ شاندا نہ معنی خیز انداز میں ہنسی۔ اشتار کا چہرہ گلگول ہو گیا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

گل بی بی شام تک واپس آگئی تھیں۔ وہ بڑا خوبصورت شرارہ خرید کر لائی تھیں جو نکاح کے وقت اشتار کو پہنا دیا گیا تھا۔ ”چشم بد دور، دل ماشاد۔ آج تو ذولین بھائی کی خیر نہیں۔“ ہشمنہ نے اس کے ہوشربا سراپا پر نگاہیں ڈال کر شرارت سے کہا۔

”بکومت\_\_\_ تم اپنی خیر منائو۔ بڑی قاتل لگ رہی ہو۔“ اشتار نے اُسے نظر بھر کر دیکھا۔

شاہ خانم نے اسے بے حد خوبصورت کامدار جوڑا دیا تھا جو اس کے تراشیدہ سراپے پر بے حد نچ رہا تھا۔ اس پر میچنگ جیولری اور ہلکے میک اپ نے اس کے چہرے کو خیرہ تن بنا دیا تھا۔ وہ اشتار کی نگاہوں پر جھینپ گئی۔

”سنو، تم بال کھلے رکھنا۔“ سحر گل اس کے کھلے ریشمی بالوں کو دیکھ کر بولی۔

”نہیں\_\_\_ میں تو مہک سے بال بنوائوں گی۔“

”وہ نہیں بنائے گی\_\_\_ بڑی بد تمیز ہے وہ۔“ سحر گل لپ اسٹک کا آخری ٹیچ دے کر بولی۔

”نہیں\_\_\_ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔“ وہ ڈریسنگ سے برش اٹھا کر مہک کو ڈھونڈنے نکل گئی۔ تبھی مہک اس کو کوریڈور سے گزرتی نظر آئی۔ اس نے اسے جا پکڑا۔

”ہائے ہشمنہ! مم۔۔۔۔۔ میں تھک گئی ہوں۔“ مہک پکڑے جانے پر جھینپ گئی۔

”کون سے سو کام کر ڈالے ہیں تم نے۔ وعدہ کیا تھا تم نے مجھ سے۔“ وہ مہک کو بہانے بناتے دیکھ کر منہ بنا کر بولی۔ ”جائو، مجھ سے بات مت کر ناب۔“ وہ خفا ہو کر جانے لگی کہ مہک نے اسے پکڑ لیا۔

”مذاق کر رہی ہوں یاد!\_\_\_ ویسے بھی اشمیل لالہ نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ خبردار، میری فیانسی کو ندامت مت کرنا۔ اسے سب سے حسین بنا دینا۔“ وہ ہنستے ہوئے اسے چھیڑنے لگی۔ ہشمنہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اسی لمحے اشمیل اپنے کمرے سے باہر نکلا تھا۔ وہ اپنے نام پر ٹھٹک گیا تھا۔ مہک تو اشمیل کو دیکھ کر تیزی سے کسی قریبی کمرے میں جا گھسی اور ادھر ہشمنہ، اشمیل کے یوں سامنے آجانے پر سٹیٹا گئی۔

”ہاں بھئی\_\_\_ میرا کیا ذکر خیر ہو رہا تھا؟“ وہ اس کے سچے سنورے سراپے کو پُر شوق نظروں سے تکتے لگا۔

وائٹ کابلیو جھلملاتا سوٹ اور کھلے بالوں کے ہمراہ وہ اس کے دل کے تاروں کو چھو گئی۔ گولڈن آئی شیڈ نے اس کی سیاہ آنکھوں کو قیامت خیز بنا دیا تھا۔

”وہ مم۔۔۔۔۔ مہک تو ایسے ہی فضول بکواس کر رہی تھی۔“ اس نے سر جھکا لیا۔ سنہری نگاہیں اس کے دل کے آر پار ہو رہی تھیں۔

”فضول تو نہ کہو\_\_\_ اتنی اچھی بات کہی تھی اس نے۔“ وہ جلدی سے بولا۔ وہ جملہ سن چکا تھا۔

”ہشمنہ!“ اشمیل کی آواز گمبھیر ہو گئی اور ہشمنہ کا دل دھڑک دھڑک اٹھا۔ اُسے اشمیل خان کی والہانہ نگاہوں سے بے طرح شرم آنے لگی۔ اسی لمحے فروان کی آواز نے اشمیل کی توجہ اپنی جانب کر لی۔ وہ اُسے دور سے پکار رہا تھا تو وہ جلدی سے پلٹا۔

”بقیہ ملاقات بعد میں ہوگی۔ سمجھیں؟“ اس نے پلٹتے ہوئے ہشمنہ کی طرف دیکھا۔

”جی نہیں\_\_\_“ وہ جلدی سے بولی اور جھپاک سے بھاگ گئی۔

حویلی کے بڑے بڑے لان رنگین شامیانوں سے سجے ہوئے تھے۔ مردوں اور عورتوں کے بیٹھنے کا الگ الگ انتظام

تھا۔ نکاح کی رسم بے حد خاموشی اور مقدس ماحول میں ہو رہی تھی۔

جو نہی نکاح کی رسم ختم ہوئی، شاہ خانم بے تابانہ اشتراکی طرف بڑھیں اور اشترا کو بانہوں میں بھر لیا اور اشترا جو جب سے آنسوؤں کا سیلاب چھپائے بیٹھی تھی اسے ضبط پر یاد نہ رہا اور وہ سیلاب اُٹ آیا۔

”میری بچی! خدا تجھے سدا سکھی رکھے۔ میں نے جو تیری خوشیاں چھینی تھیں وہ تیرے دامن میں سمٹ آئیں۔ مجھے معاف کر دینا میری بچی! بہت زیادتیاں ہوئی ہیں مجھ سے۔“ انہوں نے اس کی بھیگی بھیگی پلکوں کو چوم لیا۔ اشترا انہیں کس قدر عزیز تھی، انہیں آج احساس ہو رہا تھا۔

ذولین خان کی خوشی تو قابل دید تھی۔ اس کی آنکھوں میں سب کچھ پالینے کا نشہ اُٹا رہا تھا۔ وہ مردانے سے اٹھ کر گل بی بی کی طرف آ رہا تھا۔ تب شاہ خانم اس کی طرف بڑھیں اور وہ احتراماً جھکا تو انہوں نے اُسے بانہوں میں بھر لیا۔ آج انہیں بری طرح رونا آ رہا تھا۔ شاید خوشی کے آنسو تھے یا اندامتوں کے آنسو تھے۔ وہ سارے آنسو بہا کر پُر سکون ہو جانا چاہتی تھیں۔

ذولین کو خوب بھیج کر انہوں نے پیار کیا۔

”مجھ گناہگار کو تو معاف کر دینا بیٹے! بہت بوجھ ہے اب بھی میرے دل پر۔ شاید اتر جائے۔“

”نہیں چچی خانم! کیوں بار بار آپ ایسی باتیں کر رہی ہیں! میں تو وہ سب کچھ فراموش کر چکا ہوں۔ جب حال کی خوشیاں ہمارے اطراف میں بکھری ہوئی ہیں، مستقبل میں کوئی گرد نظر نہیں آ رہی تو پھر ہمیں کربناک ماضی کو یاد رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔“

شاہ خانم نے اُسے دیکھا۔ اس لمحے وہ انہیں بہت عظیم انسان لگا جس نے کتنی آسانی سے برسوں کی زیادتیوں کو بھلا دیا تھا۔ ان کے ڈھیر سارے جر مہل بھر میں معاف کر دیئے تھے۔ انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی۔

اشترا کے دل کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ خوشی کا بے پناہ احساس ہو رہا تھا تو کہیں بے نام سادکھ ہلکورے لینے لگتا۔

کبھی آنکھوں میں آنسو آئے جا رہے تھے تو کبھی لبوں پر مسکراہٹیں۔

اس نے ایک گہری سانس کھینچ کر قد آدم آئینے میں اپنا سجا سنورا سراپا دیکھا۔ کندن آنکھوں کو بہت غور سے دیکھا۔ آج ان کی شفاف سطح پر کسی ناآسودگی کا شائبہ تک نہ تھا۔ کسی اندیشے اور خوف کی پرچھائیں نہ تھیں۔

آج اس نے ساری محبتیں پالی تھیں۔

محبت جو ساری وحشتوں کو چوس لیتی ہے۔

بے لوث محبت جو بے نمومٹی کو شاداب کر دیتی ہے۔

یہی محبت جو دشت کو فردوس کا روپ دیتی ہے۔

آج اُس نے بنجر سالوں کا ثمر پالیا تھا۔

شاہ خانم کی محبت میں ڈوب کر اپنی پیاسی ہستی کو سیراب کیا تھا۔ ذولین خان آہ، جس کے سچے جذبوں نے اسے بالآخر جیت لیا تھا۔ فتح ہمیشہ بے غرض اور بے لوث انسانوں کی راہ دکھتی ہے۔

اُسے اپنے خدا پر بے اختیار پیار آ گیا۔

تقدیر کس طرح مہربان ہوئی تھی۔

تپتے منظروں پر دھنک رنگ لہرا گئے تھے۔

مسرت، خوشی کسی خوشگوار منظر کی طرح اس کے وجود کے سامنے کے راستوں پر پھیلی ہوئی تھی، حال اور مستقبل کو گل رنگ کرنے کے لئے۔

اُس نے ایک گہری اور آسودہ سانس سینے کی تہہ سے کھینچی۔

”گھنیری چھانوں مل جائے تو موسم کی تمازت ہار جاتی ہے۔ آج مجھے یقین آنے لگا ہے کہ تپتی دھوپ پر کس طرح مہربان ابر چھا جاتے ہیں۔۔۔ صحران کی تپتی ریت کس طرح ٹھنڈی مٹی میں بدل جاتی ہے۔“ ذولین کی بھاری آواز نے اُسے چونکا دیا۔ ”موسم بھی بدلتے ہیں، لمحے بھی سرکتے ہیں، جمود کس طرح ٹوٹتا ہے، آج ہر بات کا یقین آنے لگا ہے اشتار امہروز!“ اُس نے قد آدم آئینے میں دیکھا۔ وہ اس کے بالکل قریب اکھڑا ہوا تھا۔ کریم کلر کے شلوار سوٹ پر میرون واسکٹ میں اونچا لمبا وجود سحر انگیز لگ رہا تھا۔ سبز شفاف آنکھیں الوہی خوشیوں سے دمک رہی تھیں۔ سنہری بال بے حد نفاست سے سر پر سجے تھے۔

”آ۔۔۔۔۔ آپ یہاں؟“ وہ بغیر پلٹے دھڑکتے دل کے ساتھ بولی۔

”ہاں۔۔۔ اب تو مجھے شرعی حق حاصل ہو گیا ہے۔“ وہ مسکرایا اور اس کے بے حد قریب آ گیا۔ اشتار اکا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کسی کے آجانے کا دھڑکا اس پر لاحق ہو گیا۔ مگر ذولین خان ان سب باتوں سے بے پرواہ تھا۔ اس کا انگ انگ خوشی سے سرشار تھا۔ اشتار اکا سر اپا اس کے سامنے تھا اور یہ یقین کہ وہ اس کی امانت ہے۔ زندگی کے سفر میں اس کی شریکِ سفر ہے۔ کاتبِ تقدیر نے اس کی خوشیوں کی ضمانت دے دی تھی۔ اس کے لئے تو ہر لمحہ خوشیوں سے پُر نور ہو گیا تھا۔

کتنے کٹھن سفر طے کرنے کے بعد اس نے اشارہ مہروز کو پایا تھا۔ ایک صبر آزما جنگ کے بعد فتح کا چراغاں ہوا تھا اس کے دل نگر میں۔

”سچی چاہت کا اپنا ہی ایک نشہ ہوتا ہے، یہ تمہیں پالینے کے بعد محسوس ہوا ہے اشترا! \_\_\_ آج میں بے حد خوش ہوں۔ بہت زیادہ۔ جیسے آج پہلی بار خوشی کے مفہوم سے آشنا ہوا ہوں۔“ اس کی والہانہ نگاہیں اشترا کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”ہاں ذولین خان! خوشیاں بے حد انمول ہوتی ہیں۔۔۔ ان کی مسرت الوہی۔ اگر یہ آسانی سے مل جاتیں تو ان کے رنگ ماند پڑ جاتے، انہیں پالینے کا نشہ پھیکا پڑ جاتا۔ دُکھوں کے شجر پر ہی تو خوشی کے ثمر کھلتے ہیں۔“ اس نے اپنے لپکتے جھپکتے دل کو اس سبز نگینوں سے سنبھالتے ہوئے دھیرے سے کہا تو ذولین خان اسے دیکھتا رہ گیا۔

کس قدر مکمل تھی یہ لڑکی۔ اپنے ہر انداز میں دل کو موہ لینے والی۔ اُس نے واسکٹ کی جیب سے خوبصورت بکس نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ میری طرف سے پہلا تحفہ۔“

اشارانے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے عنابی لبوں پر دل فریب مسکراہٹ رقصاں تھی۔

”آخری نہیں کہوں گا۔“

”یہ ظاہری تحفے آپ کی محبت کے سامنے کچھ نہیں ذولین خان! مجھے تو وہ سب کچھ مل گیا جو مجھے چاہئے تھا۔“

”تھینک یو۔۔۔ مگر یہ سب تمہارا اعجاز ہے کہ ایک پتھر کو انسان بنا ڈالا۔ وہ بھی اپنے قابل۔“ وہ ہنسا تو اشتارا جھینپ گئی۔

”اشارا! یہ دن اور 22 تارخ مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔۔۔ اس لئے کہ بالکل یہی دن تھا اور یہی تارخ جب میں ان آنکھوں سے ڈسٹر ہوا تھا اور اپنا قیمتی دل ہارا تھا۔“

”جی \_\_\_؟“ وہ حیران ہوئی۔

”جی \_\_\_ اپنی شکست اور فتح کا دن کون بھول سکتا ہے بھلا۔ وہ دن میری شکست کا تھا اور آج فتح کا۔“ اس نے اس کی سنہری سنہری آنکھوں میں جھانکا تو اشارانے گہرا کر پلکیں جھکا دیں۔

”اگر اجازت ہو تو میں پہنا دوں اسے؟“ اس نے بکس کھولنا چاہا تو اشارا سٹپٹا گئی۔ اسے اس لمحے ذولین سے بے پناہ شرم آنے لگی۔ اس نے جلدی سے وہ بکس اس کے ہاتھ سے لے لیا اور ذولین اس کی گہراہٹ سے محفوظ ہوتے ہوئے ہنس دیا۔

اس نے بکس آہستگی سے کھولا تو دو سنہری کنگن دمک رہے تھے اور اس پر رکھے تراشیدہ گلابی کاغذ پر سیاہ حرفوں میں خوبصورت شعر لکھا تھا۔

شہر دل میں اک ایسا رستہ بھی ہے

جس پر برسوں سے ایک چہرہ بیٹھا ہے

اشارا کو لگا جیسے زندگی کے اتنے ڈھیر سارے لمحوں میں اُسے اپنا ایک لمحہ مل گیا جس میں محبتوں اور ٹھنڈی چھائوں کا بھرپور احساس تھا اور یہ احساس کا لمحہ یقیناً صدیوں پر محیط ہوگا۔

اس نے خوشبو میں بسے اس کاغذ پر چہرہ جھکا لیا اور لمحہ بھر کو آنکھیں موند کر محبتوں کی پیشگی دعائیں مانگ ڈالیں۔ اور جب آنکھیں کھولیں تو ذولین خان اپنی مہک اس کے اطراف بکھیر کر جاچکا تھا۔ اور وہ پورا اثریر ٹولا آنکھوں میں شوخیاں بھرے کمرے میں موجود تھا۔

وہ بے ساختہ ہنس دی۔ شفاف اور تروتازہ ہنسی \_\_\_ جس میں حسرتوں اور دکھ کا شائبہ تک نہ تھا۔

ختم شد